

Click on http://www.paksociety.com for more
دسمبر 2015
خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
WWW.PAKSOCIETY.COM
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
READING SECTION
Online Library For Pakistan
READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
READING
Section
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

# خواتین ڈائجسٹ

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز



خط و کتابت کا پتہ
خواتین ڈائجسٹ
37- اردو بازار کراچی

دسمبر 2015
جلد 43 شمارہ 8
قیمت 60 روپے







[illegible]
پاکستان [illegible] 700 روپے
ایشیا [illegible] 6000 روپے
[illegible] 7000 روپے


خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 1 [illegible] بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیر

# کرن کرن خوشبو

دسمبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

اسلامی سال کے ماہ ربیع الاول کا آغاز اسی مہینے میں ہو رہا ہے۔

یہ وہ مبارک مہینہ ہے جس میں کائنات کی اس عظیم ترین ہستی کی ولادت ہوئی جس کے ذکر کو اللہ تعالیٰ نے رفعت و بلندی عطا کی۔

دنیا میں آج تک جب بھی عظیم ترین انسانوں کی فہرست بنائی گئی، خواہ وہ غیر مسلموں نے بنائی ہو یا مسلمانوں نے۔ ایک ہی نام سرفہرست جگمگایا۔ ہمارے پیارے نبی فخرِ دوجہاں کا اسم مبارک سب سے اوپر رہا اور ہمیشہ رہے گا۔

یہ اعزاز بھی صرف آپ کو حاصل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر گوشہ، چھوٹی سے چھوٹی بات تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے اور تمام تر مذموم کوششوں کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر کوئی انگلی نہ اٹھا سکے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کائنات کی واحد ہستی ہیں جن کو انسانِ کامل، محسنِ انسانیت کا شرف حاصل ہے

ربیع الاول کا آغاز ہوتے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کے اظہار کے لیے گھر گھر میلاد کی محفلیں منعقد کی جاتی ہیں۔ جلسے جلوس نکالے جاتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حقیقی محبت کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی سوچ فکر، عمل اور زندگی کو آپ کی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالیں۔

## نیا ناول،

پچھلے ماہ ہم نے قارئین سے جاننا چاہا تھا کہ وہ کس مصنفہ کا ناول پڑھنا چاہتی ہیں۔ قارئین نے مختلف مصنفین کے نام لکھے لیکن اکثریت کی رائے کے مطابق بہن آمنہ ریاض کا ناول منتخب ہوا ہے۔

آمنہ ریاض کا شمار ان خوش نصیب مصنفین میں ہوتا ہے جنہوں نے جب بھی لکھا، قارئین نے اسے بے حد پسند کیا ہے۔ ان کے متعدد ناول، ناولٹ اور افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ تین سلسلے وار ناول بھی مقبولیت کی سند حاصل کر چکے ہیں۔

جنوری سے ان کے نئے ناول "دشت جنوں کے سودائی" کا آغاز ہو رہا ہے۔ موضوع اور کہانی کے اعتبار سے یہ ناول آمنہ ریاض کی اب تک لکھی گئی تمام تحریروں سے مختلف اور منفرد ہے۔ کردار نگاری میں آمنہ ریاض کو جو کمال حاصل ہے قارئین اس سے تو واقف ہی ہیں۔

ہمیں توقع ہے کہ بہن آمنہ ریاض کا یہ ناول ان کی دیگر تحریروں سے بڑھ کر ثابت ہوگا۔

## سال نو نمبر۔ سروے،

جنوری کا شمارہ ہماری طرف سے قارئین کے لیے خصوصی تحفہ ہوگا۔ اس میں قارئین کی شمولیت کے لیے حسب روایت سروے بھی شامل ہوگا۔ سروے کے سوالات یہ ہیں۔

1- گیا سال آپ کو کیا دے گیا۔؟ کوئی امید، کوئی سوچ، کامیابی یا ناکامی؟

2- ملکی حوالے سے اور ذاتی حوالے سے کوئی خواہش، جو آپ چاہتی ہیں اس سال پوری ہو جائے؟

3- اس سال آپ نے کوئی کتاب پڑھی یا ٹی وی پر کوئی پروگرام دیکھا، اس نے آپ کی سوچ کو نیا رخ دیا۔ کوئی خوبصورت جملہ یا اقتباس لکھیں۔

4- منیر نیازی نے کہا تھا "ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں" کوئی ایسی بات، کوئی ایسا کام جسے آپ نے کسی اور وقت کے لیے ٹال دیا اور پھر کر نہ پائیں کوئی ایسی بات جو کہنی تھی، مگر بقول منیر نیازی "دیر کر دی" اس پر پچھتاوا ہے۔

ان سوالات کے جواب اس طرح بھجوائیں کہ 22 دسمبر تک ہمیں موصول ہو جائیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے' اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری' صحیح مسلم' سنن ابوداؤد' سنن نسائی' جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے' وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کررہے ہیں' وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

# کرن کرن روشنی

ادارہ

## حرام

حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

"بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتے کی قیمت' بدکار عورت کی کمائی اور کاہن کی شیرینی سے منع فرمایا ہے۔

(بخاری و مسلم)

### فوائد و مسائل :

1۔ کتے کی قیمت کی ممانعت کا مطلب ہے کہ کتے کی خرید و فروخت حرام ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک یہ حکم عام ہے۔ جو ہر قسم کے کتے کو شامل ہے' چاہے وہ شکاری کتا ہو یا سدھایا ہوا ہو یا کھیتوں وغیرہ کی حفاظت کی غرض سے لیا گیا ہو' جن کا رکھنا جائز ہے۔ اس لیے کہ کتا مطلقاً "نجس ہے' چاہے وہ کسی بھی قسم کا ہو۔ بعض علماء کے نزدیک ان کتوں کی خرید و فروخت اور ان کی قیمت جائز ہے جن کتوں کو رکھنے کی اجازت ہے' جیسے شکار اور حفاظت کے لیے رکھے جانے والے کتے۔ دلائل کے اعتبار سے جمہور کا قول راجح ہے کیونکہ حدیث میں مطلقاً" منع کیا گیا ہے۔

2۔ بدکار عورت جو کچھ کماتی ہے' اسے مہر صرف اس کی ظاہری شکل کی وجہ سے کہا گیا ہے' ورنہ یہ حرام ہے۔ اس کے جواز کا کوئی بھی قائل نہیں۔ اسی طرح کاہن' نجومی' عراف اور جو لوگ بھی ان کی طرح مستقبل کی خبریں بتا کر عوام کو بے وقوف بناتے اور ان سے پیسے بٹورتے ہیں' ان کی کمائی بھی حرام ہے۔

3۔ ان کی کمائی کی طرح ان کو دینا بھی حرام ہے' اس لیے کہ جب ان کے لیے لینا جائز نہیں تو دینے والے کا دینا بھی جائز نہیں۔

## بدشگونی لینے کی ممانعت کا بیان

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بیماری کا ایک سے دوسرے کو لگ جانا اور بدشگونی لینا کوئی چیز نہیں۔ اور مجھے فال اچھی لگتی ہے۔"

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا "فال کیا چیز ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اچھی بات (کا سننا اور اس سے خیر کی امید وابستہ کرلینا۔)" (بخاری و مسلم)

**فوائد و مسائل :**

1۔ "بیماری کا ایک سے دوسرے کو لگ جانا نہیں" میں اس بات کی نفی ہے کہ ایک شخص کی بیماری دوسرے تندرست آدمی کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ یا نفی، نہی کے معنی میں ہے، یعنی تم کسی بیماری کو اس معنی میں متعدی مت سمجھو کہ یہ خیال کرو کہ فلاں شخص فلاں کی بیماری کی وجہ سے بیمار ہوا، بلکہ جس طرح پہلا شخص اللہ کی مشیت سے بیمار ہوا، دوسرا بھی اللہ کی مشیت ہی سے بیمار ہوا۔

بعض بیماریاں، جو متعدی سمجھی جاتی ہیں، اس میں ان کے متعدی ہونے کا انکار نہیں ہے بلکہ صرف عقیدے کی درستی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اس میں بھی اصل چیز اللہ کی مشیت ہی کو سمجھنا چاہیے نہ کہ کسی بیماری کو کیونکہ اگر بیماری ہی اصل سبب ہوتو پھر ایک گھر میں متعدی مرض میں مبتلا ایک شخص کی وجہ سے گھر کے تمام افراد کو اس بیماری میں مبتلا ہونا چاہیے جب کہ واقعتاً" ایسا نہیں ہوتا۔ صرف ایک دو شخص ہی بیمار ہوتے ہیں، سب کے سب بیمار نہیں ہوتے۔ جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ متعدی مرض میں بھی اصل سبب بیماری نہیں، اللہ کی مشیت، اس کی تقدیر اور فیصلہ ہی ہے۔

## بیوہ کہاں عدت گزارے

حضرت زینب بنت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہا جو حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ تھیں، حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ حضرت فریعہ بنت مالک رضی اللہ عنہا سے روایت کرتی ہیں، انہوں نے فرمایا۔

"میرے شوہر اپنے کچھ (بھاگے ہوئے) غلاموں کی تلاش میں نکلے۔ (آخر) "قدوم" جگہ کے قریب انہیں جالیا۔ غلاموں نے انہیں شہید کر دیا۔ جب مجھے میرے خاوند کی وفات کی خبر ملی تو میں اپنے خاندان کے محلے سے دور انصار کے ایک مکان میں رہائش پذیر تھی۔ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا۔

"اے اللہ کے رسول! مجھے خاوند کی وفات کی خبر اس حال میں ملی ہے کہ میں ایک ایسے مکان میں رہ رہی ہوں جو میرے خاندان کے محلے سے بھی دور ہے اور میرے بھائیوں کے گھروں سے بھی دور ہے اور اس نے کوئی مال بھی نہیں چھوڑا جس سے میرا خرچ چلتا رہے، نہ کوئی مال چھوڑا ہے جو مجھے ترکے میں ملے، نہ ان کی ملکیت میں کوئی گھر تھا۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے اجازت دے دیں کہ میں اپنے اقارب اور اپنے بھائیوں کے گھر چلی جاؤں۔ مجھے یہ بات زیادہ پسند ہے اور اس سے میرے (روزمرہ کے) کام بہتر طور پر چلتے رہیں گے۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر تم چاہو تو یوں ہی کرلو۔"

وہ فرماتی ہیں: "میں باہر نکلی تو مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے میرے حق میں فیصلہ فرمایا۔ میں ابھی مسجد ہی میں تھی یا گھر کے صحن ہی میں تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے (دوبارہ) طلب فرمالیا، پھر فرمایا۔

"تم نے کیسے بیان کیا؟"

میں نے دوبارہ صورت حال پیش کی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب تک اللہ کی مقرر کردہ مدت (موت کی عدت) پوری نہیں ہو جاتی، اسی گھر میں رہائش رکھو جہاں تمہیں اپنے خاوند کی وفات کی خبر پہنچی۔" چنانچہ میں نے چار ماہ دس دن تک وہیں عدت گزاری۔

**فوائد و مسائل :** عورت کو عدت اسی مکان میں گزارنی چاہیے جہاں وہ اپنے شوہر کی ساتھ رہائش

پذیر تھی۔

خاوند کی وفات پر عدت چار مہینے دس دن ہے۔ اور اگر عورت حاملہ ہو تو عدت وضع حمل (بچے کی پیدائش) ہے اگرچہ خاوند کی وفات کے چند لمحے بعد ہی ولادت ہو جائے۔

2۔ اسی طرح بدشگونی لینے کا معاملہ ہے' اس کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے' اس لیے کچھ دیکھ کر دل میں اس قسم کا وسوسہ پیدا بھی ہو تو اسے اہمیت دو اور نہ اس کے مقتضیٰ ۔ پر عمل کرو کیونکہ اس سے یہ بداعتقادی پیدا ہوتی ہے کہ فلاں چیز کی وجہ سے کام خراب ہو گیا' جب کہ فاعل اور موثر حقیقی صرف اللہ کی ذات ہے' اس لیے بدشگونی لینا حرام اور ناجائز ہے۔

اچھی بات سن کر فال لینے کو جائز قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح ایک انسان اللہ تعالیٰ سے حسن ظن قائم کر لیتا ہے جو ایک مستحسن امر ہے۔ اس میں گویا اس امر کی بھی ترغیب ہے کہ انسان کو اپنی زبان سے اچھی بات ہی نکالنی چاہیے اور اچھی بات ہی سننی چاہیے جس سے لوگ نیک فال اخذ کریں اور ایسی بات کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے جس سے ان کے دلوں میں بدفالی کا خدشہ ہو۔

**فائدہ :** بہتر یہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں بدشگونی نہ لی جائے۔ تاہم اگر دل میں اس قسم کا وسوسہ پیدا ہو تو اس کے مقتضیٰ ۔ پر عمل نہ کیا جائے۔

## آرزو

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''تم میں سے ادنیٰ جنتی کا یہ مرتبہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اس سے کہے گا'' آرزو کر۔ چنانچہ وہ آرزو کرے گا' پھر آرزو کرے گا (کہ میرے لیے فلاں چیز ہو' فلاں چیز ہو' وغیرہ۔) اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا تو نے اپنی ساری آرزوؤں کا اظہار کر دیا ہے؟ وہ کہے گا'' ہاں۔ چنانچہ اللہ اس سے کہے گا' تیرے لیے جو کچھ تو نے آرزو کی ہے' وہ بھی ہے اور اس کے ساتھ اس کی مثل اور بھی۔'' (مسلم)

## نماز میں لمبا قیام

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

ایک رات میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں نماز (تہجد) پڑھی۔ آپ اتنا عرصہ کھڑے رہے کہ میں نے ایک برے کام کا ارادہ کر لیا۔

(ابو وائل فرماتے ہیں) میں نے کہا۔'' وہ کون سا کام تھا؟''

فرمایا'' میں نے ارادہ کیا کہ میں بیٹھ جاؤں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڑا رہنے دوں۔'' (بخاری)

**فوائد و مسائل :** 1 نماز تہجد باجماعت جائز ہے۔

2 نماز تہجد میں طویل قرات افضل ہے۔

3 شاگردوں کو تربیت دینے کے لیے ان سے مشکل کام کروانا جائز ہے اگرچہ اس میں مشقت ہو۔

4 استاد کا خود نیک عمل کرنا شاگردوں کو اس کا شوق دلاتا اور ہمت پیدا کرتا ہے۔

5 صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نیکی کا اس قدر شوق رکھتے تھے کہ افضل کام کو چھوڑ کر جائز کام اختیار کرنے کو انہوں نے ''برا کام'' قرار دیا۔

6 حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہا کا ارادہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں نماز ادا کرنے کا تھا' اب اتباع اور محبت کا تقاضا ہے کہ اس نیکی میں آخر تک ساتھ دیا جائے' اس لیے بیٹھ جانے کو انہوں نے برا سمجھا کہ یہ محبت کے تقاضے کے خلاف ہے۔

## مردے کی خوبیاں بیان کرنا

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ پر بے ہوشی طاری ہو گئی تو ان کی بہن رونے لگی اور کہنے لگی۔

"ہائے اے پہاڑ! ہائے ایسے اور ایسے!"
ان کی خوبیاں شمار کرتی تھی۔ چنانچہ جب انہیں ہوش آیا تو فرمایا۔
"تونے جو کچھ کہا' تو مجھ سے پوچھا جاتا تھا: تو اس طرح ہی ہے؟" (بخاری)

**فائدہ :**
اس سے معلوم ہوا کہ بین کرنے پر گرفت ہو سکتی ہے۔ خاص طور پر ایسی خوبیاں بیان کرنا جو مرنے والے میں نہ ہوں تو فرشتے اس پر اسے سرزنش کرتے ہیں کہ کیا تو واقعی ان خوبیوں کا حامل ہے' در آں حالیکہ وہ ان سے محروم ہوتا ہے۔ یہ اس کے لیے ملامت اور توبیخ کا باعث ہے۔

## کثرت سے سجدے

حضرت ابو فاطمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔
"میں نے عرض کیا" اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی عمل بتائیے جس پر میں قائم رہوں اور اسے کیا کروں"۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "کثرت سے سجدے کیا کر' کیونکہ تو اللہ کے لیے جو بھی سجدہ کرے گا' اس کی وجہ سے اللہ تیرا ایک درجہ بلند کردے گا اور تیری ایک غلطی معاف کردے گا۔" (طبرانی)

**فوائد و مسائل :** 1 نماز کے تمام اعمال ہی اللہ کے قرب کا باعث ہیں' لیکن سجدے کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے' کیونکہ یہ اللہ کے سامنے عاجزی کا سب سے بڑا مظہر ہے اور یہ عجز ہی عبادت کی روح ہے۔

2 طویل قیام کی فضیلت تلاوت قرآن کی وجہ سے ہے اور سجدے کی فضیلت عجز و نیاز کی وجہ سے' اس لیے طویل سجدہ بھی ایک عظیم عمل ہے جیسے کہ احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طویل سجدوں کا بھی ذکر ہے۔

3 سجدے سے درجات بھی بلند ہوتے ہیں اور گناہ بھی معاف ہوتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"رب العالمین کے نزدیک یہ شخص سب لوگوں سے زیادہ بڑی شہادت والا ہوگا۔" (مسلم۔ اور بخاری نے بھی اس مفہوم کی بعض روایات بیان کی ہیں۔)

**فوائد و مسائل :**
1۔ اس میں ایک مومن کی عزیمت و استقامت اور پھر شہادت کا ذکر ہے۔ جس کا مظاہرہ اس کی طرف سے دجالی فتنے کے مقابلے میں ہوگا۔
2۔ اس میں اس کی گردن کے اس حصے کو تانبا بنا دینے کا جو ذکر ہے' جس کو تلوار مار کر انسان کے جسم سے الگ کردیا جاتا ہے' تو یہ "حقیقتاً" بھی ہو سکتا ہے' اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے کوئی بعید نہیں اور بعض لوگ اسے کنائے پر محمول کرتے ہیں کہ دجال اس کو قتل کرنے پر قادر نہیں ہو سکے گا۔ حقیقت پر محمول کرنا زیادہ بہتر ہے۔
3۔ اسی طرح آخر میں دجال کی آگ کو جنت بتلایا گیا ہے۔ یہ یا تو انجام کے اعتبار سے ہے' یعنی اس آزمائش کا نتیجہ جنت ہے۔ یا جنت بمعنی امن و سکون ہے کہ مومن کو اپنے ایمان کی پختگی کی وجہ سے آگ میں بھی امن و سکون محسوس ہوگا' یا پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح وہ آگ اس کے لیے گلزار بن جائے گی۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

## سوال

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ دجال کے فتنے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جتنے سوال میں نے کیے' اتنے کسی نے نہیں کیے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا تھا:
"وہ تجھے نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔"
میں نے عرض کیا" لوگ کہتے ہیں: اس کے پاس روٹی کا پہاڑ اور پانی کی نہر ہوگی؟"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:" اہل ایمان کو

بچالینا اللہ کے لیے اس سے بھی زیادہ آسان ہے۔"

(بخاری و مسلم)

فائدہ : مطلب یہ ہے کہ دجال کے پاس اگرچہ گمراہ کرنے کے بڑے وسائل ہوں گے لیکن اہل ایمان کو اس کے حشر سے بچانا اللہ کے لیے مشکل نہیں ہوگا۔

## کان

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو بھی نبی آیا' اس نے اپنی امت کو کانے' جھوٹے (دجال) سے ضرور ڈرایا۔ خبردار! وہ دجال کانا ہے اور تمہارا رب کانا نہیں ہے۔ اس دجال کی دونوں آنکھوں کے درمیان (ک ف ر) لکھا ہوا ہوگا۔"

(بخاری و مسلم)

## کانا

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے سامنے دجال کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کانا نہیں ہے۔ یاد رکھو! مسیح دجال دائیں آنکھ سے کانا ہے گویا کہ اس کی آنکھ ابھرا ہوا انگور ہو۔"

**فوائد و مسائل :**

1۔ دجال اور اس کی فتنہ انگیزی کی بابت جو حدیثیں بیان ہوئی ہیں' یہ صحت اور درجہ استناد کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کی ہیں' یعنی صحیح بخاری و صحیح مسلم کی' جن کی صحت و قطعیت پر علمائے امت کا اتفاق ہے' اس لیے اس کی بابت کسی قسم کا شک صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے نزول بھی ایسی متواتر احادیث سے ثابت ہے جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ قیامت کے قریب یہ علامات کبریٰ یقیناً "ظہور پذیر ہوں گی جن پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔

2۔ دجال' یہودی الاصل شخص ہوگا۔ فتنہ پردازی میں ممتاز ہونے کی وجہ سے اس کا نام ہی دجال ہے' بہت دجل و فریب سے کام لینے والا۔ اللہ تعالیٰ بھی اہل ایمان کی آزمائش کے لیے اسے بعض خرق عادت امور پر قدرت عطا فرمائے گا' وہ الوہیت کا مدعی ہوگا' یہودیوں کا ایک بہت بڑا گروہ اس کے ساتھ ہوگا' اس کو حدیث میں مسیح الدجال بھی کہا گیا ہے' لیکن یہ مسیح الضلالۃ ہے جبکہ عیسیٰ علیہ السلام مسیح الہدیٰ ہیں۔ مسیح کے معنی اور اس کے ساتھ اسے لقب کرنے کی وجہ میں بہت اختلاف ہے' بعض کہتے ہیں کہ اس کی وجہ اس کا ممسوح العین ہونا ہے' بعض کہتے ہیں کہ وہ مکہ و مدینہ کے علاوہ روئے زمین پر پھرے گا' اس لیے اسے مسیح کہا گیا ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کو بھی اسی لیے مسیح کہا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ماں کے پیٹ سے جب نکلے تھے تو ان کے جسم پر تیل ملا ہوا تھا۔ یا اس لیے کہ وہ جس بیمار پر ہاتھ پھیر دیتے تھے' صحیح ہو جاتا تھا۔ وغیرہ (فتح الباری' کتاب الصلاۃ' باب الدعاء قبل السلام)

## برکت کے ساتھ مال کی زیادتی کے لیے

ام سلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا۔

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! انس آپ کا خادم ہے اس کے لیے اللہ سے دعا کیجیے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی۔

"اے اللہ! اس کے مال و اولاد میں زیادتی کر اور جو کچھ تو اسے دے اس میں برکت عطا فرما۔"

# ایک دن اردو کے طالب علموں کے ساتھ

انشا جی

جب ہم چین گئے ہیں تو چینی زبان سے بالکل کورے تھے لیکن ہمت کرے انسان تو کیا نہیں ہو سکتا۔ سترہ اٹھارہ دن بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ دو لفظ نہایت روانی سے بولنے لگے۔ ایک نی ہاؤ (مزاج شریف) دوسرا چائی چن (یعنی اچھا پھر ملیں گے) سو مہمان کو یہی دو لفظ آنے چاہئیں باقی گفتگو کے لیے ترجمان موجود ہے۔ ہاں یاد آیا۔ ایک اور لفظ بھی ہم برجستہ اور باموقع بول کر چینیوں کو حیران کرتے تھے 'وہ ہے شے شے (یعنی شکریہ) بعضوں نے پوچھا بھی کہ آپ نے اتنی جلدی اتنی چینی زبان کیسے سیکھ لی۔

چند دن بعد ہم جاپان گئے تو جاپانی زبان میں بھی اسی طرح مہارت حاصل کرنے کا عزم کیا۔ کیونکہ ہم کو لسانیات سے ہمیشہ شغف رہا ہے۔ افسوس کہ وہاں ہمارا قیام مختصر تھا یعنی کل آٹھ دن۔ اس کے باوجود ہم جاپانی زبان میں شکریہ ادا کرنے پر قادر ہو گئے۔ یعنی "آری گاتو گزائی مش" کا لفظ اہل زبان کی طرح بولتے تھے۔ اگر کچھ فرق تلفظ میں تھا بھی تو تھوڑا سا جھک کر سینے پر ہاتھ رکھنے سے سننے والا جان لیتا تھا کہ ہم اظہار ممنونیت کر رہے ہیں۔ ایسے بھی اعتراض کرنے والے موجود ہیں۔ جنہوں نے کہا کہ واہ ایک ہفتے میں ایک لفظ جان لینا کیا کمال ہے۔ ہمارے قارئین انصاف سے کہیں 'ان میں سے کتنوں کو معلوم تھا۔ آری گاتو گزائی مش کا۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم چند ماہ اور وہاں رہتے تو ان ہی کی زبان میں صاحب سلامت کرنے لگتے۔

ہاں تو چین میں ایسا بھی ہوا کہ ترجمان پاس نہ تھا پھر بھی ہم کو کبھی چینیوں سے مکالمت میں دقت نہ ہوئی۔ ہم نی ہاؤ کہتے تھے ادھر سے چینی زبان میں کچھ ارشاد ہوتا تھا۔ ہم شے شے 'شے شے کرتے جاتے حتی کہ اس کی بات ختم ہو جاتی اور ہم چائی چن کہہ کر رخصت ہو جاتے۔

ممکن ہے ہم چینی زبان میں مزید لیاقت بھی پیدا کرنے کی کوشش کرتے بلکہ اب یاد آتا ہے کہ ہم گرم پانی بھی چینی زبان ہی میں طلب کرتے تھے اور کے سوائے کہتے تھے۔ لیکن ڈاکٹر عالیہ امام کی مثال کو دیکھ کر ہم نے تحصیل السنہ کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ وہاں کئی ماہ سے ہیں' پیکنگ ریڈیو پر کام کرتی ہیں۔ ایک روز تشریف لائیں تو ہم نے کہا۔

آپ کے لیے چائے کا بندوبست کریں؟"

فرمایا کرو۔" ہم نے کہا۔

"مشکل یہ ہے کہ ہم اردو میں کر سکتے ہیں' حد سے حد انگریزی میں' بیرا ہم بلائے دیتے ہیں گفتگو آپ کیجیے گا۔"

بیرا آیا۔ بیگم عالیہ امام نے اپنے لکھنوی لہجے میں بہت کچھ کہا۔ اتنا یاد ہے کہ چ کے مرکبات تھے۔ بیرا کھڑا سر ہلاتا رہا اور ہم نے ازراہ تحسین عالیہ امام صاحبہ کو دیکھا بلکہ کہا بھی کہ آپ نے ایسی قابل رشک مہارت کیسے پیدا کی؟

انہوں نے بتایا کہ..... "آدی ذہین ہو تو چینی زبان مشکل نہیں۔" چونکہ ہم یہ شرط پوری نہ کر سکتے تھے۔ لہٰذا کچھ دل گیر اور مایوس ہو گئے لیکن اتنے میں بیرا آگیا' دیکھا کہ دو قد آدم گلاس دودھ کے ہیں۔

بیگم عالیہ بیرے پر بہت خفا ہوئیں کہ تم اتنی چینی زبان بھی نہیں سمجھتے کہ..... "میں کہوں چائے تو چائے لے آؤ۔" لیکن وہ بس کھڑا ہاتھ ملتا رہا۔ دل میں ضرور شرمندہ ہوا ہو گا۔"

اردو کے مشہور ادیب خاطر غزنوی بھی وہاں ہیں اور ان کا کام ہی تحصیل زبان ہے تاکہ واپس آکر یہاں چینی زبان سکھا سکیں۔ ہم نے دیکھا کہ وہ ٹیکسی والے کو سمجھا لیتے ہیں کہ کدھر چلنا ہے۔ بولے دو ڈھائی سو لفظ سیکھ گیا ہوں۔ پانچ ہزار لفظ سیکھ کر اخبار پڑھا جا سکتا ہے۔

ہم نے کہا۔ "کتنے دن لگیں گے۔"

بولے..... "بشرط حیات چند برس اور....."

ہم نے کہا۔ "خیر یہ رہا اخبار کچھ تو پڑھو۔"

کافی دیر کوشش کے بعد انہوں نے کئی لفظوں پر انگلی

رکھی کہ یہ آتے ہیں فی الحال۔
خیر قطرہ قطرہ بہم شود دریا۔
پھر ایک روز ہم نے سوچا کہ دیکھیں چینی لوگ اردو سیکھتے ہیں تو کیسی سیکھتے ہیں۔ اگر چینیوں کو اپنی زبان کے مشکل اور پیچیدہ ہونے پر ناز ہے تو ہم کو بھی ہے۔ خیر ایک روز بندوبست ہوا اور ہم لوگ پیکنگ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں جا نکلے۔
پہلے تو ایک بیٹھک میں وائس چانسلر صاحب نے ہمیں شرف ملاقات بخشا۔ پھر تعارف کراتے کراتے کہا۔ "یہ ہیں مادام شان یون' یہاں اردو پڑھاتی ہیں۔"
ہم نے کہا۔ "آیئے بیگم صاحبہ ہمارے پاس آجایئے۔" وہ مسکراتی ہوئی اٹھ کر آگئیں اور بولیں۔
"آپ ابن انشا صاحب ہیں نا۔ آپ کی نظمیں ہم نے پڑھی ہیں۔ افکار ہمارے پاس آتا ہے' آپ کی کتاب ہماری لائبریری میں ہے۔"
چائے وائے پینے کے بعد ہم نے وہ کتابیں نذر کیں جو ہم یہاں سے لے گئے تھے اور مادام شان یون نے کہا "آیئے آپ کو طالب علموں سے ملائیں۔"
پیکنگ یونیورسٹی ایک وسیع و عریض رقبے میں پھیلی ہوئی ہے۔ راستے میں مختلف شعبوں کی عمارتیں تھیں۔ ہر جگہ طالب علموں کے ٹھٹ تھے جو ہمیں دیکھ کر دو رویہ کھڑے ہو جاتے اور تالیوں سے استقبال کرتے۔ رسم یہ ہے کہ مہمان بھی جواباً" تالی بجاتا ہے۔ چین کے قیام کے دنوں میں ہم کو ہر روز اتنی تالیاں بجانا پڑتی تھیں کہ رات کو آکر ہاتھ آگ پر سینکتے تھے اور روغن کس کی مالش کرتے تھے۔
شعبہ اردو کے طالب علم ہمارے خیر مقدم کے لیے پہلے سے کھڑے تھے۔ ان میں آدھے لڑکے تھے' آدھی لڑکیاں۔ بڑے تپاک سے علیک سلیک ہوئی۔ بعضے فر فر بولتے تھے بعضے اٹک اٹک کر۔
ہم نے کہا۔ "چلیے کلاس دیکھیں۔ لیکن طالب علم مصر تھے کہ پہلے ہم ان کی قیام گاہیں دیکھیں۔" وہاں دکھانے کی کوئی ایسی بات نہ تھی۔ بہت چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ اور ہر ایک میں ایک دو منزلہ چارپائی ایک کونے میں ایک میز اور کتابوں کے لیے ایک الماری۔ ایک طالب علم نیچے کی چارپائی پر سوتا تھا دوسرا اوپر ٹنگتا تھا۔ ویسے نرم گدے اور اجلی چادریں تھیں۔ ہم لوگ قریب قریب سب کے سب دو کمروں میں تقسیم ہو گئے۔ وہاں اتنی کرسیاں کہاں تھیں۔ بس چارپائیوں پر اور میز پر چڑھ بیٹھے۔ باقی باتیں تو فروعات تھیں۔ اردو کی محبت اور شوق اصل چیز تھی۔ اکثر لڑکے اور لڑکیاں فر فر بولتے تھے اور سب سے تعجب کی بات یہ تھی کہ کسی سے تذکیر و تانیث کی کوئی غلطی نہ سنی جیسی اندرون پاکستان ہم مختلف علاقوں کے لوگوں سے ضرور ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ خط پختہ تھے۔ بعضوں کے منشیانہ اور املا میں کوئی غلطی ہجے کی نہ تھی۔
ہم نے کہا۔ "پڑھتے کیا ہیں آپ لوگ"۔ معلوم ہوا اچھی خاصی لائبریری اردو کتابوں کی ہے اور پھر اخبار جنگ آتا ہے۔ اس میں سے مضامین اور اداریے یا خبریں لے کر سائیکلو اسٹائل کرالی جاتی ہیں اور طالب علموں میں بانٹ دی جاتی ہیں۔ ہم نے دیکھا تو پہلا ہی سبق صدر ایوب کے دورہ چین پر تھا۔
لائبریری میں گئے تو واقعی نئے ادب کی بہت سی اچھی کتابیں موجود تھیں۔ اور طالب علم ہمارے بعض ہم عصروں کا ذکر ان کی کہانیوں کے حوالے سے کرتے تھے۔
مادام نے کہا۔ "میں آپ کی نظم شنگھائی کا ترجمہ چینی میں کر رہی ہوں۔"
ہمارے وفد کے رکن جو اردو کے آدمی تھے۔ ان کی سرشاری کا بیان کرنا مشکل ہے۔ اتنی دور ایک مختلف تہذیب کے ملک میں اردو کے پودے کو پھولتے پھلتے دیکھنا واقعی ایک جذباتی تجربہ تھا۔
ہم نے مادام سے کہا کہ۔۔۔ "ان طالب علموں کو ہم چائے کی دعوت دیتے ہیں ان سب کو لایئے وہاں اور باتیں ہوں گی۔ ہم ان کو کتابیں دیں گے۔ اور واپس پاکستان جا کر کتابوں کی لین ڈوری باندھ دیں گے"۔ یاد رہے کہ ایسے وعدے وفا نہیں ہوا کرتے۔"
طالب علم تو پھر آئے اور ہمارے ساتھ چائے پی۔ ان کو کتابیں بھی ہم نے دیں۔ لیکن مادام کسی وجہ سے تشریف نہ لا سکیں' تیس برس کی ہوں گی۔ بہت پسندیدہ اطوار کی اور سنجیدہ' ہم نے کہا کہ ہماری ڈائری میں اپنے دستخط دے دیجیے۔ انہوں نے یہ مہربانی کی کہ دستخطوں کے علاوہ ایک عبارت بھی لکھ دی۔ ان کا خط کم از کم ہمارے خط سے تو بہتر ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ طالب علموں نے اتنی مہارت فقط دو سال بلکہ کم میں حاصل کی تھی۔ اور بیگم صاحبہ نے بھی اردو ایک چینی سے پڑھی ہے۔ ✡

# حرفِ سادہ کو دیا اعجاز کا رنگ

امت الصبور

## سدرۃ المنتہیٰ

سالگرہ پر نجانے کیوں بڑے بوڑھوں کی ایک پرانی بات یاد آجاتی ہے کہ عمر کا ایک سال گھٹ جاتا ہے مجھے فکر اس لیے نہیں کہ میری سوچ اس سے قطعی الٹ' یہ ہے کہ عمر گھٹنے کے بجائے بڑھ جائے گی اس کے ساتھ ایک اور اضافی خیال یہ بھی کہ صرف لکھنے کے لیے کم از کم ایک لکھاری کی عمر ننانوے سال ہونی چاہیے' عمر کا آخری سال جیسے چاہے گزار لو۔ میں تو جاکر کسی صوفی کے مزار پر بیٹھ جاؤں گی اگر بیچ میں ایک سو سال کی عمر مل گئی تو...... عمر سے ہٹ کر لکھنے کی طرف آتے ہیں۔ تو پہلا سوال یہ ہے کہ

1 ”لکھنے کا شوق وراثت میں ملا یا صرف آپ کو قدرت نے صلاحیت عطا کی؟“

”تو بھی قدرت ہی تو صلاحیت عطا کرتی ہے مگر یہ بھی کہنا سو فیصد سچ ثابت ہو گا کہ لکھنے کے جراثیم وراثت میں ملے۔“

2 - ”آپ کے گھر والے خاندان والے آپ کی کہانیاں پڑھتے ہیں؟ ان کی آپ کی تحریروں کے بارے میں کیا رائے ہے؟“

”میرے گھر والے اور خاندان والے قطعاً میری کہانیوں میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے' اور اسی میں میری عافیت بھی ہے' سوائے دوستوں کے جو پڑھتے بھی ہیں اور کہانی کے برے اختتام کی صورت پہلے سے گندے انڈے اور ٹماٹروں کی برسات کی دھمکی دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ تسلی بہت اس لیے بھی کہ دھمکی صرف دھمکی ہی رہتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں کہا جاتا ہے جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔ میں کہتی ہوں' برس بھی جائیں تو نکھرتے نہیں۔

3 آپ کی ایسی کون سی کہانی ہے جسے لکھ کر اطمینان محسوس ہوا ہو۔

اب تک جو لکھا جتنا لکھا' شدت سے لکھا ہے مگر

”اک جہاں اور ہے“ حنا میں سلسلہ وار چلنے والا ناول۔ جس سے میں سو نہیں تو پچاس اگر پچاس نہیں تو پچیس فیصد ضرور مطمئن ہوں' وہی پسند بھی ہے اس کے علاوہ بریت نگر کا شہزادہ اور ایک علامتی افسانہ رکی ہوئی صدی' پھر سندھیا شاہ کے بارے میں لکھا ہوا ہر لفظ' لفظ کا حرف' حرف کا نقطہ اور نقطے کا نشان دماغ نہیں دل سے عزیز ہے' محبت سے عزیز ہے (سندھیا شاہ سندھی ادب کی نامور مصنفہ اور میری پیاری دوست۔ جواب اس دنیا میں نہیں رہیں)

4 سوال ہے چوتھا اور آخری اور وہ ہے اپنے علاوہ دوسری مصنفین کے بارے میں تو کہوں گی اپنی کہانیوں میں کھل کر خرابہ کیا اور سیکھا صرف دیگر مصنفین سے اور پڑھا پسند کیا۔ سرفہرست مفتی جی کو' جن کو پڑھنے کے بعد صرف ان کو ہی پڑھنے کا دل چاہتا ہے' پھر ان کے سحر سے نکلو تو کچھ اور بھی سوچو اور اشفاق احمد ہر دل عزیز بانو قدسیہ' مستنصر حسین تارڑ کے پیار کا پہلا شہر کے جادو سے مظہر الاسلام کی جنتر منتر جیسی گھورتی' پیار برساتی لفظی آنکھوں کے اثر سے پانی کی طرح بہہ نکلو اور اپنے پاپولر فکشن کے پلیٹ فارم پہ آجاؤ۔

آجاؤ اور دیکھو' اپنے ریلوے ٹریک پر ہر طرح کا میلہ لگا ہے' ہر موضوع ہے جو جو معاشرے میں چلتا پھرتا سانس لیتا رہتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے مسائل' ننھی ننھی خوشیاں' بارش کے موسم کی چھم چھم میں

راحت بیبں کی پُرجوش ہیروئین اور لفظوں کی بھول بھلیوں میں گھومتا عنیزہ سید کا کوئی بھی کردار۔
اور بشریٰ سعید کی رقص جنوں یا پھر سفال گر کی باز گشت جو سنائی دیتی ہے اب تک ذہن کی سماعتوں میں لفظ تھرکتے ہیں' ناچتے ہیں' رقص کرتے ہیں' سماعتیں ردھم میں آجاتی ہیں۔ یا پھر سمیرا حمید کا جملہ! بولتا ہوا جملہ' سائرہ رضا کی کہانی گونجتی ہوئی کہانی دل موم کا دیا یا پھر رواں پانی کی طرح بہتی ہوئی محبت داغ کی صورت' تنزیلہ ریاض کا عدم کا فسانہ ہے دنیا' سورج کب رکا ہے "مرگ برگ" یا پھر "عہد الست" کا رعب اور سب کی جان عمیرہ احمد کی "پیر کامل" سے لے کر حاصل' حاصل سے لاحاصل' ایمان امید اور محبت میں دیگر کئی پھر رفعت آپا رفعت ناہید سجاد کی کہانی کی نئے سُرتان' منظر نگاری' بیان کی پختگی' برجستگی اور علم' علم کی جان۔ سعدیہ حمید کی "من لو" کا جادو سرچڑھ کر بولتا ہے۔
آمنہ مفتی کا مسافر پکڑ لیتا ہے' جکڑ لیتا ہے' چھوڑتا نہیں' تو کبھی غزالہ نگار کے پرانے افسانے اپنی اور بلاتے ہیں' کیا لے جاتے ہیں کہیں اور۔۔۔ اور پھر ثمینہ عظمت کے افسانے لگتے ہیں چھوٹے چھوٹے شاہکار' رواں اسلوب کے ساتھ سوچ کی پختگی اس پر لہجے کی شگفتگی اور شائستگی ساتھ یا تو پھر سندھ کے صوفیوں کی محبت جب کھینچ کر لے جاتی ہے ایک نام میری استاد' میری محسن کنیز نبوی کے پاس' جن کے نام کا ہی اچھا خاصا رعب ہے مگر تحریر میں جھلکتی ہے سندھ کی ثقافت' روحانیت شاہ بھٹائی کے بیت کا لہجہ' ترنم' آواز وہ آواز جب بجنے لگے تو ساری آوازیں ایک ساتھ بجنے لگتی ہیں یا پھر چپ کی اوڑھنی اوڑھ کر بیٹھ جاتی ہیں اور بجنے لگتی ہے۔
بس ایک آواز بھٹائی کے شعر کی آواز۔۔۔
اور رہ جاتا ہے اس کا لہجہ' اس کی مٹھاس لے کر چلا جاتا ہے قلندر کی نگری کا بنا کر مسافر اور پھر عشق تھرکتا ہے' ناچتا ہے' رقص کرتا ہے اور رہ جاتا ہے۔ بس عشق صرف عشق' باقی ساری باتیں ہوا میں اڑ جاتی ہیں' کیفیت رہ جاتی ہے آپ کے اندر۔ دل کے اندر۔

☼ ☼ ☼

## عنیقہ محمد بیگ..... سیالکوٹ

1۔ لکھنے کی صلاحیت اور شوق وراثت میں ملا ہوا؟ ۔۔۔ یا صرف آپ کو قدرت نے تخلیقی صلاحیت عطا کی گھر میں آپ کے علاوہ کسی اور بہن بھائی کو بھی لکھنے کا شوق تھا۔

جواب: لکھنے کی صلاحیت اور شوق وراثت سے نہیں ملا۔ یہ شوق بھی اک عجیب سی کہانی پر مشتمل ہے۔ مجھے بچپن میں جانور پالنے کا بے حد شوق تھا۔ چوزے' خرگوش' چڑیاں' بلی' کتا مجھے بے حد پیارے تھے۔۔۔ اور انہیں پالنے کا بے حد شوق تھا اور میں جو پالتو جانور پالتی۔۔۔ اس کے ساتھ یوں باتیں کرتی جیسے وہ میری باتیں سمجھتے ہوں۔ سنتے ہوں۔۔۔ اور میرے بہت اچھے دوست ہوں مگر اس کے برعکس میرے دوستوں کو جانوروں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور کبھی کبھار میں اپنی کالونی کے بچوں کو بلی یا کتے پر پتھر برساتے دیکھتی۔۔۔ تو اس دن عجیب سا غصہ مجھ پر سوار رہتا۔۔۔
اس کے علاوہ میری والدہ کے پاس کوئی اپنا دکھ بیان کرتا۔ آنسو بہاتا۔۔۔ تو میں سوچتی یہ آنسو کیا ہیں۔ اور کیوں آجاتے ہیں اور اللہ نے دل اور آنسو کا کیا رشتہ بنا کر رکھا ہے۔ میں اپنی والدہ سے اس بات کا تذکرہ کرتی تو وہ مجھے ہمیشہ سمجھاتیں۔۔۔ کہ میرے سوچنے' سمجھنے کی صلاحیت' انداز دوسروں سے زیادہ حساس ہے۔ میں ان چیزوں کو بھی سوچتی ہوں۔ جن پر ایک عام سوچنے والے کی نظر نہیں پڑتی۔۔۔ یا اس نے کبھی اس چیز کو اتنی اہمیت نہیں دی اور میں ان چیزوں کو لے کر زیادہ نہ سوچوں۔ مگر میری سوچ کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔
یہ ایسا کیوں ہے؟ یہ ویسا کیوں نہیں۔۔۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟۔۔۔ ایسا ہو جاتا تو؟ اس کیوں نے ہمیشہ مجھے

بے چین رکھا۔ اور ابھی تک یہ کیوں کیوں۔۔۔ جاری ہے۔ میں بچوں میں کھیلنے سے زیادہ کہانیاں پڑھنا پسند کرنے لگی۔۔۔ اور پھر ایک دن میں نے بھی قلم اٹھالیا۔ کہانی تو نہ بن سکی۔۔۔ البتہ کاغذ سے اک رشتہ جڑ گیا۔۔۔ اور میٹرک کے بعد میں نے بچوں کے لیے لکھنا شروع کر دیا۔۔۔ رسالوں میں کہانیاں چھپنے لگیں۔۔۔ پھر نظمیں لکھیں۔۔۔ اور پھر اک دن پودوں کو پانی دیتے دیتے پورا افسانہ لکھ ڈالا۔ جب یہ افسانہ "پودا" شائع ہوا۔۔۔ تو دوستوں کو حیرت ہوئی کہ پودے بھی رومینٹک ہوتے ہیں پھر امتل کو کاغذ پر اپنی عجیب عجیب سوچ لکھ کر بھیجتی رہی۔۔۔ اور ان کی حوصلہ افزائی

نے میری سوچ کو کاغذ کی دنیا سے جوڑ دیا اور اللہ کے فیض سے قارئین نے مجھے اتنی محبت، عزت دی کہ کاغذ کی دنیا سے مجھے عشق ہو گیا۔ یہ سب اللہ کا کرم ہے۔۔۔ اور اللہ اس طرح مجھ پر کرم کرتا رہے۔۔۔
فیملی میں لکھنے کا کسی کو شوق نہیں۔۔۔ بس اک میں ہی عجیب کیڑا ہوں۔

2 آپ کے گھر والے، خاندان والے آپ کی کہانیاں پڑھتے ہیں۔ ان کی آپ کی تحریروں کے بارے میں کیا رائے ہے۔

فیملی کو میرے افسانے بہت اچھے لگتے ہیں۔ (ننھے منے جو ہوتے ہیں) کزنز کی رائے بھی اچھی ہوتی ہے۔ کیوں کہ میرے سارے کزنز مجھ سے بڑے ہیں اور بڑے ہمیشہ محبت ہی کرتے ہیں۔

3 آپ کی کوئی ایسی کہانی جسے لکھ کر آپ کو اطمینان محسوس ہوا ہو۔ اب تک جو لکھا ہے۔ اپنی کون سی تحریر زیادہ پسند ہے۔

ہر افسانہ لکھ کر مجھے اطمینان محسوس ہوتا ہے۔ جس طرح ماں نو ماہ کے بعد اپنی کوکھ سے بچے کو جنم دیتی ہے۔ اسی طرح لکھاری بھی ذہن میں تحریر کو پالتے ہیں اور یہ تحریریں لکھاری کے بچوں جیسی ہوتی ہیں۔ اس لیے یہاں بھی یہ فیصلہ میرے لیے ناممکن ہے۔ کہ میرا کون سا افسانہ، تحریر لکھ کر مجھے زیادہ اطمینان محسوس ہوا۔۔۔ یا کون سا مجھے پسند ہے۔۔۔ البتہ رائٹرز اور ریڈرز کو جو افسانہ زیادہ اچھا لگتا ہے۔۔۔ وہ میں فارغ وقت میں دوبارہ ضرور پڑھتی ہوں۔

4 اپنے علاوہ کن مصنفین کی تحریریں شوق سے پڑھتی ہیں۔

عمیرہ احمد (آپی) جن کی تحریریں بے حد شوق سے پڑھتی ہوں اور ان سے میرا رشتہ بہنوں جیسا ہے۔ اس کے علاوہ ماہا ملک، نگہت عبداللہ، رخ چوہدری، عالیہ بخاری، فرحت اشتیاق، اقبال بانو، راحت جبیں، ناہید چوہدری، کنیز نبوی، صائمہ اکرم چوہدری، سائرہ رضا،

رفاقت جاوید، ثمینہ عظمت اور سدرۃ المنتہیٰ جو کہ میری بہت پیاری دوست ہیں اور ہمیشہ میرے حق میں دعائیں کرتی ہیں۔ آخر میں خواتین، شعاع، کرن کے قارئین اور امتل صاحبہ کا بے حد شکریہ ادا کرتی ہوں۔ جنہوں نے میری حوصلہ افزائی کرتے کرتے مجھے الیکٹرانک میڈیا کا بھی حصے دار بنا دیا۔ آج کل اک سوپ لکھ رہی ہوں۔ جو اللہ کے فضل سے شوٹ پر ہے۔ قارئین بہنوں سے التماس ہے کہ میرے مرحوم والدین کے حق میں دعا کرتے رہیں۔

پسندیدہ شعر۔

پلکوں کی حد کو توڑ کر دامن پر آ گرا
اک آنسو میرے صبر کی توہین کر گیا



**سرورق کی شخصیت**

| | |
|---|---|
| ماڈل | ایشا نور |
| میک اپ | روز بیوٹی پارلر |
| فوٹو گرافی | موسیٰ رضا |




سرجن، اداکار، ماڈل

# فہد مرزا سے ملاقات

## شاہین رشید

کبھی کبھی اپنی فیلڈ سے وقت نکال کر یا بور ہو کر انسان کا دل چاہتا ہے کہ وہ کوئی اور کام بھی کرے' کوئی ایسا کام جس سے وہ ریلیکس ہو جائے۔ میڈیسن ایک خشک فیلڈ ہے اور ہم نے دیکھا ہے کہ اس فیلڈ سے وابستہ افراد میں فنون لطیفہ سے لگاؤ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ پھر یا تو وہ ایک اچھے شاعر' گلوکار یا پھر اداکار ہوتے ہیں۔ عموماً" آپ نے انہیں اداکاری کرتے ہوئے ہی دیکھا ہو گا۔ یہ لوگ اگرچہ کم نظر آتے ہیں' مگر زیادہ تر اچھے کرداروں میں ہی نظر آتے ہیں۔ تو آج ہم آپ کی ملاقات ایسے ہی ایک ڈاکٹر سے کروائیں گے جو پلاسٹک سرجن ہیں اور بہت اچھے اداکار بھی۔۔۔ کمرشلز میں زیادہ آتے ہیں اور ان کا سیریل "شناخت" بہت پاپولر ہوا تھا جس میں انہوں نے "روحان" کا کردار ادا کیا تھا۔

"کیسے ہیں فہد؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"آپ ڈاکٹر ہیں اور آپ کے والد بھی۔ آپ تو پلاسٹک سرجن ہیں تو گھر میں کوئی مسئلہ ہوتا ہو گا تو باہر جانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی ہو گی؟"

"بھئی گھر کی مرغی دال برابر ہوتی ہے۔ تو بس اپنا بھی کچھ یہی حال ہے۔ ویسے خاندان میں تو سب مجھ سے ہی مشورہ لیتے ہیں اور بات مانتے بھی ہیں۔ بس گھر میں اپنی تھوڑی کم ہی چلتی ہے۔" قہقہہ۔

"آپ ڈاؤ یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں؟"

"جی جی۔ بالکل۔"

"فہد! آپ ماشاء اللہ کمرشلز میں بھی نظر آتے ہیں

اور ڈراموں میں بھی' تو ایک ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے اتنا ٹائم مل جاتا ہے آپ کو؟"

"دراصل بات یہ ہے کہ کمرشلز میں شوٹنگ ٹائم بہت ہی کم ہوتا ہے۔ میرا نوے فیصد ٹائم اسپتال میں سرجری میں ہی گزرتا ہے۔ اتوار کی چھٹی لوگوں کی ہوتی ہے' مگر میں اسپتال میں کام کررہا ہوتا ہوں تو کبھی کبھار جب اسپتال سے سات آٹھ بجے فارغ ہوتا ہوں تو شوٹ پہ چلا جاتا ہوں تو رات کے تین چار بجے فارغ ہوتا ہوں۔"

"تو ڈائریکٹر پروڈیوسرز اتنی رعایت دے دیتے ہیں؟"

"جی بالکل جو لوگ مجھے بک کرتے ہیں ان سے ٹائم کے لیے پہلے ہی بات ہوجاتی ہے۔ تو جو رعایت دیتا ہے اسی کے لیے کام کرتا ہوں اور اس لیے کم کام کرتا ہوں کہ ٹائم ہی نہیں ہوتا۔"

"آج کل کچھ کررہے ہیں۔ کمرشلز کے علاوہ؟"

"ڈراما تو نہیں کررہا' کیوں کہ سرجری سے اتنا ٹائم ہی نہیں ملتا کہ سیریل کرسکوں۔ آپ یقین کریں کہ ڈرامہ سیریل "شناخت" کے علاوہ مجھے بیس بائیس سیریلز کی آفرز تھیں' لیکن سوائے "شناخت" کے میں نے سب کے لیے انکار کردیا۔ کیوں کہ "شناخت" کا سبجیکٹ مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ کونسیپٹ بہت اچھا لگا' تو جب یہ سیریل کررہا تھا تو رات کو اسپتال میں نائٹ ڈیوٹی کرتا تھا اور صبح چھ سات بجے جاکر شوٹ کرتا تھا تو بس سال میں ایک ہی سیریل کرتا ہوں' کیوں کہ میں ٹائم نہیں دے پاتا اور اب تو سال سے زیادہ ہوگیا ہے میں نے کوئی سیریل سائن نہیں کیا۔"

"اب تک کتنا کام کرچکے ہیں؟"

"یہی کوئی تین چار سیریلز کیے ہیں اور کمرشلز میرے خیال سے 30 کے قریب تو کر ہی چکا ہوں۔"

"اور ماشاء اللہ ہر کمرشل میں بہت اچھے لگتے ہیں آپ۔۔۔ تو میں نے دیکھا ہے کہ ڈاکٹرز حضرات کو فنون لطیفہ سے بہت لگاؤ ہوتا ہے۔۔۔ کیوں؟"

"بات یہ ہے کہ ہم ڈاکٹرز حضرات زندگی کی بدترین حقیقت سے روز آشنا ہورہے ہوتے ہیں۔ ہم روز ایسے مریض دیکھتے ہیں جو ایکسیڈنٹ میں اپنا بہت کچھ کھوچکے ہوتے ہیں۔ کھال جسم سے' ٹانکوں سے کٹ پھٹ جاتی ہے' ان کی سرجری کرنا ہوتی ہے۔ مریضوں کی چیخ وپکار' ان کی تکالیف کو ہم روز دیکھتے ہیں اور یہ سب تکلیف دہ عمل ہوتا ہے۔ کہ ان لوگوں کے ساتھ رہنا' ان کا علاج کرنا اور اس حقیقت سے آشنا بھی رہنا کہ ان کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ بم بلاسٹ میں جو لوگ آتے ہیں ان کو دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے کہ کسی کے ہاتھ کٹے ہوئے ہیں' کسی کا منہ جلا ہوا ہے اور پھر یہ احساس کرنا کہ کہیں کل کو خدانخواستہ ہم خود کسی بلاسٹ کا حصہ نہ بن جائیں اور ہمارے ساتھ بھی خدانہ کرے کہ ایسا ہو۔ تو ایک ڈاکٹر تو روزانہ پین (درد) سے گزرتا ہے اور یہ فنون لطیفہ تو آپ کو ایک فینٹسی کی طرف لے جاتا ہے۔ حقیقت سے دور کرکے تو تھوڑا ریلیف لینے کے لیے ڈاکٹرز اس طرف آتے ہیں ورنہ بے چارے ڈاکٹرز کی اپنی زندگی تو بالکل ختم ہوکے رہ جائے گی۔"

"سیریل "شناخت" جس کی آپ بات کررہے ہیں اس میں آپ کو حجاب والی لڑکی بہت پسند آتی ہے جبکہ حقیقت میں تو ایسا کچھ نہیں ہے؟"

قہقہہ۔۔۔ "دراصل میں اس میں "روحان" کا جو کردار تھا وہ میری شخصیت کے بہت قریب تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ میں ہی "روحان" ہوں۔ کبھی آپ اسپتال آئیں تو میرے سب مریض میری تعریف کریں گے' کیوں کہ میں ان کے ساتھ ہنستا کھیلتا اور شرارتیں کرتا رہتا ہوں' دیگر اسٹاف کے ساتھ بھی میرا ریلیشن ایسا ہی ہے۔ تو آمنہ نواز کا اسکرپٹ بہت اسٹرونگ تھا خاص طور پر ڈائیلاگ وغیرہ۔ اور اس میں قرآن و حدیث کی جو باتیں تھیں تو میں خود بھی ایسا ہی تھا بلکہ ہوں' کیوں کہ میں نے قرآن کی تفسیر پڑھی ہوئی ہے۔ ترجمہ کے ساتھ بھی قرآن پڑھا ہے اور تبلیغ پہ بھی جاچکا ہوں اور

مسجد میں جا کر "بیان" بھی دیتے تو قرآن میری زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ ہے اور آج میں جو کام کرتا ہوں جو سوچتا ہوں اور جس طرح کی زندگی گزارتا ہوں' اس میں قرآن کا بہت بڑا پارٹ ہے اور میں نے قرآن کو بہت قریب سے پڑھا ہے اور بہت سوچ سمجھ کر پڑھا ہے۔"

"بڑی بات ہے کہ میڈیسن بھی پڑھنا' پریکٹس بھی کرنا' ٹی وی کو بھی ٹائم دینا اور سب سے بڑھ کر قرآن و حدیث کو فالو کرنا۔ بہت کمال کی بات ہے۔

چلیں جناب اس فیلڈ میں کیسے آئے کے بارے میں ہم بعد میں جائیں گے' پہلے آپ اپنے بارے میں بتائیں اور ہاں' شادی کی مبارک تو ہم دے ہی چکے ہیں بیٹا بھی مبارک ہو۔۔۔ آپ کو۔۔۔"

"جی بہت شکریہ۔۔۔ جی میرا پورا نام فہد زبیر مرزا ہے۔ پیار سے فہد کہتے ہیں' 26 اپریل کو کراچی میں پیدا ہوا' اس لحاظ سے میرا ستارہ ٹورس ہے۔ تین بہنوں کا اکلوتا اور لاڈلا بھائی ہوں۔ ایک بہن بڑی ہے پھر میں اور پھر دو چھوٹی بہنیں ہیں اور میری تعلیم کے بارے میں تو آپ جانتی ہی ہیں کہ میں نے ایم بی بی ایس کے بعد جنرل سرجری میں ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد اب پلاسٹک سرجری میں فیلو شپ کر رہا ہوں۔۔۔ میرے والد صاحب بھی کراچی میں ہی پیدا ہوئے اور ہماری شناخت پاکستانی ہی ہے۔ والد صاحب سرجن ہیں جیسا کہ میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا۔۔۔ میری بڑی بہن ڈینٹسٹ ہیں اور امریکا میں ہوتی ہیں اور چھوٹی بہنیں بھی امریکا میں پڑھ رہی ہیں۔"

"شادی۔۔۔؟"

"جی شادی 14 اگست 2014ء کو ہوئی' ماشاء اللہ سے ایک بیٹا ہے۔ جس کا نام "روحان" ہے اور یہ نام شناخت میں میرے کردار کا تھا' اسی سے متاثر ہو کر میں نے بیٹے کا نام "روحان" رکھا تو بیٹے کا پورا نام "روحان محمد مرزا" ہے تو چونکہ شادی 14 اگست



یوم آزادی کے دن ہوئی تو میرے خیال سے سب کو یاد رہے گی۔"

"بالکل جی۔۔۔ یہ بتائیں کہ ثروت کہاں پسند آئی تھیں؟"

"ثروت انڈس ویلی میں پڑھتی تھیں تو میرے دوست کا بھائی وہاں پڑھتا تھا تو دوست کے ساتھ وہاں گیا تو ثروت سے بھی ملاقات ہو گئی اور پہلی ملاقات میں ہی یہ پسند آ گئیں' مگر اظہار نہیں کیا بلکہ بات چیت کافی عرصہ چلتی رہی۔ پھر ایک دن ہم نے پسندیدگی کا اظہار کیا اور اپنے بارے میں ان سے پوچھا تو انہوں نے بھی پسندیدگی کا اظہار کر دیا تو دس سال پہلے ملاقات ہوئی تھی اور تین چار سال سے پسندیدگی زیادہ ہوتی گئی۔"

"کچی عمر کی محبت تھی؟ ظاہر ہے کہ دس سال پہلے آپ کی عمر ہی کیا ہو گی؟"

"جی کچی عمر کی پکی محبت تھی اور محبت بھلا عمر کہاں دیکھتی ہے' بس وہ تو ہو جاتی ہے۔"

"پھر شوبز میں کیسے آئے؟"

"میں جب ڈاؤ میڈیکل میں پڑھتا تھا تو اس وقت

سے مجھے اداکاری اور ماڈلنگ کا شوق تھا اور ثروت انڈس ویلی میں تھیں۔ اسے فوٹوگرافی کا بھی شوق تھا تو اس نے میری تصاویر بنائیں ان دنوں جلیل اختر (مرینہ خان کے شوہر) ایک پلے کر رہے تھے' ثروت نے ان سے ذکر کیا ہوگا تو انہوں نے مجھے بلایا تو میں نے کہا کہ ابھی تو میں پڑھ رہا ہوں۔ سچ پوچھیں تو مجھے شوق ضرور تھا' مگر مجھے ماڈلنگ اور اداکاری کی سمجھ نہیں تھی۔ خیر انہوں نے بلایا تو میں گیا۔ وہاں کا ماحول اور لوگ بڑے اچھے لگے اور میں اداکاری کے لیے تیار ہوگیا۔ بس وہاں سے شروعات ہوئیں تو چونکہ ٹائم نہیں ہوتا تھا اس لیے زیادہ کام نہیں کیا اور اصل میری "شناخت" شناخت ہی رہی۔ اور کمرشلز نے۔ مطلب پہچان...... بنتے ہوئے۔ اور آپ کو بتاؤں کہ جب میں نے پہلا کمرشل کیا تھا تو مجھے پندرہ ہزار روپے ملے تھے تو جس طرح محبت کچی عمر سے کی' اس طرح کمائی کا عمل بھی کچی عمر سے ہی شروع ہوگیا تھا' بس شوق مجھے بہت تھا اور میں خود بھی جاتا تھا لوگوں کے پاس۔ تو اب مجھے جب لوگ ملتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں بھی کمرشل کروادو تو میں کہتا ہوں کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے کہ جو منہ اٹھا کے آگیا اس کو کمرشل مل گیا' کل کو کہو کہ سرجری بھی کرادو تو بھئی یہ کام اتنے آسان نہیں ہوتے' ایک سسٹم سے گزرنا پڑتا ہے۔ بہت خواری کرنی پڑتی ہے' محنت کرنی پڑتی ہے اور اپنے آپ کو پروف کرنا پڑتا ہے تب جاکر کہیں دال گلتی ہے۔"

"شوبز میں آکر کیا کمی دیکھتے ہیں آپ؟"

"اس فیلڈ میں وقت کی پابندی نہیں ہے' ڈسپلن نہیں ہے' بالکل بھی نہیں ہے' ٹائم کی ویلیو نہیں ہے'

کمٹمنٹ کی ویلیو نہیں ہے۔ کوئی چیز سالڈ نہیں ہے۔ اب مجھے احساس ہے کہ مجھے اس ٹائم پہ اسپتال جانا ہے۔ اس ٹائم پہ فلاں کام کرنا ہے' مگر اس فیلڈ میں ایسا کچھ نہیں ہے۔"

"پیسہ کس میں ہے ڈاکٹری میں یا اداکاری میں؟ یا مشکل کیا ہے؟"

"جہاں تک مشکل کی بات ہے تو میڈیسن بہت مشکل ہے۔ بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ بہت پڑھنا پڑتا ہے جبکہ اداکاری بہت آسان ہے اس میں پیسہ بہت زیادہ ہے۔ شہرت بہت زیادہ ہے' مگر ڈاکٹری کا کوئی نعم البدل نہیں ہے' کسی کا ایکسیڈنٹ ہو اور ہم اس کا علاج کرکے اسے ٹھیک کردیں تو جو اطمینان اور خوشی حاصل ہوتی ہے وہ اور کسی میں نہیں ہوتی۔ تو اللہ کا بہت شکر کہ اس نے مجھے ایسی فیلڈ کے لیے چنا جس میں میں دوسروں کی خدمت کرسکتا ہوں۔"

"کام پہ تنقید برداشت ہوتی ہے؟ چاہے وہ میڈیسن میں ہو یا فن اداکاری میں ہو؟"

"حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ میرے لیے وہ انسان سب سے عظیم ہے جو مجھے میری خامیاں بتائے۔ ہم اپنی زندگی میں اتنے مصروف ہوجاتے ہیں کہ ہم اپنی خامیوں کو بھی نظرانداز کیے جاتے ہیں یا برائیاں کیے جاتے ہیں تو اگر کوئی ہماری خامیاں بتاوے تو میں تو بالکل بھی برا نہیں مانتا بلکہ میں تو سیلف امپروومنٹ پہ بھی زیادہ یقین رکھتا ہوں جیسے صوفیانہ یقین ہے انسان کامل کا کہ انسان بنا تو پرفیکٹ تھا لیکن جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکال کر زمین پہ بھیجا تو ہم اپنی پرفیکشن سے بہت دور آگئے' تو انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو انسان کامل کی طرف لے کر جائے اور ایسا تب ہی ہوتا ہے کہ جب ہم اپنے آپ سے لڑ کر اپنے چیلنج سے لڑ کر اور اپنے آپ کو بہتر بنا سکتے ہیں۔"

"سب کچھ بنا بنایا ملا یا محنت کرنا پڑی؟"

"نہیں جی بنا بنایا کچھ نہیں ملا۔ میں نے اتنا کٹھن وقت گزارا ہے کہ اس کو شیئر نہیں کرسکتا' بہت

جدوجہد کی میں نے۔ جو کچھ ملا بے حد محنت کے بعد۔ اتنی آسانی سے کچھ نہیں ملا۔ اچھی زندگی کے لیے پیسہ بہت ضروری ہے۔"

"کون سا کردار کرنا چاہتے ہیں؟"

رومینٹک کردار۔ کاش اللہ مجھے۔۔۔ اتنا ٹائم دے




دے کہ میں اپنی ایک سیریل کروں جس میں میری لو اسٹوری ہو۔ اور ایموشنز۔۔۔ کے ساتھ وہ لو اسٹوری ہو۔"

"کوئی کردار جس کو کرنے سے انکار کیا ہو آپ نے؟ یا بہت ہوا ہو؟"

"ہاں بہت سے کردار تھے جن کو کرنے سے انکار کیا۔ کیونکہ میرے پاس وقت ہی نہیں تھا۔ بس "شناخت" کا کردار اچھا لگا تو کرلیا اور اس طرح ایک سیریل بڑی آیا ہوا تھا اس میں بھی میرا کردار بہت مقبول ہوا تھا۔ اور سچ بتاؤں کہ ڈرامے کرکے مجھے احساس ہوا کہ ڈراموں میں اداکاری کرکے زیادہ مقبولیت ملتی ہے۔ پہلے میں سمجھتا تھا کہ اس میں پیسے بھی کم ملتے ہیں اور کیمرے بھی زیادہ اچھے نہیں ہوتے، جبکہ کمرشلز میں کام کرنے کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ مجھے پیسے بھی اچھے ملتے ہیں اور کیمرے بھی۔ مگر ڈراموں سے ملنے والی شہرت سے یہ اندازہ لگایا کہ اس شہرت کے آگے تو کمرشلز کی شہرت کچھ بھی نہیں۔"

"مریض آپ سے کس بات کی فرمائش زیادہ کرتے ہیں؟"

"مریضوں کی ایک ہی فرمائش ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنا فون نمبر دے دیں اور میں مروت میں آکر اپنا نمبر دے دیتا ہوں۔ بس پھر مت پوچھیں کہ کیا ہوتا ہے، آدھی آدھی رات کو فون آجاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب ہمیں بہت زیادہ نزلہ زکام ہو رہا ہے تو ہم کیا کریں۔ مت پوچھیں کہ اس وقت میری کیا کیفیت ہوتی ہے۔ بھئی اگر نزلہ زکام ہو رہا ہے تو جوشاندہ پی لو۔ پیناڈول CF لے لو۔ اور میں کوئی نزلہ زکام کا ڈاکٹر تو نہیں ہوں۔ مگر آپ یقین کریں کہ ایسی صورت حال میں بھی میں اپنا موڈ خراب نہیں کرتا بلکہ نہایت ہی خوش دلی سے پیش آتا ہوں۔"

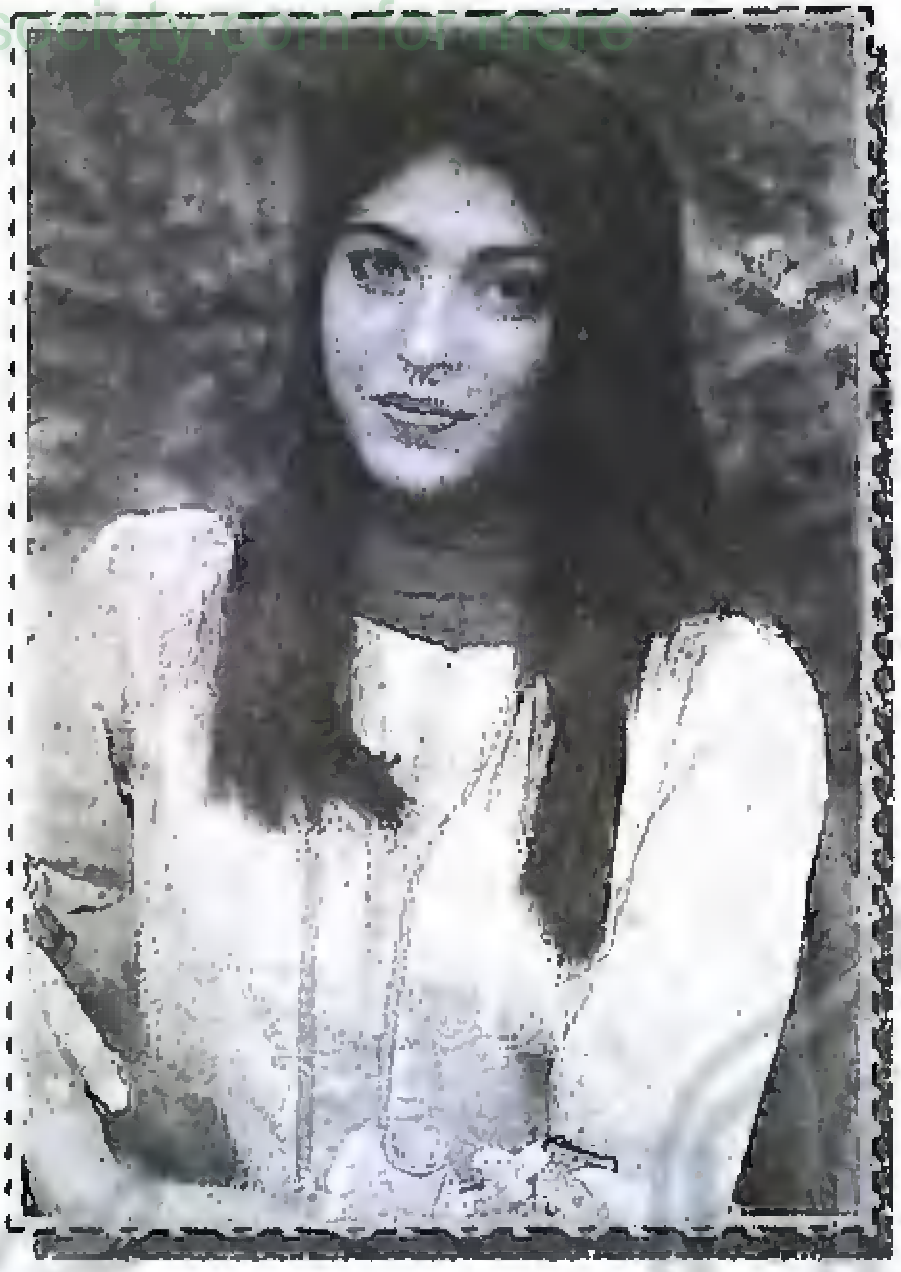
"ہم چاہ رہے تھے کہ ثروت کے ساتھ بھی آپ کا ایک انٹرویو کرتے، مگر۔۔۔؟"

"جی مگر ثروت نے انکار کیا ہوگا۔ اصل میں سچ بات تو یہ ہے کہ اس قسم کے انٹرویو بہت پرسنل ہوجاتے ہیں اور آپ و تو ایسے ہی سب کچھ ہمارے بارے میں معلوم ہے۔"

"جی بالکل۔ آپ نے کہا شادی میں کیش دینا چاہیے تو ثروت کو بھی کیش دیا تھا؟"

"ارے نہیں، بیگم کو منہ دکھائی میں ہمیشہ تحفہ دینا چاہیے، تاکہ یاد رہے اور ہاں یہ جو میرے پاس برسوں سے فون نمبر ہے اسے میں نے کبھی تبدیل نہیں کیا کیونکہ یہ مجھے ثروت نے گفٹ کیا تھا۔"

"گڈ!" اور اس کے ساتھ ہی ہم نے فہد مرزا سے اجازت چاہی اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں وقت دیا۔



میکے کو دے دو سندیس کی

# سونیا مشال سے باتیں

شاہین رشید

1۔ ''اصلی نام؟''
''سونیا مشال۔''
2۔ ''پیار کا نام؟''
''سونا۔''
3۔ ''تاریخ پیدائش/شہر؟''
''3نومبر 1991ء/قطر۔''
4۔ ''قد/ستارہ؟''
'' 5 فٹ 9 انچ/اسکارپیو۔''
5۔ ''بہن بھائی/آپ کا نمبر؟''
''تین بھائی اور میں سب سے چھوٹی ہوں۔''
6۔ ''تعلیم؟''
''فائن آرٹس میں گریجویشن کیا ہے۔''
7۔ ''شادی؟''
''جب نصیب میں ہو گا ہو جائے گی۔''
8۔ ''شوبز میں آمد؟''
''اپنے ٹیلنٹ سے آئی ہوں۔''
9۔ ''پہلا ڈرامہ/وجہ شہرت؟''
''میکے کو دے دو سندیس'' اور یہی وجہ شہرت بھی بنا۔''
10۔ ''پیسے ملے تھے.... ؟کہاں خرچ کیے؟''
''جی پیسے ملے تھے اور آج تک خرچ نہیں کیے بلکہ اپنے اکاؤنٹ میں جمع کر دیے۔''
11۔ ''اس فیلڈ میں آکر کوئی پچھتاوا؟''
''نہیں کوئی پچھتاوا نہیں' کیوں کہ میں اپنے شوق سے آئی ہوں۔''
12۔ ''آپ کا سورج کب طلوع ہوتا ہے؟''
''ساڑھے آٹھ نو بجے' جب شوٹ پر جاتی ہوں۔ ورنہ تو بارہ بجے سورج طلوع ہوتا ہے۔''
13۔ ''اور رات؟''
''جیسے ہی رات کو دس گیارہ بجے آتی ہوں بستر پر ہوتی ہوں۔''
14۔ ''صبح اٹھ کر پہلی خواہش؟''
''کہ اپنی اماں کو فون کروں۔ ان کی خیریت معلوم کروں۔''
15۔ ''بچپن میں والدین کی کون سی بات بری لگتی تھی؟''
''بچپن میں میرے دانت بہت برے تھے تو اماں' ابا دونوں کہتے تھے کہ تم نے چاکلیٹ نہیں کھانی۔''
16۔ ''مذہب سے لگاؤ؟''
''جی بالکل ہے اور روزے رکھتی ہوں اور پھر عید

بہت اہتمام کے ساتھ مناتی ہوں۔ مجھے دونوں عیدیں بہت اچھی لگتی ہیں۔"

17۔ "اپنی جسمانی ساخت میں کیا کمی محسوس کرتی ہیں؟"

"کوئی بھی نہیں 'اللہ کا بہت شکر ہے۔"

18۔ "بھوک میں کیفیت؟"

"بہت بری ہوتی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ سب کچھ میرے سامنے آجائے اور جب سب کچھ سامنے آتا ہے تو بھوک مرجاتی ہے۔"

19۔ "اپنے ملک میں کون سی تبدیلی ضروری ہے؟"

"ہمارے ملک میں کسی کو ایکوئل (برابر) نہیں سمجھا جاتا۔ امیر اور غریب میں بہت فرق رکھا جاتا ہے۔"

20۔ "پاکستان میں اب کیا ناقابل برداشت ہو گیا ہے؟"

"مہنگائی۔۔۔ اف۔ بہت زیادہ ہو گئی ہے۔"

21۔ "کس دن کا انتظار رہتا ہے؟"

"چھٹی کا۔ اور چھٹی اتوار کو ہی ہوتی ہے۔"

22۔ "کیا آپ ایکسپریسیو ہیں؟"

"نہیں میں ایکسپریسیو نہیں ہوں 'اور یہی میرا ایک مسئلہ ہے 'لیکن گھر میں کوئی خوشی کی بات ہو تو پھر تو آسمان سر پر اٹھا لیتی ہوں۔"

23۔ "زندگی میں چینج کب محسوس کرتی ہیں؟"

"جب ملک سے باہر جاتی ہوں۔ تو ہر طرح کا Change محسوس کرتی ہوں۔"

24۔ "دماغ کا میٹر کب گھومتا ہے؟"

"مجھے اپنے آپ پر بہت کنٹرول ہے۔ اس لیے میٹر گھومتا نہیں ہے 'مگر اگر گھوم جائے تو پھر گھوم ہی جاتا ہے۔"

25۔ "غصے میں رد عمل؟"

"ہاتھ کانپنے لگتے ہیں' آواز بہت اونچی ہو جاتی ہے۔ کنٹرول میں نہیں رہتی۔ شکر ہے کہ ایسا کبھی کبھی ہوتا ہے۔"

26۔ "ضدی ہیں؟"

"ہاں۔۔۔ ضدی۔۔۔ جو چاہیے وہ چاہیے۔"

27۔ "مرد حضرات میں کیا بات اچھی لگتی ہے؟"

"میری زندگی میں ابھی صرف میرے والد اور میرے بھائی ہی آئے ہیں اس لیے مجھے ان کی ہر بات اچھی لگتی ہے۔"

28۔ "اور بری؟"

"مرد کبھی کبھی "ان سیکور" ہو جاتے ہیں جب عورت کام کرنے لگتی ہے اور ایسا نہیں ہونا چاہیے۔"

29۔ "کوئی لڑکا مسلسل گھورے تو؟"

"بہت غصہ آتا ہے۔"

30۔ "گھر میں کس کا غصہ تیز ہے؟"

"میرے بابا کا۔"

31۔ "ڈرپوک ہیں؟"

"ہاں۔۔۔ بہت۔"

32۔ "کیا وقت سے پہلے ملا؟"

"عقل۔"

33۔ "اکاؤنٹ اپنا اپنا ہونا چاہیے یا مشترکہ؟"

"اپنا اپنا۔"

34۔ "کوئی وقت جو بہت برا گزرا؟"

"ہاں جی۔۔۔ کافی۔۔۔ جب ہم "قطر" سے واپس آئے تھے تب کافی وقت کرائسس میں گزرا۔"

35۔ "شاپنگ کے لیے "ضرورتاً" جاتی ہیں یا۔۔۔؟"

"ضرورتاً" جاتی ہوں۔ فالتو میں جانا پسند نہیں۔"

36۔ "پیسہ آسانی سے خرچ کر لیتی ہیں؟"

"نہیں بہت سوچتی ہوں اور پھر شکر ادا کرتی ہوں رب کا کہ اس نے اس قابل بنایا کہ میں خرچ کر سکوں۔"

37۔ "کراچی کے پکوان اچھے لگتے ہیں یا لاہور کے؟"

"لاہور لاہور ہے۔"

38۔ "بہترین تحفہ آپ کی نظر میں؟"
"میں چاہتی ہوں کہ ایسا تحفہ دوں جو استعمال میں آئے۔"

39۔ "کون سی بات موڈ اچھا کر دیتی ہے؟"
"جب سب بیٹھے ہوں اور کسی اچھے سے موضوع پر بات کر رہے ہوں۔"

40۔ "کیا آنکھ کھلتے ہی بستر چھوڑ دیتی ہیں؟"
"نہیں۔۔۔ پانچ دس منٹ لیتی ہوں اٹھنے میں۔"

41۔ "مخلص کون ہوتے ہیں اپنے یا پرائے؟"
"اگر دیکھا جائے تو زیادہ تر پرائے ہی ہوتے ہیں۔"

42۔ "چھٹی کا دن کہاں گزارنا پسند کرتی ہیں؟"
"گھر کے اندر اماں کے ساتھ اور اپنی بلیوں کے ساتھ۔"

43۔ "کسی کی سچی محبت دیکھنی ہو تو؟"
"تو کوئی ایسی بات کہیں کہ وہ چونک جائے پھر دیکھیں اس کی سچی محبت۔"

44۔ "عورت حسین ہونی چاہیے یا ذہین؟"
"ذہین تو ضرور ہی ہونی چاہیے۔"

45۔ "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"
"گھر کے اندر سکون ہی سکون ہوتا ہے۔"

46۔ "فارغ اوقات کے مشاغل؟"
"ڈرائیونگ کرنا' میوزک سننا' مووی دیکھنا یا کچھ نہ کچھ پڑھنا۔"

47۔ "کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائیں؟"
"نہیں نمبر دینے میں بہت محتاط رہتی ہوں۔"

48۔ "آپ کے پرس کی تلاشی لی جائے تو کیا نکلے گا؟"
"والٹ' سیل فون' میک اپ' پرفیوم اور ضرورت کی ہر چیز نکلے گی۔"

49۔ "سیاست میں آنے کا شوق ہے؟"
"سیاست ایک بہت بڑا گیم ہے اور اس طرح کے گیم میں میں نہیں آنا چاہوں گی۔"

50۔ "کیا چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟"
"سکے اور سیپیاں جب قطر میں تھی تو کافی سیپیاں جمع کی تھیں۔"

51۔ "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"
"مجھے کوئی نصیحت بری نہیں لگتی۔ وقتی طور پر لگتی ہے۔"

52۔ "انسان کی زندگی کا بہترین دور؟"
"کہ جب اس کے کچھ خواب پورے ہو گئے ہوں اور باقی کے خواب کے لیے وہ جدوجہد کر رہا ہو۔"

53۔ "وقت کی پابندی کی قائل ہیں؟"
"بالکل ہوں۔۔۔ اور کرتی ہوں۔"

54۔ "کن لوگوں پر بہت خرچ کرنے کو دل چاہتا ہے؟"
"اپنے بھائیوں پہ' اپنے اماں ابا پہ۔"

55۔ "اپنی کمائی سے اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟"
"سیل فون خریدا تھا۔"

56۔ "کھانے کے لیے پسندیدہ جگہ' اپنا بیڈ' ڈائننگ ٹیبل یا چٹائی؟"
"اپنا بیڈ۔"

57۔ "چھری کانٹے کا استعمال کرتی ہیں؟"
"بہت کم۔۔۔ چاول تو ہاتھ سے ہی کھاتی ہوں۔"

58۔ "انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی؟"
"انٹرنیٹ سے ہے' مگر فیس بک سے بالکل بھی نہیں۔"

59۔ "اپنے آپ کو کبھی ساتویں آسمان پہ محسوس کیا؟"
"نہیں مرنے کے بعد ہی ساتویں آسمان پہ جاؤں گی۔"

60۔ "دیس کے کھانے پسند ہیں یا پردیس کے؟"
"دونوں۔"

61۔ "کیا بہت اچھا پکا لیتی ہیں؟"

"صرف "پاستا" بہت اچھا پکا لیتی ہوں۔"

62۔ "عورت بہترین کک ہوتی ہے یا مرد؟"

"پاکستان میں عورت اور باہر کے ملک میں مرد۔"

63۔ "نرم گوشہ کس میں ہوتا ہے 'مرد یا عورت میں؟"

"عورت جناب۔"

64۔ "کس شخصیت کو اغوا کرنا چاہیں گی اور تاوان میں کیا وصول کریں گی؟"

"قہقہہ.... ہوں.... کافی ٹف سوال ہے.... کبھی سوچا نہیں اس بارے میں۔"

65۔ "کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟"

"جی بہت اندھی ہوتی ہے۔"

66۔ "کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"

"سارے کیڑوں سے۔"

67۔ "کس قسم کے رویے دکھ کا باعث بنتے ہیں؟"

"رویے نہیں بلکہ وہ الفاظ جو لوگ غصے میں بول جاتے ہیں جو دراصل ان کے دل کی آواز ہوتی ہے وہ تکلیف کا باعث بنتے ہیں۔"

68۔ "شادی کی رسموں میں پسندیدہ رسم؟"

"مہندی۔"

69۔ "شادی میں تحفہ دینا چاہیے یا کیش؟"

"جس کو آپ بہت قریب سے جانتے ہیں ان کے لیے تحفہ اور دوسروں کے لیے کیش۔"

70۔ "ناشتا اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟"

"اماں کے ہاتھ کا۔"

71۔ "کن لوگوں سے ملنے کی بہت خواہش ہے؟"

"ہالی ووڈ کے لوگوں سے۔"

72۔ "کیا چیزیں لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟"

"اپنا بیگ، ہیڈ فون، والٹ وغیرہ"

73۔ "اپنا فون نمبر کتنی بار تبدیل کیا؟"

"کبھی نہیں۔۔۔ ایک ہی نمبر ہے۔"
74۔ "آپ کو فوبیا ہے؟"
"جی بالکل ہے۔ کیڑوں مکوڑوں کا فوبیا۔ جان نکلتی ہے۔"
75۔ "آپ عام لوگوں سے کتنی مختلف ہیں؟"
"بالکل بھی مختلف نہیں ہوں۔ عام لوگوں کی طرح ہی جیتی ہوں۔ کھاتی پیتی ہوں' سوتی جاگتی ہوں۔"
76۔ "اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی ہیں؟"
"بالکل کر لیتی ہوں۔"
77۔ "ماں ناراض ہو جائے تو؟"
"جب تک سوری بول کر انہیں منا نہ لوں مجھے نیند نہیں آتی۔"
78۔ "دل کی سنتی ہیں یا دماغ کی؟"
"دماغ کی۔"
79۔ "کوئی اپنی اچھی عادت؟"
"سب کا خیال رکھتی ہوں۔ گوسپ نہیں کرتی۔ کسی کی چغلی نہیں کھاتی۔"
80۔ "اور بری عادت؟"
"میرے خیال میں دوسرے لوگ زیادہ بہتر بتا سکیں گے کہ مجھ میں بری عادت کون سی ہے۔"
81۔ "بچپن کا کوئی کھلونا جو ابھی آپ کے پاس ہے؟"
"بالکل ہے۔ ایک "ٹیڈی بیر" ہے اور ایک "ڈول ہاؤس"۔"
82۔ "کبھی کھانے پہ غصہ اترا؟"
"کھانے پہ غصہ نہیں اترتا۔ البتہ میں نے غصے میں کئی بار کھانا پینا چھوڑ دیا۔"
83۔ "غصے میں پہلا لفظ؟"
"کچھ نہیں نکلتا بس آنکھیں پھٹ جاتی ہیں۔ پھر الفاظ نکلنا شروع ہو جاتے ہیں۔"
84۔ "مارننگ شو کے لیے آپ کے تاثرات؟"
"اچھے ہوتے ہیں۔ بشرطیکہ اس میں صحیح چیزیں پیش کریں۔"
85۔ "شہرت مسئلہ بنی؟"
"ہاں جب پبلک میں جاؤں تو مسئلہ بنتی ہے۔ خاص طور پر خواتین آرٹسٹوں کے لیے۔"
86۔ "بستر پہ لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا۔۔۔؟"
"نہیں بڑی مشکل سے نیند آتی ہے۔"
87۔ "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا چیزیں رکھتی ہیں؟"
"لوشن ہوتا ہے۔ اور موبائل وغیرہ۔"
88۔ "کھانے کی ٹیبل پہ کیا چیز لازمی چاہیے ہوتی ہے؟"
"پودینے کی چٹنی۔"
89۔ "محنت سے پیسا ملتا ہے یا قسمت سے؟"
"محنت سے پیسہ ملتا ہے اور اس میں تھوڑا سا ہاتھ قسمت کا بھی ہوتا ہے۔"
90 کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"
"پورا دن سر میں درد رہتا ہے۔"
91۔ "جھوٹ کب بولتی ہیں؟"
"مجھ سے بولا نہیں جاتا' آنکھیں بند کر لیتی ہوں جھوٹ بولتے وقت تو پھر پکڑی جاتی ہوں۔"
92۔ "اپنی شخصیت میں کیا تبدیلی لانا چاہتی ہیں؟"
"تھوڑی اور زیادہ پر اعتماد ہو جاؤں۔ تھوڑا زیادہ بولنے بھی لگ جاؤں۔"
93۔ "اپنے آپ کو کب تروتازہ محسوس کرتی ہیں؟"
"صبح کے وقت۔"

"اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو۔۔۔؟"
"اللہ کی کوئی بہتری ہی ہو گی اور کوشش کروں گی کہ زوال کو پھر سے عروج تک لاؤں۔"

☆

# خاموشی کو بیاں ملے

ہمت الصبور

## حنا گل، بنوں

گفتگو کیجیے کہ فطرت انساں ہے، شکیب
جالے لگ جاتے ہیں جب بند مکاں ہوتا ہے

سوچا اس سے پہلے کہ یہ تارِ عنکبوت بڑھتے چلے جائیں، مداوا ہونا چاہیے، سو حاضر ہیں جی! نام، گلوں میں گلاب، حنا گل۔ کرتے کیا ہیں؟ جھک مارتے ہیں، ارے نہ بابا گریجویشن نے باعزت بری ہو کہ (جو بھی پوزیشن لے کہ) ماسٹر میں چھلانگ لگا چکے ہیں! پرخلوص پٹھانوں کی سرزمین بنوں سے ہمارا تعلق ہے۔ (2 ) مشغلہ ہمارا؟ بقول ابو، اخبار چاٹنا اور دماغ چاٹنا (وہ بھی دوسروں کے) اور جب بات الفاظ چاٹنے کی آجائے تو ایک اخبار پر کیا موقوف بھاڑ میں پڑے جلیبی پکوڑوں والے کاغذ سے لے کے کالج لائبریری تک سب چھان کہ چاٹ مارا ہے، خالص ادبی بھوک (بھئی ہوتی ہے نا اکثر کو...) بس یہی ہے اپنا مشغلہ بھی....

2 ۔ خوبیاں اور خامیاں؟ اپنے منہ سے اگر کہیں تو کاغذ کورا ہی رہے گا، ہم اپنے مداح اور نقاد تو ہیں لیکن خاموش... لیجیے جی دوسروں کی گل افشانیاں سنواتے ہیں۔ "حنا یو آر اے ہارڈ ورکنگ اسٹوڈنٹ" (آصفہ) "آپ جیسی دوست شاید دنیا میں کم ملے۔" (ڈیئر عالمہ) "یو آر لونگ اینڈ کیئرنگ گرل" (گڈ گرل) "دل کی بہت صاف ہو۔" (لیلیٰ) "اتنی گھنی ہے یہ لڑکی توبہ۔" (عمارہ ڈیئر) (پتا نہیں خوبی ہے یا خامی) "انوسینٹ حنا، یو آر اے نائس اینڈ ڈیسنٹ گرل" (نوشی) اور میری پیاری دوست تو یہ کچھ کہے گی نہیں لیکن یہ خاموشی جذبوں سے بھرپور ہو گی۔ (تھینکس ثوبی) کافی ہے۔ بٹ اصل ریمارکس تو اساتذہ کے ہوتے ہیں سنیے! "ماشاء اللہ آپ کی عقل کو نظر نہ لگ جائے۔" آہم (میم شکیلہ) گھر میں تو ہم سنتے ہیں، عقل سے پیدل ہے۔ "میڈم یہ ایک مثالی اسٹوڈنٹ ہیں۔" (میم نائلہ) ڈائری دیتے وقت "آپ کے لیے تو کچھ خاص لکھنا پڑے گا۔" (میم منور) "آپ میری بہت اچھی اور اوبیڈینٹ اسٹوڈنٹ ہیں۔" (میم عاصمہ) "آپ کا امیج میرے ذہن میں بہت اچھی اسٹوڈنٹ کا ہے۔" (میم فاطمہ) "آپ کی لکھی ہوئی ہر چیز دوسروں سے بہت مختلف ہوتی ہے۔" (میم شکیلہ) کافی سے بہت سارا ہو گیا۔ ابو کی سنیے۔ "اچھی ہے یہ لڑکی، پر کبھی کبھی توبہ توبہ...." (ابو آپ بھی نہ) خامیاں تو ایک ڈھونڈو ہزار ملتی ہیں، گھر میں.... "تمہارے ہاتھ سے کبھی کوئی اچھا کام نہ ہوا۔" اف! بندہ بشر ہیں، خامیوں سے مبرا تو نہیں ہو سکتے، غصے کے ذرا تیز لیکن اب قابو پا لیتے ہیں، البتہ غیر ذمہ دار نہیں ہیں، جانے اگلے کو یہ محسوس کیوں نہیں ہوتا۔ خلوص کا جواب ڈبل خلوص سے دیتے ہیں... اور... اور آج کے لیے یہی کافی ہے۔

3 ۔ ڈائجسٹ سے رشتہ "جنت کے پتے" کی اشاعت کے ساتھ شروع ہوا، اب بھی کبھی بے قاعدگی ہو جاتی ہے، پر جب نمرہ احمد موجود ہوں فہرست میں تو کوئی چھٹی نہیں، کوئی بہانہ نہیں۔ بشمول نمرہ احمد کے جب جب پڑھا ڈائجسٹ کی ان رائٹرز کو قدم قدم پہ ان کے موتی جیسے الفاظ سفر زیست میں مشعل راہ ثابت ہوئے، کیسا جادو ہے ان تحریروں میں۔ سائرہ رضا، سمیرا حمید، سحر ساجد (کیا کہنے) نمرہ احمد (کوئی ثانی نہیں) عمیرہ احمد، فرحت اشتیاق، عنیزہ سید، آسیہ رزاقی، فائزہ افتخار (اکیسویں صدی کا ایسا انمول نمونہ جو بن مانگے مل جائے) اللہ کرے زور قلم اور زیادہ....)

4 ۔ کتابوں سے محبت (میری چھوٹی سی لائبریری اس کی گواہ ہے ) بہت کچھ پڑھ چکے ہیں، پر صورت حال "ابھی پڑھا ہی کیا ہے" ابن انشاء، قدرت اللہ شہاب، اشفاق حسین، رضیہ بٹ، مستنصر حسین تارڑ، غلام عباس، پریم چند، منٹو، جمع ڈائجسٹ کی جملہ رائٹرز... سفرِ زندگی میں جب کبھی قدم ڈگمگائے مخلص دوستوں

جیسی ان کتابوں نے آگے بڑھ کر تھام لیا' کبھی نہ پھسلنے کے لیے اور ہمیں ان سے دوستی پہ ناز ہے۔

5 ۔پسندیدہ اقتباس۔

جب کشتی ہچکولے کھا رہی ہو تو بیچ سمندر خدا کی رحمت کو پکارا جاتا ہے اور جب کشتی کنارے لگ جائے تو اپنی قوت بازو کے قصیدے گائے جاتے ہیں' بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو اپنے حاصل کو رحمت خداوندی سمجھتے ہیں۔

(واصف علی واصف) "دل دریا سمندر"

6 ۔اللہ کے رسولؐ نے فرمایا تھا۔ "اسلام شروع میں اجنبی تھا' عنقریب یہ پھر اجنبی ہو جائے گا اور سلام ہو ان اجنبیوں پہ۔۔۔" (جنت کے پتے) نمرہ احمد۔

7 ۔شاعری جذبات اور احساسات کی ترجمان ہے' رغبت فطری بات ہے' اکثر شعراء کو پڑھا ہے' ابن انشاء' فیض احمد فیض' پروین شاکر' امجد اسلام امجد' غالب' میر' داغ' مومن' فراز نمایاں ہیں۔ پسندیدہ شعر تو کافی سے زیادہ ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو دل کے تاروں کو چھو لیتے ہیں' ملاحظہ کیجیے۔

میں نے کب کہا' میں حسین ہوں یا محبتوں کا امین ہوں
میری گفتگو میرا آئینہ' میرا ذوق' میری مثال ہے

سی ایل مغموم سرحدی کی نظم "کرم کنارے"
محبتوں سے گندھے کس دیس میں لے جاتی ہے' پڑھیے ذرا۔۔۔

دور نیا اک دیش بنائیں
مل کر گیت وطن کے گائیں

آپس میں ہم پریت بڑھائیں
آؤ سجنی شہر سے جائیں

جھگڑے دھندے چھوڑ کر سارے
چلیے سجنی کرم کنارے

رد کے خدائے پاالمان' کیسا لگا ہم سے مل کر بتایئے گا ضرور۔۔۔





عمیرہ احمد

# آبِ حیات

آبِ حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کردیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایرِ رنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں، جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کررہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سرا مل جاتا ہے۔



L۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے جو حریف رہ گئے ہیں۔ تیرہ سالہ بچی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتا دیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ ہجے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کر دی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کر دیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی، اس نے اس بار بھی انکار کر دیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

## چودہویں قسط

امامہ نے جیسے اسے خبردار کیا تھا۔

"مجھے پروا نہیں ہے' اس کا بھی کچھ نہ کچھ انتظام کرلوں گا میں... فی الحال تو میں نے اپنی لیگل ٹیم سے کہا ہے کہ وہ اس کے بارے میں مجھے ایڈوائس کریں... کورٹ کو اپروچ کیا جاسکتا ہے۔ اس بچی کے لیے... گارڈین شپ بدلی جاسکتی ہے۔ کوئی بہتر رشتہ دار ڈھونڈا جاسکتا ہے یا پھر کسی ویلفیئر ہوم کو اس کی ذمہ داری سونپی جاسکتی ہے۔"

وہ امامہ سے کہہ رہا تھا اور اس ساری گفتگو کے دوران سالار سکندر نے ایک لمحہ کے لیے بھی اس بچی کو گود لینے کے آپشن پر سوچا ہی نہیں تھا' وہ صرف اس بچی کی بہتر نگہداشت چاہتا تھا اور اس کے لیے روپیہ خرچ کرنے پر تیار تھا اور اس کا خیال تھا کہ وہ پاکستان میں قیام کے دوران ہی چنی کے لیے کوئی بہتر جگہ تلاش کرنے میں کامیاب ہوجائے گا۔

یہ خیال پہلی بار اس گھر میں حمین کو آیا تھا جو دوسرے دن امامہ سے چنی کا نام پوچھنے کی جدوجہد کررہا تھا۔

"مجھے یاد ہی نہیں رہا تمہارے بابا سے اس کا نام پوچھنا۔"

امامہ کو اس کے استفسار پر یاد آیا۔ سالار اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ چنی' امامہ اور تینوں بچوں کے ساتھ لاؤنج میں تھی جہاں وہ عنایہ کے تھمائے ہوئے کچھ کھلونوں کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھی۔ اس کے سر اور جسم پر موجود الرجی پر اب وہ کریم لگی ہوئی تھی جو امامہ تھوڑی دیر پہلے اسے ڈاکٹر کو دکھا کر تشخیص کرانے کے بعد لے کر آئی تھی۔

" Can I name her (میں اس کا نام رکھ دوں؟)"

حمین نے ماں کی بات کے جواب میں اسے تجویز پیش کی۔

"نہیں' تم یہ نہیں کرسکتے۔" اس سے کچھ فاصلے پر ایک کتاب پڑھتے ہوئے جبریل نے جیسے اسے لگام ڈالنے کی کوشش کی۔

"کیوں؟" حمین نے اپنا پورا منہ اور آنکھیں بیک وقت پوری طرح کھول کر انہیں گول کرتے ہوئے تعجب کی انتہا پر پہنچتے ہوئے کہا۔

"کیونکہ اس کا پہلے ہی ایک نام ہے۔" جبریل نے اسی ٹھنڈے انداز میں اس کے سوال کا جواب ایسے دیا جیسے اسے حمین کی کم عقلی پر افسوس ہورہا ہو۔

"تمہیں اس کا نام پتا ہے؟" تڑاق سے اگلا سوال جبریل کی طرف اچھالا گیا۔

"نہیں..." جبریل گڑبڑایا۔ "مجھے اس کا نام نہیں پتا۔"

حمین نے اسی انداز میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسی ڈرامائی انداز میں کہا۔ "ممی اس کا نام نہیں جانتیں۔" وہ اب امامہ کی طرف متوجہ تھا۔ جو عنایہ کے لیے کچھ ڈرائنگ کررہی تھی۔ "عنایہ کو اس کا نام نہیں پتا۔" اس نے اب اپنے دونوں ننھے ننھے ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو پھیلایا۔ "اوہ! پوری دنیا میں کسی کو بھی اس کا نام نہیں معلوم!"

وہ جیسے عدالت میں اس کا کیس لڑنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگا رہا تھا۔

"اور تم... کیا تم نہیں چاہتے کہ اس کا کوئی نام ہو؟"

اس کے انداز میں اس قدر ملامت تھی کہ ایک لمحہ کو جبریل کو بھی مدافعانہ انداز اختیار کرنا پڑا۔ وہ بری طرح گڑبڑایا۔

"میں نے یہ تو نہیں کہا۔"

"میں نے خود سنا ہے۔" حمین نے اپنے سینے پر اپنے دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے اپنی موٹی موٹی سیاہ آنکھیں مکمل

طور پر گول کرتے ہوئے اہم گواہ کا دل ادا کیا۔
جبرل نے فوری طور پر اپنا چہرہ کتاب کے پیچھے چھپانے میں عافیت سمجھی تھی۔ وہ اس چھوٹے بھائی کو تو تب ہی چپ نہیں کروا سکا تھا جب اسے بولنا نہیں آتا تھا اور اب چپ کرواتا؟
''حمین! اس کے پیرنٹس نے اس کا کوئی نہ کوئی نام ضرور رکھا ہو گا۔ وہ اتنی بڑی ہے۔''
امامہ نے اس بار مداخلت کرنی ضروری سمجھی۔ حمین کو اس کی بات پر جیسے کرنٹ ہی لگ گیا۔
''پیرنٹس!'' اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی تھی۔ جبرل کو کتاب ہٹا کر اسے دیکھنا پڑ گیا۔ ''اوہ! مائی گاڈ۔''
حمین کی آواز صدمہ زدہ تھی۔ ''پھر یہ ان کے پاس کیوں نہیں ہے؟''
اس نے اسی صدمے میں امامہ سے جیسے احتجاجاً کہا تھا اور یہ وہ سوال تھا جس کا جواب امامہ نہیں دے سکی تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس سوال کے جواب میں چنی کے خاندان کے بارے میں اسے کیا بتائے۔
اس کی خاموشی نے حمین کو جیسے اور بے تاب کیا۔
''کیا اس کا کوئی بھائی یا بہن بھی نہیں ہے؟''
''نہیں! اس کا کوئی نہیں ہے۔'' امامہ نے جواب دیا۔ حمین کا چہرہ کھل اٹھا۔
''تب تو میں اس کا نام رکھ سکتا ہوں۔'' گفتگو جہاں سے شروع ہوئی تھی گھوم پھر کر وہیں آ گئی تھی۔ حمین اپنی کوئی بات نہیں بھولتا تھا۔ یہ اس کے ماں باپ کی بدقسمتی تھی۔
''اوکے... تم اس کا نام رکھ لو۔'' امامہ نے جیسے ہاتھ جوڑنے والے انداز میں اس کے سامنے ہتھیار ڈالے اور دوبارہ عنایہ کی ڈرائنگ کی طرف متوجہ ہو گئی۔
''ممی! کیا یہ ہمارے ساتھ رہے گی؟'' حمین نے ایک اور سوال سے اسے مشکل میں ڈالنا ضروری سمجھا۔
''نہیں...'' امامہ نے اسی طرح کام میں مصروف اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر کہا۔
''کیوں؟'' حمین نے جیسے چیخ نما انداز میں سوال کیا۔ امامہ صرف گہری سانس لے کر رہ گئی تھی۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ حمین کے پاس سوال ختم ہو جائیں یا وقتی طور پر کسی وقت رک جایا کریں۔
''جب تمہارے بابا آئیں گے تو ان ہی سے پوچھنا۔'' اس نے بلا کو اپنے سر سے ٹالنے کی کوشش کی۔
''ممی! کیا ہم اس کو اڈاپٹ کر سکتے ہیں۔'' امامہ کا دماغ گھوم گیا تھا اس سوال پر۔
''نہیں... یہ نہیں ہو سکتا۔'' کوئی دوسری صورت حال ہوتی تو وہ اس سوال پر ہنس پڑتی لیکن محمد حمین سکندر نے اپنے ماں باپ کی حس مزاح کو ختم کر دیا تھا۔ ان کی برداشت کے پیمانے کے ساتھ ساتھ...
''تم اسے اڈاپٹ کیوں کرنا چاہتے ہو؟'' جبرل نے جیسے ہول کر کہا تھا۔
''کیونکہ مجھے ایک بے بی چاہیے۔''
اس نے بے حد نروٹھے انداز میں کسی سے نظریں ملائے بغیر اعلان کیا۔ جبرل جیسے غش کھا گیا تھا۔ امامہ دم بخود اپنے ساڑھے تین سالہ بیٹے کی شکل دیکھ کر رہ گئی تھی جبکہ لاؤنج میں آتے ہوئے سکندر عثمان اپنی ہنسی پر قابو نہیں رکھ سکے تھے۔ حمین نے سکندر عثمان کو اندر آتے اور ہنستے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر جا کر ان کی ٹانگوں سے لپٹا اور اس نے وہ مطالبہ ایک بار پھر پیش کیا۔
''ایک دن آئے گا جب بے بی آپ کے پاس ہو گا۔'' انہوں نے اسے تھپکتے ہوئے تسلی دی۔
''ایک دن؟'' حمین کی آنکھیں عادتاً گول ہوئیں۔ ''آج کیوں نہیں؟''
اس نے ضد کی۔ سکندر عثمان نے زمین پر بیٹھی کھلونوں سے کھیلتی ہوئی چنی کو دیکھا جتنا ترحم اور احساس جرم سالار سکندر کے دل میں چنی کے لیے تھا اتنا ہی ترحم سکندر عثمان کے دل میں اس بچی کے لیے تھا۔ وہ جیسے ان

دونوں کا مشترکہ احساس جرم تھی۔

"بیٹا! اسے واپس جانا ہے۔ وہ آپ کی بے بی نہیں ہو سکتی۔" سکندر عثمان نے اب حمین کو سمجھانے کی کوشش کا آغاز کیا۔

"اسے کہاں جانا ہے؟" حمین کو سکندر عثمان کی بات پر ایک نیا جھٹکا لگا۔ وہ جیسے ہکابکا انداز میں چنی کو دیکھنے لگا۔ "اپنی فیملی کے پاس۔" سکندر عثمان نے مختصراً" کہا۔ وہ اسے یتیم خانہ کے بارے میں بتانا نہیں چاہتے تھے' نہ چنی کے حوالے سے مزید سوالوں کا پنڈورا باکس کھولنا چاہتے تھے لیکن انہیں اندازہ نہیں تھا کہ ان کا سوال اس صورت حال میں غلط ہو گیا تھا۔

"لیکن ممی نے تو کہا تھا اس کی کوئی فیملی نہیں ہے۔"

سکندر عثمان نے امامہ کو دیکھا۔ امامہ نے انہیں۔ "آپ کے بابا اس کو کسی نرسری میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔" امامہ نے اس کے لیے ایک جواب ڈھونڈا۔

"یہ ہمارے ساتھ کیوں نہیں رہ سکتی۔ ہمارا گھر اتنا بڑا ہے۔" اس نے ہاتھ پھیلا کر "اتنا" پر زور دیا۔

سوال بے ساختہ تھا اور جواب بھی اسی میں تھا۔ بچے بعض دفعہ وہ حل چٹکی بجاتے پیش کر دیتے ہیں جن سے بڑے آنکھیں چراتے پھر رہے ہوتے ہیں۔ حمین کا یہ "حل" سالار سکندر نے بھی سنا جو اس وقت چند یتیم خانوں کا معلوماتی میٹریل اٹھائے لاؤنج میں داخل ہو رہا تھا لیکن اس وقت حمین کا یہ حل ان سب کو حمین کی بچکانہ ضد اور فینٹسی سے زیادہ کچھ نہیں لگا تھا۔ وہ ابھی دو ہفتے اور پاکستان میں تھا اور وہ ان دو ہفتوں میں چنی کے حوالے سے کوئی فیصلہ کر لینا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے وہ اس کے رشتہ داروں سے کورٹ کے ذریعے چنی کی گارڈین شپ لینے کے لیے مالی معاملات طے کرنے میں مصروف تھا۔

"یہ ہمارا گھر نہیں ہے۔ یہ آپ کے دادا ابو کا گھر ہے۔" اندر آتے ہوئے سالار نے اس کے سوال کا جواب پیش کیا۔

حمین سوچ میں پڑا۔

"آپ کے بابا صحیح کہہ رہے ہیں۔" امامہ نے جیسے اس کی خاموشی پر سکون کا سانس لیا۔ "ہمارے پاس گھر نہیں ہے۔" حمین الجھا۔ "یہ ہمارے ساتھ کنشاسا میں رہ سکتی ہے۔" حمین کو کنشاسا والے گھر کا خیال آیا۔

"لیکن وہ بھی ہمارا گھر نہیں ہے۔ ہم اسے جلد چھوڑ دیں گے۔ زیادہ سے زیادہ ایک سال میں۔"

سالار نے بے حد سنجیدگی سے اس کے ساتھ یوں بات کرنا شروع کر دی جیسے وہ کسی بڑے آدمی سے بات کر رہا ہو۔ اس کے تینوں بچے غیر معمولی ذہانت کے مالک تھے اور یہ ان کے جینز میں ودیعت ہوئی تھی مگر یہ غیر معمولی ذہانت جو جبریل اور عنایہ کی شکل میں انہیں نعمت لگی تھی' حمین کی شکل میں مصیبت بن گئی تھی۔

حمین ابھی بھی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ جیسے چنی کے لیے ایک گھر کی تلاش میں تھا جہاں اسے رکھا جا سکتا اور امامہ کو گھر کے ذکر پر جیسے اپنا گھر یاد آ گیا تھا۔ "ہمارے پاس ہمارا اپنا گھر کیوں نہیں ہے؟"

"ہمارا اپنا گھر ہو گا۔" امامہ نے حمین کو جیسے بہلایا۔

"کب۔۔۔"

"بہت جلد۔۔۔"

امامہ چائے بنا کر سالار اور سکندر عثمان کو پیش کر رہی تھی جو ملازم چند لمحے پہلے رکھ کر گیا تھا۔

"اسی لیے منع کرتا تھا میں کہ فضول خرچیاں مت کرو۔ وقت پر ایک گھر بنا لو۔ جیسے تمہارے سارے بھائیوں نے بنا لیے۔" سکندر عثمان کو اس موضوع گفتگو سے وہ پلاٹ اور وہ انگوٹھی یاد آ گئی۔

"وہ پلاٹ اس وقت ہوتا تو چار پانچ کروڑ کا ہو چکا ہوتا۔ اس رنگ کی اس وقت کی مارکیٹ پرائس سے ڈبل۔"
سکندر عثمان نے روانی سے کہا۔ اپنے لیے چائے ڈالتی امامہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی' الجھی۔
"کس رنگ کی؟" اس نے جیسے حیران ہو کر سکندر عثمان سے پوچھا۔
"جو رنگ تم نے پہنی ہوئی ہے۔" سکندر عثمان نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ سالار کو غلطی کا احساس ہوا۔ اسے سکندر کو اس موضوع پر آنے سے پہلے موضوع بدل دینا چاہیے تھی لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ امامہ نے بے یقینی سے ہاتھ میں پہنی انگوٹھی کو دیکھا۔ پھر سالار کو پھر سکندر عثمان کو۔۔۔"
"یہ پلاٹ بیچ کر آئی ہے؟"
"ہاں۔۔۔ ایک کروڑ 37 لاکھ کی۔۔۔ ذرا سوچو' دس گیارہ سال پہلے وہ پلاٹ نہ بکتا تو آج وہ اسلام آباد میں جس جگہ پر ہے اس سے چار پانچ گنا قیمت ہو چکی ہوتی۔ رنگ تو اتنی قیمتی نہیں ہو سکتی وقت کے ساتھ۔۔۔"
سکندر عثمان نے نہ امامہ کے تاثرات پر غور کیا تھا' نہ سالار کے۔۔۔ وہ روانی میں چائے پیتے ہوئے بات کہتے چلے گئے تھے۔ امامہ ساکت اور دم بخود سالار کو دیکھ رہی تھی جو اس سے نظریں چرائے چائے پینے میں مصروف تھا۔ وہ اس وقت یہی کر سکتا تھا۔ کمرے میں یک دم اپنی بات کے اختتام پر چھانے والی خاموشی سے سکندر عثمان کو لگا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔
چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے وہ رکے' انہوں نے ساکت بیٹھی امامہ کو دیکھا' جو سالار کو گھور رہی تھی اور پھر سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں انہیں اس خاموشی کی وجہ سمجھ میں آگئی۔
"اسے اب بھی نہیں پتا؟" انہوں نے بے یقینی سے اپنے بیٹے سے پوچھا جس نے کپ سامنے پڑی ٹیبل پر رکھتے ہوئے بڑے تحمل سے کہا۔
"اب۔۔۔ پتا چل گیا ہے۔" سکندر عثمان کی سمجھ میں نہیں آیا' وہ فوری طور پر اس انکشاف کے بعد کس ردعمل کا اظہار کرتے جو ایک راز کو غیر ارادی طور پر افشا کرنے پر ان کی شرمندگی کو چھپا لیتا۔
امامہ نے اپنے ہاتھ کی پشت کو پھیلا کر اس انگوٹھی کو دیکھا۔۔۔ پھر سکندر عثمان کو۔۔۔ پھر سالار کو۔۔۔ وہ اگر کہتا تھا کہ وہ انمول تھی تو غلط نہیں کہتا تھا۔ اس کی زندگی میں بہت سارے لمحے آئے تھے۔ جب اس کا دل بس سالار کے گلے لگ جانے کو چاہا تھا۔ کسی لفظ' کسی اور اظہار کے بغیر۔۔۔ احسان مندی اور تشکر کے لیے دنیا میں موجود سارے لفظ کبھی کبھی اس جذبے اور احساس کو کسی دوسرے تک پہنچانے کے لیے چھوٹے پڑ جاتے ہیں جو انسان کے اندر سے کسی دوسرے کے لیے کسی چشمے کی طرح اُمڈتا ہے۔ اس کا دل بھی اس وقت سالار سے صرف لپٹ جانے کو چاہا تھا۔ بچوں کی طرح۔۔۔ وہ زندگی میں کتنی بار اسے اس طرح گونگا کرتا رہے گا۔
اس نے سامنے بیٹھے اس شخص کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا جو اس کی زندگی کی کتاب کا سب سے خوب صورت ترین باب تھا۔ یہ اس انگوٹھی کی قیمت نہیں تھی۔ جس نے امامہ ہاشم کی زبان سے لفظ چھین لیے تھے۔ یہ دینے والے شخص کی بے لوث محبت تھی جس کے سامنے امامہ کھڑی نہیں ہو پا رہی تھی۔ وہ کیا کہتی۔۔۔ وہ سالار سکندر سے کیا کہہ سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تم نے رنگ اتار دی؟" اس رات سالار امامہ کے ہاتھ میں اس رنگ کو نہ پا کر پوچھے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔
"میں بے وقوف نہیں ہوں کہ اتنی قیمتی رنگ ہر وقت پہنے پھروں۔" امامہ نے اُسے جواباً" کہا۔ وہ اپنے فون پر کچھ ٹیکسٹ میسجز چیک کرنے میں مصروف تھی۔ سالار ٹی وی پر کوئی نیوز چینل لگائے بیٹھا تھا' جب چینل

سرفنگ کرتے ہوئے اس کی نظر امامہ کے ہاتھ پر پڑی تھی جو اس کے قریب صوفے پر بیٹھی اپنے فون میں گم تھی۔
"تمہیں مجھے بتانا چاہیے تھی اس کی قیمت۔" اس نے سالار سے کہا۔
"صرف اسی خدشے کے تحت نہیں بتایا تھا تمہیں۔۔۔ اور دیکھ لو میرا اندازہ ٹھیک تھا۔۔۔ تم اسے بھی اب لا کر میں رکھ دو گی۔"

سالار کچھ ناخوش سا دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہوا۔ ایک لمحہ کے لیے امامہ خاموش رہی' پھر اس نے کہا۔
"تو اور یہاں رکھوں۔۔۔ ساتھ لیے پھرنا بے وقوفی ہے' گم ہو جائے تو؟ مجھے پہلے بھی اس کے گم ہونے کا اتنا صدمہ ہوا تھا اور اب تو۔۔۔ ہارٹ اٹیک ہی ہو جائے گا مجھے جو ایک کروڑ سے بھی مہنگی انگوٹھی میں گم کردوں۔"
"تقریباً" سوا دو کروڑ۔" سالار ٹی وی پر نظریں جمائے بڑبڑایا۔ امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا۔
"کیا۔۔۔؟"

"اس کی موجودہ قیمت۔۔۔" وہ اسی انداز میں اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر بولا۔
"اسی لیے تو نہیں پہن رہی۔۔۔ بے وقوفی تھی ویسے یہ۔۔۔" اس نے ایک ہی سانس میں کچھ توقف کے بعد کہا۔
"کیا؟" سالار اس بار اس کی طرف متوجہ ہوا۔
"ایک پلاٹ بیچ کر انگوٹھی خریدنا۔۔۔ اور وہ بھی اتنی مہنگی۔۔۔ میں تمہاری جگہ ہوتی تو کبھی نہ خریدتی۔"
"اسی لیے تم میری جگہ نہیں ہو امامہ۔۔۔" سالار نے جتانے والے انداز میں اسے کہا۔ وہ نادم ہوئی تھی لیکن اس نے ظاہر نہیں کیا۔
"وہ پلاٹ ہوتا تو آج اسے بیچ کر گھر بنا چکے ہوتے ہم۔۔۔" اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد سالار سے کہا۔
"تمہارے خوابوں کا ایکڑوں پر پھیلا ہوا گھر چند کروڑ میں بن جاتا؟؟"
وہ اب اسے چڑانے والے انداز میں کچھ یاد دلا رہا تھا اور امامہ کو ایک جھماکے کے ساتھ وہ اسکریپ بک یاد آئی' جس میں اس نے اپنے ممکنہ گھر کی ڈھیروں ڈرائنگز بنا رکھیں تھیں۔۔۔ گھر کے نقشے ہی نہیں کمروں کی کلر اسکیم تک۔۔۔ گھر کے اندر کی سجاوٹ کی تفصیلات تک۔۔۔ اور وہ اسکریپ بک گھر کے بہت سے دوسرے سامان کے ساتھ سکندر عثمان کے گھر کی اوپری منزل کے دو کمروں میں اسٹور کیے ہوئے سامان کے ساتھ کہیں رکھی ہوئی تھی۔ دس سال پہلے امریکہ شفٹ ہونے کے بعد وہ اسکریپ بک اس کے پاس تھی لیکن وہاں سے کانگو جانے سے پہلے وہ اپنا کچھ سامان پاکستان چھوڑ گئی تھی اور اس میں وہ اسکریپ بک بھی تھی اور شاید اس کی قسمت میں بچنا تھا۔ اس لیے وہ بچ گئی تھی ورنہ کانگو میں پڑے اس کے باقی سامان کے ساتھ جل کر خاک ہو چکی ہوتی۔
"اچھا کیا مجھے یاد دلا دیا۔ میں تو کل ہی وہ اسکریپ بک نکالتی ہوں۔ مدت ہو گئی اسے دیکھے اور اس میں کچھ add کیے۔"

امامہ کا ذہن برق رفتاری سے انگوٹھی سے ہٹ کر گھر پر چلا گیا تھا اور پتا نہیں کیا ہوا' پھر ٹی وی دیکھتے دیکھتے سالار کو امریکہ میں خریدے اور پھر بیچ دیے جانے والے اس گھر کا خیال آیا تھا۔ جس کے بارے میں اس نے امامہ کو بتایا تک نہیں تھا۔
"تمہیں ایک چیز دکھاؤں؟" سالار نے ریموٹ کا میوٹ کا بٹن دباتے ہوئے ٹی وی کی آواز بند کی اور سامنے ٹیبل پر پڑے اپنے لیپ ٹاپ کو اٹھا لیا۔
"کیا؟" وہ دوبارہ اپنے سیل فون کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے چونکی۔
سالار اب لیپ ٹاپ کھول کر اس میں سے تصویروں والے حصے میں جا کر اس گھر کی تصویریں ڈھونڈ رہا تھا اور وہ چند منٹوں کی جدوجہد کے بعد اسکرین پر نمودار ہو گئی تھیں۔

"یہ کیا ہے؟" امامہ نے ایک کے بعد ایک اسکرین پر نمودار ہونے والی ان تصویروں کو دیکھتے ہوئے سالار کو دیکھا۔

"ایک گھر... ایک جھیل... اس کے گرد پھیلا لان..."

وہ اس کی بات پر ہنسی...

وہ تو مجھے نظر آرہا ہے... لیکن کس کا گھر ہے؟

اس نے سالار سے پوچھا "اور مجھے کیوں دکھا رہے ہو؟"

"تم نے کبھی پہلے یہ تصویریں دیکھی ہیں؟" سالار نے ایک لمحہ کے لیے ٹھٹھک کر اس سے پوچھا۔

"نہیں... کیوں؟" امامہ نے اس کے سوال پر کچھ حیران ہو کر پوچھا۔

"جب حمین پیدا ہوا تھا اور میں تمہارے پاس امریکہ سے آیا تھا تو تم نے مجھے بتایا تھا کہ اس رات تم نے خواب میں ایک گھر دیکھا تھا' کیا وہ گھر ایسا تھا؟ تمہیں وہ خواب یاد ہے نا؟" سالار نے اس سے پوچھا۔

"ہاں یاد ہے۔" وہ ایک لمحہ کے لیے ٹھٹھکی "لیکن وہ گھر ایسا نہیں تھا۔ وہ جھیل بھی ایسی نہیں تھی۔" امامہ نے جیسے اپنی یادداشت پر زور دیا" خواب بے شک پرانا تھا لیکن تخیل کبھی پرانا نہیں ہوتا" اور یہ کہہ کر اس نے جیسے سالار کے احساس جرم کے غبارے کی ہوا نکال دی تھی وہ بے اختیار ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

"کیوں تم کیوں پوچھ رہے ہو یہ سب؟ اور یہ کس کا گھر ہے؟" امامہ کو اب الجھن ہوئی۔

"تمہارے لیے خریدا تھا۔" سالار نے ایک بار پھر ان تصویروں کو سکرول کرنا شروع کر دیا۔

امامہ کو اس کی بات پر جیسے جھٹکا لگا تھا۔ "کیا مطلب؟ میرے لیے؟"

"ہاں تمہارے لیے mortgage کیا تھا امریکہ میں۔ تمہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا تمہاری برتھ ڈے پر گفٹ کر کے لیکن۔"

وہ اب ان تصویروں کو باری باری دیکھتے ہوئے بات کرتے کرتے آخری تصویر پر جا کر رکا۔

"لیکن...؟" امامہ نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

"لیکن پھر میں نے اسے بیچ دیا کانگو دوبارہ آنے سے پہلے۔" سالار نے تصویروں کے فولڈر کو بند کر کے اسے ڈیلیٹ کرتے ہوئے کہا۔ "سود سے میں دنیا میں تو گھر لے سکتا تھا۔ جنت میں گھر نہیں لے سکتا تھا۔"

اس نے لیپ ٹاپ اسکرین سے نظریں ہٹا کر امامہ کو دیکھا اور عجیب انداز میں مسکرایا۔ شرمندگی' ندامت' بے چارگی... سب کچھ تھا اس مسکراہٹ میں... یوں جیسے کسی نے ہتھیار ڈالے ہوں۔

"تم لے بھی لیتے تو بھی میں اس گھر میں کبھی نہ جاتی۔ صرف ایک گھر ہی کی تو فرمائش کی ہے تم سے پوری زندگی میں... وہ بھی حرام کے پیسے سے بنا کر دیتے مجھے۔" امامہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں تمہارے خوابوں کا گھر بنا کر دینا چاہتا تھا۔ ایکڑوں پر پھیلا۔ جھیل کے کنارے... سمر ہاؤس اور گرین ہاؤس والا۔" سالار نے ٹھنڈی سانس لی' اور جلد بنانا چاہتا تھا۔ بڑھاپے تک پہنچنے سے پہلے۔" اس نے لیپ ٹاپ بند کر دیا۔

امامہ نے سر جھٹکا "تم واقعی بے وقوف ہو... میرے خوابوں کے گھر کی اینٹیں حرام کے پیسے سے رکھی جائیں۔ خواہش نہیں کی تھی میں نے... اور ایکڑوں کا گھر تم سے کہا تھا لیکن دعا تو اللہ تعالیٰ سے کرتی ہوں کہ وہ اس کو تحمل کرے اور اتنے وسائل دے... تم سے ایک بار بھی میں نے نہیں کہا کہ اتنا کماؤ یا اسی سال گھر کھڑا کر کے دو۔ اتنے سالوں میں ایک بار بھی تم سے ضد کی کہ اس سال ضرور' لے کر ہی دو گھر... کبھی بھی یاددہانی نہیں کرائی میں نے... پھر کیوں جلدی تھی تمہیں اس گھر کے لیے کہ تمہیں mortgage کرنا پڑا۔"

اسے افسوس ہو رہا تھا۔ "تم نے کبھی مجھ سے نہیں کہا۔ مجھے ریمانڈر نہیں دیے لیکن مجھے پتا تو تھا نا کہ تمہاری

خواہش ہے یہ۔ میں چاہتا تھا میں تمہاری یہ خواہش پوری کردوں۔ تم نے صرف ایک چیز مانگی تھی مجھ سے۔ اس لیے۔"

وہ اس سے کہتا جارہا تھا۔ امامہ ہنس پڑی۔

"تم خواب دیکھ رہے ہو سود سے پاک ایک اسلامی مالیاتی نظام کا جسے دنیا میں رائج کرسکو۔ اور میں خواب دیکھتی ہوں ایک ایکڑوں پر پھیلے گھر کا۔ حلال کے پیسے سے بنے ہوئے گھر کا۔ خواب تمہارا بھی اللہ ہی پورا کر سکتا ہے اور میرا بھی۔ اس لیے اسے اللہ پر ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ ویسے بھی میں نے سوچا ہے وہ انگوٹھی بیچ کر اس سے کوئی پلاٹ تو لے کر رکھ ہی سکتی ہوں میں۔"

سالار نے بے حد خفگی سے اس کی بات کاٹی۔ "تم اسے بیچ دوگی؟"

وہ ہنس پڑی، "نہیں۔ تم سمجھتے ہو میں اسے بیچ سکتی ہوں؟"

"ہاں!" سالار نے اسی نروٹھے انداز میں کہا۔ "وہ ایک بار پھر ہنس پڑی "تمہیں پتا ہے دنیا میں صرف ایک ہی مرد ہے، جو میرے لیے ایسی انگوٹھی خرید سکتا ہے۔"

"اب تم رو کر مجھے جذباتی کروگی۔" سالار نے اس کی آنکھوں میں ابھرتی نمی کو دیکھ کر حفاظتی بند باندھنے کی کوشش کی۔ اسے ٹوکا۔

"یہ انگوٹھی invaluable (انمول) ہے۔ تم invaluable (انمول) ہو۔" اس نے ٹھیک بھانپا تھا۔ امامہ کی آنکھیں برسنے لگی تھیں۔

"پھر ایک بات مانو۔" سالار نے اس کا ہاتھ تھاما۔

"کیا؟"

"اسے ہاتھ میں پہن لو۔"

"گم ہوجائے گی۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

"میں اور لے دوں گا۔" اس نے امامہ کے آنسو پونچھے۔

"تمہارے پاس اب بیچنے کے لیے کچھ ہے ہی نہیں۔" امامہ نے آنسوؤں کی بارش میں بھی ہوش مندی دکھائی تو وہ ہنسا۔

"تم مجھے ایسٹیمیٹ کررہی ہو۔"

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا باہر پڑے میٹرس پر سویا ہوا حمین جاگ گیا تھا۔ وہ دونوں بیک وقت اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ نیند میں کچھ بڑبڑایا تھا۔

"اب یہ کیا کہہ رہا ہے؟" سالار حیران ہوا۔ اس نے پہلی بار اسے نیند میں باتیں کرتے دیکھا تھا۔

"شاید تسلی نہیں ہوئی اس کی۔ کوئی بات ہوگی کرنے والی جو اس وقت یاد آئی ہوگی 'کرنا۔" امامہ نے گہرا سانس لے کر اٹھ کر حمین کی طرف جاتے کہا' جو میٹرس پر بیٹھے آنکھیں بند کیے کچھ اس طرح بول رہا تھا جیسے کوئی ضروری بات کسی سے کررہا ہو۔

امامہ نے اسے دوبارہ لٹا کر تھپکنا شروع کیا اور اس کے برابر میں انگوٹھا منہ میں ڈالے لیٹی ہوئی چنی کو دیکھا جو گہری نیند میں تھی۔ اس کا میٹرس حمین کے میٹرس کے برابر میں تھا۔ اگر اسے ہونے والی سن الرجی کی وجہ سے امامہ احتیاط نہ کررہی ہوتی تو وہ چنی کو اپنے میٹرس پر ہی سلا چکا ہوتا کیونکہ وہ چنی کو ان لوگوں کی تمام کوششوں کے باوجود اپنی "لے پالک اولاد" مان چکا تھا۔

"سالار! اس کے بارے میں جو بھی طے کرنا ہے جلد کرو۔ حمین جس طرح اس سے اٹیچ ہورہا ہے۔ میں

نہیں چاہتی کچھ اور وقت یہاں رہنے کے بعد یہ یہاں سے جائے تو وہ اپ سیٹ ہو۔"
امامہ نے حمین کو تھپکتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر چنی پر پڑی چادر ٹھیک کرتے ہوئے سالار سے کہا۔
"صبح طے کرلو کہ اسے کہاں چھوڑ کر آنا ہے تو اسے چھوڑ آتے ہیں۔ جو دو چار ادارے مجھے مناسب لگ رہے ہیں ان کے بارے میں انفارمیشن تو لے آیا ہوں۔"
سالار نے بیڈ کی طرف جاتے ہوئے جس کام کو بہت آسان سمجھتے ہوئے امامہ کو ہدایات دی تھیں۔ وہ کام اتنا آسان ثابت نہیں ہوا تھا۔
اگلے دن وہ اس بچی کو لے کر ان چاروں اداروں میں گئے تھے جہاں وہ اسے رکھنا چاہتے تھے۔ دو اداروں نے مناسب قانونی کارروائی کے بغیر اس بچی کو فوری طور پر اپنی تحویل میں لینے سے انکار کردیا۔ جن دو اداروں نے اس بچی کو وقتی طور پر لینے پر آمادگی ظاہر کی تھی' وہاں بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال کے انتظامات دیکھ کر وہ دونوں خوش نہیں ہوئے۔
شام کو وہ پھر چنی کے ساتھ واپس گھر پہنچ چکے تھے اور حمین کی باچھیں چنی کو ایک بار پھر دیکھ کر کھل گئی تھیں۔ وہ صبح بھی بڑی مشکل سے ہی چنی کو رخصت کرنے پر تیار ہوا تھا اور اب چنی کی واپس آمد اس گھر میں اس کے لیے ایک بگ نیوز تھی اور چنی بھی اسے دیکھ کر کچھ اسی طرح نہال ہوئی تھی.... دو دن منہ سے کچھ بھی نہ بولنے کے باوجود اس کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی مسکراہٹ اور کھلکھلاہٹ یہ عیاں کرنے کے لیے کافی تھی کہ اس پر بھی حمین کا سامنا کرنے پر اثر وہی ہو رہا تھا جو حمین پر ہوا تھا۔
اگلے چند دن سالار نے چنی کی گارڈین شپ کے حوالے سے قانونی کارروائی کرنے اور چنی کی پیدائش اور پیدائش سے متعلقہ باقی کاغذات پورے کرنے کی کوشش کی اور جب دو تین دنوں میں وہ ان کاموں میں پھنسا رہا تو حمین نے چنی کے بارے میں یہ بھی دریافت کرلیا تھا کہ وہ "گونگی" تھی کیونکہ وہ ان تین چار دنوں میں بالکل خاموش رہی تھی۔ صرف ضرورتاً" زبان سے آوازیں نکالتی رہی تھی جو بہت محدود اور اوں آں تک محدود تھیں اور یہ چنی کے بارے میں ایک بے حد خوفناک انکشاف تھا جس نے امامہ اور سالار دونوں کو ہولا دیا تھا۔
"dumb (گونگی)...." امامہ کو یقین نہیں آیا "Mummy ! she is dumb" (ممی! یہ گونگی ہے)
حمین نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے پورا یقین ہے۔"
اس نے امامہ کو اس دن کی سب سے "اہم" اطلاع دی جو اس نے پچھلے چند دنوں میں چنی کی مسلسل خاموشی سے اخذ کی تھی۔
"نہیں سن تو رہی ہے...." امامہ نے چنی سے بات کرنے کی کوشش کے بعد نتیجہ نکالتے ہوئے کہا... وہ ہر آواز پر متوجہ ہوتی تھی۔
"ممی یہ امپورٹنٹ نہیں ہے...." حمین ماں کے اطمینان پر خوش نہیں ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا اس کی اپنی تشخیص ٹھیک تھی اور اسے ہی درنی سمجھا جانا چاہیے...." The most important thing is to talk and she can't talk
(اہم بات بولنا ہے اور یہ بول نہیں سکتی) حمین نے اس کی معذوری پر اظہار افسوس کرتے ہوئے اپنی آنکھوں میں حتی المقدور رنجیدگی اور افسوس شامل کیا۔
" The most important thing is to listen "
(سب سے اہم بات سننا ہے) امامہ نے بڑے غلط موقع پر اپنے بیٹے کو نصیحت کی کوشش کی۔ وہ چند لمحے خاموش رہ کر جیسے ماں کی بات پر سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔

"I dont think so.... There are so many things which can listen but only few can talk....

(میں ایسا نہیں سمجھتا۔ یہاں بہت ساری چیزیں ایسی ہیں جو سن سکتی ہیں لیکن چند ہی ایسی ہیں جو بول سکتی ہیں۔)

محمد حمین سکندر کی دانائی نے امامہ کو ہمیشہ کی طرح چاروں شانے چت گرایا تھا۔۔۔ وہ اب لان میں موجود وہ ساری چیزیں ماں کو گنوا رہا تھا جو "سنتی" تھیں لیکن بول نہیں سکتی تھیں۔۔۔ اور ان چیزوں میں اس نے چنی اور اس کے ہاتھ میں پکڑی گڑیا کو بھی گنا تھا۔ امامہ نے ہاتھ جوڑ کر اس گنتی کو روکا تھا۔۔۔ وہ ایک چلتی پھرتی ٹاکنگ ڈکشنری تھا جو' جو لفظ سنتا جیسے ریکارڈ کر لیتا تھا اور پھر ہر اس چیز کا نام دوبارہ دہرا سکتا تھا جو وہ ایک بار سن چکا ہوتا تھا۔

چنی کے بارے میں حمین کا یہ مشاہدہ اس وقت امامہ کو احمقانہ لگا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ بچی نئے ماحول میں آنے کی وجہ سے ابھی ایڈجسٹ نہیں ہوئی اس لیے بول نہیں پا رہی۔۔۔ بظاہر وہ وہاں بے حد پرسکون اور مطمئن نظر آتی۔۔۔ اس کی تاریخ پیدائش جان لینے کے بعد یہ ماننا مشکل تھا کہ ڈیڑھ سال کی چنی نے کوئی لفظ ہی نہ بولا ہو۔۔۔ امامہ' بچوں کا سات آٹھ ماہ کی عمر میں ٹوٹے پھوٹے لفظوں کو ادا کرنے کی صلاحیت کا مظاہرہ دیکھا تھا۔۔۔ لیکن اسے واقعی یہ اندازہ نہیں تھا جب آپ کسی کی نویں اور ان چاہی اولاد ہوں اور آپ کے گھر بھوک اور بیماری سے لے کر ہر وہ مسئلہ موجود ہو جو زمین پر کسی انسان کی زندگی جہنم بنا سکتا ہو۔ اور پھر آپ رشتہ داروں پر انحصار کرتے ہوں جہاں آپ کی زندگی کا واحد مصرف ماہانہ آنے والی رقم ہو اور اس کے علاوہ کسی کو آپ سے کوئی توقع ہو نہ آپ کی ضرورت 'تو دیکھنا اور بول پانا بہت بڑی "جدوجہد" بن جاتا ہے اور یہ جدوجہد انسان بچپن سے خود نہیں کر سکتا۔۔۔ چنی کی سب سے بڑی (کامیابی) یہ تھی کہ اس نے کسی کی طرف سے انگلی پکڑ کر چلانے کی کوشش نہ کرنے کے باوجود اپنے نحیف و نزار وجود کو اپنے قدموں پر کھڑا کرنا سیکھ لیا تھا۔۔۔ بول پانا ایک دوسری جدوجہد تھی جو اسے اس گھر میں کرنی تھی۔ وہ گونگی نہیں تھی لیکن اس گھر میں آنے سے پہلے اس نے کوئی لفظ پورا ادا نہیں کیا تھا۔۔۔ ساڑھے تین سال کا بچہ اپنے ایک ساتھی بچے کو کسی بڑے کی نسبت زیادہ آسانی سے بوجھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

چنی کے نصیب میں کسی ادارے میں پرورش پانا نہیں لکھا تھا' اس کے نصیب میں سالار سکندر کے گھر میں ہی پلنا بڑھنا لکھا تھا۔ جب تک سالار قانونی معاملات کو نپٹا کر چنی کے لیے ایک ادارے کا انتخاب کرتا' چنی کو شدید نمونیہ ہو گیا تھا۔۔۔ دو دن کے بعد ان لوگوں کو واپس کانگو جانا تھا۔۔۔ ان کی تین ہفتے کی چھٹی ختم ہو رہی تھی۔ فوری طور پر چاہنے کے باوجود وہ چنی کو کسی ہاسپٹل یا فوسٹر ہوم میں اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکے۔ ایک عجیب خدشہ ان دونوں کو لاحق ہوا تھا۔۔۔ اگر اس بچی کی اچھی نگہداشت نہ ہوتی اور وہ ان کے اس طرح چھوڑ جانے پر خدانخواستہ مر جاتی تو وہ خود کو کبھی معاف نہ کر پاتے۔۔۔ سالار اور امامہ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ امامہ بچوں کے ساتھ تب تک وہیں رہے گی جب تک چنی کی حالت سنبھل نہیں جاتی' سالار واپس چلا گیا تھا۔

امامہ دو ہفتے اور پاکستان میں رہی۔ چنی کی حالت سنبھل گئی تھی مگر اب وہ بچوں کے ساتھ اور خاص طور پر حمین کے ساتھ اس طرح اٹیچ ہو گئی تھی کہ وہ ان سے الگ ہونے پر تیار ہی نہیں تھی۔ سالار ان لوگوں کو پاکستان سے واپس لے جانے کے لیے آیا اور حمین کو بتائے بغیر وہ دوبارہ چنی کو ایک ادارے میں چھوڑنے گیا۔ وہ دونوں بار اس سے لپٹ کر چیخیں مار کر رونے لگی۔ وہ اس کے علاوہ کسی اور کی گود میں بھی جانے کو تیار نہیں تھی۔۔۔ وہ زبردستی

اسے تھام کر باہر نکلتا اور اس کی چیخوں کی آواز سن کر کسی عجیب کیفیت میں واپس چلا آتا۔ وہ اس کی گود میں آتے ہی یوں چپ ہو جاتی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ جیسے وہ واقعی اپنے باپ کی گود میں ہو......

وہ جبریل کو قرآن پاک خود حفظ کروا رہا تھا اور پاکستان سے چلے جانے کے بعد دو ہفتوں تک وہ روز اسکائپ پر جبریل کو پڑھاتا۔ پھر بچوں اور امامہ سے بات کرتا تو چنی بھی اسی ماحول کا حصہ ہوتی... وہ سالار کو اسکرین پر نمودار ہوتے دیکھ کر اسی طرح خوشی سے چیخیں مارتی۔ اوں آں کرتی... اور اس نے اپنی زندگی کا پہلا لفظ بھی سالار کے پاکستان آنے پر اسے دیکھ کر باقی بچوں کے ساتھ اس کی طرف بھاگتے ہوئے ادا کیا تھا... "با... با وہ سالار کی طرف بھاگتے ہوئے بولتی جا رہی تھی اور اس بات کو سب سے پہلے حمین نے نوٹس کیا تھا...

"Oh my God! she can talk"

(اوہ خدا! یہ بول سکتی ہے)

سالار کی طرف بھاگتے ہوئے اس کے پیروں کو جیسے بریک لگ گئے۔ وہ اپنی موٹی آنکھیں گول کیے چنی کو دیکھ رہا تھا' جو اب سالار کی ٹانگوں سے لپٹی ہوئی تھی۔ سالار عنایہ کو اٹھائے ہوئے تھا اور وہ اس کی ٹانگوں سے لپٹی... با... با... بابولتی جا رہی تھی... منہ اوپر کیے ہوئے... چمکتی آنکھوں کے ساتھ۔ الرجی کے مندمل ہوتے ہوئے نشانات والا چہرہ اور سر پر نئے نکلتے ہوئے سیاہ بالوں کی ہلکی سی تہ... اور صحت مند چہرہ... یہ وہ بچی نہیں تھی جسے ایک مہینے پہلے وہ مرغیوں کی گندگی کھاتے اٹھا کر لایا تھا...

اس کے ٹراؤزر کے کپڑے کو اپنی مٹھیوں میں بھینچے' وہ اب مٹھیاں کھول کر بازو ہوا میں لہرا رہی تھی۔ سالار سکندر کی طرف... اس طرح کہ وہ اب اسے بھی اٹھائے گا جیسے اس نے عنایہ کو اٹھایا تھا... پدرانہ شفقت اگر کوئی چیز تھی تو اس وقت سالار نے چنی کے لیے وہی محسوس کی اور کس رشتے سے' یہ اس کی بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات کبھی بھی نہیں آسکتی تھی کہ... کچھ رشتے خون کے نہیں ہوتے نصیب کے ہوتے ہیں... سالار سکندر اور اس کا خاندان نصیب سے چنی کو ملا تھا۔

سالار نے عنایہ کو نیچے اتارا اور اپنے پیروں سے لپٹی چنی کو اٹھا لیا... وہ کھلکھلائی۔ اس نے عنایہ کی طرح باری باری سالار کے گال چومے پھر وہ سالار کی گردن کے گرد ہاتھ لپیٹ کر اس کے ساتھ یوں چپک گئی کہ اب نیچے نہیں اترے گی... وہ پہلا لمحہ تھا جب سالار کو اندازہ ہوا چنی سے الگ ہونا وقت طلب کام ہے... وہ کیسے ان کے گھر اور زندگیوں کا حصہ بن گئی تھی' ان میں سے کسی کو احساس بھی نہیں ہوا تھا... سوائے حمین کے... جو دن میں تقریباً" تین سو بار یہ اعلان کرتا تھا...

" That she finally has a sister."

(وہ اب اس کی بہن ہے)

چنی کے اسٹیٹس میں یہ تبدیلی جبریل کی کوششوں سے ممکن ہوئی تھی۔ جس نے کئی دن حمین کے ساتھ سر کھپانے پر اسے اس بات پر تیار کر لیا تھا کہ وہ چنی کو ایڈاپٹ کر کے اپنی اولاد بنانے کی بجائے اسے اپنی بہن بنا سکتا تھا... "بے بی سسٹر"

اور اب حمین کی اس بے بی سسٹر کو کسی دارالامان چھوڑنا سالار کے لیے عجیب جان جوکھوں کا کھیل بن گیا تھا۔ سالار سکندر کوئی بہت زیادہ جذباتی انسان نہیں تھا مگر اس ڈیڑھ سال کی بچی نے اسے عجیب دوراہے پر لا کر کھڑا کر دیا تھا۔

وہ واپس جانے سے پہلے امامہ کے ساتھ بیٹھ کر چنی کے لیے ہر امکان کو زیر غور لاتا رہا تھا اور ہر امکان کو رد کرتا رہا یہاں تک کہ امامہ نے کہہ ہی دیا۔

"تم اسے ایڈاپٹ کرنا چاہتے ہو؟" ان سارے امکانات میں بس یہ ایک امکان تھا جس پر سالار بات نہیں کر سکا تھا اور اب اس امکان کے امامہ کی زبان پر آنے پر وہ خاموش نہیں رہ سکا۔

"ہاں... لیکن یہ کام تمہاری مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا... ایڈاپٹ جو بھی کرے... پالنا تو تمہیں ہے' تم پال سکتی ہو؟" سالار نے اس سے پوچھا۔

"پہلے کون پال رہا ہے؟" امامہ نے عجیب جواب دے کر جیسے سالار کو اس مشکل سے نکال لیا۔

"اگر اس کے نصیب میں زندگی تھی تو اس کی زندگی رہی... اس کے نصیب میں ہمارے گھر میں ہی پرورش پانا لکھا ہے تو ہم کیسے روک سکتے ہیں۔ شاید اس میں اس کی اور ہماری کوئی بہتری لکھی ہو گی۔"

امامہ نے سالار سے کہا تھا لیکن جو اس نے سالار سے نہیں کہا تھا' وہ یہ تھا کہ وہ سالار کے لاشعور میں موجود اس احساس جرم کو ختم کرنا چاہتی تھی جو چنی کی فیملی کے ساتھ ہونے والے حادثے سے پیدا ہوا تھا۔ اگر اس بچی کی اچھی تعلیم و تربیت کوئی کفارہ ہو سکتا تھا تو امامہ ہاشم اپنے شوہر کے لیے یہ کفارہ ادا کرنے کو تیار تھی۔

چنی کو ایڈاپٹ کرتے ہوئے سالار سکندر نے اس کو اپنی ولدیت بھی دی تھی... اس بچی کو ایڈاپٹ کرتے ہوئے سالار سکندر کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ بچی کفارہ نہیں تھی۔

رئیسہ سالار' اپنے نصیب میں اور اپنے سے منسلک ہر شخص کے نصیب میں خوش نصیبی کے علاوہ اور کچھ نہیں تھی... وہ ہما تھی۔ خوش نصیبی کا وہ پرندہ جو جس کے بھی سر پر بیٹھتا' اسے بادشاہ بنا دیتا اور اسے ایک بادشاہ ہی کی ملکہ بننا تھا۔

✲ ✲ ✲

کانگو کا آخری سال سالار سکندر کے لیے کئی حوالوں سے بے حد ہنگامہ خیز رہا تھا۔ وہ ورلڈ بینک کے ساتھ اپنے آخری سال میں اپنے سارے معاملات کو وائنڈ اپ کر رہا تھا اور اس کی زندگی کے آدھے دن' رات جہاز پر سفر کے دوران گزر رہے تھے اور ان ہی روز و شب میں اس کی ملازمت کا دورانیہ ختم ہونے سے چند ہفتے پہلے اسے واشنگٹن بلایا گیا تھا... اور امریکی حکومت نے اسے ورلڈ بینک کے صدر کے عہدے کی پیش کش کی تھی... وہ آفر جو پچھلے ایک ڈیڑھ سال سے اسے بلاواسطہ کی جاتی رہی تھی اور وہ اسے ایک سبز باغ سمجھ کر نظرانداز کرتا رہا تھا' وہ ایک ٹھوس حقیقت بن کر اس کے سامنے آگئی تھی... انکار اتنا آسان نہیں تھا جتنا سالار سمجھتا تھا۔ یہ بہت بڑی ترغیب تھی کہ اس آفر پر غور کرتا... وہ جس پروجیکٹ پر کام کر رہا تھا اسے اناونس کرنے میں کچھ وقت باقی تھا۔

ورلڈ بینک کا پہلا' کم عمر ترین مسلمان صدر... 42 سال کی عمر میں اس عہدے پر کام کرنے کے لیے کوئی بھی' کچھ بھی کرنے کو تیار ہو سکتا تھا... وہ تاریخ کا حصہ بن سکتا تھا... بے حد آسانی سے صرف ایک عہدے کو قبول کر لینے سے... سالار سکندر نے زندگی کے اس مرحلے پر ایک بار پھر یہ اعتراف کیا تھا کہ ترغیبات سے بچنا اتنا آسان کام نہیں تھا جتنا وہ اسے سمجھنے لگ گیا تھا۔

اس نے امریکہ میں ہونے والی میٹنگ اور اس آفر کے بارے میں سب سے پہلے کانگو واپس آنے پر امامہ کو بتایا تھا۔ اس کے لہجے میں ضرور کچھ ایسا تھا جس سے امامہ کھٹکی تھی۔

"تو؟" اس نے سالار سے پوچھا۔

"تو کیا؟" سالار نے اسی انداز میں کہا۔ ان دونوں نے ابھی کچھ دیر پہلے کھانا کھایا تھا اور وہ ڈنر ٹیبل پر ہی تھے... سالار رات گئے واپس پہنچا تھا اور ہمیشہ کی طرح نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

"تم نے کیا کہا؟" امامہ نے اس سے پوچھا۔

میں نے سوچنے کے لیے ٹائم لیا ہے۔" اس نے ڈیزرٹ کے پیالے سے ایک چمچ لیا۔ امامہ اس کے جواب سے جیسے بے حد ناخوش ہوئی۔

"سوچنے کے لیے ٹائم؟ تم انکار کر کے نہیں آئے؟" اس نے جیسے سالار کو یاد دلایا تھا۔

"انکار کیا تھا... قبول نہیں ہوا... مجھے سوچنے کے لیے کہا گیا ہے۔"

سالار نے سویٹ ڈش کا ایک اور چمچ لیا پھر پیالہ دور کھسکا دیا۔

"تم کیا سوچ رہے ہو سالار؟" امامہ نے میٹھا نہیں کھایا تھا' اس کا پیالہ ویسے ہی پڑا رہا تھا۔ سالار اسے دیکھنے لگا ... دونوں بے حد خاموشی سے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے رہے۔ پھر امامہ کی ناخوشی اور خفگی جیسے کچھ اور بڑھی تھی۔ اس نے سالار کے چہرے پر جیسے کچھ پڑھا تھا جو اسے پسند نہیں آیا تھا۔

"تم یہ آفر قبول کرنا چاہتے ہو؟" اس نے سالار سے ڈائریکٹ سوال کیا۔

"کرنی چاہیے کیا؟" سالار نے جواباً" پوچھا۔

"نہیں۔" اتنا حتمی اور دو ٹوک جواب آیا تھا کہ سالار بول ہی نہیں سکا۔ اسے شاید پھر ویسے ہی جواب اور رد عمل کی توقع تھی جو اس نے نائب صدارت آفر ہونے پر اس کے سوال پر دیا تھا۔

"تمہیں یاد نہیں ہم کس مقصد کے لیے کام کر رہے ہو اور کیا کرنا چاہتے ہو؟" امامہ نے جیسے اسے یاد دلایا۔

"بالکل یاد ہے۔"

"پھر الجھن کس بات کی ہے؟" امامہ نے پوچھا۔

الجھن نہیں ہے۔ صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ ابھی تھوڑا وقت چاہیے مجھے اپنے پروجیکٹ کو عملی شکل میں دنیا کے سامنے لانے کے لیے... ورلڈ بینک کے صدر کے طور پر کام کر لوں گا تو اس پروجیکٹ میں مجھے بہت مدد ملے گی ... میری اور اس پروجیکٹ کی repute بہت بڑھ جائے گی۔ ڈھیروں کمپنیز اور انویسٹرز ہماری طرف آئیں گے... بہت سی جگہوں پر مجھے تعارف کروانا ہی نہیں پڑے گا۔"

امامہ نے اسے ٹوکا "بس صرف یہ وجہ ہے؟" وہ اسے دیکھنے لگا۔ وہ پھر حتمی انداز میں اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ وہ دنیا میں ان چند انسانوں میں سے تھی جن کے سامنے وہ جھوٹ بول نہیں پاتا... کوشش کرنے کے باوجود... کیونکہ وہ اس کا جھوٹ پکڑ لیتی تھی... پتا نہیں یہ بیویوں کی خصوصیت تھی یا صرف امامہ ہاشم کی۔

"ورلڈ بینک کے صدر کے طور پر ایک مسلمان کی تعیناتی ایک اعزاز بھی تو ہے۔" سالار نے اس بار بے حد مدھم آواز میں وہ ترغیب بھی سامنے رکھی۔

"ورلڈ بینک کیا ہے سالار... جن ہے... ہوا ہے... کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ سود کا کام کرنے والی قوموں کا ایک اجتماع' اور کیا ہے۔ کیا اعزاز والی بات ہے اس میں کہ سود کا کام کرنے والی ان قوموں کی سربراہی ایک مسلمان کے پاس ہو... یہ اعزاز نہیں' شرم سے ڈوب مرنے والی بات ہے کسی مسلمان کے لیے۔"

امامہ نے جیسے اسے آئینہ نہیں' جوتا دکھا دیا تھا۔ وہ خفا تھی' ناخوش تھی اور بڑے آرام سے یہ دیکھ رہی تھی کہ یہ "ترغیب" تھی جو اس کے شوہر کے قدموں کی زنجیر بن رہی تھی۔

"جس پروجیکٹ پر تم کام کر رہے ہو اس میں کامیابی تمہیں اللہ تعالیٰ نے دینی ہے... تمہارے علم' تمہارے تجربے' تمہاری قابلیت اور ورلڈ بینک کے ساتھ منسلک رہنے والی شناخت نے نہیں... تم اب 40's میں آچکے ہو... بچے بڑے ہو رہے ہیں' وقت گزرتا جا رہا ہے... پانچ سال ورلڈ بینک کا صدر رہنے کے بعد تم 47 سال کے ہو چکے ہو گے... پھر اس کے بعد تم ایک اسلامی مالیاتی نظام پر کام کرنا شروع کرو گے؟ جب تم اپنی ساری جوانی ورلڈ بینک کو دے چکے ہو گے... تم یقیناً" مذاق کر رہے ہو پھر... اپنے ساتھ... اور ان لوگوں کے ساتھ جنہیں تم ایک

ممکنہ انقلاب کا حصہ بنائے بیٹھے ہو۔"

وہ کہتے ہوئے ٹیبل سے اٹھ گئی اور برتن سمیٹنے لگی۔

"تمہیں پتا ہے امامہ! میری زندگی کا سب سے بہترین asset (اثاثہ) کیا ہے؟" سالار سکندر نے یک دم اس سے کہا۔ امامہ اسی طرح اپنے کام میں مصروف رہی۔ اس نے سالار سکندر کے کسی ممکنہ انکشاف میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ وہ اس وقت اتنی ہی بد دل تھی۔

"تمہاری یہ ظالمانہ صاف گوئی... جو مجھے میری اوقات میں لے آتی ہے... تم مجھ سے امپریس کیوں نہیں ہو جاتیں۔"

سالار کے انداز میں اعترافی بے بسی... خراج تحسین' شرمندگی اور معصومیت بیک وقت تھا۔ امامہ اس بار رک کر اسے دیکھنے لگی۔

"میں الجھا تھا... tempt ہوا تھا۔ لیکن گمراہ نہیں... تم ٹھیک کہہ رہی ہو' وقت گزرتا جا رہا ہے... چیزیں سوچ سمجھ کر صبر سے کرنی چاہئیں لیکن تاخیر سے نہیں۔"

وہ اب اپنا اعترافی بیان دے رہا تھا۔ امامہ کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔

"مجھے تم سے متاثر ہونے' تمہارے گن گانے کے لیے بنایا ہی نہیں گیا سالار...! اس کے لیے دنیا ہے... مجھے تمہیں چیلنج کر کے تمہیں آگے بڑھانے کے لیے تمہارا ساتھی بنایا گیا ہے... یہ کام کوئی اور نہیں کر سکتا۔" وہ اب مسکراتے ہوئے اس سے کہہ رہی تھی۔

"مجھے پتا ہے اور میں اس کی قدر بھی کرتا ہوں۔" وہ پھر اعتراف کر رہا تھا۔ وہ فیصلہ جو اس کے لیے مشکل بن رہا تھا وہ اس کی بیوی نے بے حد آسان کر دیا تھا۔ وہ آسانی چاہتا تھا... وہ مشکل کی طلب گار تھی... کیونکہ ہر مشکل میں آسانی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ آفر میڈیا کے ذریعے سے منظر عام پر آ گئی تھی اور ورلڈ بینک کے اگلے ممکنہ صدر کے طور پر سالار سکندر کا نام بہت سی جگہوں پر اچھالا جانے لگا تھا۔ اس کے خاندان اور حلقہ احباب کے لیے یہ بے حد فخر کا باعث بننے والی خبر تھی اور سالار سکندر کے انکار کرنے کے باوجود کہ اس نے یہ عہدہ فی الحال قبول نہیں کیا' کوئی بھی یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ وہ اس آفر کو قبول کرنے سے انکار کر سکتا تھا یا اسے انکار کرنا چاہیے۔

سکندر عثمان خاص طور پر اس کے اس فیصلے سے بالکل بھی خوش نہیں ہوئے تھے کہ وہ اس آفر کو قبول کرنے کے بجائے کہ اپنے کیریئر کی اس اسٹیج پر ورلڈ بینک سے علیحدگی اختیار کر کے کچھ اور کرے گا... انہوں نے سالار سکندر سے "اور" کی تفصیلات جاننے میں بھی ذرہ برابر دلچسپی نہیں لی تھی۔ ان کا فوکس صرف اس بات پر تھا کہ وہ ورلڈ بینک کا صدر کیوں نہیں بننا چاہتا تھا۔ ایک عام باپ کی طرح وہ بھی اپنی اولاد کے لیے دنیاوی کامیابی چاہتے تھے۔ اور وہ دنیاوی کامیابی سامنے موجود تھی۔ بس ہاتھ بڑھا کر تھام لینے تک دور۔

"تم عقل سے پیدل ہو اور ہمیشہ پیدل ہی رہو گے..."

انہوں نے سالار کے ساتھ اپنی شدید خفگی کا اظہار میڈیا میں اس کے آفس کی طرف سے آنے والی اس خبر کے بعد کرتے ہوئے کہا تھا۔ جس میں اس کے آفس نے یہ بیان ریلیز کر دیا تھا کہ وہ ورلڈ بینک کی صدارت کا عہدہ سنبھالنے میں اپنی ذاتی وجوہات کی بنا پر انٹرسٹڈ نہیں اور صرف نائب صدر کے طور پر افریقہ میں اپنی ٹرم کو مکمل کرنا چاہتا ہے۔

سالار چند دن کے لیے پاکستان آیا ہوا تھا اور سکندر عثمان نے ضروری سمجھا تھا کہ وہ ایک بار اسے سمجھانے کی کوشش ضرور کرتے اور اس کوشش کے دوران سالار کی بتائی ہوئی وجہ پر وہ سیخ پا ہو گئے تھے۔ ان کی وہ اولاد ساری عمر عجیب و غریب باتیں اور کارنامے کرنے کے لیے ہی پیدا ہوئی تھی۔

"تم ورلڈ بینک کا صدر نہیں بننا چاہتے... وہ عہدہ جو پلیٹ میں رکھ کر تمہیں پیش کیا جا رہا ہے۔" وہ استہزائیہ انداز میں اس سے کہہ رہے تھے جوان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھا بے حد خاموشی سے باپ کی لعنت ملامت سن رہا تھا۔

"تم سود سے پاک ایک اسلامی مالیاتی نظام بنانے کا خیالی پلاؤ پکاتے اور کھاتے رہنا چاہتے ہو۔" وہ اتنا تلخ ہونا نہیں چاہ رہے تھے جتنا تلخ ہو گئے تھے۔ تمہاری طرح ڈھیروں لوگ یہ خیالی پلاؤ بنا رہے ہیں ساری دنیا میں اور بناتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ نہ پہلے کوئی کچھ کر سکا تھا... نہ ہی آئندہ کچھ ہونے والا ہے۔" وہ سالار سکندر کو جیسے آئینے میں وہ عکس دکھانے کی کوشش کر رہے تھے جوان کے خیال میں اسے کوئی دکھا نہیں پا رہا تھا۔

"اور مجھے یقین ہے کہ تمہارے اس ذہنی فتور کے پیچھے امامہ کا ہاتھ ہو گا... اس سے مشورہ تو کیا ہو گا نا تم نے۔"

وہ بیٹے کی رگ رگ کو جانتے تھے اور اس وقت انہیں سالار کے ساتھ ساتھ امامہ پر بھی غصہ آ رہا تھا۔

"ہر نسل اسے خیالی پلاؤ سمجھے گی تو پھر یہ صدیوں تک خیالی پلاؤ ہی رہے گا۔ کسی ایک نسل سے کسی ایک فرد کو اٹھ کر اس کے لیے کچھ کرنا ہو گا... صرف حرام حرام کہہ کر تو ہم اس سودی نظام کے اندر نہیں جی سکتے..." سالار سکندر کو اپنے باپ کی باتیں کڑوا چ لگی تھیں لیکن وہ انہیں نگلنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"تم جانتے ہو سالار! یہ جو موجودہ نظام ہے۔ اسے ہٹانا کیوں مشکل ہے؟" سکندر عثمان نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ "کیونکہ یہ افراد کا بنایا ہوا نظام نہیں ہے... ریاستوں کا بنایا ہوا نظام ہے... فلاحی ریاستوں کا... وہ بے شک اسلامی نہ ہوں لیکن وہ اپنے اندر اس نظام کو چلا کر کم از کم اپنے معاشرے میں لوگوں کو ایک فلاحی سسٹم دیے ہوئے ہیں... تم افراد کو چیلنج کر سکتے ہو' تم ریاستوں کو چیلنج نہیں کر سکتے۔ جب تک مسلم ممالک خود ایک مضبوط اقتصادی نظام بنانے کی کوشش نہیں کرتے' جب تک اسلامی فلاحی ریاستوں کی شکل میں سامنے نہیں آتے' کچھ نہیں بدلے گا... کہیں بھی... دنیا ایسی ہی رہے گی' جیسی ہے...

اقتصادی نظام کیا' ہر نظام صرف طاقت ور کا چلے گا... کمزور کی "عقل" میں کسی کو دلچسپی نہیں ہوتی... سکہ طاقتور کا چلتا ہے... یہ سود کی جنگ نہیں ہے۔ یہ قوموں کی جنگ ہے... ہم مسلمان ہیں۔ نکمے اور نااہل ہیں۔ قوم کے لیے نہیں اپنے لیے جیتے ہیں۔

اس وقت اس لیے مار کھا رہے ہیں اور کھاتے رہیں گے جب تک ایسے ہی رہیں گے... وہ یہود و نصاریٰ ہیں۔ یہ ان کے عروج کی صدی ہے' وہ باعلم اور باعمل ہیں۔ اپنی زندگیاں اپنی قوموں کے لیے قربان کرنے کا عزم اور حوصلہ رکھتے ہیں' اس لیے وہ راج کر رہے ہیں اور راج کرتے رہیں گے جب تک ان کے اندر یہ جذبہ موجود ہے... ہم بددعائیں دے دے کر کسی قوم کو زوال نہیں دلا سکتے... ہم دہشت گردی کر کے بھی کسی قوم کے کچھ لوگ مار سکتے ہیں' کچھ عمارتیں تباہ کر سکتے ہیں۔ خوف پھیلا سکتے ہیں... لیکن دنیا پر اپنی حاکمیت قائم کرنے کے لیے ہمیں مغربی اقوام سے بڑھ کر باعمل ہونا پڑے گا... اور یہ مقابلہ بہت مشکل ہے اور یہ مقابلہ افراد نہیں کرتے' اقوام کرتی ہیں' متحد ہو کر۔"

سکندر عثمان نے جو بھی کہا تھا ٹھیک کہا تھا۔ سالار سکندر بھی کچھ سال پہلے تک ایسے ہی سوچتا تھا اور اس کی سوچ آج بھی وہی ہوتی تو وہ باپ کی ہاں میں ہاں ملاتا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔۔۔ جب تک کسی قوم کے افراد صرف اپنے لیے جئیں اور مریں گے' تب تک کچھ نہیں بدلے گا۔۔۔ جب لوگ قوم کے لیے سوچنا شروع کردیں گے سب کچھ بدل جائے گا۔"

اس نے سکندر عثمان سے کہا۔

"جن معاشروں اور اقوام کی مثالیں آپ دے رہے ہیں ان کے ڈھیروں افراد نے اپنی زندگیاں لیبارٹریز' لائبریریز اور اپنے اسٹڈی ٹیبلز پر صرف اس خواب اور عزم کے ساتھ گزاری تھیں کہ جو کام وہ فرد کے طور پر کر رہے ہیں' وہ ان کی قوم کے لیے بہتر ثابت ہو۔ ان میں سے کوئی بھی پرسنل گلوری کے لیے زندگی قربان نہیں کر رہا تھا' نہ وہ بانی اور موجد کے طور پر کوئی پہچان بنا کر تاریخ کا حصہ بننا چاہتے تھے۔۔۔ وہ بس اسٹیٹس کو توڑنا چاہتے تھے۔۔۔ اپنی قوم کے "کل" کو اپنے آج سے بہتر چاہتے تھے۔۔۔ اور یہی خواہش میری بھی ہے۔۔۔ ایک کوشش اپنی قوم کے لیے مجھے بھی کر لینے دیں۔۔۔ مقالے اور کتابیں لکھ لکھ کر اپنا بڑھاپا میں نہیں گزارنا چاہتا پاپا۔"

سکندر عثمان بہت دیر تک بول ہی نہیں سکے تھے۔ اس نے ان ہی کی باتوں کا حوالہ دے کر ان سے بحث کی تھی اور ہمیشہ کی طرح وہ بحث جیت گیا تھا۔

"ورلڈ بینک کے کتنے صدر گزرے ہیں مجھ سے پہلے۔۔۔ کسی کو نام بھی یاد نہیں ہو گا۔۔۔ انہوں نے ورلڈ بینک کے طور پر کیا کارنامے کیے ہوں گے' یہ بھی کسی کو یاد نہیں۔۔۔ یاد اگر کسی کو ہے تو ورلڈ بینک کا نام یاد ہے۔۔۔ کسی ہرکارے اور پرزے کا نام کسی کو یاد نہیں رہے گا۔۔۔ میں ایسے کسی ہرکارے اور پرزے کے طور پر تاریخ کا قصہ بننا نہیں چاہتا۔۔۔ ایک کوشش کرنا چاہتا ہوں' شاید اس میں کامیاب ہو جاؤں اور ناکام بھی رہا تو بھی کوئی احساس جرم تو نہیں ہو گا۔۔۔ یہ احساس تو نہیں رہے گا کہ میں سود کھانے اور کھلانے والوں کے ساتھ زندگی گزار کر مرا۔"

سکندر عثمان سالار سکندر کی دلیلوں کا جواب کبھی بھی نہیں دے سکے تھے۔ تب بھی نہیں جب وہ ایک ٹین ایجر تھا۔۔۔ اور اب بھی نہیں۔ اب اس کے پاس جو دلیل تھی' وہ بے حد وزنی ہو گئی تھی۔

"ٹھیک ہے تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو کرو۔"

انہوں نے بے حد مایوسی سے کہا۔ "تم نے پہلے کبھی میری بات نہیں مانی تو اب کیسے مانو گے۔۔۔ مجھے بس افسوس یہ رہے گا کہ تم بہت زیادہ کامیاب ہو سکتے تھے' اس سے کئی گنا زیادہ ترقی حاصل کر سکتے تھے لیکن تمہارے ذہنی فتور نے ہمیشہ تمہاری ٹانگ کھینچی اور یہ صرف تمہارا مسئلہ نہیں' ضرورت سے زیادہ ذہین ہر مسلمان کا مسئلہ ہے۔۔۔ تم لوگ ہمیشہ دو انتہاؤں کے درمیان جھولتے رہتے ہو۔۔۔ نہ خود چین سے رہتے ہو نہ اپنے سے وابستہ لوگوں کو رہنے دیتے ہو۔"

وہ طنز کرنے کے بعد اب ایک روایتی باپ کی طرح اسے مطعون کر رہے تھے۔ سالار مسکرا دیا۔ وہ باپ کی مایوسی کو سمجھ سکتا تھا۔ وہ ان کا خواب توڑ رہا تھا۔

"مجھے یقین ہے پاپا! میں جو بھی کرنے جا رہا ہوں وہ صحیح ہو گا۔ اس لیے آپ پریشان نہ ہوں۔" اس نے سکندر کو تسلی دی۔

"اور یہ یقین تمہیں کیوں ہے؟" سکندر اس کی تسلی کے باوجود طنز کیے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔

"کیوں کہ آپ نے زندگی میں جب جب مجھے جس بھی فیصلے سے روکا ہے' وہ میرے لیے بہت اچھا ثابت ہوا ہے۔۔۔ آپ کی ممانعت گڈ لک چارم ہے میرے لیے۔"

سکندر عثمان ٹھیک کہتے تھے' وہ واقعی ڈھیٹ تھا مگر اس نے سینس آف ہیومر اپنے باپ سے ہی لیا تھا۔ جن کا پارہ لمحہ میں چڑھا اور اترا اور وہ ہنس پڑے۔

"کمینے!"

"شکریہ۔" سالار نے جوابی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

☆ ☆ ☆

"اور یہ فلو کب سے چل رہا ہے تمہارا؟" فرقان نے سالار سے پوچھا تھا۔ وہ تقریباً" آٹھ مہینے کے بعد مل رہے تھے اور سالار ڈاکٹر سبط علی سے ملاقات کے بعد فرقان کی طرف آیا تھا۔ دو دن بعد اس کی واپسی کی فلائٹ تھی اور فرقان نے بالکل ڈاکٹروں والے انداز میں اس کے فلو کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا تھا۔

"یہ تو اب ایک ڈیڑھ ماہ سے کچھ مستقل ہی ہو گیا ہے' آتا جاتا رہتا ہے۔ سر درد کے ساتھ' شاید کسی چیز سے الرجی ہے۔" سالار نے لاپروائی سے کہا۔

"تم کوئی میڈیسن لے رہے ہو؟" فرقان نے پوچھا۔

"ہاں وہی اینٹی بائیوٹک لیکن کبھی اثر ہو جاتا ہے۔ کبھی نہیں۔" سالار نے بتایا۔

"تو تم بلڈ ٹیسٹ وغیرہ کروالو' کہیں کوئی اور مسئلہ نہ ہو۔" فرقان اس وقت مر کے بھی یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ وہ مسئلہ اتنا بڑا ہو سکتا تھا۔ وہ کسی معمولی بیماری کو دریافت کرنا چاہتا تھا اور یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ اگلے دو دن لاہور میں اس کے کہنے پر سالار کے کروائے جانے والے ٹیسٹس نے فرقان کے پیروں کے نیچے سے زمین نکال دی تھی' اسے یہ یقین ہی نہیں آیا تھا کہ یہ رپورٹس سالار کی ہو سکتی ہیں۔

"کیوں مزید ٹیسٹس کیوں؟ کوئی ایسا سیریس مسئلہ تو نہیں ہے مجھے... فلو ہے' پہلے بھی ہوتا رہا ہے ٹھیک ہو جائے گا۔" دوسرے دن مزید ٹیسٹ کا کہنے پر سالار نے ایک بار پھر لاپروائی سے اس کی بات ہوا میں اڑانے کی کوشش کی تھی۔ اسے لاہور میں اس دن کاموں کا ایک ڈھیر نپٹانا تھا اور اس ڈھیر میں کسی ہاسپٹل میں جا کر کچھ مزید ٹیسٹ کروانا اس کے لیے بے حد مشکل کام تھا۔ فرقان خود میں اتنی ہمت پیدا نہیں کر سکا کہ وہ اسے بتا پاتا کہ اس کے ابتدائی ٹیسٹ کس چیز کی جانب اشارہ کر رہے تھے۔

"یہ ضروری ہے سالار! کام ہوتے رہیں گے' کام ہو جاتے ہیں لیکن صحت پر کمپرومائز نہیں کیا جا سکتا۔" فرقان نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

"صحت بالکل ٹھیک ہے یار! صحت کو کیا ہوا ہے... ایک معمولی فلو ہونے پر تم نے ڈاکٹروں کی طرح مجھے بھی ہاسپٹلز کے چکروں پر لگا دیا۔" سالار نے اسی انداز میں کہا تھا۔

"اور ویسے بھی اگلے مہینے مجھے امریکہ جانا ہے' وہاں میڈیکل چیک اپ کروانا ہے مجھے اپنا... تم فکر نہ کرو سب ٹھیک ہے..."

وہ اب اسے ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا اور فون پر اسے کہہ رہا تھا کہ اسے کسی سے ملنا تھا اگلے پندرہ منٹ تک۔

"سب ٹھیک نہیں ہے سالار!" فرقان کو بالآخر اسے ٹوکنا پڑا۔

"کیا مطلب؟" سالار اس کی بات پر ٹھٹکا۔

"میں تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں آدھے گھنٹے میں" فرقان نے فون پر مزید کچھ کہے بغیر فون رکھ دیا تھا۔

سالار اس کے انداز پر الجھا تھا لیکن اس نے اسے صرف ایک ڈاکٹر کا پروفیشنلزم سمجھا تھا جو اسے اپنی صحت کے حوالے سے فکر مند کر کے اپنی ذمہ داری کا ثبوت دے رہا تھا۔

"تم فوری طور پر کہیں نہیں جا رہے... مجھے اس ہفتے میں تمہارے تمام ٹیسٹس کروانے ہیں اور اس کے بعد ہی تم کہیں جا سکتے ہو۔"

فرقان واقعی نہ صرف آدھے گھنٹے میں اس کے پاس پہنچ گیا تھا بلکہ اس نے سالار کو اپنی سیٹ کینسل کروانے

کے لیے بھی کہہ دیا تھا۔

"کیا مسئلہ ہے فرقان! تم مجھے صاف صاف کیوں نہیں بتا دیتے... ؟ کیا چھپا رہے ہو تم؟ کیوں ضرورت ہے مجھے اتنے لمبے چوڑے ٹیسٹس کی؟"

سالار اب پہلی بار واقعی کھٹکا تھا فرقان کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ اسے کچھ بتائے بغیر ٹیسٹ پر آمادہ نہیں کر سکتا تھا۔

"میں صرف یہ کنفرم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کوئی ٹیومر نہیں ہے۔"

وہ دنیا کا مشکل ترین جملہ تھا جسے ادا کرنے کے لیے فرقان نے وہ سارے لفظ اکٹھے کیے تھے 'یوں جیسے سالار سے زیادہ وہ اپنے آپ کو یہ تسلی دینا چاہتا تھا کہ جو وہ رپورٹس اور اس کا طبی علم اسے بتا رہا تھا وہ غلط ثابت ہو جائے۔ وہ ہر قیمت پر غلط ثابت ہو جائے۔

"ٹیومر؟" سالار نے بے یقینی سے کہا۔

"برین ٹیومر۔" فرقان نے اگلے دو لفظ جس دقت سے کہے... سالار اس وقت سے بھی انہیں بول نہیں سکا' اس کے کان جیسے سائیں سائیں کرنے لگے تھے' حواس اور دماغ ایک ساتھ ماؤف ہوئے تھے' کئی لمحے وہ بے یقینی سے فرقان کو دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔

"یہ ٹیسٹس جو تم نے کروائے ہیں یہ انڈی کیٹ کر رہے ہیں کہ...."

وہ خود بھی وہ جملہ پورا نہیں کر پایا... زندگی کا خوفناک ترین لمحہ تھا وہ... اور خوفناک ہی لگ رہا تھا سالار کو... وہ پاکستان کے بہترین اونکالوجسٹ میں سے ایک کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور فرقان کو اگر ایسی کچھ علامات نظر آئی تھیں تو وہ اندازے کی غلطی نہیں ہو سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اوہ مائی گاڈ..." حمین نے امامہ کے ساتھ اسکول کوریڈور میں چلتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں قلقاری مارتے ہوئے اپنی خوشی کا اظہار کیا "Mummy! I have made you soo famous)

(ممی میری وجہ سے آپ بہت مشہور ہو گئی ہیں۔)

امامہ پیرنٹ ٹیچر میٹنگ اٹینڈ کرنے اسکول آئی تھی اور حمین کو پڑھانے والا ہر ٹیچر حمین کی ممی سے ملنے کا خواہش مند تھا... اور وہاں اسکول میں جس سے بھی امامہ کی ملاقات ہوئی تھی اس نے امامہ کو حمین کی ممی کے طور پر ہی شناخت کیا تھا' حالانکہ اسی اسکول میں جبریل بھی قرآن پاک حفظ کرنا شروع کرنے تک پڑھتا رہا تھا... عنایہ بھی پڑھ رہی تھی اور رئیسہ نے بھی اسکول کی نرسری میں کچھ عرصے پہلے جانا شروع کیا تھا لیکن ایسی شہرت امامہ اور سالار کو ان کے بڑے دونوں بچوں نے نہیں دلائی تھی' جیسی حمین نے دنوں اور ہفتوں میں دلوا دی تھی۔

وہ ڈھائی سال کی عمر سے اس امریکن اسکول میں جانا شروع ہوا تھا اور اسکول میں اس نے عالمگیر شہرت حاصل کر لی تھی' کیونکہ اس اسکول میں ہر نیشنلٹی کا بچہ آ رہا تھا اور ان میں سے اسی فی صد فارن ڈپلومیٹس اور ملٹی نیشنل کمپنیز میں کام کرنے والے لوگوں کے بچے تھے اور دو سالوں میں اس اسکول میں محمد حمین سکندر کو ہر ایک جانتا اور پہچانتا تھا' جو اس شرف سے محروم تھا اس نے کم از کم حمین کے بارے میں سن ضرور رکھا تھا۔

اور اسکول میں ہونے والی وہ پیرنٹ ٹیچرز میٹنگز جو کبھی سالار اور امامہ کے لیے جبریل اور عنایہ کی وجہ سے فخر کا باعث ہوتی تھیں اب ایک کڑوی گولی تھی یا پھر تلوار کی دھار جس پر چلنے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا اور آج بھی ایسا ہی ہوا تھا' ہر ٹیچر کے پاس حمین کا ایک اعمال نامہ تھا جو وہ امامہ کو دکھانا چاہتا تھا۔

"I am so disappointed" (میں بہت مایوس ہوئی ہوں)

امامہ نے اپنے ساتھ چلتی ہوئی رئیسہ کو اپنے دائیں طرف سے بائیں طرف کرتے ہوئے حمین کو سرزنش کی' جو اس بات پر بے حد فخر محسوس کر رہا تھا کہ اس کی وجہ سے اس کی ممی ہر جگہ جاتی جارہی تھی۔

"I am also disappointed. It's time you change my school

That's so right Mummy!"

"بالکل ٹھیک ممی! میں بھی بہت مایوس ہوا ہوں اور یہی وقت ہے میرا اسکول تبدیل کر دیا جائے۔" اس نے بڑے اطمینان سے قلابازی کھائی تھی اور پھر سنجیدگی کا چولا اوڑھتے ہوئے ماں کے سامنے ایک ممکنہ حل پیش کیا وہ اس کی شکل دیکھ کر رہ گئی۔

"دیکھو رئیسہ کی کسی نے شکایت نہیں کی۔ I am so proud of her (مجھے اس پر فخر ہے") امامہ نے اسے رئیسہ کی مثال دینی شروع کی۔

"I don't think so."

حمین نے ماں کی بات سے متاثر ہوئے بغیر کہنا شروع کیا۔ "Every teacher said that she can't speak well."

(ہر ٹیچر کا کہنا ہے کہ وہ صحیح سے بول نہیں سکتی) اس سے پہلے کہ وہ پھر شروع ہو جاتا۔ امامہ نے اسے روکنا ضروری سمجھا۔

"وہ سیکھ لے گی' ابھی بہت چھوٹی ہے۔"

امامہ نے رئیسہ کا دفاع کرنا ضروری سمجھا لیکن جو حمین کہہ رہا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ رئیسہ کو بولنے میں پرابلم تھی۔ وہ امامہ کے بچوں کی طرح جلد سیکھنے والی نہیں تھی۔ اسے کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا اور بہت سارے چھوٹی چھوٹی کمیاں تھیں اور اسے ایڈاپٹ کرنے کے کچھ عرصے کے بعد ہی وہ ساری چیزیں پتا چلنا شروع ہو گئی تھیں۔ رئیسہ کو ایڈاپٹ کرتے ہوئے امامہ نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس بچی کی پرورش سے بڑا چیلنج اسے لکھنا پڑھنا سکھانا تھا۔ اسے یہ مسئلہ اپنے بچوں کے ساتھ نہیں ہوا تھا' وہ پیدائشی ذہین تھے۔ ماں باپ دونوں طرف سے اور ان کے لیے کوئی بھی چیز سیکھنا کیک واک تھی۔ رئیسہ کے ساتھ معاملہ مختلف تھا۔ وہ چیزوں کو مشکل سے پہچان پاتی اور انہیں یاد رکھنے کی دقت کا شکار رہتی۔ یہ اللہ کا شکر تھا کہ وہ autistir نہیں تھی نہ ہی اسے کوئی اور mental disability (ذہنی پسماندگی) تھی۔ مگر وہ امامہ کے لیے ایک صبر آزما کام ضرور تھی اور رئیسہ کا کم ذہین ہونا اس کے بچوں سے بھی چھپا ہوا نہیں تھا۔ وہ آہستہ آہستہ رئیسہ سے بے حد مانوس ہونے کے باوجود یہ سمجھنے لگے تھے کہ وہ ان تینوں سے different (مختلف) تھی۔ وہ ان کی رفتار اور accuracy (درستی) کے ساتھ انگلش تو کیا اردو پنجابی' کوئی بھی زبان نہیں بول پاتی تھی۔ اسے سوچنا پڑتا تھا۔ ہر اگلا لفظ زبان سے ادا کرنے کے لیے۔ وہ ان کے ساتھ ایک سال گزار لینے کے باوجود کچھ بھی سیکھنے کے لیے بہت وقت لیتی تھی۔ اس کو سب کچھ بار بار لکھوانا پڑتا تھا۔ بار بار سنوانا پڑتا تھا۔ بار بار بولنا پڑتا تھا۔ اور یہ بے حد صبر آزما کام تھا۔ کئی بار اسے پڑھانے یا کچھ یاد کروانے کی کوشش کرتے ہوئے امامہ کو خیال آتا کہ اس کی ایڈاپشن کا فیصلہ ایک غلط اور جذباتی فیصلہ تھا۔ لیکن وہ چاہتے تو اب بھی اس فیصلے سے ہٹ سکتے تھے اور پھر اسے اپنی سوچ پر شرمندگی ہوتی کہ وہ بے حد خود غرض بن کر سوچنے لگی تھی' اگر وہ بچی واقعی اس کی اپنی اولاد ہوتی تو کیا وہ اس کے بارے میں اس طرح سوچتی۔ وہ احساس ندامت رئیسہ کی طرف اس کی توجہ میں کچھ اور اضافہ کر دیتی اور رئیسہ کا Slow learner (کند ذہن) ہونا سالار سے بھی چھپا ہوا نہیں تھا اسے اس مشقت کا بھی اندازہ تھا جو امامہ کو رئیسہ کو پڑھانے میں پیش

آنے والی تھیں۔ مگر وہ عملی طور پر کچھ کر نہیں سکتا تھا چاہتے ہوئے بھی۔

اس کی اپنی پروفیشنل مصروفیات میں سے اگر وہ کسی ایک چیز کے لیے ہر صورت وقت نکالتا تھا تو وہ جبریل کو قرآن پاک حفظ کروانا تھا جو وہ خود کروا رہا تھا' یہ جیسے قرآن کے ساتھ جڑے رہنے کی اس کی لاشعوری کوشش بھی تھی۔ رئیسہ کے لیے الگ سے وقت نکال کر کچھ کرپانا سالار کے لیے ممکن نہیں تھا اور نہ ہی امامہ نے اسے کبھی یہ جتایا تھا وہ ذمہ داری جو اس کے شوہر نے لی تھی' وہ نبھا رہی تھی اور بڑی تن دہی سے نبھا رہی تھی اور اگر کوئی اس کے اس کام میں اس کے ساتھ بھرپور مدد کر رہے تھے تو وہ اس کے بچے تھے خاص طور پر حمین۔۔۔

وہ رئیسہ کو کچھ سکھانے کے لیے ماں جیسی ہی برداشت اور تحمل کا مظاہرہ کرتے تھے' صرف حمین تھا جو جبریل اور عنایہ کے برعکس رئیسہ کو کچھ سکھاتے ہوئے اس کی کند ذہنی کو محسوس کرتا تھا اور جھنجلا کر یہ بات جتانے سے بھی نہیں چوکتا تھا اور جواباً "جبریل یا امامہ ہمیشہ اسے ایک نصیحت آموز لیکچر دیتے تھے' جس کا لب لباب یہ ہوتا تھا کہ رئیسہ کی جگہ وہ بھی ہو سکتا تھا تو پھر اسے کیسا لگتا۔۔۔

حمین کا ضمیر جیسے ایک بار پھر جاگ جاتا۔

"Ok ! one more try

(ٹھیک ہے! ایک اور کوشش)

وہ دوبارہ رئیسہ کو سکھانے بیٹھتا۔۔۔ اور رئیسہ کے ساتھ سب سے زیادہ وقت گزارنے کی یہ ایک وجہ بھی بن گیا تھا اور اب ماں کے اس روٹین کے موازنے کو وہ کسی خاطر میں ہی نہیں لا رہا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا وہ موازنہ سرے سے غلط تھا۔

"اس بار تمہارے بابا آئیں گے تو میں انہیں وہ ساری باتیں بتا دوں گی جو تمہاری ٹیچرز نے تمہارے بارے میں کی ہیں۔" امامہ نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے اسے دھمکایا تھا۔

My teachers back bite why do you want to pick a bad habit

(میری ٹیچرز نے چغل خوری کی ہے' آپ ان سے یہ گندی عادت کیوں لینا چاہتی ہیں۔)

اس نے جیسے ماں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"اوکے' دیکھو پھر۔" امامہ نے اسے دھمکایا اور فون پر سالار کو کال ملائی۔ چند مرتبہ بیل جانے کے بعد فون اٹھالیا گیا' لیکن اٹھانے والا فرقان تھا' امامہ حیران ہو گئی۔ سالار لاہور میں تھا اور اس نے کچھ مصروفیات کی وجہ سے اپنی سیٹ آگے کروالی تھی۔ فرقان سے وہ جس دن پہلی بار لاہور آکر ملا تھا۔ اس نے امامہ کو بتایا تھا۔ اس نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ فرقان اس کے بار بار ہونے والے فلو کی وجہ سے اسے بلڈ ٹیسٹ کروانے کا کہہ رہا تھا اور امامہ نے اس سے کہا تھا کہ اسے فرقان کی بات مان لینی چاہیے۔

"پتا نہیں مجھ سے کہہ رہا تھا میرے چہرے کے ایک حصے پر سوجن نظر آرہی ہے۔ میں نے کہا فلو ہمیشہ ناک کے اسی حصے سے ہوتا رہتا ہے اب بھی ہے شاید اس وجہ سے' لیکن ساتھ سی ٹی اسکین کا بھی کہہ رہا ہے۔ کروالوں گا تاکہ اسے تسلی ہو جائے۔ ڈاکٹرز آدھے پاگل ہوتے ہیں۔"

اس نے تب امامہ سے کہا تھا' لیکن سالار نے اسے اگلے دن یہ بھی بتادیا تھا کہ وہ ٹیسٹ کروا آیا تھا' لیکن اس کے بعد امامہ اور سالار کی ان ٹیسٹ کی رپورٹس کے حوالے سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس نے خود ہی یہ سمجھ لیا تھا کہ چونکہ سالار نے ٹیسٹ کے حوالے سے اسے کچھ بتایا نہیں تو اس کا مطلب یہی تھا کہ ٹیسٹ ٹھیک ہی رہے ہوں گے۔

اور اب فرقان ایک بار پھر سالار کے فون پر تھا تو یہ لاہور میں اس کی سالار سے تیسری ملاقات تھی ان چند دنوں میں... وہ سوچے بغیر نہیں رہ سکی' وہ اب اس سے اس کا اور بچوں کا حال پوچھ رہا تھا' لیکن اس کا انداز بے حد عجیب تھا' وہ خوش مزاجی جو اس کے طرز تخاطب کا حصہ ہوتی تھی' وہ آج امامہ کو مکمل طور پر غائب محسوس ہوئی۔

"سالار ابھی تھوڑی دیر میں فون کرتا ہے تمہیں۔" اس نے ابتدائی علیک سلیک کے بعد اس سے کہا۔

"فون آپ کو کیسے دے دیا اس نے؟" یہ بات امامہ کو بے حد حیران کن لگی تھی۔

"ہاں وہ اسپتال میں آئے ہوئے تھے اور سالار کو مجھ سے کچھ کام تھا اسی لیے وہ یہاں ملنے آیا مجھے... ذرا واش روم تک گیا ہے تو فون یہیں چھوڑ گیا۔"

فرقان نے روانی میں وہ جگہ بتائی جہاں وہ تھے پھر اسی روانی میں امامہ سے اس جگہ ہونے کا جواز دیا پھر فون اپنے پاس ہونے کی توجیہہ دی اور امامہ کے لیے اپنے بیان کو ناقابل یقین کردیا۔ وہ واش روم جاتے ہوئے اپنا فون کہیں چھوڑ کر جانے والوں میں سے نہیں تھا۔ وہ بھی ایک پبلک پیلس پر... بے شک وہ فرقان کا اسپتال ہی کیوں نہ ہوتا' وہ کھٹک گئی تھی' لیکن اس نے مزید سوال جواب کے بجائے فون بند کرکے سالار کی کال کا انتظار کرنا بہتر سمجھا۔

سالار ایم آر آئی کروا رہا تھا۔ اور پچھلے چند دنوں میں اوپر تلے ہونے والے ٹیسٹ ان سارے خدشات کی تصدیق کررہے تھے جو فرقان کو ہوئے تھے۔ اسے برین ٹیومر تھا' لیکن اس کی نوعیت کیا تھی یہ کس اسٹیج پر تھا۔ اس کی ہولناکی کیا تھی' یہ جاننے کے لیے ابھی مزید بہت سے ٹیسٹ اور ڈاکٹرز کی رائے ضروری تھی۔ سالار ابتدائی شاک کی کیفیت سے نکل چکا تھا' مگر اس کی زندگی یک دم جمود کا شکار ہو گئی تھی۔ وہ بھاگ دوڑ جو وہ پچھلے کئی سالوں سے کرتا آرہا تھا اور جس میں اس کی زندگی کے روز و شب گزر رہے تھے وہ عجیب انداز میں رک گئی تھی۔

برین ٹیومر مہلک تھا اس کی تصدیق ہو چکی تھی' لیکن وہ کتنا جان لیوا تھا اور صحت یابی کے چانسز کیا تھے... علاج کیا تھا... کہاں سے ہو سکتا تھا... کتنی مدت اس کے لیے درکار تھی... اس کی صحت پر اس کے کیا اثرات

ہونے والے تھے۔۔۔ اور ان سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ اس کی فیملی پر اس کی اس بیماری کے انکشاف کا کیا اثر ہونے والا تھا۔۔۔ وہ بتائے یا نہ بتائے۔۔۔ وہ چھپائے تو کس طرح۔۔۔؟

اور وہ پہلا موقع تھا جب سالار سکندر نے پہلی بار بیٹھ کر اپنی زندگی کے بیالیس سالوں کے بارے میں سوچا تھا۔ گزر جانے والے بیالیس سالوں کے بارے میں اور باقی کی رہ جانے والی مدت کے بارے میں جو یک دم ہی دہائیوں سے سمٹ کر سالوں، مہینوں، ہفتوں یا دنوں میں سے کسی کا روپ دھارنے والی تھی۔

مہلت کا وہ اصول جو قرآن پاک کی بنیاد تھا۔ وہ سالار سکندر کی سمجھ میں آیا تھا، لیکن یہ یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ وہ قانون اب اس کی اپنی زندگی پر لاگو ہونے جا رہا تھا۔ اپنی زندگی کے خاتمے کا سوچنا، روز قیامت پر یقین رکھنے کے باوجود اس کے رونگٹے کھڑے کر رہا تھا۔

"میڈیکل سائنس بہت ترقی کر گئی ہے۔ ہر چیز کا علاج ممکن ہو چکا ہے۔ ٹیسٹ میڈیسنز آ رہی ہیں۔ کوئی بھی بیماری اب نا قابل علاج تو رہی ہی نہیں۔"

اس کے ٹیومر کے moligmant (مہلک) ہونے کی تصدیق اسی دن ہوئی تھی اور اس کی تصدیق ہو جانے پر فرقان اس سے کم اپ سیٹ نہیں ہوا تھا، لیکن اس کے باوجود اس نے گم صم بیٹھے سالار کو تسلی دینا شروع کی تھی۔ اپنے جملوں کی بے ربطی کے باوجود۔۔۔

"تم ابھی صرف یہ سوچو کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" سالار نے سر اٹھا کر پہلی بار اسے دیکھا اور پھر کہا۔

"تم ڈاکٹر ہو کر مجھ سے یہ بات کہہ رہے ہو۔" فرقان بول نہیں پایا۔ وہ دونوں بہت دیر تک وہاں چپ بیٹھے رہے تھے۔

"تم فوری طور پر امریکا چلے جاؤ بلکہ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ وہاں بہترین ڈاکٹرز اور اسپتال ہیں۔ ہو سکتا ہے وہاں اس کا علاج ہو جائے یا ہو سکتا ہے کوئی اور حل ہو۔" وہ اب ڈاکٹر بن کر نہیں اس کا ایک عزیز دوست بن کر بات کر رہا تھا۔

"امامہ سے کیا کہوں؟" اس نے فرقان سے عجیب سوال کیا۔

"ابھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ ایک بار امریکا سے ٹیسٹ ہونے دو۔۔۔ دیکھو وہاں کے ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟" فرقان نے اس سے کہا تھا۔

"یہاں کے ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں؟" فرقان اس کے اس سوال کو نظر انداز کر گیا تھا۔ وہ اسے وہ سب بتانے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا جو وہ اپنے چند ساتھی ڈاکٹرز سے سالار کی رپورٹ پر مشاورت کے بعد سن چکا تھا۔

"پاکستان میں برین ٹیومرز کا علاج اور نیورو سرجری اتنی ایڈوانسڈ نہیں ہے جتنا امریکا میں۔۔۔ اس لیے یہاں کے ڈاکٹرز کی رائے میرے نزدیک زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔"

وہ نظریں چرائے کہتا گیا تھا، سالار صرف اس کا چہرہ دیکھتا رہ گیا۔ اسے فرقان کی بے بسی پر اپنے سے زیادہ ترس آیا، وہ اس سے کچھ چھپانا بھی نہیں چاہتا تھا اور کچھ بتانا بھی نہیں۔

☼ ☼ ☼

"نہیں کوئی ایسی بات نہیں ہے۔۔۔ فلو کی وجہ سے ہی گیا تھا دوبارہ۔۔۔ بس گپ شپ کرتے ہوئے فون ٹیبل پر رکھا اور پھر اٹھانا یاد ہی نہیں رہا۔"

سالار نے اس رات فون پر امامہ سے بات کرتے ہوئے کہا۔ وہ مطمئن ہو گئی۔

"اور فلو۔۔۔؟ اس کا کیا ہوا؟"

"بس چل رہا ہے۔"
"نیسٹوں کی رپورٹس آگئیں؟"
"ہاں سب ٹھیک ہے۔ بس وائرل انفیکشن ہے' اس نے کچھ میڈیسنز دی ہیں' ٹھیک ہو جائے گا۔"
"میں تو پریشان ہی ہو گئی تھی.... میں نے سوچا پتا نہیں کیا مسئلہ ہے۔ کیوں دوبارہ اسپتال میں فرقان کے ساتھ بیٹھے ہو۔"

وہ خاموشی سے اس کی گفتگو سنتا رہا۔ فرقان نے ٹھیک مشورہ دیا تھا۔ اسے ابھی امامہ کو کچھ بھی نہیں بتانا چاہیے تھا' لیکن اس کے لہجے میں جھلکنے والے اطمینان نے اسے عجیب طریقے سے گھائل کیا تھا۔ وہ اسے دھوکا دے رہا تھا۔

وہ اب اسے بچوں کے بارے میں بتا رہی تھی۔ بچوں سے باری باری بات کروا رہی تھی۔ وہ پچھلے تین دن سے جبریل کو قرآن پاک نہیں پڑھا پایا تھا۔ امامہ نے اسے یاد دلایا۔

"تم پڑھا دو۔" سالار نے جواباً" کہا۔

"میں تو پچھلے تین دن سے پڑھا ہی رہی ہوں۔ revision (دہرائی) کروا رہی ہوں۔ نیا سبق تو تم ہی دو گے۔" وہ اس سے کہہ رہی تھی۔

"کتنے پارے رہ گئے؟" سالار نے اس کی بات پر عجیب غائب دماغی سے پوچھا۔

امامہ نے نوٹس کیا۔ "آخری دس۔"

"جلدی ہو جائیں گے۔" وہ بڑبڑایا۔

"ہاں ان شاء اللہ.... وہ ماشاء اللہ ذہین بھی تو بہت ہے۔ دس سال کا ہونے سے پہلے ہی قرآن پاک مکمل ہو جائے گا اس کا۔"

وہ اس بار سالار کے لہجے پر غور کیے بغیر کہتی گئی۔ وہ چاہتے تھے جبریل اس سے بھی کم عمری میں قرآن پاک حفظ کرلیتا کیونکہ وہ بلا کا ذہین تھا اور اس کی زبان بے حد صاف تھی' لیکن سالار نے اسے اس عمر میں قرآن پاک حفظ کرنے پر لگایا تھا جب وہ کچھ باشعور ہو کر اس کے معنی و مفہوم کے ساتھ ساتھ اس فریضے کی اہمیت سے بھی واقف ہو گیا تھا۔

اسکائپ کی اسکرین پر اب باری باری اس کے بچے دکھنے لگے تھے.... وہ اب لیپ ٹاپ آن کیے ہوئے بیٹھا ان کی شرارتوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک بھیانک حقیقت کے اندر بیٹھا ایک خوب صورت خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ باری باری اپنی طرف کے کمپیوٹر کے کیمرے کے سامنے منہ کر کر کے باپ کو ہیلو کہہ رہے تھے۔

"بابا! آج میں نے ککی بنائی ہے۔" عنایہ اسے اسکرین پر ایک بڑے سائز کا بسکٹ دکھا رہی تھی۔

"واہ یہ تو بہت پی دکھتی ہیں۔" سالار نے اپنے اندر کے فشار کو چھپاتے ہوئے بیٹی کو داد دی۔ وہ سب کچھ وہ اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ وہ سب کچھ ختم ہو جانے والا تھا۔

امامہ ان سب کو وہاں سے ہٹا کر لے گئی تھی کیونکہ اب جبریل کو نیا سبق پڑھنا تھا۔ وہ اور اس کا نو سالہ بیٹا آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سالار سے اگلا سبق پوچھ رہا تھا۔ سالار نے اسے پچھلا سبق سنانے کے لیے کہا تھا۔ جبریل نے پڑھنا شروع کیا تھا۔ سینے پر ہاتھ باندھے آنکھیں بند کیے خوش الحان آواز میں.... اس نے باپ سے صرف ذہانت ورثے میں نہیں پائی تھی۔ خوش الحانی بھی پائی تھی۔

نو سال کی عمر میں بھی اس کی قرأت دلوں کو چھو لینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ کسی بھی سننے والے کی آنکھوں کو نم کر سکتی تھی۔ جبریل نے کب اپنا پہلا سبق ختم کیا تھا' سالار کو اندازہ ہی نہیں ہوا وہ کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔ جبریل نے

آنکھیں کھول کر اپنے ہاتھ سینے سے ہٹا کر سامنے رکھے قرآن پاک کو دیکھا پھر اسکرین پر باپ کے نظر آنے والے چہرے کو جو کسی بت کی طرح بے حس حرکت تھا۔

"بابا!" جبریل کو ایک لمحہ کے لیے لگا شاید نیٹ کا کنکشن ختم ہو گیا تھا یا سگنلز کی وجہ سے streaming نہیں ہو پائی تھی۔

سالار چونکا اور اپنا گلا صاف کرتے ہوئے اس نے جبریل کو ایک بار پھر پچھلا سبق سنانے کو کہا۔ وہ حیران ہوا تھا۔

"وہ تو میں نے سنا دیا۔"

"میں نہیں سن سکا ایک بار پھر سناؤ۔"

وہ پہلا موقع تھا جب جبریل نے باپ کے چہرے کو بے حد غور سے دیکھا تھا کچھ مسئلہ تھا اس دن باپ کو۔ اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا' لیکن کوئی سوال کیے بغیر اس نے ایک بار پھر پچھلا سبق سنانا شروع کر دیا۔ اس بار سالار پہلے کی طرح نہیں اور محو نہیں ہوا تھا۔ اس نے بیٹے کو نیا سبق پڑھا کر اور چند بار دہرانے کے بعد اسکائپ بند کر دیا تھا۔

"Is baba ok" (کیا بابا ٹھیک ہیں؟) جبریل نے اسکائپ پر سالار سے بات کرنے کے بعد ماں سے پوچھا۔

"ہاں وہ ٹھیک ہیں' بس فلو ہے' اس لیے کچھ طبیعت خراب ہے ان کی۔" امامہ نے اس کے سوال پر زیادہ غور کیے بغیر کہا۔

"When is he returning" (وہ واپس کب لوٹ رہے ہیں؟)

جبریل نے اگلا سوال کیا۔

"ابھی تو امریکا جا رہے ہیں دو ہفتے کے لیے پاکستان سے۔ کہہ رہے تھے کچھ میٹنگز ہیں' پھر امریکا سے آئیں گے۔"

امامہ نے سالار سے فون پر ہونے والی گفتگو اسے بتائی۔

☼ ☼ ☼

وہ دو ہفتے بعد امریکا سے کنشاسا آ گیا تھا۔ اور وہ کچھ بدلا ہوا تھا' یہ صرف امامہ نے ہی نہیں بچوں نے بھی محسوس کیا تھا' لیکن ان میں سے کسی کے استفسار پر بھی سالار نے ایسا کوئی جواب نہیں دیا تھا جس پر ان کو تشویش ہوتی۔ امامہ کا خیال تھا اس کا ورلڈ بینک کے ساتھ کام کا دورانیہ پورا ہو رہا تھا۔ یہ اداسی اس کا باعث تھی' لیکن وہ اور بچے خود بے حد خوش تھے کیونکہ ان کی پاکستان واپسی میں چند ہفتے رہ گئے تھے اور جب تک ان کی اگلی منزل متعین نہ ہو جاتی انہیں پاکستان ہی میں رہنا تھا' لیکن اس سے پہلے ہی ان کی زندگی میں وہ طوفان آ گیا تھا جس نے امامہ سمیت ان سب کی زندگیوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ورلڈ بینک کی نائب صدارت چھوڑنے سے صرف دو ہفتے پہلے جب سالار کانگو میں الوداعی ملاقاتیں اور فیئرویل ڈنرز لینے میں مصروف تھا۔ وال اسٹریٹ جرنل نے ورلڈ بینک کی صدارت سے انکار کی وجہ ڈھونڈ نکالتے ہوئے سالار سکندر کو ہونے والے برین ٹیومر کی نیوز بریک کی تھی اور پھر یہ خبر صرف اس اخبار ہی نے نہیں' ڈھیروں دوسرے اخبارات نے بھی لگائی تھی۔ سالار سکندر کے برین ٹیومر کی بریکنگ نیوز میں مغرب کو دلچسپی نہیں تھی نہ ہی میڈیا کو۔ دلچسپی اگر تھی تو سی آئی اے کو۔ اس اسٹیج پر سالار کی مہلک بیماری کی خبر بریک کرنے کا مطلب اس پروجیکٹ کے شروع ہونے سے پہلے ہی اس کی کمر توڑنے کے مترادف تھا جس پر سالار کام کر رہا تھا۔ "وہ

جانتے تھے سالار ورلڈ بینک سے الگ ہونے کے بعد کیا کرنے جارہا تھا اور انہیں یقین تھا' جو وہ کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا' وہ ناممکنات میں سے تھا۔ اس کے باوجود حفاظتی اقدامات ضروری تھے اور سب سے بہترین دفاعی حکمت عملی وہی تھی جو انہوں نے اختیار کی تھی۔ وہ سالار سکندر کی بیماری کو مشتہر کرنے کے بعد اب اس پروجیکٹ کے ممکنہ سرمایہ کاروں کے پیچھے ہٹ جانے کا انتظار کررہے تھے۔ وہ شطرنج تھی۔ سالار اپنے مہرے سجا کر پہلی چال چلنے کی تیاری کررہا تھا۔ "وہ" پہلے سے تیار بیٹھے تھے۔ "انہوں" نے پہلی چال چل دی تھی اور پہلی چال میں ہی بادشاہ کو شہہ مات ہونے والی تھی۔۔۔ یہ کم از کم "ان" کو یقین تھا۔

✲ ✲ ✲

اس نے انٹرنیٹ پر glioma کا لفظ گوگل پر سرچ کیا۔۔۔ پھر oligodendroglial کو۔ ساڑھے نو سال کی عمر میں محمد جبریل سکندر نے ان دو لفظوں کو Spelling Bee کے مقابلے میں حصہ لینے کے لیے ان الفاظ کی فہرست میں شامل کیا تھا جس کی اسپیلنگ اسے یاد کرنا تھی۔ اسے ان دو الفاظ کی اسپیلنگ یاد کرتے ہوئے یہ اندازہ نہیں تھا وہ اپنے باپ کو لاحق دنیا کے مہلک ترین برین ٹیومر سے واقفیت حاصل کررہا تھا۔

Spelling Bee کے مقابلے کے لیے جبریل نے صرف ان الفاظ کی اسپیلنگ یاد کی تھی۔ وہ دو الفاظ کیا تھے' وہ کھوجنے کی کوشش اس نے تب کی تھی جب اس نے انٹرنیٹ پر اپنے باپ کے نام کے ساتھ اس کی بیماری کے حوالے سے ایک خبر دیکھی تھی۔ وہ ورلڈ بینک کی ویب سائٹ تھی جو ان کے ڈیسک ٹاپ کا ہوم پیج تھا اور کئی بار سالار کے زیر استعمال آتا تھا اور اس ہوم پیج پر تازہ ترین اسکرول ہونے والی خبروں میں سے ایک سالار سکندر کی بیماری کے حوالے سے وال اسٹریٹ جرنل کی نیوز تھی جو صرف آدھ گھنٹہ پہلے بریک ہوئی تھی۔

ساڑھے نو سال کے اس بچے نے اس بیماری کو کھوجنا شروع کیا تھا۔ سالار ابھی گھر نہیں لوٹا تھا۔ امامہ دوسرے کمرے میں بچوں کو پڑھا رہی تھی اور جبریل انٹرنیٹ پر ساکت بیٹھا یہ پڑھ رہا تھا کہ اس کا باپ گریڈ ٹو کے oligodendroglial کا شکار تھا۔ اس ٹیومر کا علاج نہیں ہوسکتا تھا۔ مکمل طور پر کامیاب علاج۔۔۔ اور اگر علاج ہو بھی جاتا تو مریض سات سے دس سال تک زندہ رہ سکتا تھا۔ اس برین ٹیومر کے مریض صحت مند رہ کر بھی اس سے زیادہ نہیں جی سکتے تھے۔

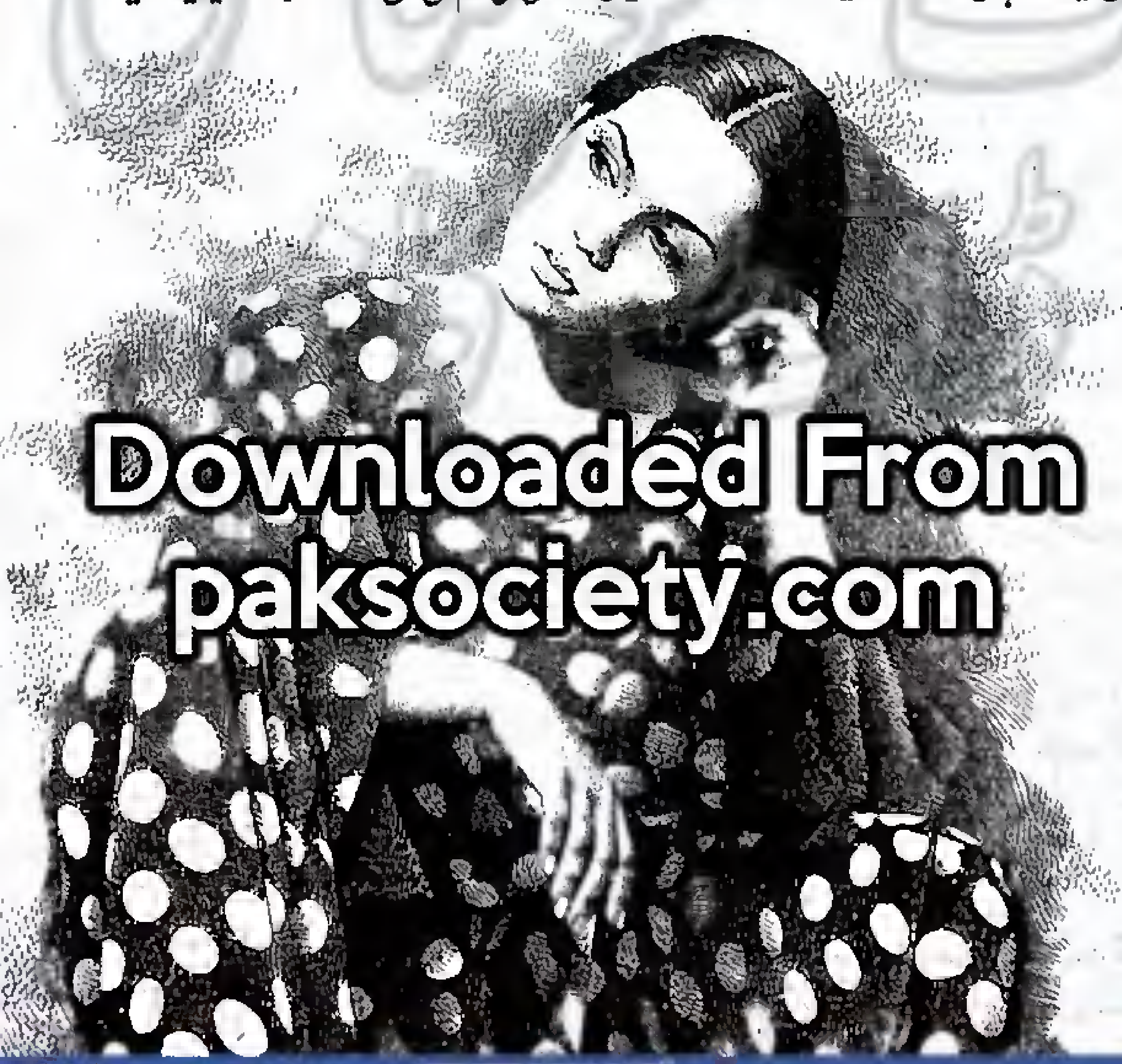
ساڑھے نو سال کا وہ بچہ اس دن چند لمحوں میں بڑا ہوگیا تھا۔ اس گھر میں سالار کے بعد وہ پہلا شخص تھا جسے سالار کی بیماری اور اس کی نوعیت اور اثرات کا علم ہوا تھا۔ جبریل کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ اس ہولناک انکشاف کا کیا کرے۔ ماں کو بتادے یا نہ بتائے۔۔۔ یہ اس کا Dilemma (مخمصہ) نہیں تھا۔ اس کا مخمصہ اور تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

قانتہ رابعہ

# مُرشد

یہ محض اتفاق تھا کہ تینوں سہیلیوں عاصمہ' سدرہ اور ثمر کے گھر ایک ہی گلی میں تھے۔ یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ تینوں نے ایک ہی اسکول سے میٹرک کیا اور ایک جیسے مضامین میں ایف اے' بی اے پاس کیا۔ یہ بھی حسن اتفاق تھا کہ تینوں کی پیدائش ایک ہی ماہ میں ہوئی۔۔۔ لیکن قدرت نے شادی کے بعد تینوں کو اتنے فاصلے پر بھیج دیا کہ کوا اڈی نہ لا سکے۔ ایک لورالائی میں' تو دوسری خانیوال میں' تیسری گوجرانوالہ میں۔۔۔ کہیں سگنل کا مسئلہ۔۔۔ تو کہیں مصروفیات کے بکھیڑے' رابطہ بھی سال' چھ ماہ بعد ہوتا اور غمی خوشی میں فیصل آباد میں اکٹھی ہونے کا اتفاق ایک دفعہ بھی نہ ہوا۔۔۔ عاصمہ سب سے شوخ چنچل خانیوال میں' سدرہ لورالائی میں اور ثمر گوجرانوالہ میں تھی۔ بس اتنا علم تھا کہ سدرہ کا میاں لورالائی سی ایم ایچ میں تھا۔ وارڈ بوائے یا کیا۔۔۔ یہ



کبھی پتہ نہ چل سکا۔ عاصمہ کا خاوند خانیوال میں بیکری چلا رہا تھا اور ثمر کا شوہر گوجرانوالہ میں کپڑے کی دکان کا مالک تھا۔ بچے اللہ نے تینوں کو دیے' کسی کو تین' کسی کو دو اور کسی کو چار۔۔۔

شادی کے نویں سال تینوں سہیلیاں پہلی دفعہ اکٹھی ہو رہی تھیں۔ سب کا میکہ فیصل آباد میں تھا۔ تینوں نے ثمر کے ہاں جمع ہونا تھا۔ جس نے کھانے کی دعوت پر بچوں سمیت بلایا تھا۔

سدرہ کچھ پھسڈی سی تھی' لورالائی سے وہ سب سے پہلے حاضر ہو گئی اور شوخ چنچل عاصمہ سب سے آخر میں۔۔۔ پہلے تو سب سکتے۔۔۔ میں آ گئیں' نو سال بعد ملاقات کی خوشی سے نہیں۔۔۔ عاصمہ کی حالت نے انہیں گم صم کر دیا تھا۔ رنگ خاصا سنولایا ہوا' چہرے پر سیاہی' آنکھوں کے نیچے حلقے' موٹی گولو اب دبلی ہو کر ہنڈی بنی ہوئی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔ جیسے جسم پر ماس بوٹی ہی نہ ہو۔۔۔ آنکھوں میں ویرانی۔۔۔ کوئی اداسی سی اداسی تھی۔

چند منٹ کے بعد سب زمانہ حال میں واپس آئیں تو ماضی کی چنچل عاصمہ اب سب سے گلے مل رہی تھی اور اشکوں کے دریا بہا رہی تھی۔ ثمر کی ملازمہ نے پہلے کولڈ ڈرنکس پیش کی' پھر بچوں کو لے کر باہر چلی گئی۔ سدرہ نے بڑی ہمت کر کے پوچھا۔

"عاصمہ! تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔"

"مجھ سے نہیں میری تقدیر پھوٹنے والوں سے پوچھو۔۔۔" سدا کی ہنسوڑ عاصمہ کا لہجہ تلخ تھا۔

"بھائی تعاون نہیں کرتے یا سسرال اچھی نہیں؟" بڑے نرم لفظوں میں ثمر نے پوچھا۔

"جس کی قسمت خراب ہو اس کے پاس نیکی بھی آتے آتے گناہ میں اور نفع نقصان میں بدل جاتا ہے۔ کوئی ایک رونا ہے۔۔۔ تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم۔ میں تو شادی والے دن سے ہی پل صراط پر چل رہی ہوں' کبھی ساس کا منہ ٹیڑھا' تو کبھی دیورانیوں' جٹھانیوں کی سازشیں' شوہر انتہا درجے کے کنجوس' دس روپے کے لیے خرچا مانگو تو گیارہویں دفعہ دیتے ہیں۔ اگر ملنے کے لیے کوئی آئے تو سارا قبیلہ سر پر سوار ہو جاتا ہے۔ سوالات پوچھ پوچھ کر ناک میں دم کیا جاتا ہے۔ کیسے آئے؟ جوتا کہاں سے لیا؟ قیمت کیا ہے؟ ہر وقت گھر میں میلہ لگا رہتا ہے۔۔۔ کام کر کر کے ہلکان ہو جاتی ہوں۔ کئی کئی دن فون پر بھی میکے سے رابطہ نہیں ہو پاتا۔"

بتاتے بتاتے عاصمہ کے آنسو چھلک پڑے۔ اس کے لہجے میں حسرت ہی حسرت تھی۔

"تم لوگ بہت خوش نصیب ہو۔ امی اکثر بتاتی ہیں کہ تم لوگ عید بقر عید پر میکے آتی ہو۔ میں تو گھر کی ہو کر رہ گئی ہوں۔"

"عاصمہ! تم مثبت سوچا کرو نا۔" سدرہ نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں بی بی! یہ مثبت منفی تو اس کو سوجھتا ہے جس کو زندگی خوشیاں دے رہی ہو۔ تمہیں کیا علم' کن جاہل لوگوں سے واسطہ پڑا ہے' تمہاری سسرال تو ویل مینرڈ ہے۔ تم کیا جانو۔۔۔"

آنے بہانے وہ روتی کرلاتی رہی' آنسو پونچھتی' پھر داستان ظلم و ستم شروع کر دیتی۔ دو گھنٹوں کے بعد جب کھانے کا بلاوا آیا تو وہ پچیس تیس دفعہ یہ فقرہ دہرا چکی تھی کہ۔۔۔

"تمہیں کیا پتا' تم ان حالات سے گزرتیں' پھر پتا چلتا۔"

کھانے کے بعد پھر محفل جمی۔۔۔ سدرہ نے عاصمہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور بہت محبت سے بولی۔

"پیاری عاصمہ! ہم آج بھی پہلے کی طرح دوست ہیں' فاصلے اور جدائیاں دوستی کو کم نہیں کرتیں' میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ ہم تمہاری خیر خواہ ہیں' تمہیں اس حال میں دیکھ کر دلی رنج ہوا ہے۔۔۔ اگر حالات کی بہتری کے لیے تمہیں مشورہ دیں تو قبول کر لو گی؟"

عاصمہ بولی کچھ نہیں' بس ٹکر ٹکر شکل دیکھتی رہی۔۔ سدرہ نے کہنا شروع کیا۔

"عاصمہ۔۔۔ اللہ نے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک امتحانی پرچا تھمایا ہے۔ سوالات سب کے ایک جیسے

ہیں' بس جوابات کا طریقہ مختلف ہے۔ کوئی راضی برضا رہتا ہے' کوئی شکوہ شکایت کرکے ۔ آزمائش کو بھی سزا بنالیتا ہے۔ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ اس دنیا میں کوئی فرد ایسا ہو جس کو کوئی مسئلہ نہ ہو۔ مال' اولاد' گھربار' رشتے دار' کاروبار یہ سب ہمارے امتحان کا حصہ ہیں' ہم سب ان سے کسی نہ کسی طریقے سے آزمائے جارہے ہیں۔ اب تم خود سوچو اگر پرچا دیتے ہوئے ہم رونے دھونے لگ جائیں تو پرچا کیسے حل کریں گے؟ تم یہ سمجھ لو کہ جو پرچا تمہارا ہے وہ میرا نہیں اور جو پرچا میرا ہے وہ ثمر کا نہیں۔ بس حل کرتے ہوئے اگر کامیابی' اطمینان' سکون چاہتی ہو تو صرف ایک ہی فارمولا سامنے رکھو جو میرے آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا کہ دنیا میں اپنے سے کم کی طرف اور دین میں اپنے سے اوپر کی طرف دیکھو۔ میں نے تو ہر مشکل میں اسے سامنے رکھا اور سرخرو ہوئی ہوں۔

"بی بی یہ کسی اور کو بتانا' مجھ سے زیادہ دکھی کون ہوسکتا ہے۔" عاصمہ نے منہ پھاڑ کر کہا۔

سدرہ کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے اس نے بڑی مشکل سے لہجہ نرم کیا اور بولی۔

"عاصمہ! خدا سے ڈرو' تم اپنے رب کی ناشکری کررہی ہو۔ تم اگر نعمتوں کو سامنے رکھو' ہر فرد میں موجود خوبیوں کو تلاشنے لگو تو شاید تم پہلے جیسی عاصمہ بن جاؤ۔ تمہیں کیا پتا میری سسرال میں کیا حالات ہیں' جن کو تم ویل منیرڈ کہہ رہی ہو وہ کیسے ہیں؟ ان کے خودساختہ منیرڈ کی وجہ سے کوئی شخص ان کے قریب بھی نہیں پھٹکتا۔ اگر آ بھی جائے تو اپنے آپ کو ہر طرح سے برتر ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جاتا ہے۔ آنے والا واپسی کے لیے گھر کی دہلیز پار بھی نہیں کرتا' اس کی برائیاں شروع ہوجاتی ہیں' تم یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ تمہاری سسرال والے اگر مہمانوں کے سر پر سوار ہوتے ہیں تو یہ ان کی اپنائیت کا انداز ہے۔ قیمت پوچھتے ہیں تو عین ممکن ہے اپنی سہولت کے لیے' آیا وہ لینے جائیں تو اسی قیمت میں ملے گا یا نہیں۔ مہمان آتے ہیں تو رحمت بن کر آتے ہیں۔ میرے گھر میں تو کوئی آتا ہی نہیں۔ دن پر دن۔ ہفتوں پر ہفتے بیت جاتے ہیں' کبھی اڑوس پڑوس سے بھی کوئی نہیں جھانکتا۔ کسی کے گھر جاکر اپنی بے عزتی اور دل آزاری کون کرواتا ہے۔ تم کہتی ہو دس دفعہ میاں سے خرچا مانگو تو گیارہویں دفعہ ہاتھ پر رکھتے ہیں' میرے ہاں موسم کے کپڑے' جوتے' بہوؤں کے میکے سے آنے چاہئیں۔ دال روٹی گھر میں جو سب کھاتے ہیں وہی ملتی ہے' اگر کبھی ضرورتاً "پیسہ مانگنا پڑ جائے تو میاں صاحب اپنی ماں سے بات کرتے ہیں اور ماں گھر کے سربراہ سے۔ جتنی دیر میں یہ مالی مذاکرات طے پاتے ہیں اگلا بندہ بے شک اگلے جہاں سدھار جائے۔ یہ دیکھو۔ یہ۔"

سدرہ نے بایاں بازو ننگا کیا۔ کھال بری طرح جلی ہوئی تھی بلکہ لٹک رہی تھی۔

"یہ کیا ہوا؟" ثمر اور عاصمہ چیخیں۔

"پریشر ککر پھٹ گیا تھا' چونکہ رقم ہاتھ میں نہیں تھی' اس لیے ساس نے مشورہ دیا کہ گھر سے ہی ٹوتھ پیسٹ' شہد جو لگا سکتی ہو لگالو۔ میں نے اس پر بھی شکر ادا کیا کہ جاننے والوں میں کچھ دن پہلے ایسے ہی پریشر ککر پھٹا تھا۔ بہو کے منہ اور پاؤں پر گرم ابلتا شوربہ گرا تھا۔ دھماکے کی آواز سن کر ساس نے کہا۔ افوہ۔ ستیاناس! ککر کا ڈھکن ہی خراب ہوگیا' نیا لینا پڑے گا۔"

سدرہ بتاتے بتاتے تھک گئی تھی۔

"اور اگر میں اپنے سے زیادہ مسائل کا شکار لوگوں کی طرف نہ دیکھوں تو شاید میں بھی تمہاری طرح گھٹ گھٹ کر مرجاؤں' اگر اللہ نے صبر' ایثار کا مادہ عورت میں نہ رکھا ہوتا تو وہ بچہ کیسے پیدا کرتی۔ پھر یہ تو دوغلا پن ہوا۔ وہاں پر صبر کرلیا۔ بچے کے لیے نیند' آرام' بھوک سب برداشت کیا اور اپنے گھر کے لیے کوئی صبر نہ کیا۔ گلے شکوؤں کے انبار جمع کرلیے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو سدرہ۔" مرے مرے لہجے میں عاصمہ نے کہا۔

"اور بالفرض ہر دکھ تمہارے لیے ہی ہے تو میں‘ تمہیں دو تین مرشد — بتاتی ہوں۔ وہ تمہاری ہر مشکل وقت میں رہنمائی کریں گے۔ تمہارا گھر آباد رکھنے میں مدد دیں گے۔ آخرت بنائیں گے۔"

"مرشد! مجھے تو گھر سے باہر جانے کی اجازت نہیں۔" عاصمہ گھبرائی۔

"نہیں بھئی! وہ مرشد ہر وقت ہر جگہ (دستیاب) ہوتے ہیں۔" سدرہ چہکی۔

"کیا مطلب۔؟" ثمر اور عاصمہ چونکیں۔

"ارے ایسے ویسے مرشد اگر ہم ان سے رہنمائی لیں تو دیکھنا لوگ تمہیں مرشد ماننے لگ جائیں گے۔" سدرہ نے سسپنس پیدا کیا۔ "جب مجھے بھری پری لیکن لوگوں سے بیزار۔ سسرال میں رہنا پڑا تو پہلی دفعہ میں نے اپنے مرشد سے رہنمائی لی تھی۔ سارا سارا دن میں اپنے کمرے کی کھڑکی سے گلی کے لوگوں کو دیکھتی‘ تو میرے مرشد نے رہنمائی کی‘ ذرا اس ہستی کی طرف دیکھو جو حق پر ہوتے ہوئے تین سال تک پورے قبیلے کے سوشل بائیکاٹ کا شکار رہی ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کے ہمراہ خاندان سے کٹ کر رہنا جان جوکھوں کا کام ہوتا ہے لیکن دیکھو اس نے تنہا اپنے گھر میں بچے پالے‘ کھجوریں اور ان کی **گٹھلیاں** چوس چوس کر یہ مدت پوری کی‘ اس بزنس وومن نے لاکھوں کا سرمایہ شوہر کے سپرد کر کے پلٹ کے خبر نہ لی کہ میری رقم کہاں ہے۔ تم جانتی ہو یہ کون تھیں‘ بزنس وومن؟

سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔

اور جب مجھے سارا سارا دن کولہو کے بیل کی طرح جت کر کام کرنا پڑتا تو میرے مرشد نے ایک اور شخصیت میرے سامنے لا کھڑی۔

"آقائے نامدار کی —— سب سے چھوٹی بیٹی (فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا)۔ پھولوں جیسی شہزادی۔ بن ماں کی بچی۔۔۔ اس کے پاس کوئی ملازم نہیں۔ تم بٹن دباتی ہو تو چولہا روشن ہو جاتا ہے‘ بٹن دباتی ہو تو کپڑے دھل جاتے ہیں‘ بٹن دباتی ہو تو سارا کمرہ روشن ہو جاتا ہے۔ بچہ پیشاب کر دے تو پیمپرز باندھ دیتی ہو۔ کبھی کنویں پر پانی لینے نہیں گئیں‘ نل کھولا تو بوتل کے جن کی طرح پانی حاضر۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شہزادی کو دیکھو۔ آقائے نامدار کی صاحب زادی کو دیکھو‘ کم سنی کی شادی‘ اوپر تلے کے کئی بچے‘ آٹا مشین میں نہیں گوندھتیں‘ چکی میں خود پیستی تھیں۔ جو کا آٹا جو گندم سے کہیں زیادہ مشکل سے پستا ہے‘ بچوں کے پاس کوئی آیا نہیں‘ کوئی چاکلیٹ۔ کینڈیز نہیں۔۔۔ ہائے میں صدقے‘ لکڑیاں جلا کے چولہا گرم کرتی ہیں۔ میں صدقے‘ میں واری۔۔۔"

سدرہ بچوں کی طرح رو رہی تھی۔

"ایک دن اپنے باپ کے پاس گئیں تو ہاتھ آگے کر دیے۔۔۔ میرے اللہ۔۔۔! ان کے نرم و نازک ہاتھوں پر چکی پیستے پیستے چھالے بن چکے تھے۔ باپ سے انہوں نے لونڈی کی درخواست کی۔۔۔ ماں تو تھی نہیں‘ کس کے پاس جاتیں؟؟"

باپ نے بجائے بیٹی کی فرمائش پوری کرنے کے ایک وظیفہ بتا دیا کہ صبح شام یہ پڑھ لیا کرو۔ اللہ تمہیں ہر ملازم اور لونڈی سے بے نیاز کر دے گا۔ میں قربان جاؤں‘ قیامت تک جو بھی یہ وظیفہ کرتا ہے جو بھی تینتیس تینتیس دفعہ سبحان اللہ اور الحمدللہ اور چونتیس دفعہ اللہ اکبر پڑھتا ہے‘ وہ دنیا کی مشقتوں کو تو سہل بناتا ہی ہے‘ اس کا ثواب "تسبیحات فاطمہ" کا اجر ان جنت کی سردار کے نام پر بھی جمع ہو جاتا ہے۔"

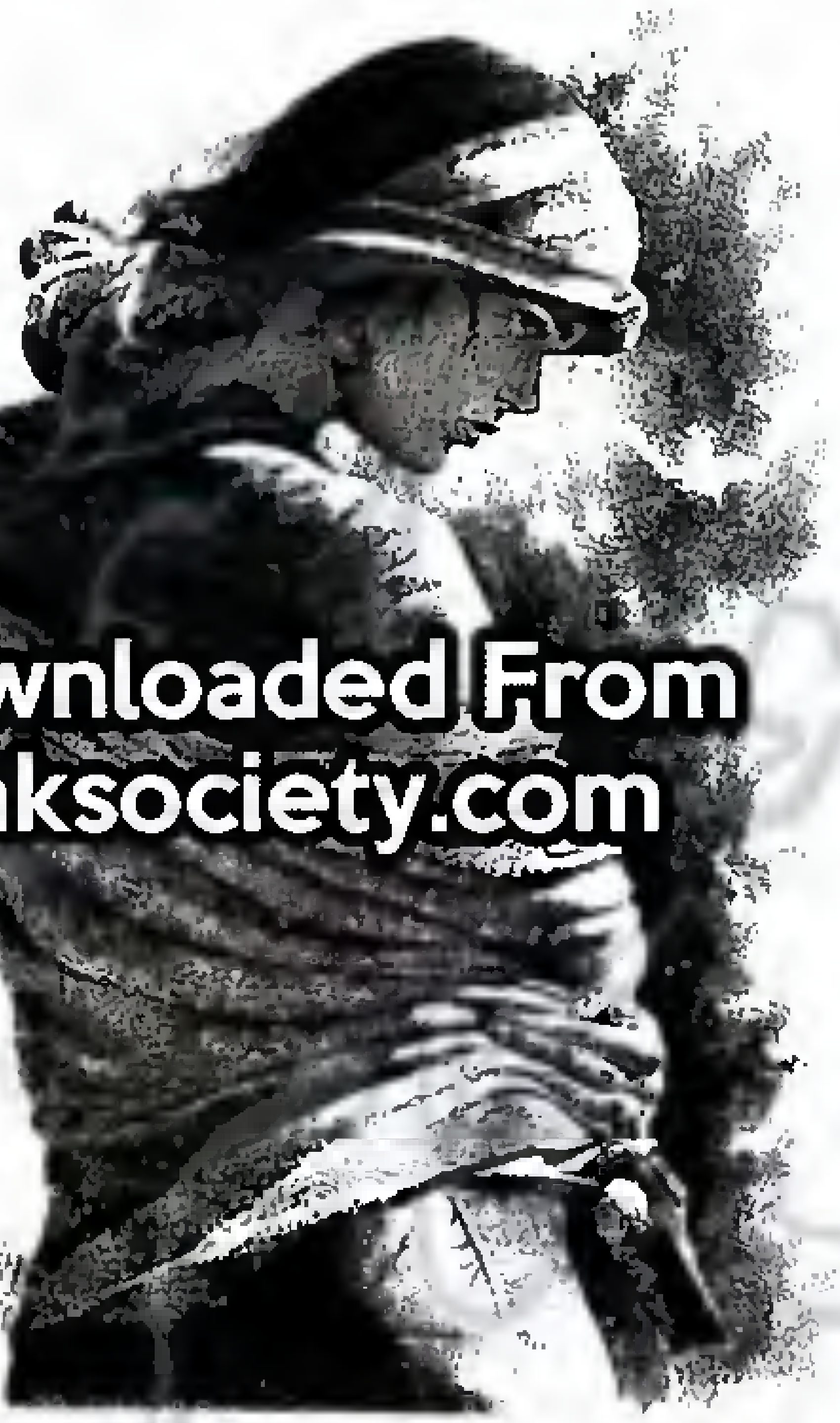
سدرہ بولے جا رہی تھی۔ روئے جا رہی تھی۔۔۔ کبھی سسکیاں۔۔۔ کبھی ہچکیاں۔۔۔ ثمر اور عاصمہ بحر ندامت میں غرق ہونے کو تھیں‘ جسے زمانہ طالب علمی میں پھسڈی‘ نالائق اور سست‘ کم فہم کہا جاتا تھا۔ ازدواجی زندگی میں کام کی کیسے بن گئی؟

محض اللہ سے مضبوط تعلق اور مرشد کامل کی پیروی کی وجہ سے۔۔۔

دونوں کا سر ہلا‘ جواب "ہاں" میں تھا۔

ایمل رضا

# حرفِ ساز





سارے کرو کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ لوگ ایک دوسرے کی طرف ایسے دیکھنے لگے جیسے ان کے علاوہ باقی سب بھوت ہوں۔ پھر کسی کو خیال آیا کہ وینا میم کو بھی ہوش میں لانا ہے۔ لیکن کوئی افراتفری نہ ہوئی۔ سب ایسے انداز میں کام کرنے لگے جیسے اسٹیج کے پیچھے کا یہ سین بھی ڈرامے کا ہی حصہ تھا۔ اور جیسے اس سین کی ریہرسل بھی بہت بار ہو چکی تھی۔

سب کچھ آنکھوں کے سامنے ہونے کے باوجود یہ معاملہ کوئی نہ سمجھ سکا کہ آخر اسے دو لائنیں ہی تو بولنی تھیں۔ پھر اس کے لفظوں نے گھرے بادلوں کی سی صورت کیوں اختیار کرلی۔ اور یہ ہی گھرے بادل وینا میم پر گرج گئے۔

اور وہ دو لائنیں کس قدر سادہ سی بھی تو تھیں۔ پہلی لائن تھی۔

”مجھے آپ سے کوئی گفٹ نہیں چاہیے ممی! میں نے ہمیشہ اپنی زندگی میں آپ کی غیر حاضری کو محسوس کیا ہے۔“

اور ممی۔ جس کا کردار روحی نبھا رہی تھی۔

روحی۔ پچاس کے پیٹے کی ایک منجھی ہوئی اداکارہ۔ اس عمر میں بھی بالوں میں لہریں ڈالتی تھی۔ اور مجال ہے جو آج تک کسی نے اسے بنا لپ اسٹک کے دیکھا ہو۔ لائٹ پنک لپ اسٹک مدتوں سے اس کے ہونٹوں کا پہناوہ رہی تھی۔ اور لگاتی بھی اس نزاکت سے تھی کہ اندر کے کالے بھدے عمر کو ظاہر کرتے ہونٹ تو بالکل چھپ ہی جاتے تھے۔

ڈرامے میں روحی بیک وقت ماں، ورکنگ لیڈی اور ایک این جی او کی مالکہ کا کردار نبھا رہی تھی۔ بیٹے کی اس شکایت پر اسے ایک طویل صبر آزما لیکچر دینا تھا۔ اس لیکچر کی ریہرسل وینا میم نے بہت بار کروائی تھی۔ آخر وہ بھی ایک ورکنگ ویمن 'ماں اور این جی او کی اونر تھیں۔ اور دوسری ورکنگ ویمن کا درد محسوس کرتے ہوئے انہیں اس لیکچر میں ساری شکایتوں کا ازالہ کرنا اور کروانا تھا۔

ویسے تو روحی کا نخرہ ہی بہت تھا۔ سیٹ پر بھی وقت پر ہی پہنچتی تھی۔ لیکن اس ڈرامے کی اہمیت کا اسے بہت اچھی طرح سے اندازہ تھا۔ وینا نے کوئی کام اول درجے سے کم کیا ہی نہیں تھا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ وہ بار بار ہر سین کی ریہرسل کرواتی رہیں۔ اور اب تک تو پورا ڈرامہ بمع اس لیکچر کے کیمرہ مین 'اسپاٹ بوائے' میک اپ آرٹسٹ اور تمام کام کرنے والوں کو ازبر ہو چکا تھا۔

”تم کبھی کیسے نہ محسوس کرتے رامس۔ تم کبھی کیسے نہ محسوس کرتے۔“ (یہاں پہنچ کر روحی نے ہاتھ میں پکڑا گفٹ زمین پر دے مارنا تھا۔ رحمان ہاشمی صاحب،

ڈرامے کے مصنف نے یہ ہی طے کیا تھا۔)

"میں نے تمہیں ماں اور باپ دونوں بن کر پالا ہے۔ تمہیں زندگی کی ہر آسائش دینے کے لیے میں نے باہر مردوں کی طرح کام کیا ہے۔(یہاں پہنچ کر روحی کا لہجہ سخت ہو جاتا تھا)۔ تم اچھے اسکول میں پڑھو۔ اچھی یونی جاؤ۔ تمہارا مستقبل روشن ہو۔ ان سب کے لیے مجھے گھر سے باہر رہنا پڑا ہے(پھر نرم لہجے میں) رامس کیا تم نے کبھی اپنی ماں کی زندگی میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ کہ اس نے اپنی زندگی کس کرب اور کس اذیت میں گزاری ہے۔ مطلب پرست مردوں سے بھری دنیا کا کس طرح سامنا کیا ہے۔ اس این جی او کو حاصل کرنے اور چلانے کے لیے کتنی محنت کرنی پڑی ہے۔ تم کیسے اندازہ لگا سکتے ہو رامس۔"

(لہجہ پھر تیز۔ اور تیز۔ غصے والا)

"کمرے میں بند رہ کر ہر وقت ویڈیو گیمز اور ایف بی میں گم رہنے والا اور دوستوں کے ساتھ پارٹیاں انجوائے کرنے والا لڑکا یہ کیسے جان سکتا ہے کہ باہر اس کی ماں ـــــ کیسے حالات میں سے گزر رہی ہے۔" (ایک آنسو بھی)

بس یہ روحی کا لیکچر تھا۔ پھر تھوڑی دیر کی خاموشی تھی اور رامس کی دوسری اور آخری لائن۔

"آئی ایم سوری ممی۔ میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا نہیں تھا۔" اس فقرے کے بعد روحی کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔ ایک فخر ایک عزم کے تاثرات کے ساتھ کہ سب کچھ جیت جانے والی عورت اپنے گھر میں ہاری نہیں ہے۔

اور پردے گر جانے تھے۔ یہ ڈرامے کا اختتامی سین تھا۔

وینا بہت پرجوش تھیں اس ڈرامے کو لے کر۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ ایک ٹیلی فلم ڈائریکٹ کر چکی تھیں۔ جس کو بہت پذیرائی بھی ملی تھی۔ اور بیس اقساط پر مشتمل ایک ڈرامہ بھی جو انڈیا کے ساتھ کو پروڈکشن کی بنیاد پر بنایا گیا تھا۔ لیکن وہ سارے کام' سارے تجربے تیز بارش میں چھتری کھولنے جیسے تھے۔ اب انہیں بادبان کھولنا تھا۔ اور ایک بہت بڑے دیوہیکل جہاز کو دنیا کے گرد گھمانا تھا۔

اس لیے وینا اس ڈرامے کو لے کر ایکسائیٹڈ تو تھیں ہی' ساتھ ساتھ کامیاب ہو جانے کا جنون بھی تھا۔

ویسے ان کی زندگی کا تقریباً" ہر دن ہی جوش سے بھرا تھا۔ وہ ہر دن آخری دن سمجھ کر نہیں گزارتی تھیں بلکہ ہر نئے دن میں اپنی پوری زندگی جی لینا چاہتی تھیں۔ زندگی بھی ان کے لیے سگی ماں کی طرح تھی۔ وہ زندگی کی لاڈلی رہی تھیں۔ ایسی کون سی چیز تھی کے جس کی وہ تمنا کریں اور اسے حاصل نہ کرپائیں۔

آغاجی صرف دوپٹے کے معاملے میں سخت تھے' یہ سختی بھی تب تک رہی جب تک وہ زندہ رہے۔ پھر کھلی آزادی۔۔۔ حالانکہ آزادی ان کے جیتے جی بھی بہت تھی۔ سب نواسیوں' پوتیوں کو سوئمنگ تک کے لیے تو وہ خود لے جاتے تھے' بیڈمنٹن' کرکٹ' فٹ بال کسی چیز کی روک ٹوک نہیں تھی۔

لیکن وینا نے نجانے کب صحت مند سرگرمیوں سے منہ موڑ لیا۔

"مجھے ایئر ہوسٹس بننا ہے۔" اور وہ بن گئی۔ دو سال بعد یہ شوق ہواؤں کی نذر ہو گیا۔ یونی ورسٹی دوبارہ جوائن کی' وہاں سے ہی ماڈلنگ کا خیال آگیا۔

گھر والوں کو روک ٹوک کا وقت تھا نہ خیال۔ اس لیے جو دل کیا وہ ہی کیا' پتا تب چلا جب وینا فیشن میگزین کے پہلے صفحے پر آنے لگی۔

"تم نے ماڈلنگ کب اسٹارٹ کی؟" ممی نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ ممی۔۔۔ اب تو چھوڑے ہوئے بھی پانچ ماہ ہو گئے ہیں۔" ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی وہ۔۔۔ ان دنوں وہ ڈراموں میں اداکاری کے جوہر دکھانے میں مصروف تھی۔

ڈرامے زیادہ تو نہیں کیے' مگر جتنے بھی کیے' زبان زد عام ہوئے۔ اور ڈراموں کی شہرت کے ساتھ ساتھ قاسم ضیا کے ساتھ افیئر بھی زبان زد عام ہو گیا۔ قاسم ضیا

اٹھارہ سال بڑا تھا دینا سے۔۔۔ پہلے ہی دو ناکام شادیاں کر چکا تھا۔۔۔ خیر تھا اتنا ہینڈسم کہ ابھی بھی کافی لڑکیوں کا کرش تھا اس پر۔۔۔ اور وہ مرمٹا دینا پر۔۔۔

قاسم ضیا طبیعت کے متلون مزاج تھے۔ سیلانی بہاؤ کسی جذباتی سیلاب کی نذر ہو چکا تھا۔ ملکوں ملکوں' جنگلوں' جھیلوں' پہاڑوں' آبشاروں' بلڈنگوں' ٹیکنالوجی کو دیکھ دیکھ کر تھک گئے تھے شاید اور دینا نے ابھی دنیا دریافت کرنی تھی۔

طلاق سے پہلے دونوں کا ایک بیٹا ہوا "عادی" جسے قاسم ضیا نے ایک بار کے کہنے پر دینا کے حوالے کر دیا۔ اور ایسا کیا کہ پلٹ کر پھر کبھی خبر ہی نہ لی اس بار قاسم نے اپنی ہم مزاج' ہم عمر سے شادی کی اور یہ شادی کامیاب رہی۔

ہدایت کاری میں آنے سے پہلے یوں تو ڈھیروں ہی کام ہوئے۔ کامیابیاں بھی ملیں ہمیشہ کی طرح' شاعری کی ایک کتاب بھی لکھی۔ ایک ناول بھی آیا' فیشن میگزین کی ایڈیٹر بھی رہیں۔ بوتیک بھی کھولی' ریمپ پر پھرے واک کی۔ اپنے کپڑوں کی واک کروائی بھی' لیکن ڈائریکشن میں آنے سے انہیں ایسا لگا جیسے یہ ہی وہ اصل کام تھا جس کے لیے وہ دراصل بنی تھیں۔ حالانکہ ایسے بہت سے اصل کو تھوڑے عرصے بعد ہی وہ ہمیشہ نقل قرار دے دیتی تھیں' لیکن اس ڈرامے نے تو ان کو اصل میں تھکا ہی دیا۔ ایک ایک چیز کو لے کر وہ اپنے سر میں درد کرواتی رہیں۔

"رحمان صاحب اتنا گوڑا نام رکھ دیا آپ نے ڈرامے کا' حروف ساز (حرف بنانے والا)۔"

"تو آپ کیا چاہ رہی تھیں؟" رحمان ہاشمی صاحب اپنی بلاوجہ کی مسکراہٹ کو مزید بڑھا کر بولے۔

"یہ ہی کوئی جنم جنم کی میلی چادر جیسا نام۔"

"ارے چھوڑیے بھی دینا جی۔۔۔ چادریں تو صدیوں سے میلی ہو رہی ہیں۔ اب ان کا میل یا صفائی کون دیکھنے آئے گا' آپ مجھ پر اعتماد کیجیے۔۔۔ آپ تو خود ماشاء اللہ سے ایک اعلا پائے کا ناول لکھ چکی ہیں۔"

"لیڈ رول تو ایسا لگ رہا ہے جیسے آپ نے مجھے دیکھ کر لکھا ہے۔"

"اور یہ لکھا بھی آپ کے لیے ہی گیا ہے۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ رحمان صاحب۔۔! مجھ سے تو نہیں ہو گی اب ایکٹنگ۔۔۔ میرے ذہن میں تو روحی ہے۔ ویسے بھی جب جب میں اسے دیکھتی ہوں۔ اس کی زندگی میں اپنی پرچھائی نظر آتی ہے۔ اس نے بھی زندگی بڑی مشکل میں گزاری ہے میری طرح۔۔۔" دینا خلاؤں میں کھونے لگیں۔

"تھام لیجیے ہمارا ہاتھ۔۔۔ سب راستے سہل کر دیں گے۔" ازلی بلاوجہ کی مسکراہٹ پھلجھڑی بن گئی۔

"مرجھائے ہوئے پھولوں کو کیوں ہاتھ میں لیتے ہیں؟"

"ہماری ایک پھونک تازگی بخش دے گی آپ کو۔۔۔ سنا نہیں آپ نے کہ مصنفوں کا تخیل ہی نہیں' وہ خود بھی جادوگر ہوتے ہیں۔" رحمان ہاشمی نے کہا تو دینا دیر تک ہنستی رہیں۔

"چھوڑیے۔۔۔ بتائیے مکمل اسکرپٹ کب دیں گے؟"

"اسکرپٹ سیٹ پر بیٹھ کر لکھا جائے گا۔"

"کیا مطلب؟" دینا چیخیں۔

"کرداروں کو سچویشن بتا دی جائے گی۔۔۔ پھر جو جو وہ بولتے جائیں گے وہ وہ میں نوٹ کر کے نوک پلک سنوارتا جاؤں گا۔"

"یہ کیا ہے بھئی۔" دینا جھنجلائی۔

"یورپ میں تو ایسا عام ہوتا ہے۔۔۔ جب آپ نے تھیٹر اپنا نام جوڑ کر اسے اتنا اعلا معیار دے دیا ہے تو پھر یہ طریقہ اپنانے میں حرج ہی کیا ہے۔۔۔ آپ اس صنف سے انجان تو نہیں۔۔۔ اسی لیے تو ڈرامے کا نام حروف ساز رکھا ہے۔۔۔ کردار اپنا آپ خود بولیں گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ پر کیا بڑے اداکار مان جائیں گے۔۔۔ ایسی ریہرسل بغیر لیے جس میں ڈائیلاگ تک نہیں۔"

"آپ کا نام اور میرا ون لائنز (خلاصہ) دیکھ کر تو

ضرور مان جائیں گے۔"

اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ روحی کے سارے نخرے تو ڈرامے کے ٹائٹل پر ہی ختم ہوگئے اور پھر اس نے ریہرسل میں اپنی اداکاری کے وہ وہ جوہر دکھائے کہ رحمان ہاشمی کو اپنے طے شدہ ڈائیلاگ بہتے پانی میں تحلیل ہوتے محسوس ہوئے۔ دو ماہ بیک اسٹیج کے ورک میں لگ گئے۔ پھر ایک ماہ ریہرسل میں... خدا خدا کرکے اسکرپٹ مکمل ہوا اور پہلے شو کی تاریخ فائنل ہوئی۔

ساری زندگی محنت کرتی وینا کو اس بار بھی آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے یہ سوچنے کا بھی وقت نہ ملا کہ اتنی بھاگ دوڑ اور اتنا ہلکان وہ آخر کس کے لیے ہو رہی ہیں؟ اور آج عادی نے جیسے ان کے سارے سوالوں کے جواب دے دیے تھے۔

حالانکہ عادی کو صرف دو لائنیں ہی تو بولنے کو کہا گیا تھا۔ پھر نجانے کیوں وہ کڑکڑاتی بجلی کی طرح قہر برساتا چلا گیا۔ عادی بھی کسی حد تک اپنے باپ پر گیا تھا۔ کم گو' خاموش لیکن گہری' اداس اور بولنے والی آنکھوں والا۔ گلابی ہونٹ (اور وینا کو مردوں کے گلابی ہونٹ سخت ناپسند تھے) اور براؤن شیو والا... زیبرے کی طرح صرف دو رنگی۔ سفید و سیاہ' سلیٹی بھی نہیں... خیر وینا نے کبھی اس کے اندر قوس قزاح بھرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ کب وقت تھا بھلا ان کے پاس ایسی چیزوں کا' بچپن عادی کا نوکروں کی نذر ہو گیا اور جوان... جوان تو وہ پتا نہیں کب ہوا۔ وینا کی نظر میں ہمیشہ بچہ رہنے والا عادی جب پہلی بار شیو کرکے ان کے سامنے آیا تو وینا کی مدتوں کی عبادت جیسے قضا ہوگئی۔

تو کیا اب وہ ایک جوان بیٹے کی ماں بن گئی ہیں؟

جوان بیٹا... ماں...

کتنے خوف ناک لفظ تھے یہ ان کے لیے... ان کے چہرے کا رنگ نچڑتا ہی گیا۔ بہت بار ذہن میں آیا کہ عادی کو اب وہ قاسم ضیا کے پاس واپس بھجوادیں... پھر یہ سوچ کر وہ ارادہ ترک کر دیتیں کہ ایک تو پہلے ہی کم گو ہے' وہاں جاکر کہیں بالکل ہی گونگا نہ ہو جائے۔

صبح وہ گھر سے نکلتیں تب عادی سو رہا ہوتا۔ رات کو جب وہ واپس آتیں تب انہیں سونے کی جلدی ہوتی۔ اتوار کا دن پارٹیز کی نذر ہو جاتا۔ ملازموں سے ہی پتا چلتا کہ آج عادی کیا کیا کرتا رہا۔ لیپ ٹاپ پر مصروف رہا' دوستوں سے ملنے گیا یا وہ ملنے آئے۔

قاسم ضیا کی طرح عادی بھی جمود کا شکار تھا اور وینا کو کتنی نفرت تھی جمود سے۔ قاسم ضیا کے جمود سے' عادی کے جمود سے' جمود ہو جانے' جمود دیکھنے میں... بکھرے بال اور ہر وقت کھلی شرٹ اور برمودا میں دیوانوں کی طرح گھومنے والا عادی۔ انہیں پتھر کا بنا ہوا لگتا۔

اپنے ڈرامے حروف ساز میں وینا نے روحی کے بیٹے رامس کا کردار عادی سے متاثر ہو کر لکھوایا تھا۔

ڈرامے میں بھی رامس کا کردار عادی جیسا ہی تھا۔

پورے ڈرامے میں اسے صرف اٹھتے بیٹھتے دکھایا گیا تھا یا اپنے "ڈیکیٹ" سے کھیلتے اور آخر میں بولنے کے لیے دو لائنیں دی گئی تھیں... صرف دو لائنیں... اور وہ دو لائنیں... خیر...

اور عین وقت پر کہ جس وقت ڈرامے کا پہلا شو تھا اور سارا ہال چیدہ چیدہ اداکاروں' عام لیکن خاص ناظرین اور مختلف چینلز کے کیمرہ مین سے بھرنے والا تھا۔ ایک عجیب بات ہوگئی۔ جس نے وینا کے اوسان خطا کردیے۔

حارث جو ڈرامے میں رامس کا کردار ادا کر رہا تھا' تھیٹر آتے وقت حادثے کا شکار ہو گیا تھا اور اب اسپتال میں پڑا تھا۔ کوئی بڑا ایکٹر ہوتا تو ڈرامے کا پہلا شو کینسل بھی کیا جا سکتا تھا لیکن...

سب پریشان سے ہوگئے... کچھ حقیقت میں کچھ دکھاوے میں... اور اصل پریشان ہوئیں وینا...

"کسی اور لڑکے سے کروالیں... کتنے تو لڑکے ہیں یہاں۔"

"ریہرسل بھی تو نہیں ہوئی... دوسرا حارث نے یہ کردار بہت اچھے سے پک کرلیا تھا۔ رحمان صاحب۔ شارٹس اور ٹی شرٹ بھی اس کے سائز کی ہے۔ اب

ایک دم سے اتنا سب کچھ کیسے ہوگا۔ حارث کی تو واقعی میں آنکھیں بولتی تھیں۔" وہ رو دینے کے قریب تھیں۔

"باہر ایک لڑکا بیٹھا ہے... آنکھیں تو اس کی بھی بول رہی ہیں۔"

"کون؟"

اور کوئی پکڑ کر عادی کو ان کے سامنے لے آیا۔ ہنسی اور آنسوؤں کا گولا ان کے حلق میں پھنس گیا۔

"کیا مذاق کررہے ہیں رحمان صاحب آپ بھی... یہ میرا بیٹا ہے... کبھی کبھی تھیٹر آجاتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ ایکٹنگ بھی کرنے لگا۔"

"آپ خاموش ہوجائیں دیناجی... عادی بیٹا! تم بتاؤ... ایک کردار کرلوگے... اپنی ماں کو مشکل سے نکال لوگے؟" رحمان ہاشمی نے کہا تو ہینڈ فری کانوں سے نکال کر اور موبائل سے نظریں ہٹا کر عادی نے سب کو دیکھا۔ منہ سے کچھ نہ بولا... ہمیشہ کی طرح ساکت چہرہ... ڈرا دینے والا... جسے دیکھ کر دینا ماں ہونے کے باوجود بھی پرے ہٹ گئیں۔

"یہ چہرہ تو جھکا ہی رہے... جب جب اٹھتا ہے پتا نہیں کیوں مجھے ماں ہونے کا احساس دلاتا ہے۔"

"بولو... یہ کردار کروگے؟" دینا نے ایسے پوچھا جیسے کسی اجنبی سے بات کررہی ہو۔ پروڈیوسر بھی وہیں آگئے۔ میک اپ مین... ساری ٹیم... مشکل کا حل بھی تو گرین روم میں ہی بیٹھا تھا۔

"تمہیں صرف دو لائنیں بولنی ہیں... صرف دو لائنیں۔"

رحمان ہاشمی نے کردار اچھی طرح عادی کو سمجھادیا۔ آخر تک انہیں یہ ہی پتا نہیں چل سکا کہ عادی سمجھ گیا ہے کہ نہیں... میک اپ مین نے جلدی سے میک اپ کردیا... پرانی برمودا اتروا کر نئی برمودا پہنادی گئی۔ اور ڈرامہ شروع ہوگیا۔

'پھولوں میں گلاب
سازوں میں ستار
رنگوں میں لال ہی
کائنات میں سیاہی
دکھ، مصیبت، رنج اور تنہائی کی زبانی
یہ ہے۔ ایک عورت کی کہانی۔

روحی کے ابتدائی جملوں نے ہی جیسے سارے ہال کا دل جیت لیا۔ گرین روم میں موجود دینا ٹی وی اسکرین پر سب دیکھتی رحمان ہاشمی کے ساتھ مل کر تالیاں بجانے لگی۔

"حروف ساز" ایک ایسی عورت کی کہانی جس کا خاوند اسے جوانی میں ہی چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور کسی طوائف کے ساتھ شادی کرلیتا ہے۔ عدالت سے اپنا حق مہر حاصل کرنے میں جسے پانچ سال لگ جاتے ہیں اور جو اپنے ایک بیٹے کی پرورش انتہائی مشکلوں سے کرتی ہے۔ سارا ڈرامہ عورت کے گرد گھومتا تھا جس میں عورت کی ہمت اور جدوجہد کی کتھا بیان کی گئی تھی جو گھر کے علاوہ بڑی کامیابی سے این جی او بھی چلا رہی ہوتی ہے۔ ڈرامے کا اختتام اس سین پر تھا جس میں روحی تھکی ہاری گھر واپس آتی ہے اور اپنے بیٹے رامس کو اس کی دو ہفتے پہلے گزر چکی سالگرہ کا تحفہ دیتی ہے۔ بیٹے کے آئی ایم سوری کہنے کے بعد روحی کے جلالی تاثرات تھے اور پھر پردے گر جانے تھے، لیکن کون جانتا تھا کہ اٹھے پردے کبھی گر نہ سکیں گے۔

"مجھے آپ سے کوئی گفٹ نہیں چاہیے ممی... میں نے ہمیشہ اپنی زندگی میں آپ کی غیر حاضری کو محسوس کیا ہے۔"

عادی نے جھکی آنکھوں کے ساتھ فقرہ بولا... اور گرین روم میں بیٹھی دینا حیران سی رہ گئیں...

ٹھیک... تو ٹیلنٹ ان کے گھر میں بھی تھا... وہ ہی نہ جان سکیں، پھر روحی کے ڈائیلاگ شروع ہوئے۔

"تم کبھی کیسے نہ محسوس کرتے رامس... تم کبھی کیسے نہ محسوس کرتے۔" روحی نے ریہرسل سے بڑھ کر اداکاری کی تھی اور ہاتھ میں پکڑا گفٹ فرش پر دے مارا تھا۔

"میں نے تمہیں ماں اور باپ دونوں بن کر پالا ہے... تمہیں زندگی کی ہر آسائش دینے کے لیے میں

نے باہر مردوں کی طرح کام کیا ہے۔" روحی کا لہجہ سخت ہوتا چلا گیا۔

"تم اچھے اسکول میں پڑھو۔ اچھی یونی جاؤ... تمہارا مستقبل روشن ہو... ان سب کے لیے مجھے گھر سے باہر رہنا پڑا ہے۔" روحی نے اپنا سر تھام لیا۔

"رامس! کیا تم نے کبھی اپنی ماں کی زندگی میں جھانکنے کی کوشش کی ہے کہ اس نے اپنی زندگی کس کرب اور کس اذیت میں گزاری ہے۔ مطلب پرست مردوں سے بھری دنیا کا کس طرح سامنا کیا ہے۔ اس این جی او کو حاصل کرنے اور چلانے کے لیے کتنی محنت کرنی پڑی ہے تم کیسے اندازہ لگا سکتے ہو رامس؟"

یہاں روحی اس غصے کی حالت میں نظر آئی تھی جو پورے ڈرامے میں اس کے چہرے پر ظاہر نہیں ہوا تھا۔

"کمرے میں بند رہ کر ہر وقت ویڈیو گیمز اور فیس بک میں گم رہنے والا لڑکا اور دوستوں کے ساتھ پارٹیاں انجوائے کرنے والا لڑکا یہ کیسے جان سکتا ہے کہ باہر اس کی ماں کن حالات سے گزر رہی ہے۔"

اور روحی کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ چند لمحوں کا وقفہ آیا۔ جتنا طے تھا، لیکن طے شدہ وقفے کے بعد بھی خاموشی ہی رہی۔ عادی کچھ نہ بولا۔ روحی پہلے تو اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر بھنویں اچکا کر اسے ایک اشارہ کیا۔ اندر رحمان ہاشمی کی سٹی گم ہو گئی۔ تو کیا عادی دو لائنیں بھی ٹھیک سے یاد نہ کر سکا تھا۔

عادی ایک ٹک روحی کو دیکھے گیا۔ پھر اس نے چہرے کا رخ موڑ کر بھرے پرے ہال کو دیکھا اور نجانے کیا ہوا کہ ہر وقت دیوانوں کی طرح گھومنے والا عادی بانس کی طرح تن گیا۔ روحی اس سب کے لیے تیار نہیں تھی، وہ سہم کر رہ گئی۔

"کس محنت کی بات کر رہی ہیں آپ ممی...؟"

عادی بولا... کہاں سے...؟ یہ فقرہ اسکرپٹ میں تو تھا ہی نہیں... لہجے میں طنز تھا یا نخوت، روحی سمجھ نہ سکی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دینا نے اپنا سر پکڑ لیا۔ سارا ڈرامہ اچھا بھلا آؤٹ کلاس گیا تھا۔ اب آخر میں عادی کو یادداشت کو نجانے کیا ہو گیا تھا۔

"یہ محنت آپ کی خودساختہ تھی ممی... (نرم مگر تنبیہی لہجہ) آپ اپنی سرشت، اپنی فطرت کو محنت کا نام لیے دے سکتی ہیں... بس کریں ممی! اپنی تنہائی کا تمغہ اپنی ذات پر سجانا... اگر عورت واقعی میں کچھ تیاگ سکتی ہے تو وہ اس کی ذات ہوتی ہے جس کے انعام میں اس کا گھر بنتا ہے... میرے جیسے نفسیاتی روبوٹ نہیں جو صرف اپنی چارجنگ ویسٹ کرتے ہیں۔" (بھیگا لہجہ) روحی نے حیرت سے عادی کو دیکھا تھا اور اندر دینا سانس لینا بھول گئی تھیں۔

"جب عورت گھر نہیں بساتی تو وہ دنیا بساتی ہے۔ وہ دنیا جو تماشا گاہ ہے... آپ اس دنیا کے میلے میں کرتب کرتی رہیں... ماڈل کا... ایکٹر کا، لکھاری کا، خوب صورتی کا... ایک شوماں کا بھی ہو جاتا... دنیا کو آپ نے اپنی سلطنت سمجھ کر اس پر راج کرنا چاہا... تو پھر مجھے کیوں غلامی کی سزا دی...؟" عادی کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔

جوان بیٹا... آنسو۔

کس قدر خوف ناک الفاظ تھے یہ دونوں...

روحی خاموش رہی... وہ کیا جواب دیتی... اس کی تو سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ بول کون رہا ہے؟ کیا یہ ڈرامے کا کردار رامس تھا...؟ گھر میں موجود اس کا اپنا اٹھارہ سالہ بیٹا احمد...؟ دینا کا بیٹا عادی...؟ اسپتال میں پڑا حارث... یا ایک بیٹا...؟

اور اسے یہ بھی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ جواب کیا بن کر دے... ڈرامے کی ممی بن کر... روحی بن کر... دینا بن کر یا ماں بن کر...؟

"آپ مجھے بتائیں گی کہ آپ نے میرے لیے کیا کیا قربانیاں دیں... میں آپ کو حقیقت بتاتا ہوں ممی! کہ آپ نے وہ قربانیاں کن کے لیے دیں... آپ نے وہ قربانیاں خود اپنے لیے دیں... آپ کو زنجیروں میں نہیں بندھنا تھا... آپ کو شراکت سے چڑ تھی۔ آپ کو بس ایک مہرا چاہیے تھی۔ یکی سیاہی والی... ماں کی یا

بیوی کی... آپ کی آنکھیں دنیا کی چمک دمک سے خیرہ رہیں اور آپ دنیا کو خیرہ کرتی رہیں... اس کھیل میں مجھے بھی گھسیٹ لیتیں... نقلی ہی سہی... میں کسی ستون سے اپنا مجسمہ تو ٹکا پاتا کہ کبھی اس مجسمے میں بھی جان تھی... اب ساکت ہو گیا تو کیا۔" آنسو بہاتے بہاتے عادی نے تیز تیز لہجے میں کہا تھا۔

رحمان ہاشمی نے اپنی نوٹ بک نکال لی تھی... اگلے ڈرامے کا پلاٹ ان کے ذہن میں آ گیا تھا اور نام بھی... "قصہ گر..." (کہانی بنانے والا)... کاش یہ لڑکا ریہرسل کے دوران مل جاتا تو یہ ڈرامہ کیا زبردست ٹرن لیتا۔

تو کیا ڈرامے کا مرکزی کردار عادی تھا... روحی نہیں... حروف ساز... اور وہ سب کے سامنے کھڑا کب سے حروف ہی تو بنا رہا تھا۔ اس کی چال نے لکڑی کے تختوں کی خاموشی کو جلا ڈالا... تھیٹر کے سکوت میں موجود ایک ایک تماشائی نے اپنا تعلق بیرون سے جدا پایا... ادراک کے لمحے جیسے ان کی آنکھوں کے آگے آ کر سربستہ کھڑے ہو گئے۔ ساتھ ہی رحمان ہاشمی کو دینا سے ہمدردی کرنے کا خیال بھی آیا۔

"دینا..." انہوں نے دینا کے پتھر وجود کو ہلایا...

اسٹیج پر عادی چپ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

"آپ تو اپنی زندگی کو لے کر اتنی کم ظرف تھیں ممی! کہ آپ اپنی زندگی میں تھوڑی سی جگہ مجھے نہ دے سکیں... میرے لیے گفٹ لاتی ہیں... کوئی دوا لاتیں... جو میری ذات کو شفا دیتی... آپ خود کو لاتیں... اپنی اداکاری، ملمع کاری کو باہر چھوڑ کر... آپ کو دنیا کا سامنا ہی تو کرنا تھا... آپ کو دنیا ہی تو فتح کرنی تھی... مجھے مت بتائیں کہ آپ نے کن حالات کو فیس کیا... کیوں کہ پھر مجھے یہ بتانا پڑے گا کہ ان حالات کو آپ نے کس چاہت سے ایجاد کیا۔"

روحی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے... حالانکہ وہ ایک منجھی ہوئی اداکارہ تھی۔ کاش آج وہ اپنی آنکھوں پر بھی لپ اسٹک جیسا ہی کچھ لگا سکتی جو اس کے اندر کے درد کو چھپا دیتا... لیکن روحی کا درد دینا سے بڑھ کر نہیں تھا۔

"آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ سے معافی مانگوں... آج میں آپ کو معاف کرتا ہوں ممی... جو عورت ماں نہیں بن سکتی... دراصل وہ ہی سب کچھ بن سکتی ہے... آپ وہ سب بن گئیں... آپ نے سب پا لیا... مگر اپنا بیٹا کھو دیا... یہ سودا مہنگا تھا یا نہیں... لیکن بے مول ضرور تھا۔"

سکتہ شدہ ہال کو جیسے کسی نے جھنجھوڑا... ایک کے بعد ایک تالی کی آواز اور پھر تالیوں کے شور سے ہال گونج اٹھا... روحی صوفے پر بیٹھے بیٹھے پتھرا گئی' نجانے کس کے اشارے پر پردے گرا دیے گئے۔

عادی کی "اداکاری" پر کھڑے ہو کر تالیاں بجائی گئیں۔

اندر رحمان ہاشمی نے بے ہوش ہو کر گرتی دینا کو اپنی باہوں میں تھاما۔

"مس دینا... مس دینا... ہوش میں آیئے۔" آواز اور آوازیں دور تک پھیلتی چلی گئیں۔

"ڈرامہ فلاپ نہیں ہوا مس دینا..." رحمان ہاشمی بولے... جیسے کہ وہ جانتے نہیں تھے کہ دینا کیوں بے ہوش ہوئی ہیں۔

سارے کرو کو تو گویا سانپ سونگھ گیا۔ لوگ ایک دوسرے کی طرف ایسے دیکھنے لگے جیسے ان کے علاوہ باقی سب بھوت ہوں۔ پھر کسی کو خیال آیا کہ دینا میم کو بھی ہوش میں لانا ہے۔ کرو اکٹھا ہو کر پھر منتشر ہو گیا۔ سب ایسے انداز میں کام کرنے لگے جیسے اسٹیج کے پیچھے یہ سین بھی ڈرامے کا ہی حصہ تھا اور جیسے اس سین کی ریہرسل بھی بہت بار ہو چکی تھی۔

"عادی..." نیم وا آنکھوں سے ہوش میں آنے کے بعد بھی دینا بے ہوش ہی رہیں۔ عادی کو بلانے کوئی نہ گیا۔ کسی کی اتنی ہمت ہی نہ ہوئی۔ اور معاملہ سلجھ نہ سکا کہ آخر اسے وہ لائنیں ہی تو بولنی تھیں۔ پھر اس کے لفظوں نے گھرے بادلوں کی سی صورت کیوں اختیار کر لی۔

اور وہ وہ لائنیں کس قدر سادہ سی بھی تو تھیں... کس قدر سادہ سی...

بدیع الجمال

# سارا کھیل انا کا ہوتا ہے

ناولٹ

شاپنگ مال میں ایک شوز اسٹور کے سامنے سے گزرتے ہوئے میری نظر اندر پڑی تو میں چونک گئی۔ شوز شیلف کے سامنے دھیرے دھیرے سے چلتے ہوئے نظروں سے ان جوتوں کو پرکھتی وہ کوئی اور نہیں ٹینزی ہی تھی۔ پہلے تو مجھے گمان گزرا کہ شاید مجھے دھوکا ہوا ہے۔ لیکن وہ وہی تھی۔ میں رہ نہ سکی اور اسے پکار بیٹھی۔

''ٹینزی!''

آواز پہ چونک کر اس نے میری سمت دیکھا۔ میں اتنی بے تاب ہوگئی کہ بھاگ کر اس کے گلے جا لگی۔



وہ پہلے ہڑبڑائی پھر اس نے میری پیٹھ پہ اپنے ہاتھ رکھ دیے۔ میں آب دیدہ ہوگئی۔

ٹینزی کون تھی؟ میرا اس سے کیا رشتہ تھا؟ کیا ہمارے درمیان کوئی گہرا جذباتی اور عزت و محبت کا رشتہ تھا؟

ایسی کوئی بات نہ تھی۔ ٹینزی سے میرا وہ رشتہ تھا جس میں دو عورتوں کے بیچ کوئی محبت یا عزت کا جذبہ ناقابل یقین ہوتا ہے۔ یعنی سوت کا رشتہ۔ خیر' سوت تو وہ میری نہ تھی۔ لیکن سوت جیسی ہی تھی۔ میں اور ٹینزی ایک ہی آدمی سے محبت کرتی تھیں۔ اور میرا اس سے جلن کا رشتہ تھا۔ پھر اسے دیکھ کر میں اتنی بے تاب اور جذباتی کیوں ہوئی؟

یہ اس وقت کی بات ہے جب میں وحیدہ ممتاز ہوا کرتی تھی۔ میں ایک صاف رنگت کی' خوش شکل اور ذہین لڑکی تھی۔ جس گھر میں' میں پلی بڑھی تھی۔ اس میں ہمارے ساتھ ہمارے تایا کی فیملی بھی رہتی تھی۔ اسامہ خالد میرے تایا کا بیٹا تھا۔ خوبرو' اونچا لمبا' ذہین' خوش گفتار اور روشن خیال لڑکا۔ میں اسے پسند کرتی تھی اور اسے اپنی ملکیت سمجھ رکھا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ خاندان میں میرے سوا اس کے جوڑ کی کوئی لڑکی نہ تھی۔ میں اور وہ ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ میں اس کے چچا کی بیٹی تھی۔ اور اس کی بہن عائزہ کی میرے بھائی سرمد سے منگنی بھی ہوئی ہوئی تھی۔ ایسے میں صرف میں ہی اسامہ کی واحد اور بہت مضبوط امیدوار



تھی۔
مجھے یقین تھا کہ آج یا کل۔ اس نے آخر کار میرا ہی ہونا ہے۔ اس لیے کبھی میں نے اس سے فلمی قسم کے اظہار محبت کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ بلکہ میں تھوڑی بے نیازی اختیار کیے رکھتی تھی۔ آخر کو میرا تعلق کسی بہت آزاد خیال گھرانے سے نہ تھا۔ ہم برقعے اوڑھ کر رشتہ داروں کے گھر جانے والی تو نہ تھیں۔ لیکن اتنے بھی آزاد لوگ نہ تھے کہ جینز پہن کر سرخی پاؤڈر لگا کر بازاروں میں گھومتے۔ ہم دوپٹہ سر پہ اوڑھ کر اسکول جانے والی لڑکیاں تھیں اور اس سے زیادہ بے پردگی کو معیوب خیال کرنے والے لوگ تھے۔

جس یونیورسٹی میں اسامہ جاتا تھا۔ میرا ایڈمیشن بھی وہیں ہوا۔ میرا یونیورسٹی میں فرسٹ ایئر تھا اور وہ اپنے سیکنڈ لاسٹ ایئر میں تھا۔ میں نے اس کے ساتھ اس کی گاڑی میں یونیورسٹی جانا شروع کیا۔ تنزیلہ وہاب میری کلاس فیلو تھی۔ ایلیٹ کلاس کی فیشن ایبل لڑکی۔ حالانکہ اس کی صورت شکل بہت عام سی تھی۔ رنگت بھی گندمی سے کچھ زیادہ گہری تھی۔ لیکن بلا کی اسمارٹ تھی۔ اپنے گہرے بھورے بالوں کو اسٹریٹ کر کے آتی تھی تو کبھی لوز کرلز بنالاتی تھی۔ نیچرل میک اپ، کبھی جینز تو کبھی انگلش ڈریسز، کانوں میں ولایتی بالیاں اور گلے میں پتھروں والے لمبے ہار۔ کلائیوں میں بریسلٹس۔ خود کو تنزیلہ کے بجائے ٹمنزی کہلوانا پسند کرتی تھی۔ بے فکری اور لاابالی سی، شرم و حیا نام کو نہیں۔ بلا امتیاز لڑکوں اور لڑکیوں سے دوستی کرنا اور منہ پھاڑ پھاڑ کر قہقہے لگانا۔ مجھے تو وہ پہلے دن ہی ایک آنکھ نہ بھائی تھی لیکن لڑکوں کو جانے کیا نظر آگیا تھا اس میں۔ یونیورسٹی کے پروفیسرز سے لے کر اسٹوڈنٹس تک تمام مرد حضرات اس کے عشق میں گرفتار اور اس کے حسن کے گن گاتے نظر آتے تھے۔ جسے دیکھو اس کا نام لے کر آہیں بھرتا پایا جاتا اور صرف لڑکے ہی نہیں۔ کچھ احساس کمتری کی ماری لڑکیاں بھی جو اس کی شوخیوں سے متاثر ہو کر اس کی سہیلیاں کم چمچیاں زیادہ تھیں۔ جہاں جاتیں سب ساتھ جاتیں اور جو ٹمنزی کہتی' اس کی ہاں میں ہاں ملاتیں وہ حقیقتاً" اس کی چمچہ گیری ہی کرتی تھیں۔

میرا گروپ ان سے الگ تھا۔ میرے گروپ میں میرے جیسی ہی شریف گھرانوں کی لڑکیاں تھیں۔ ہم نے ہمیشہ اس سے دوری قائم رکھی۔ اس سے بات تک کرنے کی روادار نہ تھیں۔ وہ آتے جاتے ہائے ہیلو بول دیتی تھی۔ جو کہ اس کی عادت تھی کہ اپنے پاس سے گزرتے ہر لڑکے لڑکی کو 'ہائے' ہائے' کرنے کی۔ لیکن میں اس کے جواب میں شائستگی سے اسلام علیکم کہہ کر نگاہوں نگاہوں میں اسے نیچا دکھا کر اس کے پاس سے گزر جاتی تھی۔ ایسے اسے ذلیل کرنے کا اپنا ہی لطف تھا۔

ٹمنزی کو نہ صرف ہم ناپسند کرتی تھیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس سے خار بھی کھاتی تھیں۔ ہم اس بات پہ مصر تھیں کہ ٹمنزی میں کوئی خاص بات نہیں ہے اور ہمارے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ جبکہ سچائی تو یہ تھی کہ ہم جب بھی بیٹھتیں ہمارا موضوع گفتگو ٹمنزی ہی ہوتی۔ یا تو بیٹھ کر اس کی غیبت کر رہی ہوتیں' یا پھر بات کوئی بھی ہوتی' گھوم پھر کر بات ٹمنزی پہ آہی جاتی۔ ہم ماننے کو تیار تو نہ تھیں۔ لیکن بلاشبہ ٹمنزی ایک ہاٹ کیک تھی' ہماری یونیورسٹی میں۔ ہم ٹمنزی کو ناپسند کرتی اس سے دور دور رہتیں۔ لیکن بات تب بڑھی جب میرے اور اس کے درمیان مقابلہ چل نکلا۔ وہ صرف فیشن کرنے اور لڑکوں کو نخرے دکھانے میں تیز نہیں تھی۔ بلکہ پڑھائی میں بھی وہ مجھے مات دینے لگی تھی۔ اپنی کلاس میں' میں سب سے ذہین تھی۔ جتنے اچھے نمبر میں لاتی تھی۔ باقی سب کی پرفارمنس مجھ سے کہیں پیچھے تھی۔ صرف ایک یہ ٹمنزی تھی جو کبھی ایک دو نمبر کم تو کبھی زیادہ لا کر میرے آگے پیچھے آتی رہتی تھی۔ میرا اس سے خار بڑھ گیا۔ لیکن میں ابھی خاموش تھی۔ میری اس سے جنگ تب سنگین صورت اختیار کر گئی۔ جب ایک روز گھر واپسی پہ جاتے ہوئے اسامہ مجھ سے پوچھنے لگا۔

"وجی! تمام ٹمنزی کو جانتی ہو؟"
لہجہ عام سا تھا مگر میں پھر بھی چونک گئی۔ ٹمنزی کی شہرت اسامہ تک بھی پہنچ گئی تھی؟
"کیوں؟ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" میں نے اپنی ناگواری چھپائے بنا الٹا اس سے سوال کیا۔
"بہت چرچا سنا ہے اس کا۔ ایک دو بار دور سے دیکھا ہے۔ سنا ہے بہت ذہین بھی ہے۔ تمہاری کلاس میں ہے نا!... کیا تمہاری دوست ہے؟" گاڑی چلاتے اسامہ کی نظریں تو سامنے سڑک پہ تھیں مگر اس کے چہرے سے پتا چلتا تھا کہ وہ بھی ٹمنزی کے دیوانوں کی لائن میں لگ رہا ہے۔ میرے اندر زہر گھلنے لگا۔
"میں ایسی لڑکیوں سے دوستی نہیں کرتی۔" میرے لہجے میں واضح تحقیر تھی۔ اسامہ نے ایک نظر میرے چہرے پہ ڈالی۔
"کیا مطلب؟"
"وہ اچھے کردار کی لڑکی نہیں ہے۔ ایسی لڑکیاں جہنمی ہوتی ہیں جو پرائے مردوں کو اپنا فیشن اور ادائیں دکھا دکھا کر رجھانے کی کوشش کریں۔" میں نے صاف صاف کہہ دیا۔ جس پہ اسامہ کا ردعمل تھا۔
"استغفراللہ... ایسا کیا کر دیا اس بے چاری نے؟ صرف اچھا پہننے اوڑھنے پر اتنی بڑی بات کیسے کہہ دی تم نے۔ اتنا سنگین الزام؟"
اسامہ مجھے ملامت کر رہا تھا۔ مجھے پتنگے ہی تو لگ گئے۔
"آدھے سے زیادہ یونیورسٹی کے لڑکے اس نے اپنے پیچھے لگائے ہوئے ہیں۔ ان گنت لڑکوں سے دوستی گانٹھ رکھی ہے۔ یہ سب کچھ نہیں ہے تمہارے نظر میں؟"
"اف... ایک تو تم لڑکیوں کی جیلسی بھی نا۔"
اسامہ نے اب کے ہلکے پھلکے لہجے میں مزاح کے انداز میں کہا تھا لیکن اس کے الفاظ نے جلتی پہ تیل کا سا کام کیا۔
"جیلسی؟ میں جلوں گی اس بے حیا اور آوارہ لڑکی سے؟ میں ایک عزت دار گھر کی شریف لڑکی ہوں۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں ان چلتی پھرتی پبلک پراپرٹیز سے جلنے کی۔"
اسامہ ایک مرد بیٹھا تھا میرے سامنے۔ کوئی لڑکی ہوتی تو میں بلا لحاظ بہت گندے گندے الفاظ ٹمنزی کے لیے استعمال کرتی۔
"اچھا، اچھا بس کرو... میری غلطی تھی۔ جو تمہارے سامنے اس کا ذکر کر بیٹھا۔ معاف کر دو مجھے اب۔" اسامہ نے تیز آواز میں مجھے خاموش کروایا۔ پہلی بار میں نے اس کے لہجے میں اپنے لیے مذمت محسوس کی۔ وہ مجھ سے متنفر ہو رہا تھا۔ اس... کی خاطر، ایسا کیا جادو کر دیا تھا۔ اس نے سب لڑکوں پہ؟

☼ ☼ ☼

کچھ دن گزرے... معلوم ہوا ٹمنزی اور اسامہ میں بات چیت ہونے لگی ہے۔ اکثر یہاں، وہاں کھڑے ایک دوسرے سے گپ شپ کرتے پائے جانے لگے۔ میں اسامہ کے اس کی طرف جھکاؤ پہ خائف ہونے لگی۔ صاف صاف تو اسامہ سے بول نہیں سکتی تھی۔ اس لیے یونیورسٹی آتے جاتے گاڑی میں بہانے بہانے سے ٹمنزی کا ذکر نکال کر اسے بتانے لگی کہ ٹمنزی اچھے چلن کی لڑکی نہیں ہے۔ اس کی برائیاں کر کے دراصل میں اس کی برین واشنگ کر رہی تھی۔ اس کی برائیاں سن کر اسامہ کے چہرے پہ ناگواری چھا جاتی اور یہ دیکھ کر میرے دل پہ چھریاں چلنے لگتیں۔ ٹمنزی کے لیے میرے دل میں حسد اور نفرت کی آگ بڑھتی جا رہی تھی۔
یونیورسٹی میں ان دونوں کو لے کر چہ مگوئیاں ہونے لگی تھیں۔ اور میں احمق نہ تھی جو حقیقت سے نظریں چرا لیتی۔ میں جب بھی انہیں اکٹھا دیکھتی۔ ان کے پاس جا کھڑی ہوتی تاکہ وہ کوئی بھی آپس کی بات نہ کر سکیں۔ ٹمنزی پہ بھی واضح کر دیا کہ اسامہ میرا کزن ہے۔ اس لحاظ سے اسامہ پہ حق صرف میرا ہے اور ٹمنزی بہت ہی منافق لڑکی تھی۔ میرے اور اس کے درمیان سخت مقابلہ ہونے کے باوجود وہ مجھ سے ہنس

ہنس کر باتیں کرتی تھی اور کبھی بھی اسامہ اور اس کی میٹنگ میں میری مداخلت پہ ناگواری کا کوئی اظہار نہیں کرتی تھی۔ وہ جیسے ہر کسی کے ساتھ پیش آتی تھی۔ ویسا ہی رویہ اس کا میرے ساتھ بھی تھا۔ اور یہ کھلی منافقت نہیں تو اور کیا تھی؟

میں اسے اسامہ سے دور رکھنے اور اسے اسامہ کی نظروں سے گرانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھی۔ اسامہ کے سامنے اس کے عیب گنواتی تھی اور سالانہ امتحانات میں اسے مات دینے کے لیے بھی میں نے دن رات محنت کی اور میں نے کر دکھایا۔ میں اس سے پورے دس نمبرز زیادہ لے کر فرسٹ آئی تھی۔ چشم تصور سے میں نے اسے مارے حسد کے انگاروں پہ لوٹتے دیکھا تو بہت ہنسی۔ اسامہ بھی میری کامیابی پہ بہت خوش ہوا۔ مجھے مبارک باد دی اور کہا۔

"اتنے اچھے گریڈز تو کبھی میرے بھی نہیں آئے۔"

میرا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ میں نے یہ معرکہ سر کر لیا تھا۔ ٹمنزی کو گرا کر خود اسامہ کی نظروں میں اونچی ہو گئی تھی۔ لیکن میرا یہ غرور اور اطمینان اس وقت خاک ہو گیا جب میں یونیورسٹی گئی۔ پہلے دن ہی جب اسامہ کے ساتھ میں یونیورسٹی کی پارکنگ سے نکل کر بلڈنگ کی طرف بڑھی تو ٹمنزی اپنی چمچیوں کے ساتھ بکے اور پھولوں کے ہار لے کر کھڑی تھی۔

"کانگریچولیشنز۔" کہہ کر مجھے بکے اور پھولوں کے ہاروں سے لاد دیا۔ ٹمنزی مجھ سے لپٹ گئی اور اپنی بغل سے لگائے خوشی سے چلاتی آواز میں بولی۔

"وحیدہ نے اتنی شان دار کامیابی حاصل کر کے ہمارا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ ومن پاور! ہے۔"

اس نے مکا بنا کر ایسے ہوا میں لہرایا جیسے میری کامیابی پہ اس کا نام روشن ہوا ہو۔ حالانکہ یہ اس کے لیے شرم سے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔

"تمہیں بھی بہت بہت مبارک ہو اسامہ۔ کزن ہونے کے ناتے تم بھی مبارک باد کے حق دار ہو۔"

ساتھ ہی اسامہ سے مخاطب ہونے کا بہانا ڈھونڈ لیا۔ اسامہ نے مسکرا کر اس کی مبارک باد قبول کی۔ میں نے اسامہ کی نظروں میں ٹمنزی کے لیے ستائش دیکھی۔

"چلو بھئی۔ وحی کی کامیابی کی خوشی میں آج شام میری طرف سے ریسٹورینٹ میں ڈنر۔ میں ٹیبل بھی بک کروا چکی ہوں۔ ہم سب سلیبریٹ کریں گے۔ اور وحی ہماری گیسٹ آف آنر ہو گی۔"

ٹمنزی نے ایسا اعلان کیا کہ میں بوکھلا سی گئی۔ (اب میں اس لچی سے پارٹی لوں گی؟)

"نہیں نہیں۔ ایسا کون سا تیر مار لیا میں نے جو پارٹی کریں گے؟ مجھے نہیں چاہیے۔" میں نے منع کیا۔

"او کم آن وحی! تم نے اعزازی نمبروں سے پاس ہو کر بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ عورتوں کی برتری اور کامیابی کی تو میں زبردست حامی ہوں۔ ہر عورت کی جیت میری جیت ہے اور اس جیت کو سلیبریٹ ضرور کرنا چاہیے۔"

ٹمنزی نے اصرار کیا۔ بالواسطہ وہ مردوں پر چوٹ کر رہی تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے اسامہ کو دیکھا کہ اب ٹمنزی کے یہ خیالات سن کر وہ کیسا محسوس کر رہا ہے؟ مگر وہ تو بہت خوش تھا۔

میں مان نہیں رہی تھی مگر اسامہ نے بھی ٹمنزی کی حمایت کی تو مجھے ہامی بھرتے بنی۔

جو عزت اور مقام میں نے امتحان میں کامیابی سے حاصل کیا تھا۔ وہ ٹمنزی نے میری کامیابی کا جشن منا کر مجھ سے چھین لیا تھا۔ میں پس منظر میں چلی گئی تھی اور وہ اسامہ کی نظروں میں آ گئی تھی۔ میں کیسے خاموش رہتی؟

"دیکھا تم نے۔ کس قدر چالاک اور مکار لڑکی ہے۔ مجھ سے مات کھا کر وہ کلاس میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہی تھی۔ کس چالاکی اور ہوشیاری سے اس نے میری جیت کو سلیبریٹ کر کے اپنا نام اور مقام بلند کر لیا ہے۔ بہت ہی چلتر اور چالباز عورت ہے۔"

ریسٹورنٹ سے واپسی پہ میں نے گاڑی میں اسامہ سے کہا۔ اسامہ کی تو مانو دم پر پیر رکھ دیا ہو۔

"یار! آئی کانٹ بیلیو دس۔ تم کیوں ہر وقت اس بے چاری کے پیچھے پڑی رہتی ہو؟ وہ کچھ اچھا کرے تو بھی مجرم' کچھ نہ کرے تو بھی گناہ گار۔ خود اس نے کبھی تمہارے بارے میں ایک لفظ بھی غلط نہیں کہا اور تم جب دیکھو اس کی برائیاں کرتی رہتی ہو۔ حسد جلن کی بھی کوئی حد ہوتی ہے یار!"

اسامہ کے اس طرح ثمینزی کی حمایت میں بولنے پہ ہمیشہ کی طرح مجھے آگ لگ گئی۔

"میں کیوں جلوں گی اس سے؟ میری تو یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ تمہیں اس 'بے چاری' میں کیا نظر آگیا ہے جو تم اس کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتے؟ نہ صورت' نہ شکل' نہ کردار۔ پھر بھی جسے دیکھو اسی کا دیوانہ ہو رہا ہے۔ ایسا کون سا جادو کر دیا ہے اس نے جو سر چڑھ کر بول رہا ہے؟ سوائے ادائیں دکھا دکھا کر لڑکے پیچھے لگانے کے اور اسے آتا ہی کیا ہے؟ کون سی کوئی خوبی یا ہنر ہے اس میں؟ یا وہ کوئی حسن کی ملکہ ہے؟" میں پھٹ پڑی تھی۔ اسامہ نے ایک نفرت بھری نگاہ مجھ پہ ڈالی۔

"ہاں تم ہمیشہ ایسے ہی جل جل کر گھٹیا پن کا مظاہرہ کرتی رہنا۔"

میں اور بھی بھڑک گئی۔

"میں گھٹیا پن کا مظاہرہ کرتی ہوں؟ میں جانتی ہوں؟ اور اس میں تو سب اچھا ہے نا... کل کو میں اگر سرخی پاؤڈر' چہرے پہ تھوپ کر پینٹ شرٹ پہن کر یونیورسٹی چلی جاؤں اور سارے لڑکے اپنے پیچھے لگا لوں۔ تب بھی کیا تم مجھے اسی طرح سپورٹ کرو گے جیسے اسے کرتے ہو؟"

میں نے ایسا سوال کر دیا جس نے اسے لاجواب کر کے رکھ دیا۔ اس کو لاجواب دیکھ کر میرے اندر بھڑکتی آگ پہ تسکین کے چھینٹے پڑے۔ میں نے اسامہ پہ ثابت کر دیا تھا کہ ثمینزی میں کیا برائی ہے اور میں اس سے کس درجہ بہتر ہوں۔

"بچپن سے سنتی آئی ہوں۔ عورت عورت کی دشمن ہے۔ لیکن میں یہ نہیں مانتی۔ صرف عورت ہی عورت کے درد کو سمجھ سکتی ہے۔ احساس' ہمدردی' خیر خواہی۔ یہ احساسات جتنے عورت میں ہیں' مرد میں نہیں۔ مرد فطرتاً" ایک بے حس خود غرض ذات ہے۔ عورت کائنات کی سب سے حساس اور رحم دل اور محبت کرنے والی مخلوق ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کی قدر کرنا چاہیے۔ اپنی قدر و قیمت کو سمجھتے ہوئے اپنی ذات کو عزت دینی چاہیے۔

افسوس کے ساتھ ایک چھوٹی سی تعداد ان عورتوں کی بھی ہے' جو عورتوں سے خار کھاتی ہیں۔ حسد کرتی ہیں۔ لیکن ایسا کرنے والی عورتیں خود اپنی دشمن ہیں۔ خود اپنا نقصان کرتی ہیں۔ یہ بات مکمل طور پر غلط ہے ویمینز یار اور ویمنز یونیٹی کی بہت حامی ہوں۔"

ثمینزی محترمہ اپنی چمچیوں اور کچھ چھچھورے مداحوں کے ٹولے میں بیٹھ کر باآواز بلند اپنے زریں خیالات کا اظہار کر رہی تھیں۔ جانے کہاں کہاں سے آرٹیکلز اور فلاسفروں کی کتابوں سے پیراگراف رٹ کر آجاتی تھی اور اپنا نام لگا کر یونیورسٹی میں لڑکوں لڑکیوں کو سناتی تھی۔ ورنہ یہ اس کے اپنے خیالات تھے۔ میں نہیں مان سکتی تھی۔ یہ تو صرف دوسروں کو مرعوب کرنے کے اس کے ٹیک ٹیکس تھے۔ جو خاصے کارگر بھی تھے۔ نہ صرف وہ ایسی باتیں کرتی تھی۔ بلکہ عملاً" بھی جیسے حقوق نسواں کی علمبردار بنی پھرتی تھی۔ جہاں کہیں کسی لڑکی کو مشکل میں دیکھتی' پہنچ جاتی سپروومین بن کر اس کی مدد کرنے کو۔ کہتی تھی کہ اگر کوئی لڑکی کچھ غلط کر بھی دیتی ہے۔ تو بھی ہم خود ہیں نا اس کی مذمت کرنے کو۔ لڑکوں کے سامنے اسے تنہا کیوں چھوڑیں یا کیوں اسے رسوا کرنے کی اجازت دیں؟

اور اس کا اثر یہ تھا کہ۔

"ثمینزی بہت کمال لڑکی ہے۔"

"عام لڑکیوں سے بہت مختلف ہے۔"

"وہ بہت ڈفرنٹ سوچتی ہے۔"

ایسے تبصرے لوگ' خاص طور پر لڑکے اس کے بارے میں کرتے تھے۔ ایسے ہی لڑکیوں کی ہیروئین بن کر وہ لڑکوں کو متاثر کرتی تھی اور ان متاثر ہونے والوں میں اسامہ بھی تھا۔

میری دور کی نظر کمزور تھی تو میں نے چشمہ لگالیا۔ پہلے دن چشمہ لگا کر یونیورسٹی جاتے ہوئے میں کچھ گھبرا رہی تھی۔ مجھے خود آئینے میں اپنی صورت اوپری اوپری لگ رہی تھی۔ کسی اور سے کیا اچھے کی امید رکھتی' جب گاڑی میں بیٹھی تو اسامہ ہی بول اٹھا۔

"تم یہ لگا کر یونیورسٹی جاؤ گی؟"

انداز ایسا تھا جیسے چشمہ لگا کر یونیورسٹی جانا معیوب ہو۔

"یونیورسٹی کے لیے ہی تو لیا ہے۔ بورڈ پہ کیا لکھا ہوتا ہے' مجھے کچھ نظر ہی نہیں آتا۔"

میں نے جواب دیا تو اسامہ خاموش ہو گیا۔ مگر میری بے چینی بڑھ گئی۔ دل تو اور برا ہو گیا تھا مگر میں نے چشمہ نہیں اتارا۔ اب دو ہی کام ہو سکتے تھے۔ یا تو میں چشمہ پہنتی یا پھر پڑھائی سے دست بردار ہو جاتی۔ کیونکہ چشمہ لگائے بغیر تو مجھے کچھ ٹھیک سے نظر آتا نہیں تھا۔ سو مجبوری تھی۔

گاڑی یونیورسٹی کی پارکنگ میں رکی تو اسامہ اپنی پروجیکٹ نوٹ بک کے ساتھ کچھ اور چیزیں بھی اکٹھی کر رہا تھا۔ میں اس کا انتظار کیے بنا گاڑی سے نکل آئی۔ یونیورسٹی کے باغ میں روش پہ چلتی جا رہی تھی اور سامنے سے ہماری کلاس کے چار پانچ لڑکوں کا ٹولہ آ رہا تھا جنہیں کبھی میں نے اتنی اہمیت بھی نہیں دی تھی کہ ان کے نام جانتی۔ وہ مجھے چشمہ لگائے دیکھ کر ٹھٹک گئے اور ایک بڑبولا تو بول بھی اٹھا۔

"اوئے۔ یہ کیا پہنا ہے؟"

میں خاصی پزل ہوئی۔

"خود کو دیکھو تم پہلے۔" اچانک سے سپر دومن جانے کہاں سے آ ٹپکی۔ میرے قریب کھڑی ہو کر اس لڑکے سے مخاطب ہوئی۔

"کیوں آفتاب شیرازی! خود تم پچھلا پورا ہفتہ طوطے کے رنگ کے موزے پہن کر یونیورسٹی آتے رہے۔ کیا ہم نے کبھی ان پر کمنٹ کیا؟ ہر انسان نظر کمزور ہونے پہ چشمہ ہی لگاتا ہے۔ اس میں کمنٹس پاس کرنے والی کیا بات ہے؟ کسی نے کیا پہنایا لگایا ہے یہ تمہارا پرابلم نہیں ہے۔ اپنے کام سے کام رکھا کرو۔"

ٹھنزی نے اسے جھاڑ پلا کر میرا سیروں خون بڑھا دیا۔ اس نے سنایا ایک کو تھا اور شرمندہ ان کا پورا ٹولہ ہوا تھا۔ مجھے ٹھنزی پہلی بار اچھی لگی۔

"چلو' آؤ وحی! ایسے لوگوں کی باتوں کو اہمیت نہیں دیتے۔"

ٹھنزی نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے لیے بے باکی سے ان لڑکوں کے ٹولے کو چیر کر ان کے درمیان سے گزرتی آگے بڑھنے لگی۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بلا ارادہ ہی میرا سر گھوما تھا۔ میں نے کچھ دور کھڑے اسامہ کو دیکھا۔ جو ٹھنزی سے متاثر ہوا اسے دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں ٹھنزی کی ساری چالاکی سمجھ گئی۔ ضرور اس نے اسامہ کو دیکھ لیا تھا اور اس کی نظر میں اپنی عزت بنانے کے لیے اس نے میری حمایت کی تھی۔

"گلاسز تم پہ بہت اچھے لگ رہے ہیں۔ پہلے کبھی تم نے لگائے نہیں نا' اس لیے شاید تمہیں آکورڈ لگے۔ لیکن ٹرسٹ می۔ بہت سوٹ کر رہے ہیں تمہارے چہرے پہ۔ پھر بھی اگر کوئی کچھ بکتا ہے تو بکنے دو۔ تمہیں اثر لینے کی ضرورت نہیں۔ تم نے یہ اپنے لیے لگائے ہیں۔ ان کے لیے نہیں۔"

ٹھنزی میرے ساتھ چلتی' میری بیسٹ فرینڈ بنی مجھ سے کہہ رہی تھی اور میں کچھ اور سوچ رہی تھی۔ یہ منافق عورت اسامہ کو یہ دکھاوا کر اس کی نظروں میں اونچی ہو رہی تھی کہ وہ میری بہت خیر خواہ ہے۔ میں نے بھی اس کو اس کے ہتھیار سے مات دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس دن کے بعد سے میں بھی اوپر اوپر سے اس کی دوست بن گئی۔ اسامہ کے سامنے اس کی برائی چھوڑ

دی اور اس کی ہر بات میں اس کی حمایت کرنے لگی۔ ساتھ ہی ساتھ میں موقعے کی تلاش میں تھی کہ مجھے کوئی ایسا چانس ملے کہ میں بنا اپنی زبان سے اس کی برائی کیے اسے اسامہ کی نظروں سے گرا سکوں۔

ٹمنزی کی نام نہاد دوست بننے کا مجھے جہاں یہ فائدہ ہوا کہ اسامہ نے مجھے عزت کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا۔ وہیں پہ یہ عذاب بھی ہو گیا کہ وہ اکثر میرے سامنے ٹمنزی کے لیے اپنے جذبات اور اپنی خواہشات کا اظہار کرنے لگا تھا۔ میرے لیے وہ سب سننا اور برداشت کرنا پل صراط پر چلنے کے مترادف تھا۔ لیکن میں صبر کا وہ کڑوا گھونٹ پی رہی تھی۔ مجھے بس موقعے کی تلاش تھی۔ اور مجھے ایسا موقع مل بھی گیا۔ موسم بدلنے سے مجھے نزلہ زکام کے ساتھ بخار بھی ہو گیا تو میں پورے پانچ دن یونیورسٹی نہ جا سکی۔ میری پڑھائی کا حرج ہو گیا تھا اور امتحانات بھی دور نہ تھے۔ میں یونیورسٹی گئی۔ جب میں نے اسامہ اور ٹمنزی کو باغ میں ایک ساتھ بینچ پہ بیٹھے دیکھا تو ان کے پاس چلی آئی۔

"ہائے ٹمنزی! تم یہاں بیٹھی ہو۔ یار! مجھے تمہاری فیور چاہیے تھی۔"

"ہاں بولو!" ٹمنزی جیسے ہمہ تن تیار تھی میری مدد کرنے کو۔ میں نے لاچار سی صورت بنالی۔

"یار! اتنے دن غیر حاضر رہنے کی وجہ سے میری پڑھائی کا بہت حرج ہو گیا ہے۔ اگر تم مجھے نوٹس دے دو تو میں پچھلا سارا کور کرلوں گی۔"

میں نے ایسا تیر چلایا تھا جو ٹھیک نشانے پہ لگتا۔ ٹمنزی کبھی بھی اپنے نوٹس مجھے دینے کو تیار نہ ہوتی۔ یا وہ صاف انکار کر دیتی یا پھر بہانا بنا کر ٹال دیتی۔ اور یہی میں چاہتی تھی تاکہ اس کا اصل چہرہ اسامہ کو دکھا سکوں۔ اگر وہ انکار کرتی تو اسامہ یقیناً" اس سے متنفر ہوتا۔ اور اگر بہانا کر دیتی تو اس کے بعد ایگزام میں اگر وہ مجھ سے آگے نکل جاتی تو میں اسامہ پہ ثابت کر دیتی کہ میری ناکامی کی وجہ ٹمنزی کی بدنیتی تھی۔ اور اگر پھر بھی میں کامیاب ہو جاتی پھر تو ٹمنزی کے لیے اور بھی شرم سے ڈوب مرنے کا مقام ہوتا۔ پھر میں اس سے پوچھتی کہ مجھے ہرانے کی کوشش کے باوجود وہ مجھے ہرا نہ سکی تو اب کیسے مجھے میری جیت کی مبارک باد دے گی؟

ٹمنزی منافقت کی انتہا کرتے ہوئے بولی۔ "یار! آف کورس۔ نوٹس تو میں تمہیں دے دوں لیکن اس وقت وہ میرے پاس نہیں ہیں۔ گھر پہ رکھے ہیں۔ اگر تمہیں ارجنٹ نہیں چاہیے تو میں کل لے آؤں گی۔"

میری توقع کے عین مطابق اس نے بہانا کر دیا تھا۔ میں دل میں خوش ہوتی مایوس شکل بنا کر بولی۔

"چاہیے تو مجھے آج ہی تھے۔ مگر۔۔۔ ٹھیک ہے۔ تم کل لے آنا۔"

اسامہ کے سامنے میں نے جتا دیا کہ مجھے کتنے ضروری نوٹس چاہیے تھے جو نہ ملے تھے اور میری بات سن کر ٹمنزی کے چہرے پہ پریشانی کے جو گہرے سائے لہرانے لگے تھے۔ انہیں دیکھ کر تو میں دل ہی دل میں بہت محظوظ ہوئی۔

یقیناً" سوچ رہی ہو گی کہ بہت بری طرح سے پھنس گئی ہے۔

میں نے سوچا اور گھر آ کر بھی میں اس کی شکل یاد کر کرکے دل میں ہنستی رہی۔ شام کو میں اپنے کمرے میں کتابیں پھیلائے بیٹھی تھی کہ اسامہ میرے کمرے میں آیا۔

"لو ٹمنزی نے بھیجے ہیں۔" ساتھ ہی کاغذات کا ایک پلندہ میری طرف بڑھایا۔ میں ششدر رہ گئی۔

"ٹمنزی نے؟" کاغذات لے کر دیکھے تو وہ نوٹس تھے۔

"کیسے بھیجے اس نے؟ تم گئے تھے اس کے گھر یا وہ آئی تھی؟"

مجھے جو پریشانی لاحق ہو گئی تھی اس کے تحت میں نے پوچھا۔

"اس نے مجھے ای میل کیے تھے کہا کہ تمہیں آج ہی چاہییں تو اس لیے پرنٹس نکلوا کر تمہیں دے

دوں۔" اسامہ نے سادگی کے ساتھ بتایا۔

اس وقت اچانک اٹھ آیا غصہ میں نے کیسے دبایا تھا' میں ہی جانتی تھی۔ کیا یہ ناٹک کرنا ضروری تھا؟ نوٹس دینے ہی تھے تو کل نہیں دے سکتی تھی؟ اور اتنی ہی مخلص تھی تو مجھے ای میل کر دیتی۔ اسامہ کو کیوں کی۔ خیر' اسامہ کا اس کے پاس ای میل ہو گا۔ میرا نہیں۔ لیکن لے لیتی نا مجھ سے مگر نہیں اس نے یہ سب صرف اسامہ کو دکھانے کے لیے کیا تھا تاکہ اس کی نظر میں اچھی بنے۔ میں جتنا جلتی کڑھتی کم تھا۔ لیکن اسامہ کے سامنے مجھے مسکرا کر شکریہ ادا کرنا پڑا۔

☆ ☆ ☆

ہمارا یونیورسٹی کا دوسرا سال بھی مکمل ہو گیا لیکن مجھے کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔ ٹھنزی سے دوستی کر کے میں نے اسامہ کی نظروں میں اپنی عزت تو بنالی تھی' لیکن اسے گرانے میں اب تک کامیاب نہیں ہوئی تھی اور ان دونوں کا عشق تھا کہ دن بدن شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ اسامہ تو اپنا آخری سال مکمل کر کے فارغ ہو گیا تھا۔ اور میں ایک بار پھر ٹھنزی کو مات دے کر فرسٹ آئی تھی۔ پھر تھرڈ ایئر میں پہلا دن۔ اسامہ مجھے یونیورسٹی چھوڑنے آیا۔ باہر سے ہی واپس جانے کے بجائے اس نے اندر جانے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے بھی اعتراض نہ کیا۔ سوچا کہ ٹھنزی نے اس بار تو کوئی ناٹک نہ رچایا ہو گا کیونکہ وہ سمجھتی ہو گی کہ اب اسامہ یونیورسٹی میں نہیں رہا۔ اور میں اسامہ کے سامنے اپنی تکلیف کا اظہار کر دوں گی کہ اس بار ٹھنزی مجھ سے جل گئی اور مجھے مبارک باد نہیں دی۔ لیکن جس طرح ایک بار پھر ٹھنزی مجھے مبارک باد دینے کے لیے اہتمام کر کے کھڑی تھی۔ اس سے میں سمجھ گئی کہ اسامہ کا اندر آنا پہلے سے طے تھا۔ ٹھنزی کو معلوم تھا کہ وہ اندر آئے گا اور اس نے ایک بار پھر میری جیت کی خوشی منا کر خود کو اسامہ کی نظروں میں سرخرو کرنے کا سارا انتظام کر لیا تھا۔ میں اس کی حرکت پہ اندر ہی اندر بل کھا کر رہ گئی۔

خیر' اسامہ تو اب اس یونیورسٹی میں تھا نہیں۔ مجھے اب اس کی دوست کا ناٹک کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اپنے رویے سے اس کے لیے نفرت اور تحقیر کا اظہار شروع کر دیا۔ بات بات پہ اسے نیچا دکھا کر مجھے عجیب سی خوشی اور تسکین ملتی تھی۔ اور میں یہ بھی چاہتی تھی کہ وہ میرے رویے کی شکایت اسامہ سے کرے۔ تاکہ پھر اسامہ بھی اس سے ویسی ہی نفرت کرے جیسی وہ مجھ سے کیا کرتا تھا۔ کیونکہ اسامہ کے مطابق میری ابھی بھی ٹھنزی سے بہت اچھی دوستی تھی اور وہ خود یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد بھی اس سے ملتا تھا اور ٹیلی فونک رابطہ بھی دونوں کا قائم تھا۔ بلکہ یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد ان کا عشق اور بھی زور پکڑ گیا تھا۔

ٹھنزی بہت مکار اور چالاک لڑکی تھی۔ میں دو تین بار یونیورسٹی میں اس سے لڑی۔ سب کے سامنے اسے ذلیل کیا اور صاف صاف کہا کہ "اسامہ سے دور رہو۔ وہ صرف میرا ہے۔" لیکن اس لڑکی نے اسامہ کا پیچھا چھوڑا نہ اسامہ سے میری شکایت کی۔ وہ ایک بار اسامہ کے سامنے میری برائی کرتی تو۔ تب دیکھتی کہ میں ان کا تختہ کیسے پلٹتی ہوں۔ لیکن ایسا کوئی موقع نہ آیا۔

مجھ پہ فرسٹریشن طاری ہونے لگی۔ ان ہی دنوں میں میرے بھائی سرمد اور اسامہ کی بہن عائزہ کی شادی کی تیاریاں بھی ہونے لگیں اور ادھر اسامہ بہت اچھی جاب سے لگ کر اب جلد سے جلد ٹھنزی سے شادی کے ارادے کرنے لگا۔ یہ میں ہی تھی جس نے اسے گھر والوں کو ٹھنزی کے بارے میں کچھ بھی بتانے سے منع کر رکھا تھا۔ لیکن اب میرے پاس اور کوئی راستہ نہ بچا۔ گھی سیدھی انگلی سے نہ نکلے تو انگلی ٹیڑھی کرنا پڑتی ہے۔ ویسے بھی جنگ اور محبت میں تو سب جائز ہے۔ میں ٹھنزی کو بار بار شکست دے کر بھی اسامہ کو جیت نہ سکی تھی۔

اب صرف ایک ہی راستہ بچا تھا۔ میں اپنی ماں کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور انہیں اسامہ سے متعلق اپنے جذبات سے آگاہ کر دیا۔ میرے منہ سے صاف الفاظ

میں اسامہ کے لیے اپنے جذبات اور شادی کی خواہش کا اظہار ان کے لیے غیر متوقع ضرور تھا۔ لیکن وہ بھی میری ماں تھیں۔ اتنا تو وہ سمجھتی تھیں کہ اسامہ ایک بہترین لڑکا تھا اور اس کے علاوہ خاندان میں کوئی میرے جوڑ کا بھی نہ تھا۔ اگر اسامہ کو حاصل کرنے میں میرا ساتھ نہ دیتیں تو کس سے بیاہتیں مجھے؟

پھر کیا تھا۔ اسی روز امی نے ابو سے بات کی اور اگلے روز ابو اور امی نے تایا اور تائی کے سامنے میری اور اسامہ کی شادی کا پرپوزل رکھ دیا۔ پہلے تو اسامہ نہ مانا۔ لیکن جب میرے بتائے ہوئے ہتھکنڈے کے مطابق امی اور ابو نے ان کے انکار کو اپنی عزت اور انا کا مسئلہ بنا کر عائزہ اور سرمد کے رشتے سے بھی انکار کر دیا تو تایا اور تائی کو بھی اسامہ پہ دباؤ ڈالتے بنی۔ اسامہ بے چارہ مجھ سے مدد طلب کرنے چلا آیا۔

"میں تو مجبور ہوں۔ پلیز تم ہی اپنے امی ابو کو سمجھاؤ۔"

اس نے منت بھرے لہجے میں کہا۔ میں تو تھی ہی مشرقی لاچار لڑکی۔

"کیا تم اپنے امی اور ابو کو سمجھا سکتے ہو؟..... جس طرح تم مجبور ہو' اسی طرح میں بھی مجبور ہوں۔ جب تم مرد ہو کر کوئی اسٹینڈ نہیں لے سکتے تو میں لڑکی ہو کر کیسے اپنے والدین کے فیصلے کے خلاف جا سکتی ہوں۔"

میری مجبوری اور بے بسی بالکل صحیح تھی۔ اسامہ کو خاموش ہوتے ہی بنی اور سرمد اور عائزہ کے ساتھ ہماری شادی بھی طے پا گئی۔

میں بہت خوش اور مطمئن تھی۔ ایک فائنل مات میں نے ٹینزی کو دے دی تھی۔ شادی کے بعد اسامہ ہمیشہ کے لیے میرا ہونے جا رہا تھا۔ لیکن ایک بار پھر اس عورت نے ایک گھٹیا چال چل دی۔ میرے اور اسامہ کے نکاح سے ٹھیک ایک دن پہلے یعنی کہ مہندی کی رات مہندی کے فنکشن کے بعد آدھی رات کو اسامہ گھر سے نکلا تو پھر فجر کے بعد ہی واپس آیا۔ سب نے بہت پوچھا کہ وہ کہاں تھا۔ لیکن اس نے کسی کو کچھ نہ بتایا۔ مگر اس کی متورم اور لال آنکھیں دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ وہ رات بھر جاگ کر کہاں اپنا منہ کالا کرتا رہا ہے۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ عورت اتنی گھٹیا چال بھی چل سکتی ہے۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق میں نے نکاح تو کر لیا۔ رخصتی بھی ہو گئی۔ لیکن سہاگ رات کو میں نے اسے ہاتھ بھی لگانے سے منع کر دیا۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں؟ کہ کسی دلہن نے سہاگ رات کو اپنے میاں سے اس کی گزشتہ شب کا حساب مانگا ہو؟ میں نے مانگا تھا۔

پہلے تو اس نے بہت انکار کیا۔ مجھ سے اخلاص اور وفا کی قسمیں کھائیں۔ لیکن پھر میں نے اسے کھری کھری سنائیں تو اس نے بھی اعتراف کر لیا کہ وہ ساری رات ٹینزی کے پاس تھا۔ اس سے آگے مجھے اور کیا سننا تھا؟ ایک مرد پوری رات اپنی معشوقہ کے ساتھ گزار لے۔ کیا رات بھر وہ اس سے راکھیاں بندھواتا رہا تھا؟

میرے اور اس کے درمیان جو اعتماد اور بھروسے کا رشتہ تھا۔ اس میں پہلے روز ہی بہت بڑا شگاف پڑ گیا۔ میں اس پہ شک کرنے لگی۔ اس کے فون پہ آئی ہر کال پہ چوکنا ہو جاتی۔ ہر بار اس کے گھر سے باہر آنے جانے پہ سوال کرتی۔ اس کی سب حرکات و سکنات پہ نظر رکھتی۔ اور اس وجہ سے ہمارے درمیان کتنی بار جھگڑا بھی ہوا۔ جس کے نتیجے میں میں اسے ٹینزی کے طعنے دیتی اور ٹینزی کو گالیاں بکتے ہوئے اس کے کردار پہ کیچڑ اچھالتی تھی۔ اس بدچلن عورت نے شادی ہو جانے کے باوجود اسامہ کو میرا نہیں ہونے دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ہماری شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد ہم اسامہ کو کمپنی کی طرف سے ملے ہوئے فلیٹ میں منتقل ہو گئے۔ وہاں بھی ہمارے تعلقات ایسے ہی رہے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ اسامہ میرے پاس آیا اور مجھ سے نرمی سے اور محبت سے بات کرتے ہوئے اپنے

خلوص کا یقین دلانے لگا۔ مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ صرف میرا ہو کر رہے گا۔ دو دن اس کا رویہ میرے ساتھ بہت اچھا رہا۔ تیسرے دن میں نے اس کے فون پہ میسج پڑھ لیا۔ جس میں اس نے ثمنزی کو لکھا تھا کہ اس کے کہے کے مطابق وہ مجھے خوش رکھ رہا ہے۔ یعنی کہ وہ مجھے خوش رکھ کر میرا اعتبار جیتنا چاہتا تھا۔ تاکہ اس کا ثمنزی سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہے اور مجھے کچھ معلوم نہ ہو۔ تب میرا اور اسامہ کا بہت بڑا معرکہ ہوا۔ ان دنوں میں پریگننٹ تھی۔ برداشت مجھ میں صفر تھی۔ اس لیے صرف اسامہ ہی نہیں ثمنزی کو بھی فون کرکے میں نے اسے بہت کچھ سنا ڈالا۔ جس سے ہمارا جھگڑا اور بڑھا۔

''جس عورت نے معمولی شکل وصورت کی ہونے کے باوجود آدھی یونیورسٹی کے لڑکوں کو اپنے پیچھے لگا رکھا ہو۔ میرے صاف صاف منع کرنے کے باوجود تمہارا پیچھا نہ چھوڑا ہو۔ حتیٰ کہ ہماری شادی ہونے کے بعد بھی جو تمہیں بلاتی ہو۔ وہ کس قماش کی عورت ہے تمہاری سمجھ میں نہیں آتا؟ جیسے وہ تمہارے ساتھ راتیں رنگین کرتی ہے جانے اور کس کس کے ساتھ کرتی ہوگی۔''

اسامہ کا ہاتھ اٹھا تھا اور اس نے زور سے تھپڑ مارا تھا۔ میرا سر گھوم گیا میں جو منہ میں آیا بولتی چلی گئی۔ اسے یہ بھی بتا دیا کہ وہ کیسے قدم قدم پہ مجھ سے مات کھانے کے باوجود مکاری اور ہوشیاری سے کام لے کر آگے ہو جاتی تھی۔ اس کے پول کھولتے ہوئے مجھے احساس ہی نہ ہوا کہ اس چکر میں میں نے اسامہ پہ اپنی محبت اور ثمنزی کے ساتھ اپنی کیٹ فائٹ آشکار کر دی تھی۔ وہ جان گیا تھا کہ اسامہ کو حاصل کرنے کے لیے میرے اور ثمنزی کے درمیان باقاعدہ ایک مقابلہ رہا تھا۔

اس کی آنکھوں میں لہو اتر آیا تھا اور مزید جھگڑنے کے بجائے وہ گھر سے نکل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

میں جانتی تھی کہ وہ اسی کے پاس گیا ہے۔ اس لیے

جب وہ اگلے روز گھر آیا تو میں اور بھی غصے سے بھری ہوئی تھی۔ وہ خاموشی سے گھر آیا اور مجھ سے براہ راست ایک ہی بات پوچھی۔

''کیا ہماری شادی کے پیچھے بھی تمہاری سازش تھی؟ تم نے خود چچی اور چچا سے کہا کہ وہ تم سے میری شادی کے لیے میرے امی اور ابو پہ دباؤ ڈالیں؟''

میں غصے میں پاگل ہوئی بیٹھی تھی۔ انکار نہ کیا۔

''ہاں۔ میری شامت آئی تھی جو تم جیسے بدکردار آدمی کو اپنانے کی خواہش کر بیٹھی تھی۔''

یہ حقیقت جان کر اسامہ کو بہت گہرا صدمہ پہنچا تھا۔ اس کے بعد تو کبھی وہ عورت ہمارے درمیان سے نکلی ہی نہیں۔ اسامہ اس سے ملتا رہا۔ ہمارے جھگڑے ہوتے رہے۔ وہ نرمی اختیار کرکے میرے ساتھ ایک نئے رشتے کی شروعات کے وعدے بھی کرتا رہا۔ لیکن میں جانتی تھی۔ سب ڈھونگ تھا۔ مجھے بے وقوف بنانے کے ہتھکنڈے تھے سارے۔ یوں ہی جلتے کڑھتے، اسامہ سے جھگڑتے، ثمنزی کو گالیاں بکتے اور اس کی کردار کشی کرتے چار سال گزر گئے۔ ہمارے دو بچے بھی پیدا ہو چکے تھے مگر حالات جوں کے توں تھے۔

پھر ایک روز ہوا یوں کہ اسامہ اور میرے جھگڑے کے بعد میں ثمنزی کے بنگلے پہ جا پہنچی۔ ارادہ تو یہی تھا کہ اس کے ماں باپ سے ملوں گی اور کہوں گی کہ اپنی اس بے حیا بیٹی کو کسی سے بیاہ کر دفعان کریں۔ معلوم نہیں اس کے گھر والوں میں سے کون گھر پہ تھا کون نہیں۔ مجھے وہ باغیچے میں نظر آئی تو میں خود کو روک نہ سکی اور اسی پہ چڑھائی کر دی۔

''بدچلن' بدکردار عورت! تمہیں کوئی اور نہیں ملتا جو ایک شادی شدہ' دو بچوں کے باپ کے پیچھے پڑی ہو۔ کسی سے شادی کرکے دفع کیوں نہیں ہو جاتیں ہماری زندگی سے؟''

میں اس پہ چلا رہی تھی۔ وہ اطمینان سے بولی۔

''وجی! ہم بیٹھ کر آرام سے بات کر لیتے ہیں۔''

''لعنت بھیجتی ہوں میں تمہارے ساتھ بیٹھ کر بات کرنے پہ۔ تم جیسی بیچ اور بدچلن عورت کے منہ لگنا

بھی گوارا نہیں ہے مجھے۔" میں بھڑکی۔

اب ثمنزی کا چہرہ بھی لال ہو گیا۔ سخت لہجے میں بولی۔ "ڈونٹ کراس یور لمٹس وجی! تمہیں کوئی اختیار نہیں ہے میری کردار کشی کا۔"

"مجھے اختیار نہیں ہے۔" میرا غصہ انتہا کو پہنچ گیا۔ مجھے کیا کیا کرنے کا اختیار ہے۔ یہ دکھانے کے لیے میں نے گھما کر طمانچہ اس کے گال پہ دے مارا۔

"وجی!" اسامہ کی دھاڑ پہ میں اچھلی۔ گیٹ کی جانب دیکھا تو اسامہ کو گیٹ پہ کھڑا پایا۔ دھاڑنے کے بعد وہ غصے میں بپھرا لمبے لمبے ڈگ بھرتا تیزی سے میرے قریب پہنچا اور بنا کوئی سوال کیے یا کچھ کہنے کا موقع دیے میرے تھپڑ رسید کر دیا۔ میں سکتے میں رہ گئی۔ ان چار سالوں میں ہماری جتنی بھی بڑی لڑائی ہوئی تھی۔ اسامہ نے کبھی مجھ پہ ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ پھر آج اس بدذات کی خاطر اس کے گھر پہ اس کے سامنے... میری تو عزت و وقار کی دھجیاں اڑا ڈالی تھیں اس نے۔

"ہاؤ ڈیر یو؟" ثمنزی غرائی۔

میں نے سر گھما کر دیکھا۔ وہ اسامہ پہ بگڑ رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے اسامہ کو دھکیلتے ہوئے بولی۔ "میرے سامنے' میری ہم جنس پہ ہاتھ اٹھانے کی جرات تم نے کیسے کی؟"

"ثمنزی!" اسامہ نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ مگر ثمنزی کچھ نہیں سن رہی تھی۔

"جاؤ نکل جاؤ۔ یہ حرکت کر کے تم میری نظروں سے گر گئے ہو۔ مجھے تم سے نفرت ہے۔ آئندہ کبھی مجھے اپنی شکل بھی مت دکھانا۔ چلے جاؤ۔"

ثمنزی نے اسے دھکے دے دے کر گیٹ تک پہنچایا اور گیٹ سے باہر نکال دیا۔

اس روز میں بھی بنا کچھ کہے' سنے ثمنزی کے گھر سے نکل آئی تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ سارا ناٹک میری نظروں میں عظیم بننے کے لیے کیا گیا تھا۔ لیکن واقعی اس کے بعد کبھی ثمنزی اسامہ سے ملی نہ اس سے فون پہ بات کی۔ اسامہ بہت جھلایا ہوا اور چڑچڑا سا رہنے لگا۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دھیرے دھیرے وہ بھی سنبھلنے لگا تھا۔

ان دنوں میں پھر سے امید سے تھی۔ مطلب کہ میرے یہاں تیسرا بچہ پیدا ہونے جا رہا تھا۔ یونیورسٹی کی ایک دوست نے مجھے فون کر کے بتایا کہ ثمنزی کی کسی سے شادی ہونے جا رہی ہے۔ یہ سن کر جہاں مجھے کچھ تسلی ہوئی۔ وہیں خدشہ بھی لاحق ہو گیا کہ اسامہ کو علم ہو گا تو وہ اس کے گھر پہنچ جائے گا اس کی شادی کو رکوانے کے لیے۔ میں نے پوری کوشش کی کہ اسامہ کو اس کی شادی کی خبر نہ ہو سکے۔ لیکن جانے کہاں سے اسے خبر مل گئی۔ وہ بہت بے چین اور چڑچڑا ہو رہا تھا میری اس پہ کڑی نظر تھی۔ شادی کے روز اس پہ سخت پہرہ بٹھائے رکھا اور ہرگز اسے گھر سے قدم باہر نہ نکالنے دیا۔ رات کو جب سونے لیٹی تب بھی میں نے صرف آنکھیں بند کیں اور اندر سے چوکنا رہی کہ ابھی یہ آدمی مجھے سوتا جان کر اٹھ کر جانے کی کوشش کرے گا۔

میں اس کا پہرہ دیتے دیتے ہی سو گئی اور مجھے معلوم بھی نہ ہوا۔ کسی پہر آنکھ کھلی تو وہ بستر میں نہ تھا۔ میرا دماغ گھوم گیا۔ اب ثمنزی کی شادی میں جا کر میں اسامہ سے بھی بڑا تماشا کرنے والی تھی۔ لیکن' کمرے سے نکل کر بیرونی دروازے کی طرف جاتے ہوئے جب میں ایک کمرے کے سامنے سے گزری تو مجھے اندر سے سسکیوں کی آواز آئی۔ میں رک گئی۔ چپکے سے دروازے کی ریخ میں سے اندر جھانکا تو معلوم ہوا' وہ اندر تنہا بیٹھا رو رہا تھا۔ مجھے اس پہ غصہ بھی آیا اور ترس بھی۔ بنا کچھ کہے اور کوئی آہٹ کیے میں اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔

(آج جتنا مرضی رو لے۔ شکر ہے' وہ بلا ہماری زندگی سے دفعان ہوئی۔ اب اسامہ ہمیشہ کے لیے میرا ہو جائے گا۔)

آخر کار میں فتح یاب ٹھہری۔ ثمنزی کو ایک فائنل شکست میں نے دے دی تھی۔ میں سوچ کر خوش اور مسرور تھی۔ لیکن...

لبنیٰ تو شادی کر کے چلی گئی۔ لیکن میں نے اسامہ کو کھو دیا۔ ہمیشہ کے لیے۔ لبنیٰ کی شادی کے بعد اسامہ اسامہ نہ رہا۔ ایک چلتی پھرتی لاش بن کر رہ گیا۔ وہ ہنستا کھلکھلاتا خوش مزاج اور زندہ دل آدمی مر گیا۔ پیچھے رہ گیا تو صرف پیسہ کمانے والی ایک مشین۔ اب وہ ہنستا بولتا تو دور، لڑتا جھگڑتا بھی نہ تھا۔ مجھ سے اس کا یہ رویہ دیکھا نہ جاتا تھا۔ میں اس پہ چیختی، چلاتی، اسے لڑنے پہ اکساتی۔ میں چاہتی کہ وہ غصے سے مجھ پہ ہاتھ اٹھائے۔ مجھے مارے پیٹے۔ لیکن کچھ تو کرے۔ مگر وہ کچھ نہیں کرتا تھا۔ اس پہ کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ بالکل ہی گونگا بہرہ بنا وہ صرف اپنی ذمے داریاں پوری کرتا رہتا۔

ہمارا تیسرا بچہ، جو کہ بیٹی تھی۔ اس کی پیدائش بھی اسے زندگی کی طرف نہ لا سکی۔ قریب ڈیڑھ سال تک میں اس پتھر سے اپنا سر ٹکراتی رہی۔ لیکن اس مردے میں جان واپس نہ آئی۔ میں ہار گئی۔ اسامہ کا من مر گیا اور لبنیٰ جیت گئی۔

لبنیٰ کی اس جیت اور اسامہ کی حالت دیکھ کر اپنی بدقسمتی پہ میں بہت عرصہ تک جلتی کڑھتی رہی۔ پھر میں نے اپنی شکست تسلیم کرلی۔ مان لیا کہ سارا قصور میرا تھا۔ میں غلط تھی۔ میں نے ناجائز ضد کر کے ہم تینوں کی زندگی تباہ کردی تھی۔ اسامہ ہمیشہ سے لبنیٰ کا تھا اور اسی کا رہتا۔ میری لبنیٰ سے حسد کی آگ تھی جس نے ہم تینوں کی زندگیاں جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دی تھیں۔ لبنیٰ سے میرا حسد اور دشمنی جتنی سچی اور خالص تھی۔ اتنا ہی سچا اور خالص اسامہ کے لیے میرا پیار تھا۔

میرے دل میں جتنا بھی حسد اور اپنی ہار کا ملال تھا۔ لیکن اسامہ کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ میرے دل سے وہ حسد اور جلن کا جذبہ مٹ گیا۔ پچھتاوے کے ناگ مجھے ڈسنے لگے۔ میں خواہش کرنے لگی کہ کاش وقت پیچھے جا سکتا۔ زندگی مجھے ایک اور موقع دیتی۔ اور میں کبھی بھی اسامہ اور لبنیٰ کے بیچ میں نہ آتی۔ لیکن افسوس۔۔۔ وقت بہت ہی بے رحم اور ظالم چیز ہے۔ گزر جاتا ہے اور پلٹ کر نہیں آتا۔ زندگی دوسرا موقع نہیں دیتی۔ میں شرمندہ تھی۔ اسامہ سے اور لبنیٰ سے۔ اسامہ کو دیکھ دیکھ کر میرا احساس جرم اور پچھتاوا بڑھتا جا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

پھر اتنے سالوں بعد۔ میں نے لبنیٰ کو دیکھا تو خود کو روک نہ سکی۔ جذبات نے بے قابو کر دیا اور میں اس کے گلے لگ کر رو پڑی۔

کچھ دیر بعد اسی مال کے فوڈ ایریا میں ہم ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔ ہمارے سامنے میز پہ جوس کے گلاس، چپس اور کیچپ پڑا تھا۔ لبنیٰ کمر سیدھی کیے بیٹھی مجھے دیکھ رہی تھی اور میں اسے۔ ان گزرے ماہ و سال نے اسے مزید جوان اور خوب صورت بنا دیا تھا۔ اس کی گندمی رنگت بہت نکھر گئی تھی۔ چہرہ کھلا کھلا اور تر و تازہ تھا۔ مزاج میں وہی بشاشت اور الہڑپن تھا جو یونیورسٹی کے دنوں میں ہوتا تھا۔ اور اس کا فیشن اب بھی اپ ٹو ڈیٹ تھا۔ وہ ویسی ہی ماڈرن اور ایڈوانس تھی۔ جدید فیشن کے کپڑے، چھ انچ اونچی ہیل کے سینڈل، مناسب جیولری، نیچرل میک اپ، گولڈن کلر کیے بال۔ وہ امریکن پاپ سنگرز کے جیسی دکھائی دے رہی تھی۔ آج بھی وہ جس راستے سے گزرتی ہو گی لڑکوں کے دلوں کی دھڑکنیں رک جاتی ہوں گی۔ حالانکہ کچھ بھی تو غیر معمولی نہیں تھا اس کی شکل و صورت میں۔ لیکن اس کے بے ریا چہرے کی خوشی اور شفاف چمکتی آنکھیں دوسروں کو مبہوت کرتی تھیں۔ اس وقت بھی اس کے لبوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں میرے لیے ویسی ہی محبت اور عزت، جیسی میں نے ہمیشہ اس کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔ اور میرے چہرے پہ تو گزرے وقت کا ملال تھا، حسرتیں تھیں۔

"کیسی گزر رہی ہے زندگی؟ امید ہے کہ تم زندگی

سے خوش ہو گی۔"
آخر کار ٹمنزی نے گفتگو کا آغاز کیا۔ میرے لبوں پہ زخمی سی مسکراہٹ چھب دکھلا گئی۔
"کہاں چلی گئی تھیں تم؟" میں نے اس سے جیسے شکوہ کیا۔ ٹمنزی میرے اس سوال پہ تھوڑا حیران ہوئی۔ پھر مسکرائی۔
"شادی کے فوراً" بعد ہی میں اپنے ہسبنڈ کے ساتھ کینیڈا چلی گئی تھی۔ اب چھ سال بعد پہلی بار واپس آئی ہوں۔"
"چھ سال گزرے وقت کا تمہارے چہرے پہ شائبہ تک نہیں ہے۔ تم آج بھی ویسی ہی دکھتی ہو جیسی فرسٹ ایئر میں تھیں۔ بلکہ اس سے بھی ینگ اور خوب صورت۔ پہلے سے زیادہ خوش اور زندہ دل۔"
میں نے کہا تو ٹمنزی مسکرائی۔
"بس یار! اللہ کا کرم ہے۔ اس نے بہت نوازا ہے مجھے۔ شوہر، گھر، دو بچے۔ پیسہ، عیش و آرام سب کچھ میسر ہے۔ کوئی پریشانی نہیں ہے۔ اپنی زندگی سے بہت خوش اور مطمئن ہوں۔ لیکن تم کیوں اتنی سنجیدہ ہو گئی ہو؟ اپنا خیال کیوں نہیں رکھتیں؟ خوش رہا کرو۔ اللہ نے تمہیں بھی تو سب کچھ دے رکھا ہے۔" اس نے کہا۔ پھر پوچھنے لگی۔ "کتنے بچے ہیں تمہارے؟"
"تین، دو بڑے بیٹے... اور ایک بیٹی۔" میں نے بتایا۔
"ماشاء اللہ۔ اللہ صحت اور زندگی دے۔" ٹمنزی نے بے ساختہ دعا دی۔ "اسکول جاتے ہوں گے؟"
"ہاں۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔
"وقت کتنا جلدی گزر جاتا ہے۔ ابھی کل ہی کی بات لگتی ہے جب فرسٹ ایر میں ہمارا پہلا دن تھا اور آج دیکھو! ہمارے بچے بھی اسکول جا رہے ہیں۔ کتنا حیران کن لگتا ہے۔"
یہ بات کہہ کر اس نے میرے زخم ہرے کر دیے۔ کیا وقت جلدی گزرا تھا؟ مجھ سے پوچھتی، ایک ایک دن صدیوں پہ محیط تھا۔ ایک ایک گھڑی سالوں کے جتنی لمبی تھی۔ اذیت بھرے دن کتنے طویل تھے۔ اور وہ کہتی تھی کہ وقت کتنا جلدی گزر جاتا ہے۔
"ٹمنزی!" میں نے اسے پکار لیا۔
وہ سر جھکا کر اسٹرا ہونٹوں میں دبائے جوس پی رہی تھی۔ میرے پکارنے پہ سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔
"کیا تم نے اسامہ کو بھلا دیا؟"
میرے سوال پہ وہ سیدھی ہو بیٹھی۔ سنجیدگی کے ساتھ مجھے دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں خوف سا تھا۔ جیسے میں وہ تلخ باتیں دہرانے جا رہی تھی۔ میں ٹوٹی ہوئی آواز میں بولی۔
"اسامہ تمہیں کبھی نہیں بھلا سکا ٹمنزی!... وہ آج بھی صرف تم سے پیار کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ سے تمہارا تھا۔ میں ہی اپنی جلن اور اور حسد میں کبھی یہ مان نہ سکی۔"
میں نے کہا تو ٹمنزی کچھ پر سکون ہوئی۔ بولی۔
"جو گزر چکا اُسے بھول جاؤ دجی! ماضی تو راکھ ہو جاتا ہے۔ اس راکھ کو کریدنے سے کیا حاصل؟"
"اور جب یہ راکھ ہی آپ کا حال ہو تو پھر؟" میں نے سوال کیا۔ ٹمنزی مجھے دیکھنے لگی۔
"اسامہ میرا کزن تھا۔ ہمیشہ سے میں نے اس پہ اپنا حق سمجھا تھا۔ لیکن جب وہ تمہاری طرف جھکنے لگا تو مجھے لگا تم ہم دونوں کے بیچ میں آ گئی ہو... کاش ٹمنزی! کاش کہ میں نے اس حقیقت کو قبول کر لیا ہوتا۔ تسلیم کر لیا ہوتا کہ اسامہ میرا کبھی تھا ہی نہیں۔ اسے حاصل کرنے کی ضد میں میں نے قدم قدم پہ تمہیں نیچا دکھانے کی کوشش کی۔ سوچا تھا کہ تمہیں شکست دے کر میں اسامہ کو جیت لوں گی۔ پہلے خود اس سے شادی کی، سوچا کہ اسے پا لیا۔ لیکن میں غلط ثابت ہوئی۔ پھر تمہاری شادی کے پیچھے پڑ گئی کہ تم شادی کر کے ہماری زندگی سے نکل جاؤ گی تو اسامہ میرا ہو جائے گا... تم نے شادی کر لی۔ اسامہ نے تمہیں کھو دیا اور میں نے اسامہ کو۔ اسامہ میرا کبھی نہ ہو سکا۔ وہ ہمیشہ سے تمہارا تھا اور تمہارا ہی رہا۔ میں تم سے تو جیت گئی لیکن اس کو ہار گئی۔"
میرے لہجے میں ملال اور پچھتاوا تھا اور آنکھوں میں

شرمندگی۔ ٹینزی نے تحمل اور سنجیدگی سے میری بات سنی۔ پھر اسی سنجیدگی کے ساتھ بولی۔

"اسے تم سے چھیننے والی میں نہیں تھی وجی!"

میں نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ کیا کہنا چاہتی تھی؟ وہ بولی۔

"یہ بہت افسوس ناک ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ اسامہ کو تم سے متنفر کرنے والی میری محبت نہیں' بلکہ تمہاری نفرت تھی۔ تمہاری جلن اور حسد نے اسے تم سے دور کیا۔"

ٹینزی کا لہجہ صاف اور سادہ تھا۔ وہ مجھے بتا رہی تھی۔ طنز نہیں کر رہی تھی۔ اور اسی لہجے میں وہ اپنی بات کو جاری رکھے ہوئے تھی۔

"تم نے کبھی مجھے اپنی دوست نہیں سمجھا۔ ہمیشہ مجھے بدنیت اور منافق سمجھا۔ اگر تم کبھی مجھے سنجیدگی سے سنتیں تو میں یہ سب باتیں بہت پہلے تمہیں سمجھا دیتی۔ جو کہ میں نے کوشش بھی کی تھی۔ بہت بار۔۔۔ لیکن تم کبھی میری کوئی بات سننے کو تیار ہی نہ ہوئیں۔"

میں اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"میرے دل میں کبھی کوئی بغض یا ریا نہیں رہا وجی! یہ جانتے ہوئے بھی کہ اسامہ سے تم پیار کرتی ہو۔ پھر بھی کبھی میں نے تم سے حسد محسوس نہیں کیا۔ کیونکہ میرے نزدیک ایک عورت کی عزت اور وقار دنیا کی ہر شے سے مقدم اور بڑھ کر رہا ہے۔ ایک مرد کی خاطر ایک عورت کا عورت سے خار کھانا' اس کی دشمن ہو جانا۔ اس سے بڑھ کر عورت کی تذلیل اور تحقیر کیا ہو گی بڑ؟ ۔۔۔ یہ تمہاری بھی انسلٹ تھی اور میری بھی۔ جو کہ کسی صورت بھی مجھے منظور نہ تھی۔ اس معاملے میں میرا نظریہ بہت کلیئر ہے۔ اگر کوئی مرد آپ کو اچھا لگتا ہے۔ آپ اسے حاصل کرنے کی خواہش کرتے ہو۔ اس میں کچھ عجیب نہیں' یہ فطرت ہے۔ لیکن' اگر وہ آپ کو نہیں چاہتا تو آپ آرام اور عزت کے ساتھ پیچھے ہٹ جاؤ۔ جانے دو اسے 'جہاں جانا چاہتا ہے۔ میرا یہ ماننا رہا ہے۔ کیونکہ دنیا کسی بھی ایک فرد یا نقطے پہ آ کر ختم نہیں ہو جاتی۔ اگر ایک شخص آپ کو نہیں ملا تو کوئی اور آپ کو مل جائے گا۔ اس سے بھی بہتر۔ اس سے بھی بڑھ کر۔ بے شک اسامہ ہینڈسم تھا۔ اسمارٹ تھا۔ لیکن وہ دنیا کا آخری شخص نہ تھا۔ ہر سیر پہ ایک سوا سیر دنیا میں موجود ہے۔ دس ورلڈ نیور اینڈز۔ پھر کسی ایک کے پیچھے اتنی خواری کیوں؟۔۔۔

تم سوچ رہی ہو گی' پھر بھی میں پیچھے کیوں نہ ہٹی؟ کیونکہ میں اور اسامہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ وہ تم سے پیار نہیں کرتا تھا۔ اس لیے میں چاہتی تھی کہ تمہیں یہ سمجھتے ہوئے پیچھے ہٹنا چاہیے۔ اسی لیے تمہارے اعتراضات کے باوجود میں بھی پیچھے نہ ہٹی۔ لیکن جب۔۔۔ تمہاری اسامہ سے شادی طے ہو گئی تو میں پیچھے ہٹ گئی۔ اسامہ ماننے کو تیار نہیں تھا لیکن میں نے اسے بھی سمجھایا۔ یہ تقدیر کا فیصلہ تھا۔ اور تقدیر سے کوئی لڑ نہیں سکتا۔ وہ سمجھ گیا تھا۔ اس نے پورے خلوص کے ساتھ تمہیں اپنایا تھا۔ لیکن تم نے کبھی اسے اپنے قریب آنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اس پہ شک کرتی رہیں۔ اس کے سامنے مجھ سے نفرت کا اظہار کرتی رہیں۔ تم اس کے سامنے مجھے گالیاں بکتی تھیں۔ میری کردار کشی کرتی تھیں۔ اور جانتی ہو!۔۔۔ یہی چیز اسے تم سے دور اور متنفر کرتی تھی۔

ایک مرد کے سامنے کسی دوسری عورت کی تذلیل کرتے ہوئے عورت یہ بھول جاتی ہے کہ وہ خود بھی ایک عورت ہے اور اپنی ہی قوم کی توہین کر کے درحقیقت وہ خود کو نیچے گرا رہی ہے۔ مرد تمام عورتوں کو اسی نظر سے دیکھتا ہے جیسا اس کے سامنے کوئی عورت بیان کرتی ہے۔ بشمول اس بیان کرنے والی کے۔ یہی تمہارے ساتھ بھی ہوا۔ تم مجھے اس کے سامنے ۔ گرانے کی کوشش میں خود کو۔ گراتی گئیں۔ وہ مڑ مڑ کر میرے پاس آتا رہا۔۔۔ وہ مجھ سے اپنا حال بیان کرتا تھا۔ تمہاری شکایتیں کرتا تھا اور میں ہمیشہ تمہاری حمایت کرتی تھی۔ اسے قصوروار ٹھہراتی تھی۔ اسے سمجھاتی تھی کہ وہ اپنی محبت اور توجہ سے تمہارا اعتماد جیتے۔ لیکن وہ کبھی کامیاب نہ ہو سکا۔

تم سمجھتی تھیں کہ وہ میرے پاس آتا ہے اس لیے

تمہارا نہیں ہوتا۔ اور میں نے اس لیے اسے کبھی منع نہ کیا کیونکہ اگر میں اس سے یہ کہتی کہ 'وجی کو برا لگتا ہے اس لیے مجھ سے ملنا چھوڑ دو تو وہ اور زیادہ میرے لیے تڑپتا۔ جتنا اس سے دور بھاگتی اتنا وہ میرے پیچھے آتا۔ اس لیے میں نے بہتر یہی جانا کہ اس سے مل کر اسے سمجھاتی رہوں۔ اور تم کہتی تھیں کہ میں اسے حاصل کرنے کی امید پہ کسی سے شادی نہیں کر رہی ... میں اسامہ کے انتظار میں نہیں تھی۔ اسامہ کو اپنانے کی چاہ سے تو میں اسی دن دست بردار ہو گئی تھی جب اس کا تم سے نکاح ہوا تھا۔ اس کے بعد میں نے کبھی اس سے شادی کا خیال اپنے ذہن میں نہیں آنے دیا... مگر میں لاکھ تمہارا بھلا چاہتی تھی وجی!... لیکن میں بیوقوف تو نہ تھی کہ صرف تمہاری تسلی کی خاطر آنکھ بند کر کے کسی کے ساتھ بھی شادی کر لیتی؟ تمہاری خوشی کے چکر میں اپنی زندگی تو برباد نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے بھی کسی ایسے مرد کی تلاش تھی جو اچھا ہو' جس کے ساتھ میں ایک خوش گوار زندگی گزار سکوں۔ مجھے جب تک کوئی ایسا شخص نہیں ملا میں نے شادی نہیں کی اور جب مجھے مل گیا' میں نے شادی کر لی اور اللہ کے فضل و کرم سے میں نے ٹھیک آدمی کو چنا ہے۔ اس سے شادی کر کے میں بہت خوش اور مطمئن ہوں۔"

ٹمنزی ساری سچائیاں مجھ سے کھول کھول کر بیان کر رہی تھی۔ میں اس کے ایک ایک لفظ کا یقین کر رہی تھی۔ ٹمنزی کے کسی بیان میں کوئی جھول نہیں تھا۔ اور مجھے پچھتاوے گھیر رہے تھے۔

(کاش کہ جو باتیں ٹمنزی کی سمجھ میں آتی تھیں' وہ میری بھی سمجھ میں آئی ہوتیں۔)

میرے نکاح کا ذکر کر کے ٹمنزی نے مجھے وہ واقعہ یاد کروا دیا تھا جو سالوں تک کانٹا بن کر میرے دل میں چبھتا رہا تھا اور میرے اور اسامہ کے درمیان فساد کی سب سے بڑی وجہ رہا تھا۔ اب سوچا کہ سب کلیئر ہو رہا ہے تو لگے ہاتھوں یہ سوال بھی کر لوں۔

"ٹمنزی!... کیا تم اور اسامہ کبھی... میرا مطلب ہے۔"

میں پوچھتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ وہ مجھے الجھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ میں کیا پوچھنا چاہ رہی ہوں۔ میں نے پھر ہمت کی۔

"اسامہ اکثر مجھ سے ناراض ہو کر رات باہر گزارتا تھا تو اسامہ اور تمہارے بیچ کچھ ہوا؟"

میرا سوال سنتے ہی ٹمنزی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"نہیں' اسامہ کبھی میرے قریب نہیں آیا۔"

ٹمنزی نے جیسے پر زور نفی کی۔ میں نگاہیں جھکا گئی۔ کیا وہ سچ کہہ رہی تھی؟ یا شاید اس معاملے میں مبالغہ آرائی سے کام لے گئی تھی۔ لیکن میں اس سے یہ سوال کیوں پوچھ رہی تھی؟ اب اس سوال کی اہمیت ہی کیا تھی؟ اگر اس کے اور اسامہ کے بیچ کبھی کچھ ہوا تھا تو کیا... اور اگر نہیں ہوا تھا تو کیا...

"کیا تم اس سے محبت کرتی تھیں؟"

اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ پہلی بار مجھے اس کی آنکھوں میں اپنی ناکام محبت کا درد نظر آیا۔ وہ ان بیتے لمحوں میں واپس چلی گئی تھی۔ ان میں کھوئی ہوئی بولی۔

"جس صبح تم دونوں کا نکاح تھا۔ وہ آخری ملاقات کے لیے میرے پاس آیا تھا۔ مجھے اور ہماری محبت کو الوداع کہنے... مجھے آج بھی یاد ہیں اس کے ساتھ بتائے وہ تین چار گھنٹے۔ بہت روئے تھے ہم دونوں۔"

ٹمنزی کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ جبکہ میری تو آنکھیں چھلک گئیں۔

یہ کیا کر دیا تھا میں نے؟

کتنے دل اجاڑ دیے تھے۔ کتنی زندگیاں برباد کر دی تھیں۔ صرف اپنے حسد کی آگ اور شک سے۔ اگر اس رات میں تھوڑا تحمل اور برداشت سے کام لے لیتی۔ تو بھی شاید اسامہ میرا ہو جاتا۔ وہ اپنی محبت کو دفنا کر اس پہ فاتحہ پڑھ کر میرے پاس آیا تھا۔ اور میں نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا۔

میں نے ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو پونچھے۔

"میں تم سے معافی مانگنا چاہتی ہوں لیکن میرے

پاس الفاظ نہیں ہیں۔۔۔ "کہتے کہتے میری آواز بھرا گئی تو میں اپنے دل کی بات پوری بھی نہ بول سکی۔

ٹمنزی نم آنکھوں کے ساتھ مسکرائی اور اپنا ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ تھام لیا۔

"یہ سب باتیں بہت پیچھے رہ گئی ہیں وجی! اور ہم بہت آگے نکل آئے ہیں۔ کوئی فائدہ نہیں ان باتوں پہ شرمندہ ہونے یا پچھتانے کا۔ جو گزر چکا ہے اسے بھول جاؤ۔" ٹمنزی نے تسلی آمیز نرم آواز میں کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ تم میری تعریفیں کررہی ہو۔"

اچانک سے مردانہ آواز پہ ہم دونوں چونکیں۔ ایک نہایت ہینڈسم اور ڈیشنگ سا جوان تیزی سے چلتا ٹمنزی کے پاس آرکا۔

"زمرد!" ٹمنزی نے اسے دیکھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ زمرد کو دیکھ کر ٹمنزی کے چہرے کی رونق بڑھ گئی تھی۔ تفاخر کے ساتھ اس کا تعارف بیان کراتے ہوئے بولی۔

"وجی! یہ میرا ہسبینڈ ہے۔ زمرد اقرار۔"

تعارف پہ زمرد نے مسکراتے ہوئے میری جانب دیکھا۔ میں پہلے سے اس پرنس چارمنگ کو دیکھ رہی تھی۔ ٹمنزی کتنی سچی تھی۔ ہر سیر پہ سوا سیر موجود ہے دنیا میں۔ زمرد اقرار اسامہ سے کہیں درجے بہتر شخصیت کا مالک تھا۔

"السلام علیکم۔" شائستگی کے ساتھ مجھے سلام کرتے ہوئے زمرد نے اس کا جملہ اچک لیا۔

"تمہاری یونیورسٹی کی دوست اور اسامہ کی بیوی۔" کہہ کر وہ خوش شکل 'خوش مزاج آدمی میری طرف مڑا۔ "میرا غائبانہ تعارف ہے آپ سے اور اسامہ سے۔ بڑی بات ہے بھئی۔۔۔ آپ دونوں کی ملاقات ہو گئی۔"

میں الجھی نظروں سے زمرد کو دیکھنے لگی۔ زمرد میرے اور اسامہ کے بارے میں کتنا جانتا تھا؟

"زمرد! ہماری لوٹرائی اہنگل کے بارے میں جانتا ہے۔ میں نے اسے سب بتایا ہوا ہے۔ سوائے ہماری کیٹ فائٹ کے۔"

ٹمنزی نے میری الجھن دور کرتے ہوئے کیٹ فائٹ کا ذکر اس انداز میں کیا تھا جیسے بڑی ہی دلچسپ اور مزاحیہ قسم کی نوک جھونک ہوتی تھی ہمارے بیچ۔ وہ کیٹ فائٹ کتنی تلخ اور شرم ناک تھی۔ اس کا اندازہ زمرد کو نہ تھا۔ ٹمنزی کے گلاس سے جوس پینے کے ساتھ چپس اٹھا اٹھا کر کترکتر چباتے ہوئے بولا۔

"تم نہ بتاؤ۔ میں وجی سے پوچھ لوں گا۔"

"بڑا شوق ہے تمہیں ہماری کیٹ فائٹ کے بارے میں جاننے کا۔ کبھی میں نے تمہاری اور سلیمان کی 'ڈاگ فائٹ' کے بارے میں پوچھا ہے؟"

ٹمنزی مصنوعی طور پر برا مانتے ہوئے لڑاکا عورتوں کی طرح اس سے لڑنے کی ایکٹنگ کررہی تھی۔ اس کی بات سن کر زمرد بڑبڑایا۔ جبکہ ٹمنزی مجھ سے مخاطب ہو کر بتانے لگی۔

"پتا ہے وجی! زمرد اور اس کا کلاس فیلو سلیمان ' دونوں کالج میں ایک ہی لڑکی پہ لٹو تھے۔"

ٹمنزی نے زمرد کی لوٹرائی اہنگل کا مذاق اڑایا تو زمرد بوکھلانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے بولا۔

"کیا کرتی ہو۔ پہلی بار تمہاری سہیلی مجھ سے مل رہی ہے۔ کیوں اس کے سامنے میرے ریپو (Rapo) خراب کررہی ہو۔"

ٹمنزی نہ جھجکی نہ ہچکچائی۔ فٹ سے بولی۔ "ریپو خراب کرنے والی کیا بات ہے؟ میں نے کون سا اسے بتا دیا کہ نانتھ اسٹینڈرڈ میں تمہیں ایک لڑکی سے تھپڑ پڑا تھا۔"

ٹمنزی کی بات پر زمرد اچھل پڑا۔ مسکراتے ہوئے طنزیہ انداز اپنا کر بولا۔

"بہت شکریہ اس کے بارے میں نہ بتانے کا۔ آپ جیسی بیوی کسی کو مل جائے تو اسے دشمنوں کی ضرورت ہی کیا ہے۔"

ٹمنزی ہنس رہی تھی۔ میرے لبوں پہ بھی مسکراہٹ تھی۔ بظاہر وہ دونوں لڑ رہے تھے۔ لیکن ان کی اس نوک جھونک سے ظاہر تھا کہ دونوں میں کتنی اچھی انڈراسٹینڈنگ اور کتنا مضبوط تعلق تھی۔ ٹمنزی

کے لیے محبت زمرد کی آنکھوں میں صاف نظر آرہی تھی۔ اور ٹمنزی کس قدر خوش اور آسودہ تھی۔

اور ایک میں تھی۔ بالکل خالی ہاتھ۔ مجھے ٹمنزی کے یونیورسٹی میں کہے وہ الفاظ یاد آرہے تھے۔

"عورت عورت کی دشمن نہیں ہے۔ لیکن بعض عورتیں جو دوسری عورتوں سے حسد کرتی ہیں۔ وہ اپنی دشمن آپ ہوتی ہیں۔"

اس کے الفاظ میں کتنی سچائی تھی۔ اس کی زندہ مثال میں خود تھی۔ جس نے اپنے حسد سے اپنی زندگی برباد کرلی تھی۔ اور جس سے حسد کیا تھا۔ وہ کتنی خوش قسمت رہی تھی۔ اس کا شوہر اس سے پیار کرتا تھا اور میرا شوہر.... وہ بھی اسی سے پیار کرتا تھا۔

میں نے سوچا تھا کہ اسامہ کو ٹمنزی کے بارے میں بتا کر اسے دکھی نہیں کروں گی۔ یہ سوچ کر میں خاموش تو تھی لیکن میرے دل کا بوجھ بڑھتا جارہا تھا۔ اس صبح گرم گرم وافلز (waffles) وافل میکر سے نکال کر اسامہ کے سامنے رکھتے ہوئے میں نے یہ بوجھ اتار پھینکنے کی ٹھان لی۔

"اسامہ! تمہیں معلوم ہے ٹمنزی پاکستان آئی ہوئی ہے۔ اور بہت جلد واپس بھی جارہی ہے۔"

میپل سیرپ وافلز پہ ڈالتے ہوئے میں نے عام سا لہجہ اپنا کر بتایا۔ اسامہ کا ہاتھ لرزا اور کانٹا چھوٹ کر ٹیبل پہ گرا۔ کچھ دیر کے لیے وہ بالکل پتھر ہو گیا تھا۔ میں پہلے منتظر رہی۔ پھر پوچھنے لگی۔

"تم بات کرنا چاہو گے اس سے؟ میرے پاس اس کا نمبر ہے۔"

اب بھی اسامہ کے چہرے پہ کوئی تاثر نہ ابھرا۔ مجھے تو لگ رہا تھا کہ آج اس کی خاموشی ٹوٹے گی۔ وہ مجھ سے ٹمنزی کے بارے میں پوچھے گا۔ مجھ پہ طنز کرے گا کہ اب میری جلن کہاں گئی؟ لیکن وہ اب بھی ویسا ہی بے تاثر چہرہ لیے بیٹھا تھا۔ بولا تھا تو صرف ایک لفظ۔

"نہیں۔"

اس کی آواز میں بھی کیسا خوف زدہ کردینے والا سناٹا تھا۔ مختصر مگر قطعی انداز میں منع کر کے وہ رکا نہیں اور بنا ناشتہ کیے سیدھا کام کے لیے نکل گیا۔ میں بوجھل دل کے ساتھ کھڑی سوچتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"ٹمنزی! تم اسامہ سے شادی کرلو۔ اس کی خوشی صرف تمہارے ساتھ میں ہے۔ تمہارا ہسبنڈ بہت انڈرسٹینڈنگ اور کوآپریٹو ہے۔ تم اس سے بات کروگی تو وہ مان جائے گا۔ میں بھی اسامہ کی زندگی سے بہت دور چلی جاؤں گی۔ لیکن پلیز تم اس سے شادی کرلو۔ میں صرف اس کی خوشی چاہتی ہوں۔"

فون پہ میں تقریباً" گڑگڑائی تھی۔ آنسو میری آنکھوں میں تھے۔ ٹمنزی میری بات پہ ایسے ہنسی جیسے کسی بچی کی نادان بات پہ ہنسا جاتا ہے۔

"تم آج بھی اتنی ہی جذباتی اور جلد باز ہو دجی!"

ٹمنزی نے مجھ پہ تبصرہ کیا۔ پھر سنجیدگی اختیار کر کے کہنے لگی۔

"ان باتوں کا وقت نکل چکا۔ اب یہ ممکن نہیں رہا۔ اور جانتی ہو؟ زمرد کے ساتھ میری خوش گوار زندگی کا راز کیا ہے؟" وہ رکی پھر خود ہی بولی۔ "زمرد کو مجھ پہ بہت اعتماد ہے۔ بہت بھروسا کرتا ہے وہ مجھ پر۔ اور میں اس کا یہ بھروسا کبھی نہیں توڑ سکتی۔"

میں مایوس ہو گئی۔ ٹوٹ کر رونے لگی۔ ٹمنزی میری تکلیف پہ بے چین ہو گئی۔

"رو مت دجی!.... ایسے مایوس نہیں ہوتے.... تم اللہ سے دعا کیا کرو۔ وہ ضرور تمہاری تکلیف دور کرے گا۔"

جس عورت سے میں نے زندگی بھر نفرت کی تھی۔ جس سے دشمنی میں میں اس حال کو پہنچی تھی۔ وہی عورت میرے درد کو سمجھ رہی تھی۔ میری پریشانی میں میرے ساتھ کھڑی ہو کر میری تکلیف بانٹنے کی کوشش کررہی تھی۔ نہ عورت عورت کی دشمن ہوتی ہے نہ مرد' یہ تو ہماری منفی سوچ ہوتی ہے جو ہماری دشمن ہوتی ہے۔

سمیرا حمید

# ولی

قاہرہ کے غیر حنوط شدہ بازاروں میں سے ایک بازار خان الخلیلی ۔ کی طرف لے جاتی سڑک کے کنارے وہ عمری با کے سامنے بیٹھی ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ نہ عمری با نہ اس کے سامنے بیٹھی الزہرہ۔ عمری با ایک فقیر ہے' مست ملنگ ہے' کبھی ۔ ماشکی' کبھی مزدور ہے۔

وہ ایک وقت میں... "ایک نہیں رہتا' کئی ایک" ہو جاتا ہے۔ کبھی وہ سڑک کے کنارے' بازار میں کہیں بھی نظر نہیں آتا اور ایسے لگتا ہے کہ وہ "یہاں کبھی" تھا ہی نہیں اور کبھی وہ اتنا نمایاں اور ہر جگہ پایا جاتا ہے کہ یہ شک بھی نہیں ہوتا کہ کبھی وہ وہاں سے کہیں گیا بھی تھا۔ وہ کب وہاں موجود ہوتا ہے اور کب موجود نہیں ہوتا' نہ اس پر سوال اٹھتا ہے' نہ اس کا جواب حاصل ہو پاتا ہے۔

دھول مٹی سے اٹی سڑکوں پر پانی چھڑکتے' دکانوں کے وزنی سامان کو کندھوں پر اٹھائے مزدور بنے' کچھ سیاحوں کے لیے سواری کا انتظام کرتے یا بچا کچا کھانا چنتے وہ کام میں ایسے منہمک ہوتا ہے جیسے سرکار کا ادنیٰ لیکن فرماں بردار ملازم ہو۔ "کس سرکار" کا یہ نہ کسی نے جانا' نہ اس نے بتایا۔ اس کے کام کی تن دہی یہ بتاتی ہے کہ اس کو تنخواہ کے علاوہ بھی کچھ ملتا ہے۔ لوگ اسے سڑک کے کنارے بے سدھ پڑا ہوا بھی دیکھتے ہیں۔ مکھیاں اس کے منہ پر ایسے بھنبھناتی ہیں جیسے وہ شیرینی کی بھری رکابی ہو اور وہ اسے چاٹ بھی جانا چاہتی ہوں اور بچا کر بھی رکھنا چاہتی ہوں۔

یہ ایک عمری با ہے اور دوسری الزہرہ... جو کیا سالوں اس کے پاس نظر نہیں آتی یا پھر سال کے کئی دن اس کے سامنے' اس کے پاس دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ بھی جتنی نمایاں رہتی ہے اتنی ہی غائب۔ جب یہ یقین ہونے لگتا ہے کہ وہ مر گئی ہو گی تب ہی وہ زندہ' ہو کر اپنی پہلے سے زیادہ بدلی ہوئی بلکہ بد تر حالت میں اپنے لمبے پیروں کو چھوتے لبادے میں کسی درویش کی طرح چلتی نظر آ جاتی ہے۔ نہ پتا چلتا ہے' زمین پر چل رہی ہے' نہ پتا چلتا ہے ہوا میں اڑ رہی ہے۔

وہ عمری با کو اللہ کا خاص بندہ سمجھتی ہے۔ برگزیدہ ہستی مانتی ہے۔ جبکہ عمری با اپنے منہ سے اس سے کئی بار کہہ چکا ہے کہ وہ کوئی ولی نہیں ہے۔ وہ ولی کیسے ہو سکتا ہے جبکہ فٹ پاتھ پر بیٹھتا ہے اور اس انتظار میں رہتا ہے کہ کب سرد ملکوں کے موسم سرد تر ہوں اور پرندے ہجرت کر کے اسے میزبانی کا موقع دیں۔ وہ ولی اس لیے بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ سارا دن اسے حشرات کاٹتے رہتے ہیں اور وہ آئے دن بخار میں مبتلا رہتا ہے۔ بھلا ولیوں پر ایسی نوبت کب آتی ہے کہ کیڑے مکوڑے ان پر اپنا حق سمجھنے لگیں۔ وہ لمبی عبادتوں کا امین بھی کبھی نہیں رہا تھا۔ وہ تو ایک عام نمازی کے عہدے پر بھی پورا نہیں اترتا تھا' کجا مومن اور برگزیدہ ہونا۔ پھر بھی نہ جانے کس نے الزہرہ کو بتا دیا تھا کہ وہ "ولی" ہے۔ اگر وہ اسے ولی مانتی بھی تھی تو حیرت کی بات تھی کہ وہ اس کے پاس کوئی حاجت لے کر نہیں آتی تھی۔

الزہرہ کو دنیا میں عمری با جیسا بے ضرر کوئی اور نہیں ملا تھا۔ عمری با کی سماعت سے زیادہ اسے کسی ذی روح




کی سماعت پر بھروسا نہیں تھا۔ وہ صرف اسی کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیتی تھی۔ وہ پہلی بار اس کے سامنے تب رکی اور پھر بیٹھ گئی' جب اس کی پہلی شادی ہو رہی تھی۔ اس کے سیاہ گھنگھریالے بالوں کی کچھ لٹیں اسکارف سے باہر اس کی پیشانی پر بکھری تھیں اور سرمئی زمین پر بکھرے رنگ برنگے پھول اس کا لبادہ تھے۔ وہ جوان تھی اور خوب صورت بھی۔

"کیا تم اللہ سے یہ نہیں معلوم کر سکتے کہ جسے میں پسند کرتی ہوں' اسے چھوڑ کر اللہ نے کسی اور کو میرے لیے کیوں پسند کر لیا؟"

عمری با خاموش رہا۔ اسے روتے ہوئے سنتا رہا۔

"مجھے جواب چاہیے... پوچھو اللہ سے..."

وہ اگلے دن پھر آئی۔ کتنے ہی دن آتی رہی۔

"میں مخلوق ہوں' جج نہیں۔ اللہ سے واقعات کی دلیل کیسے مانگ سکتا ہوں۔ میرے پاس عدالت لگانے کا حق نہیں کہ یہ کیوں ہوا؟ وہ کیوں نہیں ہوا؟ سوال مجھ سے کیا جائے گا' مجھے جواب نہیں مانگنا۔ مجھے تو عدالت میں جانا ہے' یہ کام تم خود کرو۔ ہو سکتا ہے' عدالت سجا کر تمہیں کچھ سکون مل جائے اور تمہارے آنسو رک جائیں۔ اللہ سے مقدمہ لڑتی تم جیت جاؤ اور سکھ حاصل کرو..." عمری با چڑ کر سخت آواز میں بولا۔

الزہرہ نے اپنے آنسو پونچھ لیے... "میں عدالت نہیں لگا سکتی۔ میں اللہ کا احترام کرتی ہوں۔"

"پھر اس کے فیصلوں کا احترام بھی کرو۔"

"جو مجھے پسند ہے' مجھے دے دیا جائے تو اس میں کیا برا ہے؟"

"جو تمہیں پسند ہے "وہ برا" نہیں ہے' اس کا تمہیں یقین ہے؟"

"انسان یہ جان جاتا ہے کہ اسے کیا پسند ہے۔ انسان خدا نہیں ہے' وہ یہ نہیں جان سکتا کیا اچھا ہے' کیا برا...

تو پھر جو یہ جان سکتا ہے' اسی کے پاس یہ اختیار رہنے دو۔"

"لامحدود اختیارات والا تو لامحدود خوشیاں دے سکتا ہے۔ ہماری پسند کی' ہماری من چاہی۔۔۔"

"وہ لامحدود خوشیاں ہی دیتا ہو تو؟ اور ہم نہ جان پاتے ہوں۔"

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟ تم اللہ سے گفتگو کرتے ہو نا؟ تم ولی ہی ہو نا؟"

"یہ باتیں تو میں خطبے میں سنتا ہوں۔۔۔ تم کیوں نہیں سنتیں۔"

"میرا گھر مسجد سے بہت دور ہے۔" اس نے عذر کیا۔

"تمہارا گھر مسجد سے دور ہے یا تم؟" عمری بانے سادگی سے کہا تھا۔

"الزہرہ بے چین ہو گئی۔ "تم میرا پیغام اللہ کو کیوں نہیں دے دیتے۔"

"انسان اپنا پیامبر خود ہوتا ہے۔ تم بھی اپنی پیامبر بنو۔ اپنی ادائیگیاں خود کرو۔"

وہ عمری با کی شکل دیکھنے لگی۔ اس کی داڑھی میں تنکے الجھے تھے اور اس داڑھی کو کبھی خط نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس کے کپڑے گندے اور بدبودار تھے۔ ایسا انسان اللہ کا پیارا کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ مایوس ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ چلی گئی۔ جیسے اس سے ناراض ہو گئی ہو۔ وہ خریداری کرنے بازار آئی نہ اس کے پاس لیکن جب اس کا شوہر حادثے میں مر گیا تو اسے اس کے پاس آنا پڑا۔ وہ آئی اور روئی۔ ایک بیوی اپنے مرحوم شوہر کے لیے روئی۔ پھر اس نے اپنی پسند کے آدمی سے شادی کی اور خود ہی اسے چھوڑ دیا۔ اس کا دوسرا شوہر چاہتا تھا کہ وہ اپنے پہلے شوہر کو اس کے سامنے برا بھلا کہے اور گالیاں دے' تاکہ اسے معلوم ہو کہ وہ حقیقتاً اس سے نفرت کرتی تھی اور کرتی رہے گی۔

"میں مرحوم جبار سے محبت نہیں کرتی تھی لیکن میں اس کی احسان مند ہوں۔ اس نے میرا خیال رکھا' میرے رشتے داروں کا احترام کیا۔ مجھے عزت دی۔ میں اس کے گھر میں رہی' اس کی محنت کی کمائی کھاتی رہی' اس کا دیا اوڑھتی رہی۔ میں اسے کیسے گالیاں دیتی عمری با؟ میں نہیں دینا چاہتی تھی لیکن مجبور ہو کر ایک بار میں نے مرحوم کو گالیاں دیں' اس نے کہا اور گندی گالیاں دو۔ میں نے اور گندی گالیاں دیں۔ پھر وہ مجھے ہر روز یہ کرنے کے لیے کہنے لگا۔ میں نے اپنا منہ سی لیا۔"

عمری بانے سب سمجھ لینے کے انداز سے سر ہلایا۔

"اس نے مجھے مارا۔۔۔ مارتا رہا۔۔۔ میں نے اپنے لب دانستہ سیے۔ پھر اس نے مجھے ایک طلاق دی۔"

"تم نے ایسی زبردست نیکی کی قوت کہاں سے حاصل کی؟" عمری با کی آواز اس کی چال کی طرح بے ضرر تھی۔

"نیکی؟" وہ چلا اٹھی۔ "کیسی نیکی؟"

"تم نے اپنے ہونٹ کیوں سی لیے؟"

"کیا تم نے جس کا کھایا ہو' اسے تم برا بھلا کہہ سکتے ہو؟ اس نے مجھے اناج کے اتنے دانے کھلائے۔ جتنے کہ میں دو زندگیوں میں بھی ان کی تعداد نہیں گن سکتی۔ میں کیسے اسے برا بھلا کہہ دیتی۔ میں اس سے محبت نہیں کر سکی تھی لیکن اس کا احترام تو کر سکتی تھی۔ وہ مجھے اچھا نہیں لگتا تھا لیکن اس کی خوبیاں مجھے پسند تھیں۔ میں بیمار ہوئی' وہ میرا خدمت گزار ہوا' ہماری پہلی اولاد مری' وہ میرے دکھ میں شریک ہوا۔ میں یتیم ہوئی تو وہ باپ کی طرح میرے لیے پر شفیق ہو گیا۔ وہ مجھ پر ہمیشہ مہربان رہا' میں اسے کیسے۔۔۔ عمری با کیسے۔۔۔؟"

"لیکن تم اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھیں؟"

"ہاں۔۔۔ میں نے اسے کبھی پسند نہیں کیا لیکن اس کا احسان ہمیشہ مانا۔۔۔ شوہر تھا وہ میرا۔۔۔"

"جسے تم پسند کرتی تھیں' اسے تم نے اس کے لیے چھوڑ دیا جسے تم پسند نہیں کرتی تھیں۔ تم مار کھاتی رہیں لیکن اس کو گالیاں نہیں دیں اور بالآخر جو تمہیں سب سے زیادہ پیارا تھا' تم نے اسے دور ہو جانے

دیا۔"

"میں نے اس کی منت کی تھی۔ اس سے کہا تھا کہ وہ مجھے روز مارا کرے لیکن یہ کرنے کے لیے نہ کہے۔ اس نے مجھے چھوڑ دیا۔"

"تم نے ایسی قوت کہاں سے حاصل کی؟"

"تم کس قوت کی بات کر رہے ہو؟" الزہرہ پھر سے چلا اٹھی۔

"جان سے پیارے کو چھوڑ دینے کی۔ ایک انسان کے احترام کے بدلے اپنے محبوب کو چھوڑ دینے کی۔"

وہ دنگ سی ہو کر عمری با کی شکل دیکھنے لگی۔ دیکھتی رہی۔ "تم کیا کہہ رہے ہو۔ کوئی بھی ہوتا' وہ یہی کرتا۔ میں نے بھی وہی کیا۔"

عمری با نے سب سمجھ لینے کے انداز سے سر ہلایا لیکن کچھ کہا نہیں۔

☼ ☼ ☼

جن دنوں اس کا تیسرا شوہر بستر مرگ پر تھا' وہ غم سے بے حال دیوار کا سہارا لیتی آئی۔

"دعا کرو' میرا شوہر ٹھیک ہو جائے۔"

"اللہ اسے شفا دے۔"

"میں اس سے محبت کرتی ہوں۔"

"تم جانتی تھیں وہ موذی بیماری کا شکار ہے۔ اسے ایسی دعاؤں کی ضرورت ہے جو معجزے رونما کریں۔ تم نے اس سے شادی کیوں کی؟"

وہ رونے لگی۔ "کیا صرف ان ہی سے محبت کی جا سکتی ہے جن کے پاس لمبی زندگی کی پرچی ہو۔ جو زیادہ لمبے وقت تک زندہ رہ سکتے ہوں۔ اس کی بوڑھی ماں اسے سنبھال نہیں سکتی تھی۔ زندگی میں کسی نے اس سے محبت نہیں کی تھی۔ وہ زندگی میں اکیلا تھا۔ میں اسے موت میں بھی اکیلا کیسے چھوڑ دیتی۔ جبکہ میں یہ جان چکی تھی کہ اسے زندگی کے ساتھی سے زیادہ موت کے ساتھی کی ضرورت ہے۔ جب ہم کسی کی ضرورت جان جاتے ہیں عمری با! اور اسے پورا بھی کر سکتے ہیں تو اس ضرورت کو پورا کرنا ہم پر فرض ہو جاتا ہے۔

مجھ پر وہ فرض ہو گیا تھا۔ میں اپنے فرض سے منہ کیسے موڑ لیتی۔"

"کتنی ہی عورتیں اس کے بارے میں جانتی ہوں گی' پھر تم نے ہی کیوں شادی کی؟"

"اگر میں صحرا میں بھٹک جاؤں اور پانی کی ایک بوند کے لیے تڑپ رہی ہوں تو جو پہلا شخص مجھے نظر آئے گا' مجھے اسی پر یقین ہو گا کہ وہی مجھے پانی پلائے گا۔ بیماری کی تکلیف اور موت کے صحرا میں اسے نظر آنے والا میں پہلا شخص ہوں عمری با!"

اور اس بات نے عمری با کو دنگ کر دیا۔

"اللہ اس کی تکلیف کو کم کرے گا۔" عمری با نے دعا کی۔

"اللہ اس کی تکلیف کو راحت میں بدل دے۔" الزہرہ نے اضافہ کیا۔

"اللہ ایسا کر چکا ہے' وہ تمہیں اسے عطا کر چکا ہے۔"

"تم اللہ کے قریب ہو' تم اللہ سے دعا کرو۔ اللہ اسے راحت دے۔"

"کیا اللہ صرف قریب والوں کی دعا ہی سنتا ہے۔ اگر میں ولی ہوں تو بھی کیا وہ کسی کافر یا گناہ گار کی دعا نہیں سنے گا۔ کیا وہ کچھ لوگوں کے لیے اپنی سماعتیں بند کر لے گا اور کچھ لیے کھول دے گا۔ تم نے اللہ کو اتنا پابند اور مختصر کیوں کر دیا ہے۔"

"میں ہوں کون' جس کی وہ دعا قبول کرے۔"

"تم اس کی مخلوق ہو' تم اللہ کو "مجھ" تک محدود کیوں کرتی ہو۔ آخر تمہیں یہ کیوں لگا کہ میں اللہ کے قریب ہوں۔ میں جو کہوں وہ ہو سکتا ہے؟"

"میں نے مکھیوں کو تمہارے منہ پر بھنبھناتے دیکھا اور تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔"

وہ ہنسا۔ "تو اس سے میں اللہ کا پیارا ہو گیا؟" میرے منہ پر روز مکھیاں بھنبھناتی ہیں اور ہزاروں لوگ مجھے دیکھتے ہیں' وہ مجھے ایسا نہیں مانتے۔ تم اگر مجھے مانتی ہو تو پھر ولی ہی ولی کو پہچانتا ہے۔"

"پتا نہیں، بس میں نے یہ جانا کہ تم مخلوق پر مہربان ہو۔"
"تم مجھ سے کہیں زیادہ مخلوق پر — مہربان ہو۔ تم اللہ کی سب سے پیاری مخلوق پر — مہربان ہو، انسان پر۔"

☼ ☼ ☼

اگلی بار جب وہ عمری با کے سامنے آئی تو عمری با کو کچھ وقت لگا اسے پہچاننے میں۔ اتنی سی عمر میں ہی اس کی کمر جھک گئی تھی اور اس کی کھال ہڈیوں سے لٹک جانے کے قریب تھی۔ اس کے چہرے پر جگہ جگہ زخموں کے نشان تھے۔ اس کے تیزی سے سفید ہوتے بال جلے، کٹے ہوئے تھے۔ وہ ایک آنکھ سے نابینا بھی ہو چکی تھی۔

تیسرے شوہر کی موت اس پر بڑھاپا لے آئی اور وہ اپنے شوہر کی غم زدہ بوڑھی ماں کی خدمت گار بن گئی جو اپنے ہوش و حواس گنوا بیٹھی تھی۔ اس نے گرمیاں، جاڑے اور بہاریں گھر کے اندر اس کے ساتھ کاٹے، جسے روشنی اور اندھیرے دونوں سے ڈر لگتا تھا۔ جو جاگتی تھی تو روتی تھی، سوتی تھی تو چلاتی تھی۔ اکلوتے بیٹے کی طویل بیماری اور موت نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اپنے ہوش گنوا بیٹھی تھی اور الزہرہ کے حواس تار تار کر رہی تھی۔ وہ اس پر کسی جنگلی جانور کی طرح حملہ آور ہوتی اور الزہرہ اس کے ہاتھوں شکار ہوتی رہتی۔ جب بھی الزہرہ کو ضروری خریداری کے لیے بازار جانا پڑتا تو وہ اسے اپنے ساتھ باندھ لیتی۔ پھر بھی وہ راستہ بھر اسے نوچتی، مارتی، چلاتی اور روتی ہوئی آتی۔ ایک دنگل تھا جو ہر روز اس کے گھر ہوتا تھا۔ پھر بھی وہ خوش تھی۔

لوگ اس گھر کو پاگل خانہ کہتے تھے۔ الزہرہ کے ساتھ جو لوگوں کو تھوڑی بہت ہمدردی تھی، وہ بھی جاتی رہی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ اسے چھوڑ کر چلی کیوں نہیں جاتی۔ اسے کسی پاگل خانے میں جمع کروا دے وہ صرف پینتیس سال کی ہے، پھر سے اپنا گھر بسا سکتی ہے۔ اس نے بھی یہ سب سوچا تھا لیکن کیا کچھ بھی نہیں۔

"کیا لوگوں کو اس لیے چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ اپنے حواسوں میں نہیں رہے۔ کیا اللہ ایسے لوگوں کو چھوڑ دیتا ہے۔"

"تم خدائی صفات اپنانے کی کوشش کر رہی ہو؟"

"میں جاننا چاہتی تھی کہ خدا کیا کرتا۔"

"تم دیکھ تو رہی ہو، اس نے تمہیں اس کے ساتھ رکھا ہے۔۔۔ خدا نے یہی کیا۔"

"اور اگر میں نہ رہوں اس کے ساتھ۔۔۔ پھر۔۔۔؟"

"چھوڑ دو پھر۔۔۔ اپنے سکھ تلاش کرو۔"

"میں سکھی ہوں۔ اللہ جانتا ہے میں بہت سکھی ہوں۔ کیا سکھ صرف اچھا کھانے، اچھا پہننے، اچھی جگہ رہنے کو ہی کہتے ہیں۔ میں سمجھنا چاہتی ہوں لوگ مجھے بے چاری کیوں کہتے ہیں صرف اس لیے کہ میں اپنے مرحوم شوہر کی ماں کے ساتھ ہوں جو پاگل ہے۔ میں جوان ہوں اور وہ کہتے ہیں میں خود کو برباد کر رہی ہوں۔ اگر میں ایسی پاگل ماں کے بجائے اپنے نئے شوہر کے ساتھ ہوں گی تو کیا تب ہی میں سکھی ہوں گی۔ اس نے میری ایک آنکھ پھوڑ دی، گرم سلاخ اس نے میری آنکھ میں گھونپ دی، پھر بھی میں سکھی ہوں لیکن میں تب دکھی ہوتی ہوں جب لوگ مجھے پاگل کہتے ہیں۔"

"اس پاگل ضعیف کی خدمت نے تمہیں بھی ضعیف کر دیا ہے؟"

"ایسے نہ کہیں عمری با! جس میں ان کا اختیار نہیں، اس کا الزام بھی انہیں نہ دیں۔ کیا زندگی جوانی کی بہاریں اور بڑھاپے کا آرام ہی ہے؟ کیا وقت سے پہلے بوڑھا ہو جانا عذاب ہے؟ کیا نیکی اپنے سکھ کو حاصل کرنے کے بعد کیا جانے والا عمل ہے؟"

"تو تم یہ سب نیکیاں جمع کر رہی ہو؟"

"نہیں عمری با! نیکی میرے بس کی بات نہیں۔ میں نے عبادتوں میں راتیں گزاری ہیں، نہ دن۔"

"تمہاری یہ عاجزی اللہ کو پسند ہوگی... یقیناً"...
"اگر پسند ہوتی تو وہ مجھے بزرگی عطا کرتا۔"
وہ چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

پھر اپنے مرحوم شوہر کی ماں کے مرنے کے بعد آئی تھی۔ وہ اتنی غم زدہ اور دکھی تھی کہ عمری با کو لگا کہ وہ بھی جلد ہی مر جائے گی لیکن وہ مری نہیں بلکہ دوسرے لوگوں کو اپنے سامنے مرتے ہوئے دیکھنے لگی۔ اس نے ایک خدمت گار کی حیثیت اختیار کرلی۔ لوگ اسے اپنے بیمار بوڑھوں یا معذور بچوں کی دیکھ بھال کے لیے اجرت پر رکھ لیتے۔ وہ اجرت بھی کم لیتی تھی اور اس کی نگرانی بھی نہیں کرنی پڑتی تھی۔ البتہ وہ جس جس بوڑھے مریض کی خدمت کے لیے گئی، ان میں سے بہت سے زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکے اور اسی لیے اس کی مانگ میں اضافہ ہوا۔

"کیا میرا سایہ منحوس ہے؟" اس نے عمری با سے پوچھا۔

"میں نہیں جانتا۔"

"مجھے جاننا ہے... وہ میرے ہاتھوں میں دم کیوں توڑ دیتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں میں موت کا فرشتہ ہوں۔"

"تم اسے خوش نصیبی کیوں نہیں سمجھتیں۔"

"کیا موت کسی بھی طرح خوش نصیبی ہوسکتی ہے؟"

"کیوں نہیں! جو حکم لکھ دیا گیا ہے، اس کی تکمیل ہو جائے تو کیا یہ خوش نصیبی نہیں؟"

"میں موت کے لیے تیار ہوں لیکن دوسروں کی موت مجھے گوارا نہیں۔"

"تم کون ہوتی ہو گوارا کرنے والی، جب اسے گوارا ہے، جو زندگی کے ساتھ موت لکھتا ہے۔"

"تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو، کیا تم نے اللہ سے پوچھا ہے۔" اسے یقین چاہیے تھا۔

"میرا خیال ہے، یہ سامنے کی بات ہے... صاف... صاف... بالکل حقیقت... دن کی طرح صاف اور اجلی ہوئی۔"

"تم مجھے ٹال رہے ہو، پھر ٹال رہے ہو، میں تو اپنے سامنے مرنے والوں کی تعداد بھی بھول گئی ہوں۔ میرے کانوں میں ان کی باتیں گونجتی رہتی ہیں... ان کی بڑبڑاہٹیں... ان کے کلمے... ان کی آخری ہچکیاں..."

"کیا تمہیں یہ کسی انعام سے کم لگتا ہے؟ تم ان کی شہادتوں کی گواہ ہو؟"

"کیا اللہ کو گواہوں کی ضرورت ہے؟ وہ سب جانتا ہے۔"

"وہ سب جانتا ہے لیکن روز قیامت وہ اپنے لیے نہیں 'تمہارے' لیے گواہ سامنے لائے گا۔ وہ انصاف پسند ہے، وہ سیدھے سیدھے سزا سنانا نہیں چاہتا۔ ورنہ یوم جزا صرف یوم سزا ہوتا۔"

"کاش میں ولی اللہ ہوتی، عمری با! کاش ایسا ہوتا، میں اللہ سے ان سب کے لیے راحت مانگتی۔"

عمری با مسکرانے لگا۔ "انسان عجیب ہے، اسے پیغمبر کے ساتھ معجزہ چاہیے اور فرمان کے ساتھ مہر۔ پھر ہی وہ اپنے ایمان کی کھڑکی کھولتا ہے۔"

الزہرہ دوائیوں اور حکیمی نسخوں سے بھرے تھیلے کو اٹھا کر چلی گئی۔

وہ ایسے ہی تھیلے کے ساتھ ایک بار پھر آئی تھی۔

"اس نے کہا کہ میں اسے کلمہ پڑھوا دوں۔ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ اس کا بیٹا اپنے بچوں کے ساتھ گھومنے گیا ہوا تھا۔ پھر اس نے دم توڑ دیا۔ وہ ساری رات بڑبڑاتا رہا اور اس نے اپنے گناہ مجھے بتائے۔"

"جب وہ ... اپنے گناہ تمہیں بتا رہا تھا تو تم نے اس سے کیا کہا۔"

میں نے کہا۔ "خدا رحمن ہے۔ وہ اس سے کہیں زیادہ رحمن ہے، جتنا تم سوچتے ہو یا جانتے ہو، وہ تمہیں معاف کرنے کا رائی برابر جواز بھی نہیں چھوڑے گا۔ میں ساری رات اس سے یہی کہتی رہی۔ میں چاہتی تھی وہ اللہ کی رحمت پر ایمان رکھ کر جان دے۔"

"اگر تمہارے بجائے اس کی لاڈلی اولاد اس کے پاس ہوتی تو وہ شاید اللہ پر اتنا یقین رکھ کر جان نہ دیتا۔"

الزہرہ معصومیت سے مسکرا دی۔ "اللہ رحمٰن ہے' وہ ہمارے یقین پر اپنا رحم نہیں کرتا۔ ہم اعتقاد رکھتے ہیں یا نہیں وہ رحمٰن ہی ہے۔"

"تم نے "خدائی صفت" کی ایسی حقیقی پہچان کیسے حاصل کی؟"

"یہ تو سامنے کی بات ہے۔ صاف صاف۔ بالکل حقیقت۔ کیا تم نہیں دیکھتے یہ سب۔ کیا وہ میرے اعتقاد پر مجھ پر رحم کرے گا؟"

عمری بابھی معصومیت سے مسکرا دیا۔ "تو تم نے یہ جان لیا؟"

"اگر میں برگزیدہ بندی ہوتی تو اللہ کو زیادہ اچھی طرح سے جانتی۔"

"تو تمہیں بھی مر جانا چاہیے۔ دلیل کے ساتھ ثبوت۔" عمری بابا نے اس کے رخصت ہو جانے کے بعد کہا



اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک ڈھلتی عمر کی عورت کھڑی تھی۔

"کون! دیکھو' میں نے تھیلا تیار کر لیا ہے' میں نکلنے ہی والی تھی گھر سے۔ کچھ نسخے تیار کرنے میں وقت لگا' ورنہ اندھیرا چھانے سے پہلے میں گھر سے نکل چکی ہوتی۔" اسے لگا جس نئے مریض کے لیے اسے خدمت گار کی حیثیت سے مامور کیا گیا ہے' ان ہی میں سے کوئی اسے لینے آیا ہے۔

عورت اسے دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے جھجک گئی۔ الزہرہ نے آنکھ رگڑ کر اپنی بینائی کو ذرا صاف کیا اور ایک پریشان حال اجنبی عورت کو سامنے کھڑا پایا۔

"میرا گھر جل چکا ہے۔ میرا شہر مر چکا ہے' میں بے اولاد رہی اور پھر میرا ایمان ڈگمگا گیا' میں۔۔۔ میں نے اللہ کو گنوا دیا۔" اس نے سسک کر کہا۔

الزہرہ نے اسے ذرا غور سے دیکھا۔ پھر آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ پر تھپکی دی۔

"میں دو ٹانگوں سے معذور ایک ضعیف کی خدمت کے لیے جا رہی ہوں۔ کیا تم میرے ساتھ آنا چاہو گی؟ اللہ کو اس کی مخلوق کی خدمت کے ذریعے پانے کی کوشش کرو گی۔"

عورت نے سر ہلا دیا اور الزہرہ کے ہاتھ سے تھیلا لے لیا۔

"تم مجھے جانتی ہو؟"

"کیا آپ مجھے نہیں جانتیں۔ اس فقیر نے کہا' میں یہاں آ جاؤں' وہ جو خان الخلیلی۔۔۔"

"عمری بابا؟" الزہرہ حیران رہ گئی۔ "وہ میرا گھر نہیں جانتا۔ ہمیشہ میں ہی اس کے پاس گئی ہوں۔ تمہیں جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں تھی۔"

"میں نے جھوٹ نہیں بولا۔ اس نے کہا' محلہ اشرافیہ میں مسجد کے گنبد کے سائے میں اس کا گھر ہے اور مسجد کے گنبد کی روشنی صرف اسی کے گھر کو روشن کرتی ہے۔"

پندرہ سال سے اس گھر میں رہتے الزہرہ نے پہلی بار گھر کی دہلیز سے نکل کر مسجد کے گنبد کو دیکھا اور اس سے اٹھتی روشنی کو۔ وہ صرف اسی کے گھر کو روشن کر رہی تھی۔ اس نے ڈگمگا کر دہلیز کو پکڑ لیا۔

"اور اس نے کیا کہا؟"

اس نے کہا۔ "انسان بھی عجیب ہے' ہر چیز کا ثبوت مانگتا ہے' اپنے ولی ہونے کا بھی۔"

☆

امثل عزیز شہزاد



ایک ڈھلتی عمر کی عورت سڑک پار کرتے ہوئے ایک لڑکی کو دیکھتی ہے۔ اس کے ساتھ ایک ماڈرن عورت ہے۔ وہ اسے چلا کر رکنے کے لیے کہتی ہے لیکن وہ دونوں سڑک پار کر کے گاڑی میں بیٹھ کر چلی جاتی ہیں۔

وقار صاحب کے دو بچے ہیں۔ اجیہ اور سائر... وہ سائر کی شادی کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ان کی بیوی اس دنیا میں نہیں ہے۔ ان کی سالی مہ پارہ خاص طور پر لندن سے اس شادی میں شرکت کرنے آئی ہیں' اجیہ وقار صاحب کو بتاتی ہے کہ سائر اس شادی سے ناخوش نظر آتا ہے۔ وقار صاحب یہ سن کر پریشان ہو جاتے ہیں۔

اجیہ بہت خوب صورت ہے۔ وہ دو ماہ کی تھی جب اس کی ماں چلی گئی۔ وہ اپنی خالہ مہ پارہ سے پوچھتی ہے' اس کی ماں کیسی تھیں۔ مہ پارہ بتاتی ہیں کہ اس کی ماں بہت خوب صورت تھی بالکل کانچ سے بنی مورت۔ وقار صاحب کی بہنیں بھی انہیں احساس دلاتی ہیں کہ سائر اس شادی سے خوش نہیں ہے۔ تب وقار صاحب سائر سے براہ راست بات کرتے ہیں کہ سائر کہیں اور انٹرسٹڈ تو نہیں ہے۔ تب سائر کہتا ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے اور وہ اپنے باپ کی کوئی بھی خواہش رد نہیں کر سکتا۔

سائر کی شادی میرب سے ہو رہی ہے۔ میرب دو سال کی تھی جب ان کی ماں بھی دنیا سے چلی گئی تھیں۔ ابراہیم صاحب نے اس کے بعد شادی نہیں کی۔ ان کے پڑوسی اور دوست احمد سعید اور ان کی بیگم نے میرب کا خیال اپنے بچوں کی طرح رکھا سعید صاحب کی بیٹی ماریہ کی میرب سے گہری دوستی ہے ان کا ایک بیٹا عاشر ہے جو اجیہ کو پسند کرتا ہے شادی کی

مکمل ناول





تقریبات میں سائر کا رویہ بہت اکھڑا ہوا رہتا ہے۔ شادی کی رات بھی وہ میرب سے بہت رکھائی سے پیش آتا ہے وہ میرب سے کہتا ہے کہ وہ اس سے صرف وفاداری کی توقع رکھتا ہے اور اسے اپنی بہن اور والد کا خیال رکھنے کو کہتا ہے۔

اجیہ کی دوست شینا بہت آزاد خیال لڑکی ہے۔ اس کا بھائی آغا شایان اجیہ میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔ اجیہ بھی اس کی طرف مائل ہے۔ جبکہ میرب کا بھائی سعد' اجیہ کو پسند کرتا ہے۔

سائر کا رویہ میرب کے ساتھ بہت عجیب ہے۔ وہ معمولی باتوں پر شدید رد عمل ظاہر کرتا ہے۔' وہ کہتا ہے کہ وہ کسی بھی لڑکے سے بات نہ کرے۔

وہ عورت جس نے سڑک پر مہ پارہ کو دیکھا تھا۔ ایک خستہ فلیٹ میں رہتی ہے۔ وہاں سے کوئی پرانا پتا نکال کر مہ پارہ کے گھر جاتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ مہ پارہ وہ گھر چھوڑ چکی ہے۔ لیکن وہاں کے مکین اسے وقار صاحب کے گھر کا پتا دے دیتے ہیں۔

تب وہ کہتی ہے وقار آج سے سالوں پہلے تم نے جو اذیت مجھے پہنچائی تھی' اس کے بدلے کا وقت آپہنچا ہے۔"

شیخ عبدالحمید کریانہ فروش ہیں۔ دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں' نازو' چندا اور مانو۔ چندا کا مزاج اور صورت سب سے الگ ہے۔ وہ بے حد حسین ہے اور پڑھائی کے بجائے دوسری رنگا رنگ سرگرمیوں میں دلچسپی رکھتی ہے۔ شیخ صاحب کی لاڈلی ہے۔ کالج میں ایک ڈرامے میں قلوپطرہ کا کردار کرتی ہے تو آصف شیرازی اسے ٹی وی پر اداکاری کی آفر کرتا ہے۔ وہ ایک ڈائریکٹر شکیل ملک کا ملازم ہے۔ اس آفر پر چندا بہت خوش ہوتی ہے لیکن وہ جانتی ہے کہ اس کے گھر والے کبھی اسے ٹی وی پر کام کرنے کی اجازت نہیں دیں گے اور شادی کرکے رخصت کردیں گے۔ وہ آصف شیرازی سے کہتی ہے کہ تم مجھ سے شادی کرلو یہ اصلی شادی نہیں صرف ایک معاہدہ ہوگا۔ میں گھر والوں کے چنگل سے نکل آؤں گی۔ آصف مان جاتا ہے۔

میرب سائر کے رویے سے بہت پریشان ہے۔ وہ عاشر سے بات کرنے کو منع کرتا ہے۔

اجیہ کا تعلق آغا سے بہت بڑھ چکا ہے۔ دونوں ملاقاتیں کررہے ہیں۔ ادھیڑ عمر عورت اجیہ کو فون کرکے بتاتی ہے کہ اس کی ماں زندہ ہے۔ وہ کہتی ہے کہ وہ اجیہ کی ماں سے ملاقات بھی کرا سکتی ہے۔

# چوتھی قسط

اس کے بال پکڑ کر ہذیانی انداز میں غرایا۔

"آوارہ عورت۔۔۔ کیوں پہنا ہے تو نے یہ بے ہودہ لباس' جواب دے۔" وہ اس کے بال پکڑ کر جھٹکے دینے لگا۔ مارے تکلیف کے وہ بلبلا کر رو دی۔

"میرے بال چھوڑیں مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔" وہ کرلائی۔

"تکلیف تو تجھے اب ہوگی۔۔۔ کس لیے کر رہی ہے تو اپنے جسم کی نمائش' تیری کون سی حس کو تسکین مل رہی ہے بتا۔" وہ جنگلیوں کی طرح اس کی ساڑی کا پلو کھینچ کر بولا۔ پلو پن سے اٹکا ہوا تھا۔ یوں کھینچنے سے پھٹ گیا۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو۔۔۔ پلیز ہوش کریں۔" وہ بری طرح روتے ہوئے گڑگڑائی۔

"ہوش میں تو تجھے میں لاؤں گا۔ تو نے کیا سمجھا مجھے بے غیرت؟ جو میں چپ چاپ تیری بے ہودگیاں برداشت کرتا رہوں گا۔ مجھے پہلے ہی پتا تھا ساری عورتیں بے وفا ہوتی ہیں۔ اپنی خواہشات کی غلام تو میری آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہتی ہے مگر میں بے وقوف نہیں ہوں' تو نے مجھے کمزور سمجھ رکھا ہے۔" اس نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر دے مارا۔ وہ جو بے یقینی سے آنکھیں پھاڑے روتی ہوئی اس کا یہ پاگل پن وحشت' دہشت سے دیکھ رہی تھی۔ لڑکھڑا کر پیچھے گری اور ہوش و خرد سے بے گانہ ہو گئی۔

ایک خوب صورت دن کا بد صورت اختتام ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

سر پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں لگتا تھا گویا کسی نے مرچیں ڈال دی ہوں۔ پوری رات روتے روتے گزر گئی تھی۔ کیا تھا جو وہ بے ہوش ہی رہتی مگر اس ظالم نے اسے بے ہوش بھی رہنے نہ دیا۔ ہوش میں لا کر خود کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ صبح کہیں جا کر روتے روتے ذرا کی ذرا آنکھ لگی۔ جو نامعلوم احساس کے تحت کچھ دیر بعد کھل بھی گئی۔ وہ دشمن جاں آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میرب کے وجود میں دوڑتی اذیت دوچند ہو گئی۔

"اتنی ذلت... ایسا وحشیانہ سلوک۔" وہ اپنی نگاہوں ہی میں گر گئی تھی۔ وہ تو صرف اسے بھرپور توجہ دینے... اپنی محبت کا احساس دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"مگر بے کار ہے... سب بے کار ہے' اس آدمی کے سینے میں دل ہی نہیں تو دوسروں کا احساس کہاں سے ہو گا۔ یہ شخص اک پتھر ہے' جس سے سر ٹکرا کر میں پاش پاش تو ہو سکتی ہوں مگر اپنی محبت سے اسے تراش نہیں سکتی۔ اپنے حسن سلوک سے اسے موم نہیں بنا سکتی۔

بابا... آپ کہاں ہیں دیکھیے تو مجھے... جسے آپ نے کبھی غصے میں ڈانٹا تک نہیں' آج اس کے ساتھ کیسا بے رحمانہ سلوک کیا گیا ہے۔" روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

وہ اسے نظر انداز کیے تیار ہوتا رہا اور پھر بنا کچھ کہے کمرہ عبور کر گیا۔ وہ اس کے جانے کے بعد اپنے بکھرے منتشر وجود سمیت اٹھی۔ دیر تک شاور کے نیچے کھڑی رہی۔ مگر اک عجب سی ذلت و بے کلی کا احساس تھا جو حل ہی نہیں رہا تھا۔ کچھ دیر بعد نکلی اور اسٹڈی سے وقار صاحب کا لیپ ٹاپ لے کر اپنے روم میں لوٹی۔ فون پر اس نے ابراہیم صاحب کو اسکائپ پر آنے کا پیغام دے دیا تھا۔ جوں ہی وہ سامنے آئے وہ بنا کچھ پوچھے بنا کچھ کہے بے ساختہ ___ رو دی۔

"کیا ہوا میرو... میری جان... سب خیر تو ہے۔" انہوں نے انجانے خدشوں میں گھر کر بے قراری سے پوچھا۔

"کیوں چلے گئے بابا! آپ مجھے یہاں اکیلا چھوڑ کے۔" وہ بلک کر بولی۔

"میری بیٹی... خدارا خاموش ہو جاؤ' کچھ بتاؤ تو سہی کیا بات ہے۔ اتنی صبح سویرے کیوں مجھے بلایا... سب ٹھیک تو ہے۔" ان کا تو چین و قرار اسے یوں تڑپتے دیکھ کر لٹ گیا تھا۔

"وہاں سب ٹھیک ہے؟ کسی نے کچھ کہا ہے کیا' سارہ سے جھگڑا ہوا ہے؟" وہ اندازے لگاتے رہے۔

"کچھ نہیں ہوا... بس مجھے آپ کے پاس رہنا ہے۔" وہ ملتجی ہوئی۔ "پلیز۔"

"مگر بیٹا!... ایسے کیسے... اب گھر بار والی ہو۔ تم پر ذمے داریاں ہیں۔ سمجھ داری سے کام لو۔" وہ رسان سے اسے بہلانے کی کوشش کرنے لگے۔

"تو آپ پاکستان آ جائیں۔ میں کچھ دن آپ کے پاس گزارنا چاہتی ہوں۔" وہ مصر ہوئی۔

"بیٹا..." ابراہیم صاحب اس کے مسلسل اصرار پر کچھ پریشان سے ہو کر بولے۔ "کیا ہو گیا ہے تمہیں؛ تم تو کبھی اتنی ضدی نہیں تھیں۔ میں اکیلا نہیں آ سکتا۔ یہاں آ کر میرے گھٹنے جواب دے گئے ہیں۔ بغیر سہارے کے چلنے پھرنے سے معذور ہوں۔"

"مجھے آپ کی بہت یاد آ رہی ہے بابا۔" وہ سسکنے لگی۔

"میرو بیٹے... اپنے بابا کی برداشت کا امتحان مت لو یوں رو کر۔" وہ نمناک ہوئے۔ "تم جانتی ہو میں تمہیں اور عاشر کو ذرا سی بھی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔" تب اسے ایک دم خیال آیا۔ بابا ضعیف ہیں اور دل کے مریض بھی۔ اس کے یوں ان کے سامنے ضبط کھو کر رونا بلکنا کسی طور مناسب نہیں' مگر کیا کرتی وہ

بھی اپنی جگہ مجبور تھی۔ اس وقت کسی بہت ہی اپنے کی گود میں سر رکھ کر سارے دکھ درد اسے سنانے کا جی چاہتا تھا مگر اپنے زخم انہیں کہاں دکھا پائی تھی وہ... دکھا بھی نہیں سکتی تھی کہ انہوں نے بہت مان اور اعتماد کے ساتھ اپنے دوست پر بھروسا کر کے اپنی نازک سی بیٹی اس کے حوالے کی تھی اور جب مان اور اعتماد ختم ہو جائے' تب تو کچھ بھی باقی نہیں بچتا' جیسے اس کے اندر نہیں بچا تھا مگر وہ یہ خالی پن نہ انہیں دکھا سکتی تھی' نہ اس میں حصے دار ہی بنا سکتی تھی۔

"سوری بابا... میں نے بلاوجہ آپ کو پریشان کیا' یوں آدھی رات کو۔" وہ بے حد شرمسار لہجے میں بولی اور اپنی سسکیاں اپنے اندر دفن کرنے کی سعی لاحاصل کرنے لگی۔

"کوئی بات ہوئی ہے تو مجھے بتاؤ۔" وہ فکر مند تھے۔

"نہیں بس... بہت یاد آرہی تھی آپ کی۔" اس نے بات گھمانا چاہی۔

"یاد تو میں اور عاشر بھی تمہیں پل پل کرتے ہیں بیٹا۔ عاشر کا کانٹریکٹ ختم ہوتے ہی ہم آجائیں گے۔ تم سنبھالو اپنے آپ کو... بلکہ ایسا کرو کچھ دنوں کے لیے ماریہ بیٹی کے گھر رہ آؤ... وہ بھی تو تمہارا میکہ ہے۔"

(نہیں بابا... میں کہیں نہیں جا سکتی۔ اس زنداں سے تو شاید اب مر کر ہی رہائی ملے گی۔) "ہاں... دیکھتی ہوں' رئیلی سوری بابا... میں نے آپ کو پریشان کر دیا نا۔"

"ہرگز نہیں میری جان... کچھ دیر میں' میں بس جاگنے ہی والا تھا۔" انہوں نے اس کی شرمندگی زائل کرنے کو کہا۔

"اچھا... پھر خدا حافظ... عاشر کو میرا سلام کہیے گا۔"

"وہ بھی تمہیں بہت یاد کرتا ہے۔ چھٹی کے روز بات کر لینا اس سے بھی۔"

"او کے..." وہ کہہ کر سرعت سے آف لائن ہو گئی اور گھٹنوں میں سر دیے کر بے آواز رونے لگی۔

"کیا کروں میں... کچھ سمجھ نہیں آتا... یا اللہ تو ہی کچھ راہ سجھا دے۔" وہ فریادی بنی۔ دوسری جانب ابراہیم صاحب تاحال متفکر بیٹھے تھے۔

"نہیں کچھ تو بات ہے... کیسی بجھی بجھی اور بے حال لگ رہی تھی میری... مجھے فاروقی سے بات کرنی ہی ہو گی۔" انہوں نے حتمی انداز میں سوچا۔

☆ ☆ ☆

دن بوجھل اور راتیں بے کیف تھیں۔ اوپر سے اس کی حالت... اس کا مزاج دن بدن چڑچڑا ہوتا جا رہا تھا۔ جمیل اس کا ہر ممکن خیال رکھ رہا تھا۔ اس کی ہر فرمائش خواہ ——— بے تکی ہی پوری کر رہا تھا مگر اس کی بے زاری تھی کہ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ یوں ہی سات ماہ گزر گئے۔ اک روز اس کا جی اتنا گھبرایا کہ سرِشام ہی کالونی کے باغ میں چہل قدمی کی غرض سے نکل گئی۔ اس کے بعد اس نے یہ معمول بنا لیا۔ جمیل کو پتا چلا تو اس نے بشیرن کو ساتھ لے جانے کی تاکید کی۔ وہ ان دنوں اپنے کاروبار میں دن رات مصروف تھا۔ وہ محنت کر رہا تھا۔ اسے چندا کو خوشیاں دینی تھیں۔ وہ ساری فرمائشیں پوری کرنی تھیں جو وہ "وقتاً فوقتاً" کرتی رہی ہے۔ چندا کو پرتعیش زندگی چاہیے تھی اور اس کے لیے بہت سا پیسہ درکار ہوتا ہے اور بہت سا پیسہ بہت سی محنت سے آتا ہے۔ سو وہ محنت کر رہا تھا۔ اس شام بھی وہ حسب معمول باغ کے لیے نکلی۔ بشیرن نے ساتھ چلنے کا کہا تو اسے دھتکار دیا۔ دھیمی چال چلتی ہوئی وہ اپنی مخصوص بینچ پر آ بیٹھی اور... باغ میں ہوئی رونق دیکھنے لگی۔ تب ہی کوئی خاتون اس کے نزدیک بینچ پر آ کر بیٹھیں۔

"ہیلو..." انہوں نے اسے مخاطب کیا۔ وہ چونکی... اور انہیں دیکھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کی خاصی ماڈرن سی خاتون تھیں۔

"ہیلو..." وہ بھی جواباً بولی۔

"کون سا منتھ ہے؟" اس نے ناگواری سے جواب دیا۔ اسے عورتوں کے اس طرح کے سوالات بے

حد برے لگتے تھے۔

"اوہ۔۔۔ بہت کم عمر لگتی ہو۔ کیا عمر ہے تمہاری؟" اب انہوں نے اپنے کندھے تک آتے براؤن بال بینڈ سے آزاد کر لیے تھے۔

"انیس سال۔۔۔" اسے ان کا سوال نامہ زہر لگ رہا تھا۔

"اتنی کم عمر میں شادی کیوں کرلی؟ اوہ! سمجھ گئی لو میرج؟" انہوں نے یوں سرہلایا، گویا سب سمجھ گئی ہوں۔

"جی نہیں۔۔۔ ارینج میرج۔۔۔" اس نے ان کی غلط فہمی فی الفور رفع کی۔

"ہائے نہیں۔۔۔ ایسی کیا افتاد آن پڑی تھی جو تمہیں اتنی کم عمری میں بیاہ دیا۔" وہ افسوس کرنے لگیں۔

"آپ کی تعریف؟" چندا نے چڑ کر پوچھا۔

"پومی۔۔۔" مسرت سے بتایا۔ (جتنی بے تکی یہ شخصیت ہے اس کا ایسا ہی نام ہونا چاہیے تھا۔) اس نے دل میں سوچا۔

"اچھا تو پومی آنٹی۔۔۔ آج کیا پہلی مرتبہ آئی ہیں آپ یہاں، آپ کو پہلے تو نہیں دیکھا۔" اس نے وقت گزاری کے لیے اب ان سے سوالات شروع کردیے۔

"ہم ابھی ابھی کراچی سے یہاں شفٹ ہوئے ہیں۔ یہ علاقہ تو ایویں ہے۔ ہمارا تو گھر بن رہا ہے گلبرگ میں۔۔۔ کچھ روز میں وہیں شفٹ ہوجائیں گے۔" وہ تفاخر سے بولیں۔ ان کے اس علاقے پر ناک بھوں چڑھانے پر چندا کا منہ بن گیا۔ (ویسے کہہ تو ٹھیک ہی رہی ہیں۔ گلبرگ کے آگے تو یہ علاقہ تھرڈ کلاس ہی ہے۔) وہ تو سو فی صد متفق تھی۔

"کراچی میں کہاں رہتی تھیں؟" اس سوال پر وہ ایک لحظہ رکیں پھر بولیں۔

"نرسری کے علاقے میں، دراصل میرے شوہر پی ٹی وی پر جاب کرتے تھے پہلے۔ سچ اتنی محنت اور معاوضہ کچھ خاص نہیں۔ پھر وہ تو میری قسمت سے باٹلی والا صاحب کی نظران پر پڑ گئی۔"

"کیا نام ہے آپ کے شوہر کا؟" چندا کے کان کھڑے ہوگئے۔

"انوار حمیدی۔۔۔ نام تو تم نے یقیناً سنا ہوگا۔" وہ تیقن سے بولیں اور یہ نام یقیناً چندا نے نہیں سنا تھا مگر اخلاقیات بھی کوئی چیز ہے آخر۔

"ہاں کیوں نہیں، وہ تو خاصے مشہور ڈائریکٹر ہیں۔" وہ بولی۔

"ڈائریکٹر تو خیر نہیں ہیں" وہ کچھ ہلکی ہو کر بولیں۔ "اسسٹ کرتے ہیں۔"

"ویسے اصلی کام تو سارا اسسٹنٹ ہی کرتے ہیں۔ ڈائریکٹر تو صرف منہ چلانے اور چیخ پکار کرنے کے سوا کرتا ہی کیا ہے۔" چندا نے کہا۔

"تم نے بالکل ٹھیک کہا" وہ بہت خوش ہو کر بولیں۔ "ساری محنت تو کریں۔ اسسٹنٹ اور کریڈٹ لے جاتے ہیں ڈائریکٹر اِس لیے تو حمیدی صاحب خود ڈائریکشن کا سوچ رہے ہیں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔"

"تم بہت خوب صورت ہو، بالکل کسی فلمی ہیروئن کی طرح۔۔۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ۔ وہ کمبخت ماریاں تو یوں ہی سی ہوتی ہیں، سارا کمال میک اپ کا ہوتا ہے۔"

"آپ مذاق کررہی ہیں۔" وہ انکساری سے بولی۔ بناوٹی انکساری۔

"ارے بالکل نہیں۔۔۔" انہوں نے کہا۔۔۔ "تم مجھے پیاری لگیں، تب ہی تم سے بات کی، ورنہ تو میں یوں ہی ہر کسی سے بات شروع نہیں کردیتی، آخر کو اتنے بڑے نامی گرامی آدمی کی بیوی جو ہوں۔" وہ متکبرانہ لہجے میں بولیں۔

"جی ٹھیک کہا۔" چندا نے اثبات میں سرہلایا۔

"آپ سے مل کر ازحد خوشی ہوئی، وہ سامنے میرا گھر ہے کسی وقت تشریف لائیے۔"

"ضرور۔۔۔ مجھے تمہارے گھر آکر خوشی ہوگی۔" پھر

وہ دیر تک یوں ہی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں اور یوں چندائی روکھی پھیکی زندگی میں اک رنگ برنگ کردار کی آمد ہوئی۔ پومی۔ جیسا نام۔ ویسی ہی شخصیت اور ویسے ہی کام۔

☼ ☼ ☼

وقار بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ تب ہی بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھا ان کا فون بجا۔ انہوں نے چونک کر کتاب نشانی لگا کر بند کی اور راکنگ چیئر سے اٹھ کر فون تک آئے۔ اسکرین پر ابراہیم کا نمبر جگمگا رہا تھا۔

ابراہیم صاحب بمشکل تمام کچھ گھنٹے ہی اپنی فکر مندی اور تشویش کو دبا پائے تھے۔ وہ بھی اس لیے کہ انہیں معلوم تھا کہ شاید پاکستان میں ابھی سب جاگے نہ ہوں' خود تو وہ خیر رات کے اخیر پہر سے جاگ رہے تھے۔ میرو کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ نظر انداز کیا پاتے۔

"ہیلو۔ کیسے ہو بھئی ابراہیم۔ بڑے دنوں بعد یاد کیا۔" وہ خوشی سے کھل گئے۔

"السلام علیکم وقار۔ کیا حال ہے تمہارا؟" وہ نسبتاً"سنجیدگی سے بولے۔

"وعلیکم السلام۔ ٹھیک ٹھاک ہیں بھئی ہم تو'تم اپنی سناؤ۔" وہ بیڈ کے کنارے پر ٹک گئے۔

"سائز اور میرو کیسے ہیں؟" انہوں نے نہ جانے کیا سوچتے محتاط لہجہ اختیار کیا۔

"الحمدللہ دونوں خیریت سے ہیں۔ کل سالگرہ تھی سائز کی' میرو بیٹی تمہیں بہت یاد کرتی رہی۔" انہوں نے بتایا۔ "ابھی جاگی نہیں' جاگے گی تو تمہاری بات کروادوں گا نیٹ پر' شکل دکھا دینا بچی کو۔"

"وقار۔ وہاں سب ٹھیک تو ہے نا؟" وہ چاہتے ہوئے بھی انہیں آج صبح کا واقعہ بتا نہ پائے۔

"ارے بھئی ہاں۔ یار تم کیوں اتنے متفکر ہو رہے ہو' تمہاری بیٹی بہت خوش' بہت مطمئن ہے یہاں۔ چاہو تو اس سے خود پوچھ کر دیکھ لو۔ مجھ پر تو شاید تمہیں اعتبار نہیں رہا۔" وہ مصنوعی خفگی سے بولے۔

"خوش اور مطمئن۔" ابراہیم نے دل میں دہرایا' مگر نہ ہی وہ مجھے خوش لگ رہی تھی' نہ ہی مطمئن۔ مگر یہ وقار کیا کہہ رہا ہے' میں کس پہ یقین کروں؟ وہ مزید بے چین سے ہو گئے۔

"ارے یار۔ کیا خاموش رہنے کے لیے فون کیا ہے۔ اور کیسا ہے عاشر۔ پھر کب آرہا ہے پاکستان؟"

"ہاں سب ٹھیک ہے۔ دیکھو کب آپاتا ہوں۔ چلو یار ابھی رکھتا ہوں' پھر بات کروں گا۔" انہوں نے مزید بنا کچھ سنے کہے فون رکھ بھی دیا۔

"یہ اسے کیا ہو گیا۔ لگتا ہے تنہائی سہتے سہتے بڈھا خبطی ہو گیا ہے۔" انہوں نے سر جھٹک کر ہنستے ہوئے فون رکھا اور دوبارہ کرسی پر بیٹھ کر کتاب اٹھالی۔ جو میرب پہ گزری تھی اس کا وہ گمان بھی نہیں کر سکتے تھے۔

مگر وہ میرب کے لیے اس قدر پریشان کیوں تھا۔ شاید دور ہے نا' اس لیے اور یوں بھی بیٹیوں کے معاملے میں تو والدین کے دل ہمیشہ ہی غیر مطمئن رہتے ہیں۔ میری اجیہ جب رخصت ہو گی تو نہ جانے میرا کیا حال ہو گا؟ وہ مسکرائی مگر نم آنکھوں سے سوچے گئے۔ کتاب انہوں نے ایک مرتبہ پھر بند کر دی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے گڑیا' جب سے تو آئی ہے کچھ پریشان سی ہے' سب خیریت تو ہے نا؟" گل نے چائے کے کپ تپائی پر تکا کر خود بیڈ پر اجیہ کے نزدیک جگہ سنبھال لی۔

"نہیں امی۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ زبردستی مسکرا کر بولی۔ نہ جانے کون کون سی سوچیں تھیں جو اس وقت ذہن میں چکرا رہی تھیں۔

"اچھا۔ تو نے پھر کیا سوچا آگے کے بارے میں۔"

گل اپنا کپ اٹھا کر دانستہ سرسری انداز میں پوچھنے لگی۔

"آگے کیا سوچنا امی۔ فی الحال ایسے ہی ملنا ٹھیک ہے۔ یوں بھی کچھ دنوں میں میری شادی ہو جائے گی۔

پھر مجھے ڈیڈ کا کوئی خوف نہیں ہوگا۔ میں آپ سے علی الاعلان ملا کروں گی۔" اس کی نگاہیں ہاتھ میں پکڑے سیل پر تھیں۔

دھڑ... دھڑ... دھڑام... گل ششدر نگاہوں سے اسے دیکھے گئی۔ اس کے ارادوں کی فلک بوس عمارت خود اس پر گر پڑی۔

"تو... تم... تمہاری شادی ہو رہی ہے مگر کس سے؟" اس نے کپ واپس رکھ کر بے یقینی و اضطراب سے استفسار کیا۔

"وہ..." اجیہ نے نگاہیں فون اسکرین سے ہٹا کر اسے دیکھا۔ "میری فرینڈ ہے نتاشا۔ اس کا بھائی مجھ میں انٹرسٹڈ ہے۔ بہت ڈیشنگ ہے۔ اسٹیٹس میں اپنا بزنس کرتا ہے۔" اس کے تابناک چہرے پر شرم و حیا جھلک رہی تھی۔

"مگر تم نے کبھی بتایا نہیں۔" اس کی آواز سے گہرا صدمہ جھلکتا تھا۔

"امی... موقع ہی نہیں ملا مگر اسے آپ کے متعلق سب معلوم ہے۔"

"کک... کیا معلوم ہے۔" وہ ہکلانے لگی۔

"بھئی یہ ہی کہ آپ میری والدہ ہیں اور میں آپ سے ملتی رہتی ہوں۔" اجیہ نے گل کے گلے میں بازو حمائل کرتے ہوئے سرخوشی سے کہا۔

"مگر تمہیں اتنی جلدی کسی پہ اعتبار نہیں کرنا چاہیے تھا۔" وہ ناراضی سے بولی۔

"اتنی جلدی کہاں امی!" وہ اس کی بات پر پریشان ہو کر بازو ہٹا کر پرے کھسکی۔ "میں تقریباً چھ مہینے سے جانتی ہوں اسے۔ اس کی فیملی سے بھی واقف ہوں۔"

"چھ ماہ میں صرف کسی سے جان پہچان کی جاسکتی ہے۔ دوستی نہیں اور تم تو اعتبار کر بیٹھی ہو۔" وہ چبھتے لہجے میں بولی۔

"وہ ہے ہی ایسا کہ اعتبار کرنے کو دل چاہتا ہے۔ اور پھر میں اس کی کس بات پر شک کروں؟ میں نے ان چھ ماہ میں اس سے بہت بار ملاقات کی ہے۔ اس نے کبھی کسی عامیانہ پن کا مظاہرہ نہیں کیا' مجھ سے بے جا فرمائش نہیں کی اور اب تو وہ مجھ سے سیدھا شادی کرنے کا خواہش مند ہے۔" وہ اس کا بھرپور دفاع کر رہی تھی۔

"مرد کو پہچاننے کے لیے صرف یہ ہی باتیں کافی نہیں ہوتیں۔" گل نے بتانا چاہا۔

"سارے مردوں کا پتا نہیں امی! مگر میں آغا کو اچھی طرح پہچانتی ہوں اور میری پیاری امی... اس کی طرف سے دل میں خدشات مت لائیں۔ وہ بہت نائس ہے' میں بہت جلد اسے آپ سے ملوانے لے کر آؤں گی۔" وہ گل کے دونوں ہاتھ تھام کر لجاجت سے بولی۔

"اتنے سالوں بعد ملی ہو۔ ابھی تو دل کی پیاس بھی نہیں بجھی تھی۔ تم تو پھر دور جا رہی ہو۔" اس نے اجیہ کے ہاتھ جھٹک دیے اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے انداز پر اجیہ حقیقتاً پریشان ہو گئی۔

"تو پھر میں کیا کروں؟" وہ یک دم ہی پریشان ہو کر بولی۔

"اسے شادی سے منع کر دو فی الحال..." وہ اسے دیکھ کر بولی۔

"وہ بالکل نہیں مانے گا۔" اس نے قطعیت سے نفی میں سر ہلایا۔

"تمہیں اس کی اتنی پروا ہے اور اس بے بس و خالی دامن ماں کا خیال نہیں۔" وہ سسکی لے کر رو پڑی۔

"امی... امی..." وہ عالم اضطراب میں یک دم اٹھ کر اس تک آئی اور اسے کندھوں سے تھام لیا۔

"پلیز روئیں مت... میں کرتی ہوں کچھ..." اجیہ نے چند آنسو اپنی پوروں میں سمیٹ لیے۔

"دیکھو میں تمہاری دشمن نہیں... تمہارے بھلے کے لیے ہی کہہ رہی ہوں اور یوں بھی تم کیا سمجھتی ہو کہ تمہارا باپ تمہیں پسند کی شادی کرنے دے گا' ہرگز نہیں... وہ دقیانوسی خیالات کا حامل شخص تمہیں زندہ گاڑ دینے کو ترجیح دے گا۔ میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔" وہ زہریلے لہجے میں بولی۔

"اس بات کا خدشہ تو مجھے بھی ہے' وہ اگر کچھ نہ بھی کہیں مگر سائر بھائی۔۔۔" اس کی آنکھوں میں سائر کا میرب کے ساتھ روا رکھا گیا سلوک گھوم گیا۔

"اسی لیے کہہ رہی ہوں۔۔۔ فی الحال اس قصے کو چھوڑو۔۔۔ یہ نہ ہو کہ اس کی ضد میں آکر تمہاری شادی فافٹ یہ لوگ کہیں طے کردیں۔ ہمارا معاشرہ مردوں کا معاشرہ ہے۔ عورت چاہے جتنی بھی محفوظ ہو' بالآخر کمزور پڑ ہی جاتی ہے ان معاملات میں۔" وہ گہرے لہجے میں بولی۔

"تو پھر میں کیا کروں۔" اجیہ یک دم ہی ڈھیلی پڑ کر بیڈ پر ڈھے سی گئی۔

"فی الحال اس بات کو رہنے دو اور اپنی پڑھائی مکمل کرو۔ اور دیکھو تمہاری باتوں میں ہماری چائے بھی ٹھنڈی ہو گئی' میں گرم کر کے لاتی ہوں۔" اس نے ٹرے اٹھائی۔

"آپ بیٹھیں' میں چلوں گی۔" وہ اپنا ہینڈ بیگ تھام کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا بیٹی۔۔۔ فی امان اللہ۔۔۔" وہ اسے دروازے تک چھوڑنے آئی۔ ڈھیلے ڈھالے قدم اٹھاتی اجیہ کوریڈور میں چلتی چلی جارہی تھی۔ دروازہ بند کرکے گل نے ہذیانی قہقہہ لگایا۔

"میں اتنی جلدی ہار نہیں مانوں گی۔" اس نے اپنا عزم دہرایا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"سچ بڑا ظلم ہوا تمہارے ساتھ۔" پومی اپنے ٹائٹ پرم بالوں کو جھٹکا دے کر ازحد تاسف سے بولیں۔ وہ اس وقت چندا کے گھر کے لاؤنج کے صوفے پر براجمان تھیں۔ سامنے کے صوفے پر چندا پیر اوپر کیے بیٹھی تھی' گود میں کٹی ناشپاتیوں کی پلیٹ تھی اور زبان پر اپنے ساتھ بیتے واقعات۔ پومی اور چندا کی دوستی روز افزوں ترقی کررہی تھی۔

"بس نصیب نصیب کی بات ہے۔" وہ ملول ہوئی۔

"ایسی بھی کوئی بات نہیں۔" پومی نے سیدھا ہاتھ نفی میں ہلایا۔ "انسان چاہے تو ذرا سی کوشش سے نصیب بدل بھی سکتا ہے۔"

"مجھے اب ان باتوں پر یقین نہیں رہا۔" وہ بے زاری سے بولی۔

"نہیں چندا نہیں۔" پومی تڑپ کر اس کے نزدیک آبیٹھیں۔ "میں تمہیں یوں تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ تم ذرا فارغ ہو جاؤ' میں نے بہت کچھ سوچ رکھا ہے تمہارے لیے۔ آخر دوست کس لیے ہوتے ہیں؟" اس نے بڑے دلار سے چندا کی ٹھوڑی چھو کر کہا۔

"بی بی جی کچھ کھانے کا جی چاہ رہا ہے تو لے آوں۔" تب ہی بشیرن نے آکر بڑے احترام و تابع داری سے پوچھا کہ یہ جمیل کا حکم تھا کہ چندا کا بے حد خیال رکھنا ہے۔

"یہ تم کیا ہر وقت میرے سر پر سوار رہتی ہو۔ کھلا کھلا کر مارنا ہے کیا مجھے۔ ویسے ہی میرا وزن ضرورت سے زیادہ بڑھ گیا ہے۔ پوری ڈھول بن گئی ہوں میں۔ نہ جانے واپس شیپ میں آنے کے لیے کتنی مشقت کرنی پڑے گی۔" وہ چیخ اٹھی۔

"شکر بی بی اس حالت میں تو کھانا پینا اپنی صحت کا خیال رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔" وہ کہے بنا نہ رہ سکی۔

"بکواس بند کرو اپنی' آئی بڑی مجھے لیکچر دینے والی۔ اب جاؤ یہاں سے۔" اس نے جھڑک کر کہا۔ بشیرن ضبط کرتی پلٹ گئی مگر دل میں اسے ناشکری کے لقب سے پکارنا نہیں بھولی تھی۔

"دیکھا آپ نے۔" اس نے پومی آنٹی کو شکایتی انداز سے دیکھا۔ "کیسے جمی نے جگہ جگہ میری جاسوسی کرنے کے لیے لوگ اکٹھا کر رکھے ہیں۔ مجھے سانس لینے کی آزادی دے رکھی ہے اس انسان نے اس کی بڑی مہربانی ہے۔" اس نے گود میں رکھی پلیٹ سامنے ٹیبل پر پٹخ دی۔

"چلو جہاں اتنا برداشت کیا ہے چند روز اور سہی۔" انہوں نے دلاسا دیا۔ "ویسے آپ ٹھیک ہی کہتی ہیں، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے سے کچھ نہیں ہوگا، مجھے کچھ کرنا ہی پڑے گا۔" وہ پرسوچ لہجے میں بولی۔

"شاباش... یہ ہوئی نا بات۔" پوپی خوش ہو گئیں۔

"چلو اب اپنا موڈ ٹھیک کرلو ٹی وی پہ گانے دیکھتے ہیں۔"

"ہوں..."

☼ ☼ ☼

"ماریہ فون اٹھاؤ۔" وہ اور سعدیہ بیگم ابھی ابھی بازار سے کچھ کپڑوں وغیرہ کی خریداری کرکے لوٹی تھیں۔ لاؤنج میں ماریہ سامان کے ساتھ ڈھیر تھی جبکہ سعدیہ فریش ہونے چلی گئی تھیں اور جاتے جاتے اسے فون ریسیو کرنے کی تلقین کرتی گئیں۔

"اُف... کیا ہے بھئی..." ماریہ کسلمندی سے اٹھی۔

"ہیلو..."

"ہیلو بیٹی ماریہ بات کر رہی ہو؟" ابراہیم صاحب تھے۔

"وہ... السلام علیکم انکل... کیسے ہیں۔ کیا حال ہے آپ کا عاشر... کیسا ہے؟" اس نے نان اسٹاپ سوالات کرنے شروع کردیے۔

"وعلیکم السلام جیتی رہو، خوش رہو۔ تم سب کیسے ہو۔"

"الحمدللہ سب خیر خیریت ہے۔ ڈیڈی تو اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔" وہ یہی سمجھی کہ انہوں نے اس کے ڈیڈی سے بات کرنے کے لیے فون کیا ہوگا۔

"آ... اچھا... بھابی سے بات کرواسکو گی؟"

"جی... جی... ہولڈ کریں۔" دوسری طرف وہ بات تو سنو کہتے رہ گئے مگر وہ ریسیور کان سے پرے کیے اونچی آواز میں چیخ کر سعدیہ کو پکارنے لگی۔

"کیا ہو گیا؟" سعدیہ اس کے چیخنے پر برہمی سے بولتی کمرے سے نکلیں۔

"ابراہیم انکل کا فون ہے، آپ سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔" اس نے کہہ کر فون انہیں تھمادیا اور خود دوبارہ صوفے پر گر گئی۔

"السلام علیکم بھائی صاحب... کیا حال ہے؟" انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

"وعلیکم السلام... بس بھابی لگتا ہے زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔" انہوں نے یاسیت سے کہا۔

"ارے اتنے افسردہ کیوں ہیں آپ؟ عاشر بھی عجیب ہے ویسے... جب وہاں آپ نے تنہا ہی رہنا تھا تو بھلا یہاں سے لے جانے کی کیا تک تھی۔ یہاں کم از کم ہم لوگ تو تھے آپ کے پاس۔" وہ بولیں۔

"بس بھابی، وہ بھی اپنی جگہ درست ہے۔ پہلے کی بات اور تھی، میرب بیٹی چوبیس گھنٹے میرے ساتھ رہتی تھی۔ اگر میں اب وہاں اکیلا رہتا تو اس کا ذہن بھی اٹکا رہتا۔ اب کم از کم اس کے سامنے تو ہوں۔" انہوں نے مدافعانہ انداز اختیار کیا۔ سعدیہ بے ساختہ مسکرادیں۔

"اچھا خیر... اور سب خیریت ہے۔"

"بھابی آپ سے اک بات پوچھنی تھی۔"

"ارے تو بلا جھجک پوچھیے۔" وہ ان کے انداز پر حیران ہوئیں کہ اتنے تکلفات ان لوگوں کے مابین بہرحال نہیں تھے۔

"آپ میرب کے گھر آتی جاتی ہیں؟"

"ایک دوبار تو گئی ہوں مگر زیادہ جانا میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ اس کی نئی شادی ہوئی تھی، ایسے میں اسے وہاں ایڈجسٹ کرنے میں مسئلہ ہوجاتا۔" انہوں نے محتاط جواب دیا۔ میرب کے تذکرے پر ماریہ کے کان کھڑے ہوگئے۔

"رہنے تو آتی ہوگی میرو؟"

"نہیں... آج تک تو نہیں آئی، ہم نے بھی نہیں بلایا۔"

"مگر کیوں بھابی..." انہوں نے پھر سے پوچھا۔

"اب آپ سے کیا کہوں... میں نے محسوس کیا ہے کہ شاید سائرہ یہ بات پسند نہیں کرتیں" وہ صاف

کوئی سے بولیں۔ کچھ دیر وہ چپ سے ہو گئے۔

"بھابھی کیا اس کے گھر میں کوئی مسئلہ ہے۔ کیا وہ خدانخواستہ خوش نہیں ہے وہاں۔"

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" انہوں نے قطعی لہجے میں کہا۔ "ماریہ تو آتی جاتی رہتی ہے اس کے ہاں' اگر ایسا کوئی مسئلہ ہوتا تو وہ مجھے ضرور بتاتی۔"

"اچھا۔۔۔ ماریہ بیٹی جاتی ہے وہاں۔۔۔" وہ کچھ اطمینان سے بولے۔ "دراصل آج صبح صبح اس نے مجھے نیٹ پر بلایا اور بنا کچھ کہے بہت دیر تک بلک بلک کر روتی رہی بھابھی! آپ تو جانتی ہیں ان دونوں بچوں کو میں نے کتنے پیار اور توجہ سے پالا ہے۔ ان کی ماں کے گزر جانے کے بعد۔" وہ آبدیدہ سے ہو گئے۔ "ان کی آنکھ میں آیا آنسو میرے دل پر لاوا بن کر گرتا ہے۔ میں صبح سے بہت بے چین اور بے آرام ہوں' اس نے تو مجھے کچھ نہیں بتایا مگر میں سمجھ گیا ہوں کہ اس کے آنسوؤں کا کچھ نہ کچھ سبب ضرور ہے' بھابھی! آپ نے تو بالکل ایک ماں کی طرح اس کا خیال رکھا ہے۔ آپ اس سے ملاقات کریں شاید اپنے دل کی بات وہ آپ سے کر سکے۔"

"آپ بالکل فکر نہ کریں' میں آج ہی جاتی ہوں اس کی طرف۔ آپ کی یہ بات سن کر تو مجھے بھی پریشانی ہو گئی ہے۔ تسلی رکھیں' ان شاء اللہ سب ٹھیک ہی ہو گا۔" انہوں نے تسلی آمیز انداز اختیار کیا۔

"بہت ممنون رہوں گا میں آپ کا۔"

"ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں آپ۔ میو میری بھی تو بیٹی ہے۔" وہ خفا ہوئیں۔

"اچھا اللہ حافظ۔"

"خدا حافظ۔۔۔" سعدیہ نے کہہ کر فون رکھ دیا اور متفکر سی ماریہ کے برابر آبیٹھیں۔

"کیا بات ہے امی؟" ماریہ نے تشویش سے پوچھا۔

"بھائی صاحب کا فون تھا۔ میو نے انہیں صبح فون کیا اور بہت رو رہی تھی۔"

"اچھا مگر کیوں۔" وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

"پتا نہیں' ماریہ! تم تو اس کے پاس جاتی رہی ہو۔ اس کی سہیلی ہو تم مجھے بتاؤ کیا اسے کوئی مسئلہ ہے وہاں؟" انہوں نے یک دم پوچھا۔ ماریہ گڑبڑا سی گئی۔

"نن۔۔۔ نہیں تو۔۔۔" اسے میو کا بھرم عزیز تھا۔

"ہوں۔۔۔" سعدیہ نے پر سوچ ہنکارا بھرا۔ "شام میں چلتے ہیں پھر اس کی طرف۔"

"آپ رہنے دیں امی میں ہو آتی ہوں۔" ماریہ نے انہیں روکنا چاہا۔

"نہیں ماریہ۔۔۔ بھائی صاحب نے مجھے جانے کے لیے کہا ہے اور پھر کچھ تو فرض میرا بھی بنتا ہے کہ میں اس کا خیال رکھوں۔ سامان سمیٹو اور کچھ دیر آرام کر لو تم بھی۔ سعد آجائے تو چلتے ہیں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"جی امی۔۔۔" اس کے حلق سے مری مری سی آواز برآمد ہوئی۔ وہ نہیں چاہ رہی تھی کہ سعدیہ وہاں جائیں کہ اتنا تو وہ سمجھ گئی تھی کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔

"میں بھی تو اتنے دن سے اسے فون نہ کر سکی' نہ جانے کیا بات ہو گئی ہے۔" وہ بھی گہرے تفکر میں ڈوب گئی۔

☆ ☆ ☆

"مبارک ہو آپ کو۔ بیٹا ہوا ہے۔" نرس نے باہر آکر مسرت سے اطلاع دی۔ جمیل پر تو گویا شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ تسبیح پڑھتی بی بی جان اور مانو کی خوشی بھی دیدنی تھی۔

"بہت مبارک ہو بیٹا۔" انہوں نے جمیل کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"آپ کو بھی بی بی جان۔" وہ خوشی سے دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔

"خوشی ہمارے ساتھ نہیں بانٹیں گے۔" اسی نرس نے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔ یہ لیں آپ کا حصہ۔" اس نے جھٹ ہزار کا نوٹ پاکٹ سے نکال کر اسے تھمایا۔ نرس جو سو یا دو سو کے آسرے میں تھی اکٹھا ہزار روپیہ

دیکھ کر اس کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ پھر جلدی سے اسے مٹھی میں بھینچ کر بولی۔

"کچھ دیر بعد آپ کی مسز کو روم میں شفٹ کر دیا جائے گا۔ آپ لوگ آکر ملاقات کر سکتے ہیں۔" اور مڑ کر چل دی۔

"جاؤ بیٹا پہلے شکرانے کے نوافل ادا کر لو۔" بی بی نے یاد دلایا۔

"جی بی بی جان۔" وہ سعادت مندی سے کہہ کر نماز کے لیے چلا گیا۔

"یا اللہ۔ میری چندا کو عقل سلیم عطا فرما۔ تیری عطا کردہ نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرما۔ اسے صحت دے، تندرستی دے۔ دنیا و آخرت کی ہر خوشی و نعمت سے نواز دے۔ آمین ثم آمین۔"

ماں کی دعا کبھی رد نہیں ہوتی۔ بلکہ دعا تو کوئی بھی مانگے، کبھی رد نہیں ہوتی۔ بی بی جان کی دعاؤں کو جلد یا بدیر مقبول ہونا ہی تھا۔ مگر انسان کا کیا کیا جائے۔ اس کی جلد بازی کا کیا کیا جائے۔ دعا اور عمل سے تقدیر بدلتی ہے۔ مگر کبھی کبھی آپ کے اعمال دعا پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ اور ان کا بوجھ دعا کو اوپر جانے ہی نہیں دیتا۔ زمین بوس کر دیتا ہے۔

☆ ☆ ☆

یہ مغرب کے بعد کا وقت تھا جب سعدیہ بیگم اور ماریہ سعد کے ساتھ میرب کے گھر میں داخل ہوئے۔ عجیب سے وحشت ناک سناٹے نے ان کا استقبال کیا۔ لالی نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ اور ان کی آمد کی اطلاع دینے کے لیے میرو کے کمرے پہ دستک دی۔ وہ صبح سے تین چار مرتبہ اس کا دروازہ کھٹکھٹا چکی تھی۔ وقار صاحب تو صبح ہی سے اپنے کسی دیرینہ دوست کی طرف نکلے ہوئے تھے۔ اجیہ کو ویسے بھی گھریلو معاملات سے کچھ خاص سروکار نہ تھا۔ رہ گئی لالی تو وہ دروازہ کھٹکھٹا تو ضرور دیتی تھی۔ مگر اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ بغیر اجازت ملے وہ مالکان کے کمروں میں داخل ہو سکے۔ اسے تشویش تو ضرور تھی مگر ادھر ادھر کے کاموں کی مصروفیت نے اس کی تشویش بھی بھلا دی تھی۔ ابھی بھی دروازہ پہ دستک دینے پر جواب ندارد۔ اس کی تشویش پھر سے جاگ اٹھی۔ اور اس نے ڈرائنگ روم میں جوس کے ساتھ یہ اطلاع بھی پہنچا دی۔

"کیا؟" ماریہ اپنی جگہ سے بے ساختہ اٹھ کھڑی ہوئی، "صبح سے میرو کمرے میں ہے اور گھر میں کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ وہ کمرے میں جھانک آتا کہ وہ زندہ ہے یا مر گئی۔" وہ غصے میں چیخی۔ اس کی بات پر سعدیہ دہل گئیں۔

"کیا بات کر رہی ہو ماریہ، جاؤ دیکھو اندر جا کر تم۔" انہیں صورت حال کی سنگینی کا اندازہ صحیح معنوں میں اب جا کر ہوا تھا۔ ماریہ تیزی سے لالی کے پیچھے گئی۔

"آپ پریشان نہ ہوں امی جان، ان شاء اللہ میرو ٹھیک ہو گی۔" سعد خود فکر مند تھا مگر انہیں دلاسہ دیتا رہا۔ ماریہ نے بری طرح دروازہ کھٹکھٹایا مگر جواب نہیں ملا۔ اس نے دروازے کے ہینڈل کو گھمایا۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ کمرے میں گہرا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

"میرو۔ میرو۔ کہاں ہو تم۔" وہ متوحش ہو کر چلائی۔ لالی نے ٹٹول کر لائٹ جلائی۔ میرو آڑی ترچھی رات والے لباس میں بیڈ پر پڑی ہوش و خرد سے بیگانہ تھی۔

"میرو!" اس کی حالت دیکھ کر ماریہ رو دی۔ "میرو ہوش کرو۔" وہ اس کے پاس بیٹھ کر اس کا گال تھپتھپانے لگی۔

"پانی دو۔" اس نے لالی سے کہا۔ اس کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر لالی بھی حواس باختہ ہو گئی تھی۔

"یہ لیں۔" اس نے سائیڈ ٹیبل سے گلاس اٹھا کر اسے تھمایا۔ اس نے میرو کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے، مگر نتیجہ صفر رہا۔

"جاؤ سعد سے کہو گاڑی نکالے۔ ہمیں اسے اسپتال لے جانا ہوگا۔" اس نے اپنے آنسو پونچھ کر لالی سے کہا۔

لالی تیزی سے پلٹ کر باہر نکلی اور ڈرائنگ روم میں جا کر سعد سے گاڑی نکالنے کو کہا۔

"خدا خیر کرے۔ کیا معاملہ ہے۔" سعدیہ بیگم بھی پریشانی سے کھڑی ہو گئیں۔

"وہ جی، بڑی بی بی بے ہوش پڑی ہیں۔ ہوش میں نہیں آرہی ہیں۔" اس نے فکر مندی سے بتایا۔

"سب گھر والے کہاں ہیں؟" انہوں نے سلگتے ہوئے پوچھا۔

"صاحب تو صبح سے اپنے کسی دوست کی طرف گئے ہیں۔ چھوٹے صاحب ابھی آفس سے نہیں لوٹے اور اجیہ بی بی جی اپنی دوست کے گھر گئی ہوئی ہیں۔" اس نے مؤدب لہجے میں بتایا۔

"نہ جانے کیسے بے پروا لوگ ہیں۔ اب بتاؤ میں ابراہیم بھائی کو کیا جواب دوں گی۔" ان کا طیش اب شرمندگی میں ڈھل گیا۔

"اوہ امی۔ اتنا کیوں پریشان ہو رہی ہیں، ان شاء اللہ سب ٹھیک ہوگا۔" سعد خود بھی بے حد فکر مند ہو گیا تھا، تاہم خود پر قابو پا کر انہیں تسلی دی پھر لالی سے مخاطب ہوا۔

"آپ اور ماریہ میرب کو گاڑی تک لائیے۔ میں گاڑی نکالتا ہوں۔" وہ کہہ کر تیزی سے باہر نکلا۔ وہ واپس میرب کے کمرے میں آگئی۔ ماریہ اس کی ہتھیلیاں سہلا رہی تھی۔

"وہ جی آپ کے بھائی کہہ رہے ہیں کہ میرب بی بی کو گاڑی تک اٹھا کر لے آئیں۔" ماریہ پریشان ہو گئی گو کہ میرب دھان پان سی تھی مگر ماریہ بھی آخر لڑکی تھی اور اس کے لیے میرب کو ــــــ اٹھا کر گاڑی تک لے جانا ہرگز آسان نہ تھا اور سعد کا اسے لے جانا انتہائی نامناسب تھا سو اس نے ہمت کی لالی نے بھی بھرپور مدد کی۔ یوں اسے پورٹیکو میں کھڑی گاڑی میں ڈالا گیا۔ ماریہ اس کے ساتھ ہی پیچھے بیٹھ گئی جبکہ شدید پریشانی میں گھری سعدیہ نے آگے بیٹھتے ہوئے لالی سے بے حد غصے سے کہا۔

"ہم میرو کو اسپتال لے جا رہے ہیں۔ جب تمہارے صاحب لوگ لوٹ آئیں تو انہیں بتا دینا اور یہ بھی کہہ دینا کہ اگر اسے کچھ ہو گیا تو ان کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔" یہ کہہ کر انہوں نے دروازہ دھاڑ سے بند کیا۔ لالی نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

بی بی سوا مہینے تک چندا کے پاس رہ کر گھر لوٹ گئی تھیں۔ ان دنوں زیادہ تر سو تو ان کے پاس ہی رہا۔ انہوں نے ہی اسے سنبھالا۔ چندا کی بے آرامی کے خیال سے راتوں کو خود جاگیں بھی۔ اس عمر میں اس مشقت نے انہیں تھکا ڈالا تھا۔ اور وہ خود بخار میں مبتلا ہو گئیں۔ وہ تو چاہتی تھیں کہ چندا یہ دن اپنے میکے میں گزارے مگر چندا ہی کسی طور راضی نہ ہوئی کہ اسے یہاں ہر طرح کی سہولت میسر تھی۔ بات ٹھیک بھی تھی اسی لیے بی بی جان مان گئیں اور اس کا خیال کرتے ہوئے خود یہاں رہ کر بچے اور اس کی دیکھ بھال کرتی رہیں۔ اسے مقوی غذائیں بنا کر دیتیں، مگر وہ کھانے سے صاف انکاری تھی۔

"مجھے نہیں کھانا یہ سب 'میرا ویٹ مزید بڑھ جائے گا۔" وہ جھلا جاتی۔

"نہیں بڑھتا وزن، تم کھاؤ تو۔ تمہارے لیے یہ ضروری ہے۔" وہ پیار سے پچکارتیں۔

"اُفوہ۔ نہیں کھانا، کہہ دیا نا۔" وہ چیخ اٹھتی تو بی بی

اپنا سامنہ لے کر رہ جاتیں۔

جمیل ان کی موجودگی سے مطمئن تھا۔ اب جب وہ چلی گئی تھیں تو اس نے چندا کو کھلانے پلانے اس کا خیال رکھنے کی ذمہ داری خود پر عائد محسوس کی۔

"چندا! یخنی دن میں دوبار پیا کرو۔"

"بشیرن سے کہو، تمہیں فروٹ کاٹ کر دے۔"

"چندا! رات کو بھی تم نے دودھ کا گلاس یونہی پڑا رہنے دیا۔ اپنی صحت کی طرف سے اتنی بے پروائی اچھی نہیں۔ آخر کو تم سونو کو فیڈ بھی کرواتی ہو، ایسے تو تم بیمار پڑ جاؤ گی۔" فکر مندی سے لبریز محبت سے چور یہ جملے چندا کو تیر کی طرح لگتے۔

"خدا کے واسطے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔" ایک روز اس نے تنگ آکر ہاتھ جوڑے۔ "میری بھی کوئی زندگی ہے۔ پسند ہے کیوں ہر وقت تلوار کی طرح میرے سر پر لٹکتے رہتے ہیں۔" وہ اتنی درشتی سے بولی کہ جمیل تو چپ کا چپ رہ گیا۔ پھر اسے کھانے پینے کی تاکید کرنے میں محتاط بھی ہو گیا، مگر کب تک؟

سونو کا سینہ کچھ روز سے جکڑا ہوا سا تھا۔ اس پر مستزاد چندا جمیل کو آئس کریم کھاتی ہوئی دکھائی دی۔

"یہ تم کیا کھا رہی ہو؟" وہ قدرے برہمی سے بولا۔

"اسے آئس کریم کہتے ہیں۔" اس نے ٹی وی پر نظریں جمائے ہوئے جواب دیا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ سونو بیمار ہے؟" وہ ترشی سے بولا۔

"وہ بیمار ہے میں تو نہیں۔" اس نے ایک بڑا سا چمچہ بھر کر منہ میں ڈالا۔

"مگر وہ بیمار ہو سکتا ہے تمہاری ان حرکتوں سے۔ تم کیا جانتی نہیں کہ وہ مدر فیڈ پر ہے۔" وہ تپ کر بولا۔

اس نے اطمینان سے خالی کپ سامنے ٹیبل پر رکھا اور بغور اس کی آنکھوں میں دیکھ کر گویا ہوئی۔

"میں جانور نہیں ہوں جمیل! آج کے بعد وہ پاؤڈر ملک پیے گا۔"

"مگر اس کی صحت...!" اس کی بات چندا نے تیزی سے اچک لی۔

"اور میری صحت؟ تمہیں یہ نظر نہیں آ رہی۔ کیا سے کیا ہو گئی ہوں میں۔ میرا فگر دیکھو، کیسا بگڑ گیا ہے۔ چہرہ مرجھا کر کالا ہو چکا ہے۔ آنکھوں کے نیچے دو دو انچ کے حلقے بن گئے ہیں۔ بال ہیں تو وہ جھڑ جھڑ کر جھاڑو بن چکے ہیں۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"سب تمہاری غلطی ہے۔" جمیل نے صاف گوئی سے کہا۔ "کون سی نعمت ہے جو تمہیں میسر نہیں مگر تم ہو کہ کھانے کا نام نہیں لیتیں۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔"

"ہاں... ہاں سب میری غلطی ہے۔" وہ جاہلوں کی طرح چیخی۔

"بالکل ہے۔" وہ بے لچک انداز میں بولا۔ "اور اب تم کہہ رہی ہو کہ ہمارا سونو ڈبے کا دودھ پیے گا۔ چار ماہ کا بچہ ہے وہ اس کی صحت بالکل برباد ہو کر رہ جائے گی۔"

"پھر اس کی صحت۔" وہ چیخ ہی تو گئی۔ "تمہیں اب میری کچھ پروا ہے کہ نہیں۔"

"ہے کیوں نہیں ہے۔" وہ یک لخت نرم پڑ گیا۔ "یہ سب میں تمہارے بھلے ہی کے لیے تو کہہ رہا ہوں۔" وہ اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔

"میرے بھلے کے لیے یا سونو کے بھلے کے لیے۔" اس نے زہر خند لہجے میں کہا۔

"ایک ہی بات ہے۔"

"ایک ہی بات نہیں ہے۔" وہ زور دے کر بولی۔ "بس میں نے کہہ دیا میں آج کے بعد اسے فیڈ نہیں کرواؤں گی۔" وہ قطعیت سے کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"جیسی تمہاری مرضی۔" اس نے تھک کر صوفے کی پشت سے سر ٹکا لیا تھا۔

"ہونہہ!" وہ نخوت سے سر جھٹک کر لاؤنج عبور کر گئی۔

کتنا بچپنا بھرا ہے اس کے اندر۔ بات سمجھتی ہی نہیں۔ وہ سوچ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

سائرہ اور وقار آگے پیچھے ہی گھر میں داخل ہوئے

تھے۔ ابھی سائر کے قدم سیڑھیوں کی جانب بڑھے ہی تھے کہ اسے لالی کی آواز سنائی دی جو وقار کو میرب کے متعلق مطلع کررہی تھی۔

"صاحب جی! بی بی اپنے کمرے میں بے ہوش پڑی تھیں۔ ان کے رشتے دار آئے تھے' وہ ہی کمرے میں گئے تو معلوم پڑا۔"

"کیا بات کررہی ہو۔" وقار جو اطمینان سے صوفے پر بیٹھ رہے تھے گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ "کہاں ہے میرب بیٹی؟" انہوں نے تشویش سے پوچھا۔

"وہ جی۔۔۔ ان کے رشتے دار انہیں گاڑی میں ڈال کر اسپتال لے گئے ہیں۔" اس نے انگلیاں چٹخاتے ہوئے بتایا۔

"صبح جب میں گیا تب تو سب ٹھیک تھا۔ ناشتا کیا تھا اس نے؟"

"وہ جی۔۔۔ بی بی تو آج اپنے کمرے سے نکلی ہی نہیں سارا دن۔" اس نے سر جھکا کر مجرموں کی طرح بتایا۔

"کیا؟" وہ بے ساختہ چیخ اٹھے۔ "اور تم؟ تم نے بھی انہیں بلانے کی زحمت محسوس نہیں کی؟" وہ طنزیہ بولے۔

"تین چار مرتبہ دروازہ بجایا تھا جی میں نے' مگر ان کا کوئی جواب نہیں ملا تو میں سمجھی وہ سو رہی ہوں گی۔"

"شاباش ہے تمہاری عقل کو' اور اجیہ۔۔۔ اجیہ کہاں تھی؟ اسے بھی بھابھی کا خیال نہیں آیا۔" وہ سخت طیش میں آکر بولے۔

"وہ تو جی۔۔۔ کالج سے آکر سو گئی تھیں۔ شام میں اپنی سہیلی کی طرف چلی گئیں اور ابھی تک نہیں لوٹی ہیں۔" اس نے سہمے ہوئے لہجے میں بتایا۔

"اجیہ سہیلی کی طرف چلی گئی۔۔۔! بنا بتائے۔۔۔ بنا اجازت کے؟"

وہ اچھنبے سے بولے' اپنی پیشانی پریشانی سے رگڑتے ہوئے سائر کو پکارا جو بے تاثر انداز میں کھڑا تھا۔ ان کے پکارنے پر ان کے پاس آیا۔

"تم نے بھی میرب کو فون نہیں کیا؟" انہوں نے اپنا غصہ دباتے ہوئے کہا۔

"میں تو روز ہی اسے فون نہیں کرتا۔" اس نے سپاٹ لہجے میں بتایا۔

"تمہاری بیوی بے ہوش ہے' اسپتال میں پڑی ہے۔" انہوں نے جیسے اس کے جذبات جھنجھوڑنے چاہے۔

"اسے گاڑی میں کس نے ڈالا تھا؟ اس کے کزن سعد نے؟" سائر نے جوابا" لالی کی طرف دیکھ کر کی' اس پر وقار نے تحیر سے اسے دیکھا۔

"نہیں جی۔۔۔ میں نے اور ان کی کزن نے۔" لالی سرعت سے بولی۔

"یہ کیا فضول کی باتوں میں پڑ گئے ہو۔ فون کرو انہیں۔ پتا کرو' کہاں ہیں وہ؟" انہوں نے جھڑکا۔

سائر دانت پر دانت جمائے اپنا سیل نکال کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ نمبر ماریہ کا تھا' مگر ریسیو سعد نے کیا۔ ان سے اسپتال کا پتا معلوم کرکے اس نے فون بند کردیا۔

"چلو' جلدی چلو۔۔۔ نہ جانے کیا معاملہ ہے۔ بس اللہ رحم کرے۔" وہ متفکر سے تھے مگر سائر کے چہرے پر تفکر' پریشانی' پشیمانی کچھ بھی نہ تھا اور یہی چیز وقار کو حیران کررہی تھی' بے حد حیران۔۔۔

☼ ☼ ☼

چندا کے بے حد اصرار پر جمیل کو سونو کے لیے کل وقتی آیا کا بندوبست کرتے ہی بنی۔ زینت بی بی ادھیڑ عمر کی بیوہ خاتون تھیں۔ اولاد کوئی تھی نہیں۔ صاف ستھری اور معقول تھیں۔ انہوں نے آتے ہی سونو کو بڑے اچھے طریقے سے سنبھال لیا۔ زینت بی بی کیا آئیں چندا کے پیروں سے گویا کوئی بیڑی کھلی تھی۔

پوری آنٹی کا اپنا پارلر اور جم بھی تھا۔ اب چندا کا بیشتر وقت وہیں پر گزرنے لگا۔ چند ہی دنوں میں وہ پہلے سے زیادہ اسمارٹ' جاذب نظر اور خوب صورت ہوگئی۔ اس وقت وہ بڑی مطمئن و مسرور سی ان کے سجے سجائے ڈرائنگ روم میں بیٹھی اورنج جوس کے گھونٹ

لے رہی تھی۔ تب ہی باتوں کے دوران پومی آنٹی نے کہا۔

"تو پھر کیا سوچا ہے تم نے آگے کے بارے میں۔"

"کیا مطلب؟" وہ یک دم چونک سی گئی۔ "کیا سوچنا ہے مجھے۔" وہ الٹا ان ہی سے استفسار کرنے لگی۔

"بھئی! وہ تمہارے خواب تمہاری تمنائیں؟ وہ سب کیا ہوئیں؟" انہوں نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے گویا اس کا ہی کوئی درد اسے یاد دلایا تھا۔ اب چندا اور ان کی اتنی "دوستی" تو ہو ہی چکی تھی کہ دونوں ہی نے ایک دوسرے سے اپنے دل کی باتیں شیئر کرلی تھیں۔ اپنے ساتھ ہوئی "زیادتیوں" پر ایک دوسرے سے ہمدردی بھی وصول کرچکی تھیں۔

"اب ان باتوں کا تذکرہ کرنے سے کیا فائدہ۔" اس نے چڑ کر گلاس ٹیبل پر پٹخا۔

"بھئی۔۔۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ اپنے خوابوں کو پانے کی کوئی عمر نہیں ہوتی اور جو لوگ کوشش کرتے ہیں بالآخر اپنی منزل پا ہی لیتے ہیں۔" انہوں نے اکسایا۔

"مگر کیسے پومی آنٹی" آپ کو میری مجبوریوں کا پتا تو ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"مجبوری وجبوری کچھ نہیں ہوتی ڈیئر یہ سب کم ہمت' بزدلوں کی باتیں ہیں۔ نیا آسمان تمہارے سامنے ہے' آگے بڑھو' اڑان بھرو بھلا آزاد پنچھی کو بھی کوئی قید کرسکا ہے؟" انہیں نے ایک گہری ستائشی نگاہ اس کے ہیرے جیسے چمکتے چہرے کو دیکھ کر کہا۔

"مگر کیسے ممکن ہے یہ اب؟ میں شادی شدہ ہوں۔ میرا ایک بچہ ہے۔" وہ کڑوے لہجے میں بڑبڑائی۔

"مگر یہ بات تو صرف تم جانتی ہو نا۔ مارکیٹ میں کون بتائے گا؟" وہ معنی خیزی سے دھیمے سے ہنسیں۔ اب کی مرتبہ چندا کچھ نہیں بولی بس نا سمجھی مگر دلچسپی سے انہیں دیکھے گئی۔

"کیوں ٹھیک ہے نا؟" وہ تصدیق چاہتے ہوئے بولیں۔

"خاک ٹھیک ہے۔۔۔ جمیل کبھی نہیں مانے گا۔"

وہ جھنجلائی۔ ساس اور نند کے درمیان والی کیفیت۔۔۔

"نہ مانے۔۔۔ تمہیں بتانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔" وہ بے پروائی سے بولیں۔ "اور یوں بھی اس نے کون سا تمہیں سکھی رکھا ہوا ہے۔ ہنی مون تک پہ تو تمہیں لے کر نہیں گیا۔ کپڑے دیکھو اپنے۔۔۔ صاف لگتا ہے جیسے کہ کسی عام سی مارکیٹ سے خریدے ہوں۔ ہیرے کی ایک انگوٹھی تک تو ہے نہیں تمہارے پاس۔ آخر اس نے تمہیں دیا ہی کیا ہے۔ اوپر سے پابندیاں ایسے لگاتا ہے تم پر گویا تمہیں کسی محل کی ملکہ بنا رکھا ہو۔ توبہ۔" انہوں نے تیزی سے نفی میں سر ہلا کر اسے اس کی زندگی کا ایسا آئینہ دکھایا جس میں وہ اپنی کربناک تصویر دیکھ کر گنگ رہ گئی۔

✡ ✡ ✡

"ذہنی تناؤ اور نقاہت کی وجہ سے پیشنٹ بے ہوش ہے ایسی کوئی فکر کی بات نہیں۔ انہیں ڈرپ لگادی گئی ہے۔ کچھ دیر میں انہیں ہوش آجائے گا تو دوبارہ چیک اپ کرکے دوائیاں تجویز کی جاسکیں گی تب تک آپ لوگ ریلیکس کریں۔" ڈاکٹر اپنے مخصوص لہجے میں کہہ کر پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے انہیں نواز کر اپنے روم کی طرف جاچکی تھی۔

"یا اللہ تیرا شکر ہے۔" سعدیہ بیگم کے منہ سے بے ساختہ ہی شکر کا کلمہ نکلا اور وہ لابی میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھ گئیں۔

"جی ہاں! شکر ہے اللہ کا کہ اس کی جان بچ گئی ورنہ سائر بھائی نے تو اسے مارنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔" ماریہ تند لہجے میں چبا چبا کر بے ساختہ کہہ گئی۔ کیا کرتی' وہ پچھلے ایک گھنٹے جس شدید ذہنی پریشانی کا شکار رہی تھی وہی جانتی تھی' پھر فکر مندی کے ساتھ ساتھ اسے ہلکا سا یقین بھی تھا کہ ہو نہ ہو میرو کی اس حالت کا تعلق براہ راست سائر ہی سے ہوسکتا ہے۔

"کیا اول فول بک رہی ہو۔" سعدیہ نے یکدم سر اٹھا کر اسے بے یقینی سے دیکھا۔

"جی ہاں امی! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ سائر بھائی نے اس کی زندگی جہنم بنا رکھی ہے۔ وہ بے حد شکی مزاج انسان ہیں۔ ہم سے ملنے' ہمارے گھر آنے تک کی پابندی لگا رکھی ہے انہوں نے اس پر۔ اس کا ہر عمل' اس کا کردار' سب کچھ مشکوک ہے ان کی نظر میں۔ جب سے شادی ہوئی ہے وہ کسی تلوار کی مانند لٹکے رہتے ہیں اس کے سر پر۔ ہو نہ ہو اس کی اس حالت کے ذمے دار بھی وہی ہیں۔" وہ یقین سے بولی۔ سعدیہ منہ کھولے اس کے انکشافات سن رہی تھیں۔

میرب کا محتاط رویہ اور سائر کا لیا دیا انداز وہ بھانپ تو گئی تھیں' مگر انہوں نے نظر انداز کر دیا تھا کہ نئی نئی شادی ہے' میرب سائر کے ساتھ جتنی جلدی ممکن ہو' ایڈجسٹ کر لے اچھا ہے۔ ان کے تو وہم و گمان میں بھی یہ سب نہیں تھا۔ بیٹی نہیں تھی وہ ان کی' مگر عزیز اتنی ہی تھی۔

"تم... تمہیں یہ سب کیسے معلوم؟" الفاظ بکھرنے لگے تھے۔

"خود اسی نے بہت مجبور ہو کر بتایا تھا۔" اب وہ یک دم ہی راز فاش کر دینے پر کچھ پشیمان سی تھی۔ تھک کر ان کے برابر ہی میں ٹک گئی۔

"ابراہیم بھائی کو پتا ہے؟" ان کے ذہن میں یک دم ہی ابراہیم صاحب کی فون کال آ گئی۔

"نہیں' نہ انہیں نہ کسی اور کو۔ اس نے اپنی بہن اپنا دوست سمجھ کر صرف مجھ سے شیئر کی تھی یہ بات۔" وہ سر جھکا کر مجرموں کی طرح بولی۔

"اور تم نے مجھ تک کو بتانا ضروری نہیں سمجھا۔" انہیں یک دم ہی اس پر بے تحاشا غصہ آیا تھا۔ "تم آج کل کی نسل نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہو۔ ارے ابھی بڑے بیٹھے ہیں تمہارے' تم لوگ خود کیوں اپنے ماں باپ بن کر اپنے مسائل سلجھانے کی کوشش کرتے ہو۔"

"امی... ایسی بات نہیں۔ میرو کسی کو دکھ نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔ بس اسی لیے۔" وہ اس کی صفائی دینے لگی۔

"پتا نہیں ان پانچ ماہ میں بن ماں کی بچی پر کیا بیت گئی۔ ابراہیم بھائی تو اسے میری سرپرستی میں چھوڑ گئے تھے۔ میں انہیں کیا جواب دوں گی؟" ان کی آنکھیں ایک مرتبہ پھر بھیگ گئیں۔ تب ہی دور سے سامنے کا شیشے کا داخلی دروازہ دھکیل کر اندر آتے ہوئے وقار اور سائر دکھائی دیے۔ ان کے ساتھ ساتھ ہی بل کے معاملات نپٹا کر سعد آتا دکھائی دیا۔

وقار متوحش اور پریشان سے تھے جبکہ سائر کے اوپر بے حس سی لاتعلقی طاری تھی۔ جسے دیکھ کر ماریہ اور سعدیہ' دونوں ہی کو بے حد و بے حساب غصہ آیا تھا۔

"السلام علیکم!" وہ انہیں سلام کر کے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ البتہ سعد سے مصافحہ کرتے وقت ایک ناگوار و کٹیلی نگاہ اس پر ڈالنا ضروری سمجھا تھا۔

"کیسی طبیعت ہے میرب بیٹی کی۔" وقار نے سعد سے مصافحہ کرتے ہوئے سعدیہ سے پوچھا۔

"زندہ ہے۔" انہوں نے تڑخ کر جواب دیا۔ وقار کے ماتھے پر ناگواری کی لکیریں ابھریں۔

"کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" انہوں نے حتی الامکان اپنے لہجے سے غصہ ظاہر نہ ہونے دیا' مگر ایسا کوئی تکلف سعدیہ نے نہیں کیا۔

"پوچھیں اپنے صاحبزادے سے' جو اس کی اس حالت کے ذمے دار ہیں۔" وہ اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ ماریہ نے کچھ پریشانی جبکہ سعد نے حیرت سے اپنی نرم خو والدہ کو دیکھا تھا۔

"دیکھیے بھابھی! میرب کی حالت کی وجہ سے ہم بھی پریشان ہیں' مگر اس طرح کی الزام تراشی قطعی نامناسب ہے۔" اب کی مرتبہ ان کا انداز بھی روکھا تھا۔ سائر کے ابرو تن گئے تھے۔ آنکھیں غصے سے بھری تھیں تاہم وہ خاموش رہا۔

"بھائی صاحب! بخدا میں الزام تراشی نہیں کر رہی' آپ کو حقیقت سے آگاہ کر رہی ہوں کیوں کہ آپ کے انداز سے لگتا ہے جیسے آپ بھی اس بات سے ناواقف ہیں۔" وہ اب کی بار کچھ نرم ہو کر بولیں۔

"کیسی حقیقت' کون سی بات؟" وہ بے وقوفوں کی طرح کبھی انہیں کبھی پیچھے کھڑے سائر کو دیکھے گئے۔

"یہ تو آپ اپنے بیٹے ہی سے پوچھیے' فی الحال میں آپ کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ میرب یہاں سے میرے ساتھ گھر جائے گی اور اس وقت تک وہاں رہے گی جب تک کہ وہ مکمل صحت یاب نہیں ہو جاتی۔" وہ استحقاق سے دوٹوک گویا ہوئیں۔ تب ہی یک دم سائر آگے آیا۔

"آپ چاہیں تو اسے ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھ سکتی ہیں۔ جبکہ میرا خیال ہے وہ خود بھی ایسا ہی چاہتی ہے۔"

وہ زہرخند لہجے میں سعد کو سر سے پیر تک طنزیہ انداز میں گھور کر الٹا گھوما اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔ یہاں کوئی بھی ناسمجھ نہیں تھا جو اس کی بات کا مفہوم نہ سمجھ پاتا۔ مارے ضبط کے سعد کا سفید چہرہ سرخ پڑگیا۔ ماریہ اس کی جرات پر ہکا بکا رہ گئی جبکہ سعدیہ نے حق دق کھڑے وقار کو مخاطب کیا۔

"دیکھ لیا آپ نے' کیا خناس سمایا ہوا ہے آپ کے بیٹے کے دماغ میں۔ اس کے اسی خناس نے میرب کو اس حال پر پہنچایا ہے۔ بھائی صاحب! مجھے شکایت سائر سے نہیں' گلہ آپ سے ہے۔ آپ تو بڑے مان سے بیاہ کر لے گئے تھے' اس بن ماں کی بچی کو' آپ نے بھی اس کا خیال نہ رکھا۔ اب آپ ہی بتایئے۔ میں ابراہیم بھائی کو کیا جواب دوں۔" وہ جذباتی انداز میں بولیں۔ ماریہ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں حوصلہ دینا چاہا۔

"میں... میں آپ سے کیا کہوں... اس وقت بہت شرمندہ ہو رہا ہوں۔ مجھے تو لگا' ان دونوں کے درمیان سب کچھ ٹھیک ہے۔ اب اس طرح کی صورت حال کا تو میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ آپ ابراہیم کو مت بتایئے۔ خدا کی قسم میں اس کی ملامت برداشت نہیں کر سکوں گا۔" وہ اپنی پیشانی رگڑتے ہوئے شدید مضمحل لگ رہے تھے۔

"میرا مقصد آپ کو شرمندہ کرنا ہرگز نہیں ہے بھائی صاحب! میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ اگر کوئی مسئلہ ہے تو اسے حل کر لیا جائے۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ... میرب کیسی ہے میں مل لوں اس سے؟" وہ اپنے آپ کو سنبھال کر بولے۔

"ٹھیک ہے مگر ابھی غنودگی میں ہے۔" ماریہ نے بتایا۔ سعد کافی دیر خاموش کھڑے رہنے کے بعد وہاں سے ہٹ گیا تھا۔

"ٹھیک' ٹھیک ہے پھر۔ میں چلتا ہوں۔ آپ لے جایئے میرب کو اپنے ساتھ... میں دیکھتا ہوں اس مسئلے کو... حل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" وہ جانے کے لیے مڑے پھر کچھ یاد آنے پر دوبارہ ان سے مخاطب ہوئے۔ "بل میں بھر دوں گا' آپ تردد نہ کریں۔"

"بل ادا کیا جا چکا ہے بھائی صاحب! میرو میری بیٹی کی طرح ہے۔ آپ فکر نہ کریں بے کار باتوں کی۔" سعدیہ نے کہا۔ وہ سر ہلا کر الوداع کہے باہر نکلتے چلے گئے۔

"اولاد بھی انسان کو کیسے کیسے شرمندہ کرواتی ہے۔" سعدیہ بڑبڑائیں تب ہی نرس نے آکر اطلاع دی۔

"آپ کی پیشنٹ کو ہوش آگیا ہے اور وہ اندر بلا رہی ہیں آپ کو۔"

☼ ☼ ☼

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" چندا نے چینل تبدیل کرتے ہوئے بے چینی سے ایک مرتبہ پھر جمیل سے پوچھا۔

"کس بات کا؟" جمیل کا سر ہنوز رنگ برنگی فائلوں پر جھکا ہوا تھا۔

اب کی بار چندا تپ ہی تو گئی۔ ریموٹ بیڈ پر پٹخ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ڈریسنگ چیئر پر آکر بیٹھ گئی مگر جمیل کے انہماک میں فرق نہ آیا۔ اس نے تلملاتے ہوئے ہینڈلوشن کا ڈھکن کھولا اور لوشن ہاتھ پر ملنے لگی۔

"میں کچھ کہہ رہی ہوں' گم رہے ہیں آپ۔" وہ چیختے ہوئے بولی۔

"ہاں کہو... کان کھلے ہیں میرے۔"

"مجھے یورپ کب لے کر چلیں گے۔ ہماری شادی کو اتنا عرصہ ہو گیا' آپ مجھے کہیں گھمانے نہیں لے کر گئے۔"

"یار... سونو کو ذرا بڑا تو ہو لینے دو۔ ایک سال کا بچہ ہے خیال کرنا پڑتا ہے۔" ان کی بات نے اس کے تن بدن میں آگ بھڑکا دی۔

"آپ ایک بات مجھے صاف صاف بتائیے۔" اس نے لوشن ٹیبل پر پٹخا۔ "آپ کی زندگی میں میری کوئی اہمیت ہے بھی یا نہیں۔" اس کے انداز برہمی پر جمیل نے فائل سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تمہاری ہی وجہ سے کہہ رہا ہوں' تم وہاں تفریح کرو گی یا بچے کے پیچھے ہلکان ہوتی رہو گی۔ ذرا بڑا ہو جائے تو تمہیں ہی آسانی رہے گی۔" وہ اس کے برعکس رسان سے بولا۔

"مگر اسے لے کر جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہمارا ہنی مون ہے۔ ہم اکیلے نہیں جا سکتے کیا؟" وہ ضدی پن سے بولی۔

"اوہو' تو یوں کہو نا کہ ہنی مون منانے کا جی چاہ رہا ہے۔" اس نے فائل بند کر کے اسے محبوبیت سے دیکھتے ہوئے شرارت سے کہا۔

"جمیل' بات کو اِدھر اُدھر مت کریں۔" وہ سختی سے بولی۔

"بات ادھر جائے یا اودھر پہنچے گی یہیں تک۔" وہ غیر سنجیدہ انداز میں بولا۔

"مجھے ٹالنے کے بجائے صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ آپ کی اوقات نہیں ہے مجھے وہاں لے کر جانے کی۔" اس نے کچھ اتنی بدتمیزی سے کہا کہ یک لخت جمیل سنجیدہ ہو گیا۔

"میری اوقات کو چھوڑو... تمہاری اوقات ہے اتنی بہترین زندگی گزارنے کی جو تم گزار رہی ہو۔" اس نے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں کہا۔ چندا تمسخر سے ہنس دی۔

"میری اوقات کی کیا بات کرتے ہو جمیل... میری پرواز تو آسمانوں تک ہے' مگر مجھے محض گھر اور گھرداری جیسے سنہرے جال میں مقید کر دیا گیا ہے۔"

"اپنے آپ کو اتنی اونچائی پر تصور کرنا چھوڑ دو... نیچے گرو گی تو تمہیں ہی تکلیف ہو گی۔" اس کا لہجہ ناصحانہ تھا' مگر وہ مزید بھڑک گئی۔

"گرتے وہ ہیں جو اونچا اڑنے کے ہنر سے ناواقف ہوں اور مجھے ڈرا دینے کی بجائے کچھ اپنا اسٹیٹس بلند کرنے کی کوشش کرو تو تمہارے لیے بہتر ہے۔"

"اپنی ہمت اور کوشش سے ہی میں اس مقام پر پہنچا ہوں۔" اس نے جتایا۔

"زمین کے نیچے رہنے والے محض زمین کے اوپر ہی آجانے کو کامیابی تصور کرتے ہیں۔" وہ استہزائیہ بولی۔

"زمین کے اوپر ہی سب کچھ ہے۔ میں آسمان پر چڑھنے کی خواہش میں اپنے پیر زمین سے اٹھا دینے والے بے عقلوں میں سے نہیں ہوں۔" وہ گہرے لہجے میں بولا۔

"بہرحال میں کچھ نہیں جانتی... مجھے یورپ جانا ہے اور اسی مہینے جانا ہے ورنہ نہیں۔" وہ ہٹیلے پن سے بولی۔

"نہیں تو نہ سہی تمہاری مرضی' مگر فی الحال میں تمہیں لے کر نہیں جا سکتا۔" اس نے قطعیت سے کہہ کر گویا بات ہی ختم کر دی اور فائلیں سمیٹنے لگا۔

"تم مجھے منع کر رہے ہو؟" وہ تحیر آمیز بے یقینی سے بولی۔ اس کی کشادہ آنکھیں مزید پھیل گئی تھیں۔

"ہاں!" وہ کہہ کر فائلیں سمیٹ کر اسٹڈی میں رکھنے چلا گیا۔

"ہیں۔ اسے کیا ہوا؟" وہ اب تک بے یقینی سے کھڑی تھی۔ جن کے لبوں سے صرف آپ کے لیے ہاں نکلتا ہو' جب وہ منکر ہو جائیں تب جو محسوس ہوتا ہے اس وقت وہ وہی محسوس کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

اسپتال سے گھر تک کا راستہ بے حد خاموشی سے

طے ہوا۔ سائر لب بھینچے' ماتھے پر شکنوں کا جال پھیلائے ازحد سنجیدگی سے ڈرائیونگ کرتا رہا۔ جبکہ وقار صاحب کسی بہت ہی گہری سوچ میں مستغرق تھے۔ وہ چونکے تب' جب گاڑی گھر کے پورٹیکو میں آکر رکی۔

گھر کے اندر آکر وہ اسی گہری' دبیز خاموشی کے ساتھ بنا کسی کی طرف دیکھے اپنے کمرے کی جانب چلتے چلے گئے۔ ان کے قدم ڈھیلے ڈھالے اور کندھے ڈھلکے ہوئے سے تھے۔ سائر انہیں یوں پژمردہ دیکھ کر عجیب سے ملال میں گھر گیا' مگر دوسرے ہی لمحے اسے اس چالباز' احمق پر شدید تاؤ چڑھ گیا جو اس سب کی ذمے دار تھی۔

"ہونہہ ڈرامے باز' بدکردار عورت۔" وہ تنفر سے سر جھٹک کر اپنے کمرے میں آکر کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ شام میں کچھ اسنیکس لے لیے تھے اس لیے بھوک تو اسے فی الحال نہیں تھی البتہ کافی کی طلب شدید تھی۔ ابھی وہ باہر جاکر لالی کو کافی کا کہنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ معاً دروازہ پر دستک ہوئی۔

"یس کم ان۔" وہ اپنے لیپ ٹاپ کو بیڈ پر رکھتے ہوئے بولا۔ آنے والے وقار تھے جنہیں دیکھ کر وہ یک دم سیدھا ہوا۔

"بابا آپ.... آیئے بیٹھیے۔" اس نے جلدی سے بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔

وہ چپ چاپ بیٹھ گئے۔ وہ یونہی کھڑا انہیں سوالیہ نگاہوں سے دیکھے گیا۔

"بیٹھ جاؤ۔" وہ کچھ دیر توقف کے بعد گہری سانس بھر کر بولے۔ وہ بلاچوں چرا بیٹھ گیا۔

"تم جانتے ہو سائر....!" کچھ دیر بعد ان کی درد میں ڈوبی گہری آواز گونجی۔ "تم نے آج کیا کیا ہے؟ تم نے میری تربیت' میرا مان' میرا تم پر بھروسا' فخر و غرور سب تہہ خاک کردیا۔" اتنا کہہ کر ان کی آواز رندھ گئی۔

"نہیں بابا! نہیں۔" وہ تڑپ ہی تو گیا۔ "میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ میں تو آپ کو دکھ دینے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔" اس کے روم روم میں ندامت آمیز بے چینی بھر گئی۔ اس نے وقار کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ انہوں نے چھڑائے نہیں' تاہم اس کی جانب دیکھا بھی نہیں۔

"کیا میں یہ پوچھنے کا حق رکھتا ہوں کہ آخر تم نے اس معصوم کے ساتھ ایسا کیا سلوک روا رکھا تھا جو وہ یوں نڈھال ہوکر رہ گئی۔" ان کی رندھی ہوئی آواز میں ہلکا سا غصہ چھلکا۔

"معصوم؟" اس نے زہرخند انداز سے دہرایا اور ان کے تھامے ہوئے ہاتھ چھوڑ دیے۔ "وہ ہرگز معصوم نہیں ہے بابا! آپ محض چہرے دیکھ کر دھوکا کھا جاتے ہیں۔" وہ نظریں چراتے ہوئے بولا۔

"اچھا۔۔۔ ایسا کیا کیا ہے اس نے؟" ان کا غصہ بڑھنے لگا۔

"وہ بدکردار ہے۔" وہ مضطربانہ انداز میں چیخ کر بولا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے الفاظ پر وقار ششدر رہ گئے۔ ان کی نگاہوں میں اتنی بے یقینی اور تحیر تھا کہ سائر جھینپ گیا۔

"مجھے معلوم ہے کہ آپ میری بات کا یقین نہیں کریں گے حالانکہ آپ کو کرنا چاہیے۔" وہ زور دے کر بولا۔ مگر اب کی بار وقار بھڑک گئے۔

"تمہیں اتنا رکیک جملہ اپنی پاک باز بیوی کے لیے ادا کرتے ہوئے ذرا بھی شرم نہیں آرہی؟"

"شرم مجھے نہیں اسے آنی چاہیے۔" وہ بھی بلند آواز میں بولا۔

"وہ غیر لڑکوں کے ساتھ بے تکلفی برتتی ہے' لوگوں کو اپنے پیچھے لگا کر خوش ہوتی ہے۔ بے ہودہ لباس پہنتی ہے۔ پھر بھی اسے شرم نہیں آتی تو مجھے اسے بدکردار کہتے ہوئے شرم کیوں آئے۔" وہ ہذیان بک رہا تھا۔ وقار الزامات کی یہ فہرست سن کر حق دق رہ گئے۔ کچھ دیر بعد ان کے لب پھڑپھڑائے۔

"سائر....! وہ ایسی نہیں ہے' میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں' میرے بچے۔" وہ بے چارگی سے بولے۔

"وہ ایسی ہی ہے بابا' پلیز آپ اس کی طرف داری مت کریں۔" وہ بے لچک لہجے میں کہہ کر واش روم

میں گھس گیا۔ وقار نے تھکی تھکی سی سانس لی۔
"تو گویا تاعمر مشقت کے بعد بھی میں ناکام ٹھہرا؟"
ان کے ذہن میں یہی سوچ منجمد ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

میرب کے ہوش میں آنے کے بعد کچھ ٹیسٹ کیے گئے۔ وہ اب نارمل مگر بے حد گم صم اور اداس سی تھی۔ ماریہ اس کے نزدیک بیٹھی پیار سے اس کا سر سہلا رہی تھی جبکہ سعدیہ اپنے سیل پر آنے والی کسی کال پر مصروف کوریڈور میں تھیں۔ سعد کہیں گیا ہوا تھا۔

"میرب... میری جان! اب کیسا محسوس کر رہی ہو تم۔ قسم سے یار! تم نے تو جان ہی نکال دی تھی۔" وہ اس کی اداسی زائل کرنے کو شگفتگی سے بولی۔

"ماریہ... کیا سائرہ ابھی تک نہیں آئے۔" اس نے بے چینی سے دریافت کیا۔

"وہ اور انکل دونوں آئے تھے۔ انکل کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں تھی اسی لیے انہیں لے کر وہ واپس گھر چلے گئے۔" ماریہ نے اس کی کیفیت کے پیش نظر بات بنائی۔

"ماریہ پلیز... مجھے کچھ دن اپنے گھر لے چلو۔" وہ لجاجت سے بولی۔ ماریہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"کیوں نہیں میرب... وہ تمہارا ابھی تو گھر ہے۔" اس نے پچکار کر کہا۔

"نہیں ماریہ! دنیا میں اب میرا کوئی گھر نہیں۔" اتنا کہہ کر وہ رونے لگی۔ ماریہ بے بسی و ترحم سے اسے دیکھنے لگی۔ تب ہی سعدیہ نرس کے ساتھ خوشگوار موڈ میں کمرے میں داخل ہوئیں اور اسے روتا دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔

"کیوں بھئی میرب! کیوں رو رہی ہو؟" وہ اس کے نزدیک آکر پیار سے بولیں۔ نرس سفید لفافہ ہاتھ میں لیے مسکرا رہی تھی۔

"آنٹی! مجھے بابا کے پاس جانا ہے۔" وہ بچوں کے سے لہجے میں بضد ہوئی۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے چلی جانا۔" انہوں نے اسی انداز میں تسلی دی جسے طفل تسلی کہا جاتا ہے۔ "فی الحال تو ایک خوش خبری سنو۔" وہ معنی خیزی سے مسکرائیں۔ ماریہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

"تمہارے قدموں تلے جنت تعمیر ہونے جا رہی ہے میرب۔" انہوں نے اسے نم آنکھوں سے دیکھ کر مطلع کیا۔

"ک... کیا مطلب؟" وہ ہکلا گئی۔

"مطلب... آپ امی جان بننے والی ہیں۔" نرس نے شوخی دکھائی۔

"کیا..." ماریہ خوشی سے اچھل پڑی۔

جبکہ اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ وہ بس بے یقینی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"کیا ہوا سب خیریت ہے؟" جوں ہی وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی اسے آغا کا ایس ایم ایس موصول ہوا۔ جواباً اجیہ نے اسے کال ملالی۔ وہ آج وقار سے اجازت لیے بغیر آغا ہی کے گھر گئی تھی۔ وہاں سے وہ اسے ڈنر کے لیے لے گیا تھا جہاں انہیں بہت سی باتیں ڈسکس کرنی تھیں۔ مستقبل کا لائحہ عمل طے کرنے کے بعد اس نے ہی اجیہ کو گھر ڈراپ کیا تھا۔ اجیہ کچھ خائف سی تھی گھر پر اترتے وقت تب ہی اس وقت آغا نے اسے ایس ایم ایس کر کے حالات جاننا چاہے تھے۔

"کیا ہوا؟" آغا نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"کیا بتاؤں آغا! یہاں تو مسئلہ ہو گیا ہے؟" وہ بیڈ پر ٹک کر ناخن کترنے لگی۔

"کیا ہوا کچھ بتاؤ تو سہی۔" وہ جھنجلا گیا۔

"میری بھابھی ہاسپٹلائز ہو گئی ہیں۔ اب ہمارا کیا ہو گا؟" وہ پریشان کن لہجے میں گویا تھی۔

"یار! ان کے ہاسپٹلائزڈ ہونے سے ہمیں کیا مطلب "آئی مین ہمیں کیا مسئلہ ہو سکتا ہے؟" وہ ناسمجھی سے بولا۔

"بھئی۔ میرے بابا بہت عجیب آدمی ہیں۔ وہ یہ بھی

تو کہہ سکتے ہیں کہ جب تک بھابھی ٹھیک نہیں ہوجاتیں اس وقت تک ہمارے رشتے کی بات نہیں چل سکتی اور پھر ہم نے تو یہی ڈی سائیڈ کیا تھا ناکہ میں بھابھی سے تمہارا ذکر کروں گی اور وہی اپنے طریقے سے بات آگے پہنچائیں گی۔" اس نے مسئلے سے آگاہ کیا۔

"اوہ نو..." وہ یک دم ہی پریشان ہو کر بولا۔ "واقعی یہ تو پرابلم ہوگئی۔ میرے پاس تو زیادہ دن نہیں ہیں، میں تو چاہ رہا تھا کہ کم از کم نکاح ہوجاتا، پھر پیپر وغیرہ بننے میں بھی وقت لگتا ہے۔ میرا تو ذہن بالکل ماؤف ہوگیا یار۔"

"اب کیا کریں؟" وہ سابقہ لہجے میں بولی۔

"چلو کچھ سوچتے ہیں۔ یہ تمہاری بھابھی کو بھی ابھی ہی کچھ ہونا تھا۔" وہ چڑ کر بولا۔

"ہاں میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی اور پھر بائے کر کے فون آف کرنے کے بعد اپنے گھٹنے پر چہرہ ٹکا کر لامتناہی سوچوں میں گھر گئی۔

اور اگر ہماری سوچوں ہی کے مطابق مستقبل بسر ہونے لگے تو پھر تقدیر کہاں جائے؟

☼ ☼ ☼

"میں نے تو تمہیں پہلے ہی کہا تھا۔" پومی آنٹی اپنے موقف کے درست ہونے پر تفاخر سے بولیں۔ "کہ تم اس شخص کے ساتھ رہ کر اپنے آپ کو، اپنی صلاحیتوں کو ضائع کر رہی ہو۔ اس شخص کو نہ تمہارا احساس ہے نہ قدر۔"

وہ لوگ اس وقت پومی آنٹی کے گھر کے لان میں موجود کین کی کرسیوں پر بیٹھے شام کے وقت چائے اور اسنیکس سے شغل فرما رہے تھے۔

"مجھے لگتا ہے آنٹی! آپ کی بات ٹھیک ہی ہے۔ پہلے کی بات اور تھی اب وہ خاصا بدل گیا ہے۔ نہ وہ اب میری باتوں کو اہمیت دیتا ہے نہ فرمائشیں پوری کرتا ہے۔ اور تو اور اب تو ہمہ وقت اس کے سر پر "خسو" اور

اس کی پرورش" ہی سوار رہتی ہے۔" اس کی پرسوچ نگاہیں غیر مرئی نقطے کو دیکھ رہی تھیں۔

"تم ابھی بھولی ہو۔ یہ مرد نامی مخلوق صاحب اولاد ہوجانے کے بعد ہی اپنا اصل چہرہ دکھاتے ہیں جو کم از کم بیویوں کے لیے تو ہرگز خوب صورت نہیں ہوتا۔" وہ ناک چڑھا کر بولیں اور چائے کے گھونٹ بھرنے لگیں۔

"ہوں... تو اب میں کیا کروں؟" اس نے غور سے انہیں دیکھ کر استفسار کیا۔

"حمیدی صاحب کے پاس چوہدری فضل دین کی آفر ہے کہ وہ ان کی فلم ڈائریکٹ کریں... ابھی تو معاملات چل رہے ہیں۔ فلم کی کاسٹنگ وغیرہ بھی نہیں ہوئی تم کہو تو بات کروں؟"

انہوں نے لہجہ بہ ظاہر سرسری سا بنا کر پوچھا، مگر چندا تو اچھل ہی پڑی۔ اس کی بجھتی آنکھوں کی قندیلیں روشن ہوگئیں۔

"کیا ایسا ممکن ہے؟" وہ پرجوش ہو کر بولی۔

"نا ممکن بھی ہو تو بھلا میں کس مرض کی دوا ہوں۔ تم سے دوستی کی ہے، تمہارے شوہر کی طرح تم سے غرض کا رشتہ تو باندھ نہیں رکھا۔" وہ جتا کر بولیں۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے کیجیے آپ بات... اب کچھ بھی ہو جب اسے میری پروا نہیں تو مجھے کیا پڑی ہے، یوں بھی ایسی روکھی پھیکی سی زندگی تو میرا خواب نہیں تھی۔" وہ پُراعتماد ہو کر بولی۔

پومی آنٹی کی چھوٹی چھوٹی میک اپ سے اٹی آنکھیں جگمگانے لگیں۔

☼ ☼ ☼

اک اچھوتا احساس تھا جو اس کے من میں جاگزیں ہو رہا تھا۔ اسے لگا وہ مکمل ہوگئی ہو۔ اسے آج تک ایسی لذت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ خوشی کے اس مقام پر کھڑی تھی جہاں پہنچ کر روح اداس ہوجاتی ہے۔ سو وہ اداس تھی مگر مسرور بھی۔ بہت سے واہمے اندیشے، مایوسیاں بھاپ بن کر اڑ گئے تھے۔ اور وہ ہلکی

پھلکی سی ہو کر گھر آئی تھی۔
"تم کیا کمرے میں اکیلے اکیلے بیٹھی مسکرا رہی ہو؟ چلو تمہیں باہر امی بلا رہی ہیں۔"
ماریہ نے کمرے میں آکر جھانکا۔ وہ اس کی بات سن کر چونکی پھر اثبات میں سرہلا کر اس کے پیچھے چلتی ہوئی لاؤنج میں چلی آئی۔ سعدیہ فون پر مصروف گفتگو تھیں۔ اسے دیکھ کر بولیں۔
"لیں بھائی صاحب آگئی میرب، خود ہی اس سے بات کر کے تسلی کرلیں۔" انہوں نے فون اسے پکڑایا۔ وہ یک لحظہ محجوب سی ہوگئی تاہم سنبھل کر اس نے ابراہیم صاحب کو سلام کیا۔
"وعلیکم السلام میری بیٹی میرے جگر کا ٹکڑا! کیسی ہو تم؟" ان کے حلیم لہجے میں محبت کی چاشنی تھی۔
"جی بابا! اللہ کا شکر ہے بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے، عاشر کیسا ہے۔" اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
"ہم لوگ ٹھیک ہیں میرے بچے! تمہارے گھر میں تو سب ٹھیک ہے نا؟ سائر کیسا ہے؟ اس سے تو بات ہی نہیں ہو پاتی۔" ان کے لہجے میں شکوہ تھا۔
"سب ٹھیک ہے بابا! سائر اصل میں بہت مصروف رہتے ہیں آج کل، کچھ کاروباری مسائل ہیں بس ان ہی میں الجھے ہوئے ہیں۔ آپ کو تو اکثر سلام دیتے ہیں، میں ہی پہنچانا بھول جاتی ہوں شاید۔" وہ سائر کے تذکرے پر بجھ سی گئی۔
"اسے وعلیکم السلام کہنا اور بہت دعائیں دینا اور ہاں بیٹا! زندگی کے اس نئے موڑ پر گھبرانا نہیں۔ میں دعا گو ہوں تمہارے لیے۔ جی تو چاہ رہا ہے اڑ کر وہاں پہنچ جاؤں، مگر مجبور ہوں کہ اکیلے سفر نہیں کر سکتا اور عاشر کو چھٹی ملے گی نہیں۔" وہ اداسی لیے بولے۔
"بابا جان! آپ پلیز اداس مت ہوں۔ بس دعا کرتے رہیں میرے حق میں۔" وہ بھی رنجیدگی سے بولی۔
"چلو بیٹے رکھتا ہوں۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔" انہوں نے فون بند کر دیا۔ اس نے بھی ڈھیلے انداز میں ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔
"کیوں بیٹا... کیوں اتنی بجھی بجھی سی بیٹھی ہو۔" سعدیہ نے اس کے لیے جوس لاتے ہوئے پوچھا۔
"آنٹی پلیز... میرے لیے اتنا تردد مت کریں۔" اس نے انہیں جوس کا گلاس لاتے دیکھ کر شرمندگی سے کہا۔
"یہ تم نے غیروں جیسی باتیں کب سے شروع کر دیں۔ کیا تم میری بیٹی نہیں ہو۔" وہ اس کے قریب بیٹھ کر خفگی سے بولیں۔
"آنٹی پلیز... آپ لوگ ہی تو میرے اپنے ہیں۔ آپ کو میں غیر کیوں سمجھوں گی۔" وہ بولی۔
"غیر تو تم سمجھتی ہو بیٹا۔" وہ کچھ ناراضی سے بولیں۔ "اگر اپنا سمجھتیں تو کیوں سارے دکھ اکیلے جھیلتی رہتیں۔" ان کی بات پر میرب کا سر جھک گیا۔
"مجھے اپنا پندار عزیز ہے آنٹی۔" وہ دھیرے سے بولی۔
"پندار کو عزیز رکھنا اچھی بات ہے، مگر تجربے کی بات ہے کہ محض پندار کے سہارے زندگی نہیں گزرتی۔ زندگی مسائل کا حل مانگتی ہے۔"
"میں اپنے طور پر اپنا مسئلہ حل کرنا چاہتی تھی۔"
"مگر کیا تمہارا مسئلہ حل ہوا؟ نہیں نا۔ تو کیا اب بھی تمہیں کسی کی رہنمائی کی ضرورت نہیں؟"
وہ خاموش رہی۔ وہ کچھ دیر اسے بہ غور دیکھتی رہیں۔
"اب کیا سوچا ہے تم نے۔ ابھی تو میں نے بھائی صاحب کی طبیعت اور دوری کے پیش نظر یہ بات ان سے چھپالی، مگر کیا یہ بات اتنی ہی معمولی ہے کہ تادیر مخفی رہ سکے؟ کیا تمہیں یقین ہے کہ انہیں دوسری جانب سے بھی یہ بات معلوم نہیں ہوگی کہ تمہارے اور سائر کے مابین کچھ بھی ٹھیک نہیں؟" انہوں نے میرب کے سامنے ان گنت سوال رکھ دیے۔
"تو پھر میں کیا کروں؟" وہ سسک اٹھی۔ "اس بے یقین آدمی کو اپنی وفا کا یقین کیسے دلاؤں؟ اس بدگمان شخص کی بدگمانیاں کیسے دور کروں؟ وہ جو ایک عورت کی

بے وفائی کا بدلہ مجھ سے لے رہا ہے۔ اسے انتقام لینے سے کیسے روکوں؟" وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

سعدیہ اسے تاسف سے دیکھنے لگیں۔ مگر یہ وقت افسوس کرنے سے کہیں زیادہ سوالات کرنے کا تھا۔

"اس نے تم سے خود یہ بات کہی ہے کہ وہ کسی اور کو چاہتا تھا؟" سعدیہ کو ماریہ ساری صورت حال سے آگاہ کر چکی تھی۔

"نہیں۔" اس نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ "مگر مجھے یقین ہے کہ یہی بات ہوگی۔" اس نے یقین سے کہا۔

"بیٹی۔ زندگی مفروضوں کی بنا پر نہیں گزرتی۔ تمہیں اس سے کھل کر بات کرنی چاہیے۔" انہوں نے سمجھایا۔

"بات تو تب کروں نا جب وہ کرنے دیں۔ ان کا جی چاہتا ہے تو بات کرتے ہیں ورنہ نہیں۔" وہ کچھ چڑ کر بولی۔

"یہ تو عجیب بات ہے۔" وہ کچھ پریشان سی ہو گئیں۔ "تب پھر یہ مسئلہ کیسے حل ہو؟ وہ تو یوں چپ کر کے بیٹھ گئے ہیں گویا جان چھوٹی ہو۔"

"جان ہی تو چھوٹی ہے ان کی۔" وہ تلخ ہوئی۔ اس نے سائر کے ہاتھ اٹھانے کا ابھی تک کسی کو بھی نہیں بتایا تھا۔ کیسے بتاتی؟ خود کو ارزاں کرنا دوسروں کی نظر میں آسان نہیں ہوتا۔

"ایسے تو معاملات نہیں چلیں گے۔ مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا۔ تم ہی اسے فون کر کے یہ خوش خبری سنا دو، شاید اس کے مزاج پر خوش گوار اثر پڑے۔" وہ جیسے کسی نتیجے پر پہنچ کر بولیں۔

"آپ کو کیا لگتا ہے وہ یہ خبر سن کر مجھے لینے دوڑے چلے آئیں گے۔" وہ طنزیہ بولی۔

"نہ آئے مگر اس کے علم میں یہ بات لانی بھی تو ضروری ہے۔"

"تو پھر آپ ہی بتا دیجیے میں تو ہرگز بھی انہیں فون نہیں کروں گی۔" وہ قطعیت سے کہہ کر اٹھی اور لاؤنج عبور کر گئی۔

سعدیہ کی تفکر میں ڈوبی آنکھیں اس کے تعاقب میں تھیں۔

☼ ☼ ☼

پومی آنٹی نے اپنے نئے گھر کی خوشی میں پارٹی دی تھی اور چندا کو ہدایت تھی کہ بہت بہترین انداز میں تیاری کر کے آئے کہ وہاں پومی آنٹی اور ان کے شوہر حمیدی صاحب کے حلقہ احباب نے جمع ہونا تھا۔ چوہدری صاحب بھی مدعوئین میں شامل تھے۔ چندا نے آج کی تقریب میں اپنے تن پر سجانے کے لیے سفید براق ۔۔ نیٹ کی ساڑی کو چنا تھا جو سفید اور ہلکے نیلے نگینوں کے کام مزین تھی۔ فیروزے اور زرقون کا سیٹ ان کی شادی کی سالگرہ پر جمیل نے اسے گفٹ کیا تھا۔ اس نے وہی پہن لیا۔ ریشمی تھان سی مرمریں کلائیوں میں نگینے جڑا کڑا گھمایا۔ غزالی قاتل آنکھیں گہرے نیلے رنگ میں رنگین۔ ہونٹوں پر چمکدار مگر ہلکی گلابی لپ اسٹک جمائی۔ بالوں کے سروں کو اس نے لوز کرل کرلیا تھا وہ یوں ہی پشت پر لہرا رہے تھے۔ آخر میں "بولڈ" کی مسحور کن خوشبو اسپرے کی۔ سلور چمکدار اونچی ہیل کے سینڈل پہنے۔ چھوٹا سا پرس مٹھی میں دابے وہ تقریب میں جانے کے لیے بالکل تیار تھی۔

اس وقت رات کے آٹھ بجے کا عمل تھا۔ جمیل کو آج دیر سے گھر آنا تھا وہ فون پر اسے مطلع کر چکا تھا اور وہ بھی اسے مسز حمیدی کے گھر کی اس "پارٹی" کے متعلق بتا چکی تھی۔ مگر اتنا ہی کہ ان کے نئے گھر کی خوشی میں پارٹی ہے مگر وہاں کیا ہوگا، یہ بتانا اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا۔

ٹھیک آٹھ بجے پومی آنٹی کا ڈرائیور اسے لینے گھر کے باہر موجود تھا۔ پومی آنٹی نے چندا کو پک کرنے کے لیے، بہ طور خاص اسے بھیجا تھا۔

وہ اپنی کمان دار کمر لچکاتی نزاکت سے گاڑی میں آ بیٹھی۔ اس نے گھر سے نکلتے وقت براؤن شال لپیٹ

لی تھی۔ جو اس نے پوی آنٹی کے گھر میں داخل ہونے سے قبل اتار کر گاڑی ہی میں رکھ دی تھی کہ واپسی بھی تو اسی گاڑی میں ہونی تھی۔

پوی آنٹی کے وسیع و عریض گھر کے بقعہ نور بنے لان میں وہ جس دم داخل ہوئی 'یک لحظہ جھجک سی گئی کہ وہ بھلا کب اتنی شاندار تقریبات کا حصہ رہی تھی؟ ان کی کلاس میں تو تقریب کے نام پر محض شادی 'ولیمہ ہی بڑے پیمانے پر کیا جاتا تھا۔ بہت ہوا تو عقیقہ 'سالگرہ وغیرہ۔ جہاں کی سجاوٹ 'مہمان اور کھانے 'سب ہی اوسط درجے یا اس سے کچھ نیچے ہی ہوتے تھے۔

یہی دنیا تو ہے میری منزل۔ جہاں سب کچھ محض "یور یج" نہیں بلکہ بہترین ہے۔ شاندار ہے پر تعیش ہے۔ اس کی ساحر آنکھیں خوابناک سی ہو کر کئی ایک لوگوں کو اس کی جانب متوجہ کر گئیں۔

"ارے چندا!" پوی آنٹی کی گرم جوش آواز اسے ہوش میں لے آئی"یہاں کیوں کھڑی ہو ارے بھئی آؤ نا۔" انہوں نے بڑے پرتپاک انداز میں اسے خوش آمدید کہا تھا۔ وہ ان کی معیت میں یوں قدم اٹھاتی گئی گویا کسی ریاست کی شہزادی ہو۔ وہاں موجود کئی "شوقین" اس کی جانب مکمل متوجہ ہو گئے۔ کئی ایک کو اپنا دل اس کے قدموں کے ساتھ گھسٹتا محسوس ہوا۔ مگر وہ شان بے نیازی سے ان کے دل روندتی ہوئی چوہدری صاحب کے پاس جا کر ٹھہر گئی۔

"دیکھیں چوہدری صاحب! کیا ہیرا ڈھونڈا ہے آپ کے لیے۔ کیا داد نہیں دیں گے۔" پوی آنٹی نے چوہدری صاحب کو مخاطب کر کے کہا۔ وہ جو کسی سے مصروف گفتگو تھے 'پلٹے اور ان کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

"واہ۔ واہ بھئی واہ مسز حمیدی 'جواب نہیں آپ کے انتخاب کا۔" انہوں نے اسے تولتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مشروب کا گھونٹ بھرا۔

"تو۔ کیا کرتی ہیں یہ؟"

چندا نے لب کھولے مگر کچھ سوچ کر بند کر لیے۔

"پڑھتی ہے کالج میں بہت شوق ہے اسے اداکاری کرنے کا۔" انہوں نے گڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"اچھا شوق ہے اور ان کا شوق انہیں بالکل صحیح مقام پر لے کر آیا ہے۔" اس نے کہا۔

"اچھا چندا تم ذرا چوہدری صاحب کو کمپنی دو' میں اپنے مہمانوں کو اٹینڈ کر لوں۔" پوی آنٹی نے چندا کا داہنا ہاتھ دباتے ہوئے گویا اسے کچھ اشارہ دیا۔ اور اسے سمجھا کر آگے بڑھ گئیں۔

اسے چوہدری کے ساتھ کھڑا دیکھ کر دیگر کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ مگر یہ ان کے ہاں کا مروجہ اصول تھا کہ کوئی دوسرا کسی کے خاص مہمان کو بہکا کر اپنی جانب متوجہ نہیں کر سکتا تھا۔

"کہاں پڑھتی ہیں؟" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ابھی کالج میں ہوں۔" اس نے دھیمے سے بتایا۔

"اچھا۔ اچھا خیر پہلے اداکاری وغیرہ کا تجربہ ہے؟"

"جی۔ جی نہیں بس کالج ہی میں اسٹیج ڈرامے وغیرہ کیے ہیں۔"

"چلیں خیر۔ آپ کا تو یہ قاتل حسن ہی کافی ہے۔" اس نے چٹخارا لے کر کہا۔ اس کا انداز چندا کو اچھا تو نہیں لگا مگر پروفیشنل ازم کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ اس لیے محض اک خاص انداز سے مسکرا دی۔

"آپ کے ہاتھ خالی ہیں۔ کچھ شوق نہیں فرمائیں گی؟"

"جی نہیں شکریہ۔" اس نے ناگواری سے ناک چڑھائی۔

"کیا ادا ہے۔" وہ عش عش کر اٹھا۔ "آپ تو بنی بنائی ہیروئن ہیں۔ جی آپ پر محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ قسم سے اک بار آجائیں اسکرین پر تہلکہ مچا دیں گی۔"

اچانک ہی فضا بے ہنگم موسیقی سے گونج اٹھی۔ اور کچھ لوگ اپنے اپنے پارٹنرز کے ساتھ تھرکنے لگے۔ چوہدری نے بھی مشروب کا خالی گلاس ویٹر کو تھمایا اور کمال بے تکلفی سے اس کی نیم برہنہ کمر میں ہاتھ ڈال کر بولا۔

"ساتھ نہیں دیں گی۔"

"کیوں نہیں۔" وہ پذیرائی کرنے والے انداز میں مسکرائی تھی۔ اور دوران رقص ہی چوہدری اس کے متعلق بہت کچھ سوچ چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مگر یہ کیوں ہوتا ہے کہ کرتا تو کوئی اور ہے اور بھگتنا اس کے متعلقین کو پڑتا ہے۔" وقار نے کتاب نشانی لگا کر بند کی اور ٹیبل پر رکھ کر چشمہ دائیں ہاتھ سے اتار کر ساتھ ہی رکھ دیا۔ اور خود کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ وہ آج کل اپنا زیادہ وقت اسٹڈی میں گزار رہے تھے گھر میں سوائے لالی سے ضرورتاً بات کرنے کے کسی سے بھی بات نہیں کر رہے تھے۔ ان کا ذہن الجھنوں کا شکار تھا۔ خدشے تھے کہ انہیں چین نہیں لینے دے رہے تھے۔ سائر کا رویہ ہنوز اول روز جیسا تھا۔ اور یہی بات انہیں خطرے کی گھنٹی محسوس ہو رہی تھی۔

اور میری ساری زندگی اسی ڈر کے تحت گزری ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے مگر تب تو ایسا یا ویسا کچھ بھی نہیں ہوا اور اب یہ صورت حال۔ میں کیا کروں کس سے مدد مانگوں۔ ابراہیم کیا سوچے گا' کیا یہی سب کرنے کے لیے اس کی بیٹی کو گھر لائے تھے؟

وہ ان ہی سوچوں میں غلطاں تھے تب ہی ٹیبل پر رکھا ہوا ان کا فون زور سے بج اٹھا۔ انہوں نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں اور فون اٹھا کر دیکھا سعدیہ کے گھر کا نمبر تھا۔ "اٹھاؤں یا نہ اٹھاؤں' ان کے سوالوں کا میں کیا جواب دوں گا؟" وہ شش و پنج میں پڑ گئے۔ فون بج بج کر خاموش ہو گیا۔

"مگر خاموشی تو فرار ہے۔ اب جو بھی ہو' اللہ مالک ہے۔" انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری تب ہی فون پھر بجنے لگا۔

"ہیلو' السلام علیکم۔ میں سعدیہ بات کر رہی ہوں بھائی صاحب۔" انہوں نے کہا۔

"وعلیکم السلام۔ جی بھابھی' سنائیے کیا حال ہے آپ کا۔" انہوں نے محتاط ہو کر بات شروع کی۔

"ہم تو اللہ کا شکر ہے ٹھیک ہیں' آپ سنائیے وہاں کا کیا حال ہے۔ آپ نے تو پلٹ کر کال بھی نہیں کی۔" ان کے لہجے میں تپش بھی تھی اور شکوہ بھی۔

"جی بس۔ کچھ مصروفیت تھی' اک دو روز میں چکر لگاتا ہوں۔" ان کا لہجہ بے یقین سا تھا۔

"جی ضرور' فی الحال تو میں نے آپ کو ایک خوش خبری سنانے کے لیے فون کیا ہے۔ خیر سے آپ دادا بننے جا رہے ہیں۔ مبارک ہو آپ کو۔"

"کیا کہا؟" انہیں لگا ان کی سماعت کو دھوکا ہوا ہے۔

"جی بالکل' اللہ نے کرم کیا ہے' میرو منتظر ہے بھائی صاحب! لاکھ یہاں ہر طرح کا آرام ہے مگر ایسے اس حالت میں روحانی مسرت و قلبی سکون تو بہرحال اپنے شوہر کے گھر جا کر حاصل ہو گا۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا میری بات۔" وہ سنجیدگی سے بولیں۔

"بھابھی صاحبہ! بالکل سمجھ رہا ہوں آپ فکر مت کریں۔ بس بچی کا بہت خیال رکھیں ان شاء اللہ میں آج یا کل آ کر اسے لے جاؤں گا۔" ان کی آواز مارے خوشی کے کپکپا رہی تھی۔

"آج یا کل تو نہیں' فی الحال تو وہ یہیں ہے۔ ماریہ کی تاریخ طے ہونے تک۔"

"ملنے تو آ سکتا ہوں؟" انہوں نے پوچھا تو وہ شرمندہ ہو گئیں۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ' جب چاہیں آئیں۔ آپ کا اپنا گھر ہے۔ مگر آپ سائر کے ساتھ آئیں گے تو مجھے زیادہ خوشی ہو گی۔"

"چلیں دیکھتا ہوں۔" ان کا مسکراتا لہجہ کچھ ماند پڑ گیا۔ "بھابھی صاحبہ آپ سے ایک التجا کرنی تھی۔" وہ جھجک کر بولے۔

"جی بولیے۔"

"آپ فی الحال ابراہیم سے ان سب باتوں اور حالات کا تذکرہ مت کیجیے گا خدارا۔" ان کی آواز شرمندگی سے مغلوب تھی۔

"ارے نہیں۔" وہ سرعت سے بولیں "بلکہ میں

خود آپ سے یہی کہنے والی تھی کہ خوامخواہ ابراہیم بھائی کو پریشان مت کیجیے گا۔"

"نہیں سمجھتا ہوں۔"

"اچھا رکھتی ہوں۔ آپ کی منتظر رہوں گی۔" انہوں نے یاد دلایا۔

"ان شاء اللہ میں کل ہی چکر لگاتا ہوں۔" فون بند کرنے کے بعد انہوں نے ایک تروتازہ سی سانس لی۔ انہیں لگ رہا تھا گویا وہ پھر سے جوان ہو گئے ہوں۔

☼ ☼ ☼

"کیوں کیا ہوا؟ اتنی افسردہ اور پریشان سی کیوں ہو؟" گل نے شربت بنا کر لاتے ہوئے پوچھا۔ آج کئی دن بعد اجیہ نے اس کے پاس چکر لگایا تھا۔

"بس کیا بتاؤں امی! اچانک ہی بھابھی کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی اور وہ اسپتال سے اپنے گھر چلی گئی ہیں۔ معلوم نہیں ان کے اور سائر بھائی کے بیچ کیا مسئلہ ہو گیا ہے مگر مصیبت میرے لیے کھڑی ہو گئی ہے۔" وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ہم کیوں فکر مند ہو رہی ہو اتنی۔" گل بے پروائی سے بولی۔ "ہو گیا ہو گا کسی بات پر جھگڑا۔ میاں بیوی تو یوں بھی لڑتے جھگڑتے ہی رہتے ہیں۔" اس نے کہہ کر ٹھنڈا ٹھار شربت کا گلاس لبوں سے لگایا۔

"مجھے ان کی پرواہ نہیں اپنی فکر ہے۔ میرا معاملہ تو کھٹائی میں پڑ گیا نا۔" وہ چڑ کر بولی۔ "گھر میں ہر کوئی اسی ٹینشن میں مبتلا ہے۔ ایسے میں میرے معاملے کو کون دیکھے گا۔" لالی اسے سب خبریں بہم پہنچاتی رہتی تھی۔

"چچ۔ چچ۔" گل نے متاسف سے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "کس قدر خود غرض ہیں یہ باپ بیٹا۔ انہیں تمہاری کوئی پروا ہی نہیں۔ سچ کہتی ہوں میری بچی، تجھے دیکھتی ہوں تو کلیجہ شق ہونے لگتا ہے۔ کاش تیری شادی ہی میں اپنے ہاتھوں سے کر سکتی۔ تیری پرورش تو نہ کر سکی۔" وہ گلاس رکھ کر رقت لہجے میں بولی۔

"امی!" اس نے جھٹ اپنی بانہیں اس کے گلے میں ڈال کر پیار سے کہا۔ "یہ بھی آپ ہی کی خواہش ہے کہ آپ سے تعلق کو میں پوشیدہ رکھوں ورنہ تو مجھے اب آپ سے ایک پل بھی دور رہنا گوارا نہیں ہے۔"

"تب ہی بیاہ کر سات سمندر دور جانے کا منصوبہ بنائے بیٹھی ہو۔" اس نے خفگی سے اس کے ہاتھ ہٹائے۔ وہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔ پھر صفائی دینے والے انداز میں بولی۔

"مگر امی! یہ تو ہم دونوں ہی کے لیے اچھا ہے نا، شادی کے بعد میں آپ کو وہیں اپنے پاس بلا لوں گی۔"

"خاک بلا لو گی۔ وہ تمہارا شوہر بلانے دے گا تب نا۔"

"نہیں امی! وہ ایسا نہیں۔ میری ہر بات مانتا ہے۔" اس نے آغا کا دفاع کیا۔

"ہونہہ۔ شادی کے بعد عورت مرد کے لیے صرف بیوی ہوتی ہے۔ جس کی بات ماننا یا سننا وہ اپنی توہین سمجھتا ہے۔" وہ زہر آلود لہجے میں بولی۔

"امی۔ آپ دنیا کے ہر مرد کو بابا جیسا کیوں سمجھتی ہیں۔"

"کیونکہ سارے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔" وہ کرختی سے بولی۔

"چھوڑیں یہ بے کار کی بحث۔ میرے لیے دعا کریں۔ آغا بہت غصے میں ہے۔ پتا نہیں ہمارا کیا بنے گا۔" وہ مضطربانہ انداز میں اپنی انگلیاں چٹخاتی ہوئی بولی۔

"(بنے گا تو وہی جو میں بنانا چاہتی ہوں۔ عنقریب وہ وقت آیا ہی چاہتا ہے میری بچی!)" گل نے دل میں مسکراتے ہوئے کہا مگر بولی تو یہ کہ۔

"ہاں بیٹا۔! میری ساری دعائیں تیرے ہی لیے ہیں۔"

☼ ☼ ☼

کچھ دیر قبل ہی وقار صاحب نے کسی نتیجے پر پہنچ کر سائر کو اسٹڈی میں طلب کیا تھا اور اب وہ ٹیبل کے سامنے رکھے لائٹ براؤن صوفے پر خاموشی سے

سر جھکائے بیٹھا تھا۔

"تمہیں صاف صاف بتانا ہوگا کہ تمہیں میرب سے کیا شکایت ہے؟" وقار صاحب کی بارعب آواز گونجی۔ سائر نے سر نہیں اٹھایا۔

"میں بتا چکا ہوں۔" اس نے بھی دوٹوک کہا۔

"میرے نزدیک ان بے کار اور واہیات باتوں کی کوئی اہمیت نہیں۔" بیک جنبش قلم انہوں نے اس کی بات رد کی۔

"مگر میرے لیے ہے۔" سر ہنوز جھکا ہوا تھا۔ اور نگاہیں براؤن کارپٹ پر مرکوز تھیں۔

"ہوں۔" انہوں نے پرسوچ ہنکارا بھرا۔ "تو پھر آگے کا کیا سوچا ہے؟" انہوں نے نگاہیں سائر پر گاڑ کر جاننا چاہا۔ وہ خاموش رہا۔

"میں کچھ پوچھ رہا ہوں۔" وہ تحکمانہ بولے۔

"میں نے فی الحال کچھ نہیں سوچا۔" کچھ دیر توقف کے بعد مدہم انداز میں کہا۔

"یہ تو اچھی بات ہے کہ تم کوئی سنگین فیصلہ کرنے میں متامل ہو۔" انہیں کچھ اطمینان ہوا۔ "اب جو میں تمہیں بتانے جا رہا ہوں ہوسکتا ہے وہ سن کر تمہیں فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔" انہوں نے کچھ دیر ٹھہر کر اس کے تاثرات جانچے۔ وہ ہنوز چہرے کے عضلات تانے بیٹھا تھا۔ انہوں نے بات کا سرا وہیں سے جوڑا۔

"تمہاری بیوی ماں بننے والی ہے۔ بہتر ہے کہ تمہارے بیچ جو بھی معاملات بگڑ گئے ہیں انہیں درست کرلو اور اسے گھر لے آؤ۔" یہ اطلاع نہیں دھماکا تھا۔ سائر کے کان سنسنانے لگے۔ اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

وہ سنجیدہ مگر مطمئن سے بیٹھے تھے گویا اب سب ٹھیک ہونے والا ہو۔

مگر نہیں۔ کہیں کچھ بہت غلط ہو گیا تھا۔ اور غلطیوں کو بہر حال سدھارنا تو پڑتا ہی ہے۔

"ٹھیک ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔" وہ عجلت میں کہتا ہوا اضطراری انداز میں کمرہ عبور کر گیا۔ وقار نے اک پدرانہ شفقت بھری مسکراہٹ سے اس کا بے قرار انداز دیکھا۔ اور سر جھٹک کر پھر سے کتاب اٹھالی۔

انہیں محسوس ہوا تھا کہ اب تو سب ٹھیک ہی ہونا ہے۔ اب تو سب ٹھیک ہی ہوگا۔!

☼ ☼ ☼

"اب بتا بھی دیجیے یومی آنٹی! آخر ایسی کیا بات ہوگئی جو آپ اتنی پرجوش ہو رہی ہیں۔" چندا نے بے چینی سے دریافت کیا۔

"بتاتی ہوں۔ بتاتی ہوں۔ آخر اتنی جلدی بھی کیا ہے۔" بشیرن ٹیبل پر چائے سرو کر رہی تھی۔ شام کا ٹھنڈا وقت تھا۔ یومی آنٹی نے سہ پہر ہی چندا کو فون کر کے شام میں اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی۔ چندا تب ہی سے خاصی مضطرب اور بے تاب تھی۔

"ہاں تو اب سنو۔" یومی آنٹی نے بشیرن کے جانے کے بعد چپس اٹھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "چوہدری صاحب تمہیں اپنی فلم کی ہیروئن بنانے پر تیار ہوگئے ہیں۔"

"کیا!" چندا کی چیخ بڑی بے ساختہ تھی۔ "آپ سچ کہہ رہی ہیں نا۔" اندرونی جوش و مسرت سے اس کا حسین چہرہ گلنار ہو گیا۔

"لو مجھے جھوٹ بولنا ہوتا تو گلبرگ سے یہاں تک کا سفر طے کر کے آتی۔ میں نے کہا تھا نا چندا ڈیئر! اپنی قسمت خود بنانی پڑتی ہے اور پھر ہم جس کا ساتھ دینے کی ٹھان لیں اسے منزل پر پہنچا کر ہی دم لیتے ہیں۔" وہ شانِ بے نیازی سے بولیں۔

"مان گئے آپ کو۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا۔" وہ جذباتی ہو کر بولی۔

"ارے بھئی، یقین کر بھی لو۔" آنٹی ہنستے ہوئے بولیں۔ "بس اب سمجھو سارے ہی معاملات تیزی سے آگے بڑھیں گے۔ ایسا کرو کہ کل شام چوہدری صاحب کے گھر چل کر اپنا رول وغیرہ پڑھ کر کانٹریکٹ سائن کرلو۔ فلم سے متعلق کچھ ڈسکشنز بھی وہیں کرلیں گے ہیں کیوں کیا خیال ہے؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں جیسا آپ کہیں۔" اس پر تو

گویا شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری تھی۔

"ہاں بس تو پھر ٹھیک ہے۔ سچ چندا! تم بڑی خوش قسمت ہو۔" انہوں نے اس کے اندر ہوا بھری۔ چندا نے کرن انگڑائی۔

"واقعی چوہدری صاحب کافی پروفیشنل بندے ہیں۔ میں تو ان کی قائل ہو گئی۔" چندا داد دینے والے انداز میں بولی۔

"ہاں نا۔" آنٹی نے تائیداً کہا۔ "اب دیکھو نا ان کی جگہ کوئی اور بندہ ہوتا تو خواہ مخواہ الٹی سیدھی شرائط رکھتا۔ انہوں نے تو سیدھا سادا پیغام بھجوایا ہے تمہیں۔" انہوں نے چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے توتے کی طرح آنکھیں پھیریں۔

"پیغام! کیسا پیغام؟" چندا نے مسکراتے ہوئے یونہی پوچھا۔

"بھئی۔" وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ "صاف اور سیدھی بات ہے اتنا تو تم جانتی ہی ہو کہ اس فیلڈ میں کچھ لو اور دو کا اصول چلتا ہے۔ اب اگر وہ تمہیں اتنا بڑا چانس یونہی دے رہے ہیں تو ان کے جذبات کا خیال کرنا تمہارا فرض بنتا ہے۔" وہ کچھ مبہم سے انداز میں بول رہی تھیں۔ چندا کو الجھن ہونے لگی۔

"آپ صاف صاف بات کہیے۔" اس نے ٹوکا۔

"صاف بات تو یہ ہے کہ چوہدری صاحب تم سے شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔" وہ تو یوں بولیں گویا یہ کوئی از حد معمولی بات ہو مگر چندا کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

"کیا مطلب؟" وہ تحیر سے لہجے میں بے ساختہ بولی۔

"مطلب کیا پوچھ رہی ہو۔ بھئی! سیدھی سی بات ہے وہ تم سے شادی کرنے کی صورت ہی میں تمہیں اپنی فلم کی ہیروئن کاسٹ کریں گے۔" انہوں نے بغیر لاگ لپیٹ کے کہہ دیا۔

"کیا بکواس کر رہے ہیں وہ۔ میں شادی شدہ ہوں۔ ایسا کیسے ممکن ہے۔" وہ آتش فشاں بن گئی۔

"مگر ان سے تو تم کالج گرل کی حیثیت سے ملی ہو نا بابا؟" یوں آنٹی نے اکسا کر اسے یاد دلایا۔

"مگر وہ تو آپ ہی نے کہا تھا اس لیے میں نے ایسا کہا۔" اس نے بھی بلا وہاں کروائی۔ مگر یوں نے پڑا سے نکا سا قہقہہ لگا کر کہا۔

"تو کیا بتاتی کہ تم شادی شدہ اور ایک بچے کی ماں ہو۔ انہوں نے تو یہ سن کر تمہیں قریب بھی پھٹکنے نہ دینا تھا۔ لاکھوں روپے پہلی ہوئی شے پر لگا کر انہیں اپنا سرمایہ ڈبونا ہے کیا؟ بی بی! تم کس جہاں میں ہو یہ مایا نگری ہے یہاں سچ کی کوئی قیمت نہیں۔ جھوٹ کا سکہ چلتا ہے انہوں نے صاف کہا ہے تم سے شادی کرنے کی صورت ہی میں وہ تمہیں اپنی فلم میں لیں گے ورنہ نہیں۔" وہ کاٹ دار لہجے میں بولتی چلی گئیں۔

"مگر آپ تو کہہ رہی تھیں کہ ان کی کوئی شرط نہیں پھر یہ کیا ہے۔" وہ بگڑ کر بولی۔

"اسے شرط نہیں ڈیل کہتے ہیں۔ تم چاہو تو بنا شادی کے بھی ان کے ساتھ۔" مگر ان کی بات ادھوری رہ گئی۔

"کیا بکواس کر رہی ہیں آپ یوں آنٹی۔" وہ بپھر گئی۔ "مجھے ہیروئن بننا ہے فاحشہ نہیں۔"

"زیادہ پارسا بننے کی ضرورت نہیں۔ تم اتنی ہی تو بھولی ہو نا! ارے بی بی! جب اپنے حسن کی نمائش لگاؤ گی تو خریدار بھی آئیں گے اور لٹیرے بھی۔ یہ تو ان کی شرافت ہے کہ وہ لوٹنے پہ یقین نہیں رکھتے۔ اور بالفرض تمہیں وہ یا کوئی اور کسی بھی شرط اور مطالبے کے بنا کام دے بھی دے تو تب تم اپنے اس دقیانوسی اور احمق شوہر کا کیا کرو گی؟ وہ تمہیں چپکے اتنی ہی آسانی سے یہ کام کرنے دے گا نا۔ چندا جان! خواب دیکھنے اور انہیں حقیقت بنانے میں آسمان سے زمین تک کا سفر کرنا پڑتا ہے یہ نخرے مارکیٹ میں نہیں چلیں گے۔" وہ استہزائیہ کہتے کہتے آخر میں ناراضی سے بولیں۔

"کیا کوئی اور صورت نہیں یوں آنٹی؟" وہ حقائق کی روشنی میں کچھ دھیمی ہو کر بولی۔

"ہے نا۔ گھر بیٹھ کر اپنا بچہ پالو۔" وہ طنزیہ بولیں۔ "میں تو اب چلوں گی۔ دیکھو چندا! تمہاری دوستی کے چکر میں، میں نے تمہیں چوہدری سے متعارف کروایا

تھا ورنہ تو یہاں نہ حسن کی کمی ہے نہ ٹیلنٹ کی اور جو لڑکیاں مارکیٹ میں نکلتی ہیں وہ اتنی شرائط اور پابندیوں کے ساتھ آگے نہیں بڑھ پاتیں میں نے تمہیں سمجھا دیا باقی تمہاری مرضی۔ تمہارا جو فیصلہ ہو مجھے وہ تین دن میں سوچ کر بتا دو فون پر۔ میں اب یہاں نہیں آؤں گی۔ مجھے اور بھی بہت سے کام ہیں۔"

وہ نخوت سے کہہ کر اٹھیں اور اپنا گولڈن پرس بغل میں داب کر چل دیں۔ اسے خدا حافظ بھی نہیں کہا۔ چندا نے بے ساختہ آنسو بہانے شروع کر دیے تھے۔

"میری تو قسمت ہی پھوٹی ہوئی ہے۔ کیا ہے جو وہ کم بخت چوہدری بغیر اس واہیات شرط کے مجھے فلم میں لے لے۔" اس نے سسکتے ہوئے سوچا۔

"اور کیا ہے اگر تم اس کی بات مان جاؤ۔" دل نے چپکے سے کہا۔

چندا رونا دھونا بھول کر یک دم خاموش ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"کیا سوچ رہی ہو؟" میرب چھت پر رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھی کافی دیر سے ایک ہی زاویے پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ ڈھلتی سہ پہر کا سمے تھا۔ ماریہ اور وہ چائے لے کر چھت پر آ گئی تھیں۔

"ہوں؟" وہ چونکی پھر اس کی جانب دیکھا "کچھ نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلا کر چائے کا کپ اٹھایا۔

"ساحر بھائی کے متعلق سوچ رہی ہو نا۔" ماریہ پر یقین لہجے میں بولی۔

"تو اور کیا سوچوں۔" وہ الٹا اس سے پوچھنے لگی۔

"ویسے تو سوچنے کو بہت کچھ ہے جیسا کہ" وہ سوچتی ہوئی بولی "میرے سسرال والوں کی آمد پر مینو کیا ہو؟ میرے برائیڈل ڈریسز کس رنگ کے ہوں۔ تم میری شادی پر کیا پہنو گی۔ وغیرہ وغیرہ" وہ اسے جتا کر داد طلب نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

"نہیں ماریہ۔ میرا دل کہیں بھی نہیں لگ رہا۔ تم نہیں جانتیں میں کس ذہنی اذیت سے دوچار ہوں۔"

وہ بے چارگی سے بولی۔

"اگر تم یہ باتیں ہی سوچتی رہو گی تو ذہنی اذیت ہی میں رہو گی۔ یار! اپنے آپ کو نکالو اس جمود سے جو تم پر طاری ہے۔"

"میں نے کتنا چاہا تھا کہ میرے اس نئے نئے رشتے کا تماشا نہ بنے مگر بن گیا۔" وہ اداسی سے بولی۔

"تماشا کس نے بنایا ہے میرب۔" وہ برا مان گئی۔

"خدانخواستہ ہم تماشائی تو نہیں۔ ہم تو تمہارا معاملہ حل کرنے کی مخلصانہ کوشش کر رہے ہیں۔"

"مجھے تم سب کے اخلاص اور کوششوں پر چنداں شک نہیں ماریہ۔ مگر میں جانتی ہوں تمہاری یہ کوشش رائیگاں ثابت ہوگی۔" وہ مایوس لہجے میں بولی۔

"کیوں اتنی مایوسانہ باتیں کر رہی ہو میرب۔ اللہ پر بھروسا رکھو۔ وہ کوئی نہ کوئی بہتری کی صورت نکال دے گا ان شاء اللہ۔" اس نے تسلی آمیز لہجہ اختیار کیا۔

"پھر اب تو یہ صرف تمہارا معاملہ نہیں ان کی اولاد کا بھی معاملہ ہے۔ ہو سکتا ہے یہ نیا موڑ تمہاری زندگی میں خوشی اور مثبت تبدیلی لے آئے۔"

تب ہی ملازمہ نے آ کر نیچے وقار صاحب کی آمد کی اطلاع دی۔ میرب کے اعصاب کشیدہ ہو گئے۔

"چلو۔ دیکھتے ہیں انکل کیوں آئے ہیں۔" ماریہ بھی تشویش سے بولی۔

پھر وہ دونوں ڈرائنگ روم میں چلی آئیں جہاں سعدیہ پہلے ہی موجود تھیں اور غالباً وقار کو صورت حال سے آگاہ کر چکی تھیں ان کے سنجیدہ اور گہری سوچ میں ڈوبے چہرے کو دیکھ کر تو یہی لگا۔ ماریہ اور میرب انہیں سلام کر کے بیٹھ گئیں۔

"بیٹا یہاں آؤ میرے پاس بیٹھو۔" وقار نے اسے پیار سے اپنے پاس بلایا۔ وہ اٹھ کر ان کے نزدیک بیٹھ گئی۔ چند ثانیے کے لیے ڈرائنگ روم میں خاموشی چھا گئی۔ تب ہی سعدیہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور انہوں نے ماریہ کو بھی پکارا۔

"آؤ بیٹا ماریہ ذرا میرے ساتھ کچن میں۔" پھر وہ میرب سے مخاطب ہوئیں "جب تک تم انکل سے باتیں کرو ہم ابھی آتے ہیں۔" ان کی نگاہوں میں

حوصلہ افزائی تھی۔

"تمہارا بیٹا ہم سے ناراض ہے؟" گفتگو کی ابتدا وقار ہی نے کی۔

"نہیں تو بابا۔ میں آپ سے بالکل ناراض نہیں ہوں۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ سے بولی۔

"ہوں۔ سائر سے ہو۔" وہ خاموش رہی۔

"گویا ہو۔" وہ جیسے سمجھ کر سرہلانے لگے۔ "دیکھو بیٹا۔" پھر انہوں نے محتاط لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"سائر کے لیے میں نے تمہارا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ تم نہایت سلجھی ہوئی' تعلیم یافتہ اور بہت پیاری بچی ہو اس کے علاوہ تم بھی سائر کی طرح بچپن ہی میں اپنی والدہ کے سائے سے محروم ہوگئی تھیں تو تمہیں شاید بہتر اندازہ ہو کہ اک بن ماں کے بچے کی شخصیت میں کجی رہ ہی جاتی ہے۔ وہ بہت سے نفسیاتی مسائل کا شکار ہوجاتا ہے۔ بیٹا!" وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوگئے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ لفظوں کا استعمال نہایت احتیاط اور سوچ سمجھ کر کررہے ہوں۔

"سائر بھی کچھ مسائل کا شکار رہا ہے مگر میرا خیال تھا کہ تمہارا پیار و محبت اور توجہ اس کے اندر کا یہ خلا پُر کردے گی مگر شاید اس کے من میں اتنی زیادہ گہرائی ہے کہ تمہاری رسائی فی الحال وہاں تک ممکن نہیں ہوسکی۔"

وہ یکدم چپ ہوگئے۔ تب غور سے اس کی بات سنتی ہوئی میرب نے ان سے پوچھا۔

"بابا! مجھے سچ بتایئے گا کہ کیا سائر کہیں انوالو تھے؟"

"کیا مطلب؟" وقار بری طرح چونک اٹھے۔

"میرا مطلب ہے کہ۔" میرب جھجکی۔ "کیا ان کی زندگی میں کوئی لڑکی تھی پہلے۔"

"ہرگز نہیں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" وقار قطعیت سے بولے۔ "مگر تمہیں ایسا کیوں لگا۔؟" انہوں نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"مجھے۔" وہ جھجکی "مجھے لگا شاید وہ کسی کی بے وفائی کا بدلہ مجھ سے لے رہے ہیں۔" وہ تصویر والی بات گول کر گئی۔ ان کا انداز ہی اتنا قطعی تھا۔

"بے وفائی؟" وقار نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "بچے! بے وفائی صرف محبوب یا محبوبہ ہی تو نہیں کرتے۔" ان کا لہجہ گہرا اور یاسیت آمیز تھا۔ "تم اس کی طرف سے جی میلا مت کرو۔ بہت پیارا بچہ ہے میرا سائر۔ تم جیسی اچھی لڑکی اگر اس کا ساتھ دے گی تو بہت جلد وہ اعتبار کرنا سیکھ لے گا' وہ صرف بے اعتبار ہے اور کچھ نہیں۔"

"بابا' میں ہر طرح سے تعاون کرنے کے لیے تیار ہوں مگر۔ تعاون تو باہمی طور پر ہوتا ہے۔ یک طرفہ نہیں۔ یک طرفہ تو محض احسان ہی ہوا کرتا ہے۔"

"تمہیں احسان ہی کرنا ہوگا بیٹی! کیا تم نہیں جانتیں' احسان کا بدلہ بھی احسان ہی ہوتا ہے۔" انہوں نے اس کا سر تھپکا۔ میرب دھیرے سے مسکرادی۔

"ابھی کیا' جب تک چاہو یہاں رہو۔ ان شاءاللہ وہ خود تمہیں لینے آئے گا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں میرا بیٹا اتنا برا نہیں۔"

تب ہی سعدیہ اور ماریہ کے ساتھ ٹرالی گھسیٹتی ملازمہ آتی دکھائی دی۔ میرب کے لبوں پر نسبتاً مطمئن مسکراہٹ سجی تھی۔ ماریہ نے بھی سکون سا محسوس کیا۔

"پھر کب آرہے ہیں ہماری بیٹی کے سسرال والے تاریخ لینے۔" وقار نے موضوع بدلا تو سب اب اس موضوع پر گفتگو کرنے لگے۔ ماریہ شرمگیں مسکراہٹ سمیت بڑی دلکش لگ رہی تھی۔ میرب اسے دیکھ کر کھل کر مسکرادی۔

☼ ☼ ☼

پچھلے دو گھنٹوں سے وہ فل اسپیڈ سے گاڑی مختلف سڑکوں پر دوڑا رہا تھا۔ پتا نہیں وہ کس سے بھاگنا چاہتا تھا۔ زہریلی سوچیں تھیں کہ اس کا دامن یوں پکڑے ہوئے تھیں گویا چھوٹ جانے کا خدشہ ہو۔

تھپڑ۔ دھکے۔ جھڑکیاں۔

ہاں یہی سب تو ہے میرے بچپن کی سوغات۔ مگر

میں اسے کسی اور کا نصیب نہیں بننے دوں گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے اس کی جان ہی کیوں نہ لینی پڑے۔" اس نے مصمم ارادہ کیا۔ رات کا اندھیرا کچھ اور بڑھ گیا تھا گاڑی ہوا سے باتیں کررہی تھی اور سائر خود سے۔

☆ ☆ ☆

"پوپی آنٹی ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں۔ بھلا اس جیسا بیک ورڈ انسان مجھے بخوشی اجازت کیوں دینے لگا اس کام کی۔ اچھا ہے نا' بعد میں بھی تو یہی سب ہونا ہے تو ابھی ہی کیوں نہ ہو؟" چندا نتیجے پر پہنچ چکی تھی۔ سارا مسئلہ جمیل سے بات کرنے کا تھا اور آج کل وہ اسی ادھیڑبن میں تھی۔ پوپی آنٹی کو پہلے ہی فون کرکے وہ اپنی رضامندی دے چکی تھی جس پر انہوں نے اسے ازحد شاباشی سے نواز کر بے پناہ مسرت کا اظہار کیا تھا۔ مگر سارا مسئلہ یہ ہی تھا کہ وہ جمیل سے کہے کیسے مگر بہرحال اسے ہمت تو کرنی تھی سو اس نے کمر کس ہی لی۔ وہ آج کل مختلف فائلیں پھیلائے نجانے کیا کرتا رہتا تھا۔ اس وقت بھی ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا کسی نیلی فائل میں منہمک تھا تب ہی چندا اس کے نزدیک آکر کھڑی ہوگئی۔

"سنو! مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔" سچی بات تو یہ ہے کہ وہ اس وقت بے طرح گھبراہٹ کا شکار تھی۔ ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ رہے تھے۔

"بولو جان! سن رہا ہوں۔"

"مجھے تم سے طلاق چاہیے۔" اس نے تھوک نگلتے ہوئے بالآخر جلدی سے کہہ دیا۔

جمیل نے حیرانی سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "کیا چاہیے؟" ویسے تو اسے ہمیشہ کچھ نہ کچھ چاہیے ہی ہوتا تھا تب ہی وہ اس کے پاس آتی تھی مگر اس وقت "کیا" چاہیے۔ وہ سمجھ نہیں سکا۔

"مجھے تمہارے ساتھ نہیں رہنا۔ مجھے طلاق چاہیے۔" اس نے "طلاق" پر زور دے کر کہا۔ جمیل بے ساختہ زور سے ہنس دیا۔ اس کے ہنسنے پر وہ جزبز ہوگئی۔

"میں مذاق نہیں کررہی۔" وہ تپ کر بولی۔

"او ہو۔ بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ کر بات کرو۔" وہ محظوظ ہورہا تھا۔

"قسم سے یار میں اتنا میچور شخص اور تم۔ ایمان سے تم بالکل بچوں جیسی حرکتیں کرتی ہو۔" وہ ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹ کر اپنے نزدیک بٹھاتے ہوئے بولا۔ وہ تلملا گئی۔

"جمیل! میں سنجیدہ ہوں۔"

"ہاں وہ تو دکھ ہی رہی ہو' مگر ہو کیوں... اب کیا غلطی کر بیٹھا ہوں۔ میں اچھا ہاں یاد آیا تمہارا ہنی مون ڈیو ہے مجھ پر پچ پچ... ویسے ٹھیک ہی ناراض ہو تم حق ہے تمہارا کتنے سال ہوگئے۔ مگر میں اپنا وعدہ پورا نہ کرسکا۔ بس جان نیا نیا اس کام میں ہاتھ ڈالا ہے۔ کام مکمل توجہ مانگ رہا ہے بس اسی لیے تم سے غافل ہوگیا مگر پکا وعدہ اب بالکل بھی نہیں۔ اگلے ہفتے کام کے چکر میں مجھے ملائیشیا جانا ہے۔ چلو تم بھی... اب ٹھیک۔" وہ اسے پچکارتے ہوئے بولا۔

"لعنت بھیجتی ہوں میں تم پر اور تمہارے جھوٹے وعدوں پر۔ بس میں نے کہہ دیا مجھے طلاق چاہیے۔" وہ ہٹ دھرمی سے بولی تو وہ بھی یکلخت سنجیدہ ہوگیا۔

"چندا! اتنا بچپنا اچھی بات نہیں۔ میں اگر تمہارے جاہلانہ مطالبے کو ہنس کر ٹال رہا ہوں تو میری نرمی سے ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ۔" وہ بولا۔ ساری فائلیں اس نے پرے کھسکا دی تھیں۔ چندا بھی ہاتھ چھڑا کر ایک مرتبہ پھر کھڑی ہوگئی۔

"میں بچی نہیں ہوں۔ پورے ہوش و حواس میں یہ بات کررہی ہوں۔ یہ مطالبہ کرنا میرا حق ہے۔" وہ چلائی۔

"آہستہ بولو جاہل عورت... سونو سن لے گا تمہیں اس کا کچھ خیال ہے کہ نہیں۔" وہ بھی ضبط کرتے کرتے چیخ گیا۔

"مجھے کسی کی پروا نہیں... تم لوگوں کو جب میرا احساس نہیں تو میں کیوں خیال کروں۔"

"دیکھو! تم حد سے بڑھ رہی ہو..." وہ انگلی اٹھا کر

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

قرۃ العین خرم ہاشمی

# من رنگی

"تمام اہلِ ذوق، غم زدہ اور افسردہ دل والے دوست واحباب سے مودبانہ گزارش ہے کہ کل سے دسمبر کا مہینہ شروع ہونے والا ہے۔ براہ مہربانی اپنے جذبات و احساسات کے ریلے میں بہہ کر دسمبر کو ستمگر بنا کر پیش مت کیجیے گا اور اگر ایسا کرنا بھی ہو تو مجھے ٹیگ کرنے سے گریز کیجیے گا۔ دوسری صورت میں آپ کو اپنی فرینڈ لسٹ سے غائب کرنے میں ایک منٹ بھی نہیں لگاؤں گی۔"

زویا نے فیس بک پہ اسٹیٹس لگا کر لیپ ٹاپ بند کیا اور ہینڈ فری کانوں میں لگا کر مزے سے گانے سننے لگی۔ کچھ دیر کے بعد مینا نے اسے زور سے ہلایا تھا۔ مینا اس سے ایک سال چھوٹی تھی اور بی اے فائنل ایئر کی طالبہ تھی جبکہ زویا یونیورسٹی کے پہلے سال میں تھی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" زویا نے بڑے ہونے کا رعب جمانا چاہا مگر وہ بھی مینا تھی۔ جسے زویا کے مزاج کو درست کرنا آتا تھا۔

"یہ ہی میں تم سے پوچھنے آئی ہوں کہ یہ کیا بدتمیزی ہے؟" مینا نے آئی پیڈ اس کے سامنے کیا۔

"ہاں تو میں نے کب کسی کو منع کیا ہے اپنی پسند کا اظہار کرنے سے مگر خدارا دوسروں کو اس سے دور ہی رکھا کریں۔" زویا نے چڑ کر کہا تھا۔

"تمہیں پتا ہے تمہاری اس فضول حرکت کے بعد میری کتنی دوستوں نے برا منایا ہے۔ بہت سے لوگوں نے تو اعتراض کیا ہے کہ تمہیں اردو شاعری کے گروپ سے نکال دیا جائے۔"

مینا نے اپنے غصے کی اصل وجہ بتاتے ہوئے کہا تھا۔

"میں اردو شاعری کے خلاف نہیں ہوں۔ مجھے صرف دسمبر پہ کی جانے والی المیہ شاعری۔ پوسٹ کرنے پہ شدید اعتراض ہے۔" زویا نے منہ بنا کر کہا تھا۔

"تمہیں تکلیف کیا ہے؟ اتنے بڑے بڑے شاعروں نے دسمبر پہ شاعری کی ہے، نظمیں لکھی ہیں۔" مینا نے اسے یاد دلایا۔

"ارے بھائی! اگر ہمارے بڑوں نے دسمبر کو غم و الم کی داستان بنا دیا ہے تو کم از کم اب اس کی جان تو مت لو۔ بات یہ ہے کہ صرف اسی مہینے کو کیوں تختۂ مشق بنایا جاتا ہے۔ اداسی، خوشی ہمارے اندر کے موسم ہیں پھر انہیں صرف ایک مہینے سے ہی کیوں منسوب کر دیا جاتا ہے۔" زویا نے سنجیدگی سے اپنا نقطہ نظر بیان کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"زویا کہاں ہو؟" صالحہ بیگم نے چادر اوڑھتے ہوئے آواز لگائی۔

"جی امی!" زویا نے اپنے کمرے سے نکلتے ہوئے سوالیہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھا تھا۔ جو کہیں جانے کے لیے بالکل تیار کھڑی تھیں۔

"میں عابدہ باجی کے گھر درس پہ جا رہی ہوں۔ گھر کا خیال رکھنا۔ اماں کو وقت پہ چائے اور اس کے ساتھ انڈہ ابال کر دے دینا اور ان کا خیال رکھنا۔ سردی بڑھتے ہی ان کی طبیعت بھی خراب ہونے لگتی ہے۔ مینا آئے گی تو گرم گرم روٹی بنا دینا اسے۔ سالن بنا دیا ہے میں نے۔"

صالحہ نے جلدی جلدی اسے مختلف ہدایات دی

تھیں۔ بینا کالج گئی ہوئی تھی۔

رویا نے ماں کی بات سن کر فرماں برداری سے سر ہلایا تھا۔ اور ان کے جانے کے بعد دروازہ بند کر کے دادی اماں کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ فی الحال کرنے کے لیے کوئی کام نہیں تھا۔ جب تک صالحہ واپس آتیں بینا اور وقار صاحب کے آنے کا وقت بھی ہو جانا تھا۔ رویا کے والد وقار کا اپنا کاروبار تھا۔ اچھا خاصا خوشحال گھرانہ تھا ان کا۔ کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ گھر میں پیسہ بھی تھا اور رشتوں میں محبت، اتفاق اور ایک دوسرے کا احترام بھی شامل تھا۔ اسی لیے تو یہ گھر سکون کا گہوارہ تھا۔

"اچھا ہوا رویا کہ تم آ گئیں۔ مجھے بہت سردی لگ رہی ہے۔ ہیٹر تیز کر دو اور میرے بیڈ کے تھوڑا قریب بھی۔" دادی اماں جو پہلے ہی اچھی طرح گرم کپڑوں



میں ملبوس تھیں کانپتے ہوئے کہنے لگیں۔
"دادی اماں! آپ نے اتنا کچھ تو پہلے ہی اپنے اوپر لیا ہوا ہے۔ پھر بھی سردی سے کانپ رہی ہیں۔ مجھے دیکھیں ایک شال اور سوئیٹر میں پھر رہی ہوں۔" زویا نے ہیٹر تیز کر کے ان کے بیڈ کے پاس کرتے ہوئے کہا تو دادی اماں دھیرے سے مسکرا دیں۔
"بیٹا! جب میں بھی تمہاری عمر کی تھی تو اسی طرح سردی کی پروا نہ کرتے ہوئے سردی کے مزے لیتی تھی مگر اب بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم خم نہیں رہا ہے کہ موسم کی سختی کو برداشت کر سکیں۔ آخری وقت اور عمر میں احساس ہوتا ہے کہ جوانی کتنی کار آمد اور نعمت ہوتی ہے۔ اپنے ہاتھ پاؤں کی تندرستی' اعضاء کا درست اور بروقت کام کرنا' اس کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔ چاہے آپ کی خدمت کرنے پہ دس لوگ بھی مامور ہوں۔"
دادی اماں کی کپکپی بند ہوئی تو وہ سکون سے گویا ہوئیں۔
"اس کا مطلب یہ ہوا کہ امی ٹھیک طرح سے آپ کا خیال نہیں رکھتی ہیں۔ اسی لیے آپ اپنی جوانی کے وقت کو اتنی حسرت سے یاد کر رہی ہیں۔" زویا نے ان کی رضائی میں گھستے ہوئے شرارتاً کہا تھا۔ دادی اماں ہنس پڑیں۔
"میری بہو تو لاکھوں میں ایک ہے۔ میرا اتنا خیال رکھتی ہے۔"
دادی اماں نے زویا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جو گرمائش کے مزے لیتے ہوئے نیند کی وادی میں اترنے والی تھی۔
اسی وقت کالج سے تھکی ہاری مینا سلام کرتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ آٹومیٹک لاک کی ایک ایک ڈپلیکیٹ چابی سب کے پاس تھی تاکہ خود دروازہ کھول کر اندر آسکیں اور انتظار کی زحمت سے بچیں۔
"آگئی میری بچی!" دادی اماں نے محبت سے کہتے ہوئے اس کا ماتھا چوما۔ وہ کالج سے آتے ہی دعائیں لینے دادی اماں کے پاس ضرور آتی تھی۔ زویا پوری طرح رضائی میں چھپی ہوئی تھی اس لیے مینا کی نظر اس پہ نہیں پڑی تھی۔
"دادی اماں! میری طرف سے بھی اس کا ماتھا چوم لیں۔ آج مجھے بھی اپنی بہن پہ بہت پیار آرہا ہے۔" زویا نے بہت دھیمی آواز میں رضائی میں سے سر نکال کر کہا۔
"وہ بھلا کس خوشی میں؟" مینا نے مشکوک لہجے میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"وہ اس لیے کہ ابھی تم فریش ہو کے میرے اور اپنے لیے روٹی بناؤ گی اور سالن گرم کر کے ٹرے میں سلیقے سے سب رکھ کر میرے پاس لے کر آؤ گی اور ہم دونوں مزے مزے سے کھائیں گے۔" زویا نے مطلب کی بات کی طرف آتے ہوئے کہا۔ دادی اماں کھانا جلدی کھا لیتی تھیں۔ زویا اور مینا ایک ساتھ کھانا کھاتی تھیں۔
"جی نہیں! میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ شرافت سے اٹھو اور روٹی بناؤ' تب تک میں یونیفارم تبدیل کر لوں۔" مینا نے نولفٹ کا بورڈ دکھایا۔
"میری اچھی بہن ہو ناں! پیاری والی! میں اتنے مزے سے گرم رضائی میں لیٹی ہوئی ہوں کہ اب دل ہی نہیں کر رہا۔ اٹھنے کو۔" زویا نے منت کی تو مینا منہ بنا کر وہاں سے اٹھی تھی۔ وہ دروازے تک پہنچی تھی جب پیچھے سے زویا کی آواز آئی۔
"اور ہاں امی کہہ گئی تھیں کہ مینا سے کہنا کہ دادی اماں کو چائے کے ساتھ انڈہ ابال کر ضرور دے۔ میں نے سوچا کچن میں تو جا ہی رہی ہو تم.... یاد کروا دوں۔"
"بہت مہربانی' بائی داوے یہ امی سارے کام مجھے کرنے کے لیے ہی کیوں کہہ کر گئی تھیں؟" مینا نے اسے گھورتے ہوئے کہا جو رضائی میں منہ چھپا گئی تھی۔
"بری بات ہے زویا! بہن تھکی ہوئی آئی تھی۔" مینا کے جانے کے بعد دادی اماں نے نرمی سے کہا۔
"کوئی بات نہیں دادی اماں! رات کو اس کے حصے

کے سب کام میں کردوں گی۔ آپ تسلی رکھیں۔"
زویا نے کہا تو دادی اماں سر ہلا کر رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

"یہ نہیں ہو سکتا" زویا کی چیخ واضح تھی۔ کل کے ٹیسٹ کی تیاری کرتی مینا نے سر گھما کر بیڈ پہ لیپ ٹاپ لیے بیٹھی پہلے زویا کی طرف پھر آگے ہو کر اسکرین کی طرف دیکھا اور کچھ دیر بعد اس کی کھلکھلاتی ہنسی سارے کمرے میں گونج رہی تھی۔

"یہ سچ میں فصیح ہی ہیں ناں؟ کہیں میری آنکھیں دھوکا تو نہیں کھا رہیں؟ فصیح ایسے لگتے تو نہیں تھے۔"
زویا حیران نظروں سے فصیح کی آئی۔ ڈی کو دیکھ رہی تھی۔ مینا کے لیے اپنی ہنسی کو روکنا مشکل ہو رہا تھا۔

"کیسے نہیں لگتے تھے فصیح بھائی؟" مینا نے اسے چھیڑا تھا۔ جس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ "بات صرف اتنی سی ہے میری پیاری اور بے وقوف سی بہن! تمہیں دسمبر کے مارے اور عاشقان دسمبر کی آہ لگی ہے۔ اب کرو بلاک فصیح بھائی کو۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں تم اپنے دعووں میں کہاں تک سچی ہو۔"
مینا نے مزے لیتے ہوئے کہا تھا۔

جبکہ زویا نے جلدی سے اپنے اس بیان (اسٹیٹس) کو ڈیلیٹ کیا تھا جس نے کافی لوگوں کو اس سے ناراض کر دیا تھا۔

"شکر ہے فصیح نے ابھی یہ پوسٹ نہیں دیکھی تھی۔ جو میں نے دسمبر کے لیے لگائی تھی!" زویا نے سکون کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"ویسے کتنی عجیب بات ہے امریکا میں رہ کر میڈیکل کی تعلیم حاصل کرتے ہوئے شوق اور پسند ایسی جیسے زمانہ کے سب دکھ انہیں ہی ملے ہوں!" زویا منہ بناتے ہوئے فصیح کی پوسٹ کی ہوئی شاعری بغیر پڑھے لائک کرتی جا رہی تھی۔ مزے کی بات یہ تھی کہ سارے شعر دسمبر کی مناسبت سے ہی تھے۔

"کیوں کیا ڈاکٹرز کے پاس دل نہیں ہوتا ہے؟ کیا وہ نرم احساسات نہیں رکھتے ہیں؟ میرے خیال سے تو جو انسانی اعضاء کی اہمیت سے واقف ہوتے ہیں وہ انسانی جذبات کی قدر بھی اسی طرح کرتے ہیں۔ بس فرق صرف اتنا ہے کہ انداز اور طریقہ اپنا اپنا ہوتا ہے۔"
مینا نے اپنے نوٹس کو سنبھالتے ہوئے کہا تھا۔

"ایک تم اور تمہارے فلسفے! اوپر سے سرد اور دھند میں لپٹا ہوا دسمبر! جسے جتنا بھی رومانٹک بنانے کی کوشش کرتی ہوں اتنا ہی بور اور سنجیدہ ہوتا جاتا ہے۔"

"کیا سچ میں دسمبر اداس مہینہ ہے!" زویا نے سوچتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"کسی اور کا تو پتا نہیں مگر ہماری قوم کو دسمبر راس نہیں آتا ہے شاید!"
مینا نے اداسی سے کیلنڈر پہ 16 دسمبر کے گرد دائرہ کھینچتے ہوئے کہا تھا۔ دکھ ایسا تھا کہ زویا بھی چپ کی چپ رہ گئی۔

کچھ دکھ ایسے ہوتے ہیں جن کے اظہار کے لیے لفظ نہیں بنے۔ ان کے لیے صرف آنسو ہوتے ہیں۔ بے تحاشا اور شفاف آنسو۔ جیسے کسی تازہ قبر پہ سرخ پھولوں کی پتیوں پہ شبنم کے شفاف قطرے ٹھہرے ہوں۔

☼ ☼ ☼

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ایسا کیسے ممکن ہے؟" صالحہ نے پریشان ہو کر اپنے شوہر وقار کی طرف دیکھا تھا۔ جو خود بھی گہری سوچ اور الجھن کا شکار نظر آتے تھے۔

"بات یہ ہے صالحہ بیگم کہ!" اسی وقت زویا چائے کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی تو وہ چپ ہو گئے۔ زویا کو ماں باپ کے چہرے پہ لکھی پریشانی صاف نظر آ رہی تھی۔ جو اسے دیکھتے ہی چپ ہو گئے تھے۔ زویا نے چائے کے کپ دونوں کے آگے رکھے اور اسی خاموشی سے باہر نکل گئی۔

مگر اس کے دل کو بے چینی لگ گئی تھی۔ جیسے بات اسی سے متعلق تھی۔ کچھ تو ہے، جو اس سے چھپایا جا رہا تھا۔ وہ اپنا دھیان بٹانے کے لیے دادی اماں کے کمرے

کی طرف چل پڑی۔ کمرے میں داخل ہوئی تو ہینا' دادی اماں کو وضو کروا کر فارغ ہوئی تھی۔ دادی اماں نماز شروع کر چکی تھیں۔

"میں ابھی آئی ہوں!" ہینا نے آہستگی سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

"کیا بات ہے' آج میری کوئل کوک نہیں رہی! بڑی خاموشی ہے ہر طرف؟" دادی اماں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا۔ جو خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ دادی اماں کے پکارنے پہ منہ بناتے ہوئے بولی۔

"دادی اماں کوئل تو کالی ہوتی ہے جبکہ میرا رنگ گورا نہ سہی مگر سانولا بھی نہیں ہے۔" دادی اماں بے ساختہ ہنس پڑیں۔

"کوئل تمہیں تمہارے رنگ کی وجہ سے نہیں کہا تھا بلکہ تمہارے بولنے اور چہکنے کی وجہ سے کہا تھا۔ کبھی کوئل کی آواز سنی ہے؟" دادی اماں نے دلچسپی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"چھوڑیں دادی اماں! آپ کس کو [illegible] مغرور کے ساتھ سر کھپا رہی ہیں۔ یہ لیجیے گرم گرم گاجر کا حلوہ کھائیں اور مجھے دعائیں دیں۔ امی سے چھپا کر لائی ہوں۔" ہینا نے فخریہ اپنا کارنامہ جتایا۔ دادی اماں کو حلوہ بہت پسند تھا مگر ان کو ذیابیطس بھی تھی۔ اس لیے صالحہ اس بات کا خاص خیال رکھتی تھیں۔

زویا کو پلیٹ تھما کر' ہینا بھی اس کے ساتھ ہی کھانے بیٹھ گئی۔

"حلوہ تو بہت مزے کا بنایا ہے میری بہو نے۔" دادی اماں نے خوشی سے کہا۔

"آخر ماں کس کی ہیں؟" ہینا نے فخریہ کہا تو زویا اسے گھور کر رہ گئی۔

اسی وقت صالحہ' ہینا اور زویا کو آوازیں دیتی ہوئی آ گئیں۔ ہینا نے تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھ کر دادی اماں کی خالی پلیٹ اٹھائی اور فوراً بیڈ کے نیچے کھسکا دی۔

"تم دونوں یہاں بیٹھی ہوئی ہو اور میں کب سے آوازیں دے رہی ہوں۔" صالحہ نے کمرے کے اندر آتے ہوئے کہا۔ پھر دونوں کو حلوہ کھاتے دیکھ کر دادی اماں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"اماں یہ لیجیے گاجر کا حلوہ بنایا ہے آج۔ آپ کے لیے شوگر فری' آپ کی شوگر آج کل ہائی ہے اس لیے۔" صالحہ نے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ اماں کی طرف بڑھائی تھی۔ جبکہ ہینا اور زویا حیرانی سے آنکھیں پھاڑے دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔ دادی اماں کی حالت بھی مختلف نہیں تھی۔

"صالحہ بیٹی! ابھی تو میرا دل نہیں کر رہا۔ میں کچھ دیر کے بعد کھالوں گی۔" دادی اماں نے بات کو سنبھالتے ہوئے کہا تو صالحہ حیران سی اثبات میں سر ہلا کر رہ گئیں۔

"حیرت ہے آج اماں نے حلوہ کھانے سے منع کر دیا۔ جبکہ وہ میٹھے کی شیدائی ہیں۔" صالحہ خود کلامی کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

ان کے جانے کے بعد تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔ پھر بے ساختہ ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑا تھا۔ ان دونوں کی کھلکھلاتی' زندگی سے بھرپور ہنسی میں دادی اماں کی مدہم اور لرزتی ہنسی بھی شامل تھی۔

❋ ❋ ❋

جو بات پہلے صرف سرگوشیوں میں' بہت چھپا چھپا کر' ایک کان سے دوسرے کان تک کا سفر کر رہی تھی۔ وہ روشنی کے تیز جھماکے کی طرح ایسی پھیلی کہ بہت قریب سے دیکھنے والوں کی آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں۔

"نبیح اپنی کسی کلاس فیلو کو پسند کرتا ہے اور اسی سے شادی کا خواہش مند ہے۔"

وقار قریشی کے بہت قریبی دوست جو کافی عرصے سے امریکا میں مقیم تھے اور ان کا بیٹا نبیح کا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔ انہوں نے یہ اطلاع وقار تک پہنچائی تھی۔ جو یہ سنتے ہی پریشان ہو گئے تھے۔ صالحہ کو بھی یہ بات بتاتے ہوئے وہ بہت فکرمند تھے۔

فصیح ان کی اکلوتی بہن رضوانہ کی نند کا بیٹا تھا۔ وقار قریشی کی یہ بہن عرصہ دراز سے قطر میں مقیم تھیں اور ان کی نند اپنی فیملی کے ساتھ امریکا میں مقیم تھیں۔ بہت سوچ بچار کے بعد وقار قریشی نے اپنی بہن سے بات کرنے کا سوچا کیونکہ خاندان بھر میں سرگوشیوں میں یہ باتیں دہرائی جانے لگی تھیں۔

رضوانہ یہ سنتے ہی صدمے سے چور ہو گئیں۔ انہیں اپنی بھتیجیوں سے بہت محبت تھی۔ بدقسمتی سے ان کے سب بچے عمولیا میں بڑے اور شادی شدہ تھے ورنہ وہ ضرور بھائی کے آگے جھولی پھیلا تیں۔

"وقار! تم پریشان مت ہو۔ میں عارفہ سے بات کرتی ہوں۔ وہ ہمارے ساتھ ایسا نہیں کر سکتی۔ انہوں نے یہ رشتہ بہت چاہ اور محبت سے کیا تھا۔ میرا دل نہیں مان رہا۔ فصیح میرے سامنے کا بچہ ہے۔"

رضوانہ کا اپنا دل اندیشوں میں ڈوب چکا تھا مگر وہ اپنے چھوٹے بھائی کو مسلسل تسلی دے رہی تھیں۔

لبنیٰ کے لیے یہ صدمہ برداشت کرنا بہت مشکل تھا۔ وہ بالکل چپ ہو کر رہ گئی تھی۔ بے چین اور بے کل سی، سردیوں کی تنہا اور اداس شاموں میں چھت، دالان اور صحن میں بھٹکتی رہتی۔

ہما، خاموشی سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ جو اپنے جذبات کو اس سے بھی چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ ہما نے اس کی ان کوششوں پر ایک افسوس بھری نگاہ اس پر ڈال کر آسمان کی طرف دیکھا تھا کہ کم ودی سے عقل آگر لبنیٰ کو بھی دان ہو جاتی تو کون سا اس کے خزانے میں کمی آجاتی۔

✲ ✲ ✲

"ہما کہاں رہ گئی ہے؟ ظہر کی نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے۔ مجھے وضو کروا دیتی۔" شدید سردی کی وجہ سے دادی اماں کی طبیعت کچھ ناساز تھی اور ہما روز باقاعدگی سے نیم گرم پانی سے دادی اماں کو خود وضو کروا تی تھی۔

"دادی اماں ہما کی طبیعت خراب ہے۔ گلا خراب ہے اور تھوڑا بخار بھی ہے۔ آپ انھیں میں آپ کو وضو کروا دیتی ہوں۔" لبنیٰ نے پاس آکر سمجھداری سے کہا تھا۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ بہت خاموش اور سنجیدہ سی رہنے لگی تھی۔

دادی اماں کو وضو کروا کے واپس بیڈ تک لائی۔

"آپ نماز پڑھیں۔ میں ہما کو چائے کے ساتھ بخار کی ٹیبلٹ دے آؤں۔" لبنیٰ نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر کے بعد وہ واپس آئی تو دادی اماں کے لیے بھی چائے بنا کر لے آئی۔ جو سردی سے کانپتی انگیٹھی کے آگے ہاتھ سینک رہی تھیں۔

"جیتی رہو میری بچی!" دادی اماں نے دل سے دعا دی۔

"دادی اماں ایک بات تو بتائیں۔ آپ کو سردی بھی شدید لگتی ہے۔ مگر آپ باقاعدگی سے نماز اور قرآن پاک بھی پڑھتی ہیں۔ کیا کبھی دل نہیں کرتا کہ گرم گرم بستر میں پڑی رہیں اور کچھ نہ کرنا پڑے۔" لبنیٰ نے پاس بیٹھتے ہوئے ان کو کانپتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

"بیٹا تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ تم نے کبھی کسی ایسے فرد کو دیکھا ہے جو کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو کر زندگی کی جنگ لڑ رہا ہو؟ موت سے ہمکنار ہوتے شخص سے پوچھو۔ زندگی کی کچھ سانسیں، کچھ پل ہی کتنے قیمتی اور نایاب ہوتے ہیں۔ جب آخری حصے میں عمر کی نقدی تیزی سے ختم ہونے لگتی ہے تو سال اور مہینے سے زیادہ دن، لمحے، اور پل اہمیت کے حامل بن جاتے ہیں۔ جب سود و زیاں کا حساب بھی زیادہ جلدی اور تیزی سے ہوتا ہے اور اس نقدی کے ختم ہونے سے پہلے پہلے جو بھی نیکی سمیٹی جائے، جو بھی نیک عمل کر لیا جائے، وہ بھی کم لگتا ہے۔

ساری عمر تو بھاگ دوڑ میں، دنیا میں گم رہ کر گزار دی ہے۔ اب اس آخری عمر میں بھی اپنے رب کو راضی نہ کیا تو مجھ سے زیادہ بدنصیب کون ہو گا۔" دادی اماں کی آنکھوں میں نمی تھی۔ لبنیٰ جو ان کی باتوں میں کھو

چکی تھی۔ ان کی خاموشی پہ ایک دم ہی حال میں واپس لوٹ آئی۔

"دادی اماں ہر سچ اتنا تلخ اور اداس کر دینے والا ہی کیوں ہوتا ہے۔" زویا نے معصومیت سے پوچھا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں نمی واضح تھی۔ دادی اماں نے اپنی بانہوں میں اسے لے لیا اور نرمی سے اس کا ماتھا چومتے ہوئے بولیں۔

"بعض دفعہ اسی تلخی میں زندگی کی مٹھاس چھپی ہوتی ہے۔ اسی گہری اداسی کے پیچھے خوشیوں کا نہ رکنے والا سلسلہ چھپا ہوتا ہے۔ بس صبر اور یقین ہونا چاہیے۔" دادی اماں کی گود میں سر رکھ کر' ان کے مہربان لمس اور لفظوں کے مرہم نے زویا کو پر سکون کر دیا تھا۔

زندگی میں کچھ لمس اتنے قیمتی ہوتے ہیں کہ اکثر کسی قیمت پہ بھی نہیں ملتے ہیں۔ جیسے ماں کا لمس' بچے کا لمس' کسی بزرگ ہستی کے ضعیف اور کمزور ہاتھوں کا مہربان لمس! جو صرف قسمت اور نصیب سے عطا ہوتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

فصیح سے زویا کا رشتہ طے ہوئے ایک سال ہو چکا تھا مگر دونوں کا تعلق آہستہ آہستہ کر کے اب بننے لگا تھا۔ لڑکیاں تو ویسے بھی خوابوں کی دنیا میں قدم رکھتے ہی صدیوں کا سفر لمحوں میں طے کرنے لگتی ہیں۔ اس لیے خواب ٹوٹیں تو سب سے زیادہ تکلیف بھی وہ ہی اٹھاتی ہیں۔

فصیح کے دلچسپی ظاہر کرنے پر بھی زویا اس سے فون پہ بات کرنے کے حق میں نہیں تھی۔ اس کی سوچ اور اس گھر کی روایات کچھ قدیم ضرور تھیں مگر بوسیدہ نہیں۔ کچھ مہینے پہلے ہی فیس بک پہ دونوں نے ایک دوسرے کو (ایڈ) کیا تھا اور ایک دوسرے کو جاننے کے لیے تھوڑی سی کوشش کی تھی۔ فصیح کے **میسجز** آتے رہتے تھے۔ جن کا جواب کبھی مینا دیتی تھی اور کبھی وہ خود مگر بہت محتاط سے انداز میں۔

آج کل کے بے باک اور آزاد دور میں زویا کی شخصیت کی سنجیدگی اور پر وقار انداز بہت منفرد اور الگ تھا۔ اور مرد کو ہمیشہ منفرد اور الگ رویے ہی متوجہ کرتے ہیں۔ آہستہ آہستہ فصیح کی دلچسپی کا دائرہ بڑھنے لگا تھا۔ ایک رشتہ بن جانے کے بعد' ایک دوسرے کے بارے میں جاننے کی جستجو اور لگن فطری تھی۔ اور مختلف طریقوں اور بہانوں سے جاننے کا یہ عمل بہت دلفریب اور خوب صورت تھا۔ زویا کو کبھی ایسا نہیں لگا کہ فصیح اس رشتے سے خوش نہیں ہے۔ مگر جو سچ اس تک پہنچ رہا تھا اسے بھی جھٹلانا آسان نہیں تھا۔

والدین کے چہروں سے جھلکتی ویرانی اور روز بہ روز بڑھتی خاموشی زویا کا دل دہلاتی رہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تمہاری کافی!"

مینا نے مگ گم صم سی کھڑی زویا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ رات اور دھند دونوں ہی گہری ہو چکی تھیں۔ دسمبر کی آخری رات تھی۔ زویا اور مینا گرم گرم کافی کے مگ تھامے سردی کا مزہ لیتے ہوئے پورچ میں چکر لگا رہی تھیں۔ زویا جو پہلے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد بولی۔

"تم جانتی ہو مینا! ہم جس چیز' جس بات کو جاننے کی جستجو کرتے ہیں' بہت جلد اس کی تہہ تک بھی پہنچ جاتے ہیں جیسا کہ۔" زویا نے توقف کیا تھا۔ مینا نے مزیدار کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے۔ اس کی طرف دیکھا۔

"جیسا کہ؟" مینا نے پوچھا۔

"مجھے اس بات کو جاننے کی جستجو تھی کہ دسمبر کا مہینہ اداسی سے بھرا کیوں محسوس ہوتا ہے یا لوگ اسے اداسی' دکھ' درد سے منسوب کیوں کرتے ہیں؟"

"پھر تمہاری شب و روز کی انتھک محنت اور سوچ بچار نے کیا ثابت کیا؟" مینا نے بظاہر سرسری مگر پچھلے کئی دنوں سے اس کے گم صم اور اداس انداز پہ طنز کرتے ہوئے پوچھا تھا۔ ساتھ ہی اس نے اپنے ہاتھ

میں پکڑے موبائل کی طرف بھی دیکھا تھا۔ زویا اپنی ہی دھن میں مگن بول رہی تھی۔

"دادی اماں کہتی ہیں کہ آخری عمر میں سود و زیاں کا حساب بہت تیزی سے ہونے لگتا ہے سال کا آغاز خوشی اور امید سے کیا جاتا ہے۔ خود سے کیے بہت سے عہدوں کے ساتھ مگر جب سال کا اختتام ہوتا ہے تو سال کے آخری مہینے' آخری دنوں میں گزرے ہر لمحے' ہر پل کا احتساب بہت تیزی سے کیا جاتا ہے اور جب خسارہ زیادہ ہو تو اداسی اور دکھ فطری ہوتا ہے۔ ویسے بھی ہاتھ سے نکلنے والی چیز کا دکھ زیادہ ہوتا ہے۔ یہ ہمارے اندر کی کیفیات ہی ہوتی ہیں جو دن' مہینوں اور سالوں کو مختلف رنگ بخش دیتی ہیں۔ اسی لیے شاید دسمبر کا مہینہ بھی اتنی اہمیت کا حامل بن جاتا ہے۔" زویا نے چلتے چلتے رک کر کہا اور خالی مگ کار کی چھت پہ رکھتے ہوئے' شال کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹا۔ مینا نے کچھ فاصلے پہ رکتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"ویسے زویا ایک بات کہوں اگر تم برا نہ مانو تو!" مینا نے پوچھا تو زویا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"یار! میں نے پہلے کبھی تمہیں کہا نہیں مگر قسم لے لو تم سنجیدہ ہو کر فلسفہ جھاڑتی ہوئی کافی بونگی لگتی ہو۔ تمہارے احمقانہ چہرے پہ زبردستی کی پھیلی سمجھ داری اور سنجیدگی دیکھ کر کئی بار میں نے اپنی بے ساختہ ہنسی کو روکا مگر اب نہیں.....!" مینا قل قل کرتی ہنسی کے ساتھ بولی تھی جبکہ زویا جو پہلے حیرانی سے اسے دیکھ اور سن رہی تھی تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی جھینپی ہوئی ہنسی ہنس رہی تھی۔

وہ اس کی بہن بھی تھی' ہم راز بھی' ہم مزاج بھی اور ہمدرد بھی۔ دونوں ایک دوسرے کا عکس تھیں۔ ایک دوسرے کے لیے صاف و شفاف آئینہ۔ دونوں کی ہنسی خالص تھی ایک دوسرے سے محبت بھی خالص تھی۔

اسی وقت مینا کے موبائل کی رنگ ٹون بجی تھی۔

"ایک منٹ"

مینا تیزی سے دھند میں گیٹ کی طرف بڑھی تھی۔ زویا نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اسی وقت گہری ہوتی دھند میں سے گزر کر کوئی اس کے پاس پہنچا تو زویا اپنی جگہ اچھل ہی پڑی۔

"آپ.....!" فصیح کو ہشاش بشاش مسکراتے ہوئے سامنے کھڑے دیکھ کر زویا کو اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آرہا تھا۔ فصیح نے ہاتھ میں پکڑا سرخ گلابوں کا بکے اس کی طرف بڑھایا تھا۔

"یہ پچھلے کئی دنوں سے پھیلی اس آدھی جھوٹی اور سچی افواہ اور پریشانی کے ازالے کے طور پر میں خود لے کر حاضر ہوا ہوں۔" فصیح نے مسکراتے ہوئے کہا تو بکے ہاتھ سے پکڑتے ہوئے زویا حیرت و خوشی سے بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔

"سرخ گلابوں کا مہکتا ہوا دسمبر!"

اس کے دل نے دھڑکتے ہوئے پوچھا تھا۔ گلاب کی خوشبو نے ہنس کر تصدیق کی تھی۔

"مگر میں نے تو سنا تھا کہ آپ اپنی کسی کلاس فیلو....." زویا کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

"یہ بات جس نے بھی آپ لوگوں تک پہنچائی سو فیصد درست ہے۔ دوران تعلیم میں اپنی ایک کلاس فیلو کو پسند ضرور کرتا تھا اور اس سے شادی کا خواہش مند بھی تھا مگر وہ میری نصیب میں نہیں تھی اس لیے نہیں ملی مگر جو نصیب میں ہے وہ مجھے دل و جاں سے قبول ہے۔ میں چاہتا تو دور بیٹھے بھی یہ سچ تم تک پہنچا سکتا تھا مگر میں مزید رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ اسی لیے اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان آنا ہی بہتر سمجھا تاکہ اس بار اپنے رشتے کو نکاح جیسے مضبوط رشتے میں محفوظ کر سکوں اور پھر تمہارے پیپرز ختم ہوتے ہی رخصتی اور....." فصیح جو تفصیل سے اسے سب بتا رہا تھا۔ مینا کے پاس آنے پہ چونک گیا۔

"فصیح بھائی! باقی کے پلان بعد میں بتا دیجئے گا۔ کام نکلتے ہی اکلوتی سالی کو بھلا دیا۔ پہلے فون کر کر کے میرے ساتھ سرپرائز دینے کے منصوبے بنا رہے تھے۔" مینا نے منہ بناتے ہوئے کہا تو فصیح ہنس پڑا۔

"تمہاری مدد کے بغیر تو کچھ بھی ممکن نہیں تھا۔ اچھی بہنا!" فصیح نے کہا۔ اسی وقت اس کے موبائل کی ٹون بجی۔ اس نے چونک کر وقت دیکھا۔

بارہ بج گئے تھے۔

"ایک منٹ!" کہتا ہوا وہ واپس گیٹ کی طرف بھاگا۔ کچھ منٹ کے بعد ہاتھ میں ایک اور سرخ بکے لیے واپس آیا۔

"نیا سال مبارک ہو!" فصیح نے زویا کو بکے پیش کرتے ہوئے کہا۔ زویا خوشی سے کھل اٹھی تھی۔ نئے سال کا آغاز اتنی خوب صورتی سے ہوا تھا کہ زویا کو آنے والا ہر لمحہ گلاب کی طرح خوب صورت اور مہکا ہوا لگ رہا تھا۔

"یہ تمہارے لیے۔" فصیح نے چاکلیٹ مینا کی طرف بڑھائی تھی جسے مینا نے شکریہ کہتے ہوئے فوراً تھام لیا تھا۔

"اب چلتا ہوں کل حاضر ہوں گا اپنے پیرنٹس (والدین) کے ساتھ۔" فصیح نے اجازت لیتے ہوئے کہا تھا اور جتنی خاموشی سے آیا تھا اسی خاموشی سے پلٹ گیا۔ پندرہ منٹ کی اس ملاقات نے جاتے سال کو بھی یادگار بنا دیا تھا اور آنے والے سال کو بھی رنگ دیا تھا۔

"اب اندر چلیں محترمہ! رضوانہ پھوپھو بھی بمع فیملی تمہارے نکاح کی تقریب میں شامل ہونے کے لیے آ رہی ہیں۔ امی ابو سے کل رات ہی ان کی بات ہوئی تھی۔ امی صبح دادی اماں کو بتا رہی تھیں۔ تم ہر طرف سے لاتعلق ہو کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس لیے تم نے سب کے بدلتے خوشگوار موڈ کو محسوس ہی نہیں کیا تھا۔ ڈفر زویا۔"

مینا نے تفصیل بتاتے ہوئے اس کی کلاس بھی لی تھی۔ اور مزے سے ریپر کھول کر اپنی چاکلیٹ کھانے لگی تھی۔ زویا ندیدی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"چاکلیٹ پہ بری نظر لگانے سے بہتر ہے اپنے بکے نظر بٹو بناؤ۔ اگر چاکلیٹ چاہیے تو ایک بکے مجھے دینا پڑے گا۔" مینا نے شرط پیش کی تھی۔

"جی نہیں! یہ سرخ گلاب میرے ہیں۔ صرف میرے۔" زویا نے پورے یقین سے کہا تھا اور اندر کی طرف قدم بڑھائے تھے۔

"ویسے ایک بات ہے!" زویا نے مڑ کر مینا کی طرف دیکھا تھا۔ جو کار سے ٹیک لگائے کھڑی چاکلیٹ سے انصاف کر رہی تھی۔

"پلیز! اب کوئی نیا فلسفہ مت جھاڑنا۔ میں نئے سال کا آغاز تمہاری سڑی اور بور باتوں سے نہیں کرنا چاہتی۔" مینا نے حفظ ماتقدم کے طور پہ پہلے ہی کہہ دیا۔

"جی نہیں' میرا ایسا ارادہ ہے بھی نہیں میں تو صرف یہ کہہ رہی تھی کہ سب رنگ' سب لمحے اچھے اور خوب صورت ہوتے ہیں اگر پیا سنگ ہوں۔ چاہے جاتے سال کی آخری ساعتیں ہوں یا نئے سال کے اولین لمحے۔" زویا نے مسکراتے ہوئے مگن سے انداز میں پھولوں کی پتیوں کو چھوتے ہوئے کہا تھا۔

"نہیں! میں تمہاری بات سے پوری طرح متفق نہیں ہوں۔ تم نے ٹھیک طرح سے دادی اماں کی بات کو نہیں سمجھا۔" مینا نے خالی ریپر کو لپیٹ کر کونے میں رکھے ڈسٹ بن میں پھینکا اور زویا کے پاس آتے ہوئے بولی۔

"خوشی کا تعلق اور احساس من سے ہے۔ من رنگی دنیا سے ہوتا ہے۔ پھر چاہے رشتہ کوئی بھی ہو۔ یہ ہمارے احساسات اور جذبات ہی ہوتے ہیں جو وقت کو یادوں کی زنجیر ڈال کر مختلف حصوں میں تقسیم کر کے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیتے ہیں۔ من رنگے لمحے' دن اور سال کبھی بھی نہیں بھولتے ہیں۔ اب اندر چلیں محترمہ! سردی کی شدت میں ہوتا اضافہ۔ میری کمزور جان کے لیے مزید برداشت کرنا ممکن نہیں ہے۔"

مینا کے کہنے پہ زویا نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا تھا۔ اور دونوں نے اندر کی جانب قدم بڑھائے تھے۔

وہ دونوں جا چکی تھیں مگر گملے میں لگی ننھی بوگن ویلیا پہ کلی مسکرا رہی تھی۔ سرخ گلابوں کی مہک نے آنے والے ہر لمحے کو مہکا دیا تھا۔ من کی خوشی سے ہے

"من رنگی لمحے!"

☆

ام طیفور

# اس درد کی دوا کرے کوئی

ہر شہر کی کوئی نہ کوئی خاصیت ہوتی ہے جو اس کی وجہ شہرت بن جاتی ہے۔ کوئی "روشنیوں کا شہر" تو کوئی "پھولوں کا شہر" کوئی "رنگوں کا شہر" تو کوئی "بے ڈھنگوں کا شہر" کوئی کہلاتا "شاہینوں کا شہر" تو کوئی



"پہلوانوں کا شہر۔۔۔"

تو یہاں ذکر گوجرانوالہ کا ہے، جس کی وجۂ شہرت یہاں کے پہلوان نما انسان ہیں۔

پہلوان تو کھو گئے مگر اپنا اثر چھوڑ گئے۔۔۔ اب تو جی یہ عالم ہے کہ۔۔۔

"اٹ پٹونے۔۔۔ موٹا نکل دا اے۔۔۔" ایسا نہیں ہے کہ یہاں سیانے لوگوں کا کال ہے۔۔۔ یہ جس کے ہاتھ میں قلم ہے، وہ ذہانت ہی کی مثال ہے۔۔۔ آہم اگر وہ کیا ہے ناکہ یہاں "موٹوں" کی کھیتی بڑی پھلتی پھولتی نظر آتی ہے۔

اندرون شہر کا محلہ چاندنی چوک، گلی نمبر سات کے مکان نمبر۔۔۔ کے خوب صورت منقش لکڑی کے دروازے پر صبح کے سات بجے ہی خاصی رونق تھی۔ شیخ حاجی مشتاق صاحب چھوٹی سی سیڑھی نما کھڑی کے قریب کرسی ڈالے بیٹھے تھے۔

جس دن شیخ صاحب کا مل بیٹھ کر ناشتے کا موڈ ہوتا، وہ اپنے ملازم "چھوٹے" کو دوڑاتے۔۔۔ چھوٹا تمام یار دوستوں کے گھروں میں پیغام دے آتا کہ آج ناشتا شیخ جی کے ساتھ کریں۔ اگلے پندرہ منٹوں میں شیخ صاحب کے دروازے کے آگے چھوٹی سی ٹیبل پر تمام لوازمات سج جاتے۔۔۔ یہ اور بات کہ ان تمام لوازمات میں شیخ جی کی صرف ٹیبل ہی ہوتی تھی۔۔۔ باقی سارا ناشتا دوست احباب ٹرے میں ساتھ ـــــ لے کر آتے تھے۔

شیخ جی بڑے مسرور سے سب کے حصے میں سے تھوڑا تھوڑا اپنی پلیٹ میں رکھ لیتے اور جب بعد میں پلیٹ پر کسی کی نظر پڑتی تو وہ دل مسوس کر رہ جاتا، کیونکہ تھوڑے تھوڑے سے ہی شیخ جی کی پلیٹ ـــــ ـــــ خاصی بھاری بھرکم ہوتی۔ اب تو سب ہی عادی ہو چکے تھے۔ لہٰذا خوش گپیوں میں ناشتا تناول کیا جاتا۔۔۔ محلے کی صورت حال پر تبادلہ خیال ہوتا۔۔۔ اللہ

مکمل ناول



اللہ خیر صلا!

یوں شیخ جی بھرے پیٹ سے اندر تشریف لے جاتے۔ آج بھی حلوہ پوری' روغنی نان اور سری پائے کا بھرپور ناشتا کرکے وہ اندر آئے۔

"چھوٹے... پانڈے چک کے میز صاف کر..." چھوٹے چھوٹے کام نپٹاتے چھوٹے کو آواز دے کر باہر دوڑایا۔ اندر بھی وہی سین چل رہا تھا جسے وہ ہر اس دن دیکھتے جب ان کے دکان پر جانے سے پہلے ان کا نور چشم اٹھ گیا ہوتا... ان کی بیگم منتیں ترلے کر کر کے اکلوتے "دکا کے" کو وقت کے کھانے جتنے ناشتے کو نوش کروانے میں ہلکان ہو رہی تھیں۔

"کھالے میرا نوشہ! میرا ہو... چل میرا پتر... ماں کو تنگ نہ کیا کر' روز کے رونے... بس یہ ایک اور پراٹھا ختم کر اور پھر بھلے سے جا کر دوبارہ سو جانا..."

"واہ کی شاواش اے... ٹھسا اور پھر سلا... پھر ٹھسا اور دوبارہ سلا... اور پھر ایک دن اس ٹھولنے اور سونے کے نتیجے میں کمرے کی چھت پھاڑ کر تیری گود میں آ کر گرنے کا یہ میرا کل... تیرے کمرے کے بالکل اوپر ہی ہے اس کا کمرہ..." شیخ صاحب غصے اور کوفت سے بیوی کو ٹوک بیٹھے۔ جو زبردستی نیند سے بند ہوتی آنکھوں والے جوان پتر کو حلق تک بھر کر دوبارہ بستر توڑنے کا مشورہ دے رہی تھیں۔

"تیری صلا... میرا پتر کیوں ہونے لگا میرا کل... ایویں نہ بولتے جایا کرو جی... بچے کو نظر لگتی ہے۔ اس نے نہیں کھانا تو کیا آپ کھاؤ گے جی... آپ تو ویسے ہی دوسروں کے ہاں سے پیٹ بھر آتے ہو۔" مسرت بانو کو خاصا برا لگا تھا۔ جب ہی جوابا" شیخ جی کو بھی چوٹ لگا گئیں۔

"تیری ان ہی باتوں نے اس کا ککھ نہیں رہنے دیا۔ پال پال کر سنڈا کیے جا رہی ہے۔ اب تو اسکوٹر پہ بھی بیٹھتا ہے تو اس کے پرزوں سے بھی "ہائے ابا جی" جیسی آواز نکلتی ہے۔"

"زیادہ مخول نہ کریں شیخ جی! میرا بیٹا کوئی نہیں ہے سنڈا سنڈا۔"

"چل تو سنڈا ہی کہہ لے۔" شیخ جی مزہ لیتے ہوئے بولے "ویسے بھی اس کی باڈی "سنڈے" جیسی ہی لگتی ہے۔ سر سے پاؤں تک گول مٹول اور بس گول' جاؤ جالی پینٹ شرٹ پھنسا لے تو قسمے... ہو بہو گاؤ تکیہ لگتا ہے... شرٹ کے سارے بٹن ٹوٹنے کے ڈراسے پہ کھڑے رہتے ہیں... ہاہاہا... ہاہا!"

اپنی بات کے اختتام پر شیخ جی خود ہی زور' زور سے ہنسنے لگے اور اس ہنسنے کے چکر میں ان کے کرتے کا آخری بٹن جھٹکوں کی تاب نہ لاتے ہوئے پھڑک کے گرا تھا۔ آخر ان کی توند بھی توانائی سے بھرے بڑے غبارے کی طرح تھل تھل کر رہی تھی۔

مسرت بانو کے مارے طیش کے نتھنے پھول رہے تھے۔ سرخ و سفید رنگت مزید دہکنے لگی۔

"ہنس لو... جی ہنس لو! میرا پتر گبھرو ہے' موٹا نہیں' آج رشتے کی بات نکالوں نا تو ایک سے ایک خوب صورت لڑکی لائن میں کھڑی ہے۔"

"آہو... انکار کرنے والوں کی لائن میں..." شیخ جی نے لقمہ دیا اور پھر سے ہنس ہنس کے دوہرے ہوتے گئے۔

"لو جی... لکھ لو..." مسرت بانو بائیں ہتھیلی پہ دائیں ہتھیلی کی پشت زور' زور سے مارتے ہوئے بولیں۔

"لکھ لو... میں اسی سال اپنے پتر کا ویاہ کروں گی اور ایسی سوہنی کڑی لاؤں گی کہ ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔"

"میرے ہوش بعد میں ٹھکانے لائیں۔ پہلے ذرا اپنے پتر کو ہوش کروا... وہ تیرے پیچھے کھا پی کر سب کا لڑھک گیا ہے۔ ہونہہ... ویاہ کرنے کی اس کا ٹینڈر اس کی کوئی نہیں' اپنی بارات پہ بھی سو لے۔ ہوگا... پھر تو سب سے کہنا کہ "دکا! رات بڑا تنگ کروانی... لفڑی وی اے" ہاہاہا... ہاہا..."

شیخ جی ہنستے ہوئے وہاں سے نکل گئے... جانتے تھے۔

مسرت بانو کو جب جواب نہ سوجھے تو جو چیز نظر آتی اس کو زور' زور سے فرش پر پٹخنا شروع کر دیتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

ویسے تو شیخ جی کی پانچ اولادیں سطح ہستی پر نمودار ہوئی تھیں... پہلے تینوں بڑے لڑکے چہرہ کرا کے دنیا سے رخصت ہو گئے' پھر بڑی دعاؤں' وظیفوں کے بعد عظیم مشتاق صاحب جلوہ افروز ہوئے... یہ جب ہوئے تو انہوں نے پہلوانوں کے شہر کا نام روشن کر دیا۔ نرس نے جس وقت بچہ باہر لا کر شیخ جی کی بہن یعنی عظیم کی پھوپھی کی گود میں دیا تو وہ بے اختیار بولیں۔

"نہیں جی... اتنا وڈا کاکا... یہ تو کوئی پر اتا بال (بچہ) لگدا ہے۔" نرس نے جھنجلا کر بچہ زبردستی گود میں دیا اور بولی۔

"آپ کا ہی ہے' بچے کی ماں نے پورے سال کی خوراک اسے اندر ہی کھلا چھوڑی ہے۔"

ساڑھے تیرہ پونڈ کے عظیم کو پیدا ہونے سے لے کر جوانی تک مسرت بانو نے کھلایا ہی کھلایا تھا۔ ان کے دل میں پہلے تینوں بیٹوں کی دلعہ وہم بیٹھا تھا۔ وہ تینوں اس قدر کمزور اور چھوٹے سے پیدا ہوئے تھے کہ بلی کے بچوں کا گمان ہوتا اور اسی کمزوری نے ان کی جان لی تھی... اس کے بعد جب مسرت بانو چوتھی بار امید سے ہوئیں تو آندھی ہو یا طوفان... دن ہو تا یا رات... مسرت بانو کچھ نہ کچھ کھاتی پائی جاتیں۔ اس قدر کھانے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آخری دو مہینے لیٹے لیٹے گزارے... خود بھی پھول کر کپا ہیں اور نتیجتاً" ڈاکٹر نے آپریشن کے ذریعے ایک عدد پانڈا نما صحت مند بچہ حوالے کیا۔ اس کے بعد بھی مسرت بانو نے عظیم کو کھلانا اور ہر وقت کھلاتے رہنا اپنا مشن بنا لیا۔ عظیم کے بعد اللہ نے ایک عدد رحمت سے بھی نوازا مگر صبیحہ کے حصے میں وہ "خوراک" کبھی نہیں آسکی تھی' جس کا حق دار عظیم تھا۔ ہر وقت کھاتے رہنے کی عادت اتنی پختہ ہو گئی کہ صبح اٹھنے سے لے کر رات سونے تک بکری کی طرح جگالی کرتا پایا جاتا۔ جسم موٹاپے کی طرف مائل ہوا تو قدرتی طور پر سستی بھی چھائی چلی گئی۔ مرغن غذائیں نیند کا موجب ہیں... یوں پڑھنا لکھنا دشوار ہوا۔ اسکول میں سارا دن آنکھیں جاگتی اور دماغ سوتا رہتا اور پھر تھک ہار کر آنکھیں بھی بند ہو جاتیں اور عظیم میاں ڈیسک پہ سر رکھے خراٹے لیتے پائے جاتے۔ ہاں... ایک واحد بریک تھی جس میں عظیم کے حواس مکمل چوکس ہوتے اور وہ ننھے پھلاتا' کمزور بچوں کو دھکے سے پرے کرتا... کینٹین سے اپنا مطلوبہ خورد و نوش کا سامان لے کر چند نوالوں میں اسے ختم کر جاتا۔

کھا کھا کر اور سو سو کر تعلیمی مدارج طے کرتے عظیم نے جب کراماتی طور پر میٹرک کلیئر کیا تو مسرت بانو نے اس خوشی میں اپنے ہاتھ سے بیٹے کو پوری چنے اور بڑے کے پائے پکا کر کھلائے... اور شام کو عظیم اور مسرت بانو نے شیخ جی کے سامنے بڑی نخوت سے یہ اعلان کیا کہ اب آگے نہیں پڑھنا... نقاہت ہو جاتی ہے۔

شیخ جی جو پہلے ہی اکلوتے چاند کی میٹرک کی مارک شیٹ کے ——— نمبر ملاحظہ کر رہے تھے۔ یک دم آپے سے باہر ہو گئے۔ انہوں نے اتار الترا (جوتا) اور وہ مار ماری بیٹے کو کہ کل کو تھنا جسم مزید سوج گیا۔ سارے محلے میں دوڑا دوڑا کر اتنی تواضع کی کہ دوپہر کو کھائے گئے سری پائے اور پوریاں... سب برابر ہو گئے۔

اور اسی چھتروں نے عظیم کو تھرڈ ڈویژن میں ایف اے کروا دیا۔ سادہ سا ایف اے جس کے مضامین میں سرفہرست "پنجابی" تھا اور واحد سبجیکٹ تھا جس میں عظیم کے نمبر "قابل ستائش" تھے۔ باقی مضامین میں وہ لیل کے پاس سے گزر کر "پاس" ہوا تھا۔ شیخ جی تو بی اے بھی کرانا چاہتے تھے مگر مسرت بانو میدان میں کود پڑیں۔

"اوبس بہت ہوا شیخ صاحب... ایک میرا بیٹا ہی

پڑھائی جو گا رہ گیا ہے کیا؟ جن عذابوں سے گزر کر میرے لعل نے ایف اے کیا ہے' وہ یا تو میں جانتی ہوں یا وہ خود۔۔۔ اب آگے اگر آپ کو اتنا ہی شوق آرہا ہے تو اپنا داخلہ کرالیں کالج میں۔۔۔ کیونکہ اپنے پتر کا تو میں دیاہ کروں گی۔۔۔ دیاہ۔۔۔"

مسرت بانو اپنے "ڈھیلے آٹے" (ضیغم) پر واری صدقے جاتے ہوئے لنک کر بولیں۔

"نہیں۔۔۔ تو الٹ کر لے! میرا ویاہ کرادے اور اس بوری کا داخلہ۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ ہاہا۔۔۔"

شیخ جی نے حسب عادت بیگم کا دل جلا کر قہقہہ لگایا تھا۔

"آہو۔۔۔ آپ کا ویاہ کرادوں۔۔۔ جیسے آپ کے لیے تو ملکہ الزبتھ بھی ہاں کہہ دے گی ناں۔۔۔"

اب کے مسرت بانو نے ٹھٹھا لگایا۔۔۔ ان کے ساتھ ان کا لاڈلا ڈھیلا آٹا بھی ہنسی کے مارے تھرتھرانے لگا۔ شیخ جی نے قدرے غصے سے اسے گھورا تو ہنسی رک گئی' صرف تھرتھراہٹ باقی رہ گئی۔ شیخ جی ذرا دو ٹوک لہجے میں بولے۔

"اب بس کرو یہ مسخریاں۔۔۔ پہلے اپنے پتر کو روز کام پہ جانے کی عادت ڈال' پھر ویاہ کی بخ پال۔ اگلی نے آکر تیرا یہ کاکا پالنا نہیں ہے' بلکہ اپنی کفالت کرانی ہے۔ اب کل سے روز اسے میرے ساتھ روانہ کر۔۔۔ سیکھتے سیکھتے بھی سالوں گزر جاتے ہیں۔"

شیخ جی تو کہہ کر چلے گئے مگر وہ کل کبھی نہیں آئی۔ ضیغم کی وہی روٹین تھی۔ کبھی کبھی مارے باندھے کام پر جانا بھی تو وہاں بیٹھ کر نیند سے ہچکولے کھاتا رہتا۔۔۔ شیخ جی غصے میں آکر واپس بھیج دیتے۔ مسرت بانو اسی طرح اس کے ناز نخرے اٹھائے جاتیں۔ صبغہ کی شادی تو انہوں نے ایف اے کے امتحانات دیتے ہی کردی تھی۔ پاس ہونے کی مٹھائی اس کے سسرال لے کر پہنچی تھیں۔ ماں کی بے توجہی نے اسے کافی سمجھ دار بنادیا تھا۔ اب تو اس کے تین بچے تھے۔ جب بھی آتی ماں کو سمجھانے کی کوشش کرتی مگر بے سود۔۔۔

ضیغم تو خیر اسے کسی کھاتے میں لکھتا ہی نہیں تھا۔ سستی کے مارے ضیغم نے اس ڈھب میں پانچ سال کا عرصہ برباد کرلیا تھا۔۔۔ اور اب اسی تیئس سالہ پلے پلائے موٹے تازے ضیغم کی شادی کرنے جارہی تھیں مسرت بانو۔۔۔ تین چار لڑکیاں نظر میں تھیں' بس آج کل میں کوئی بھی ایک فائنل کرکے بات ڈالنی تھی اور انہیں یقین تھا کہ جہاں ان کا ارادہ ہے وہاں سے انہیں کسی صورت نہ نہیں ہوگی۔

☼ ☼ ☼

"نیلو۔۔۔ یہ دیکھو آپی کتنا پیارا جوڑا لے کر آئی ہیں تمہارے لیے' کہہ رہی تھیں کہ معظم بھائی کے کولیگ کی مسز نے انہیں گفٹ کیا تھا مگر تب ہی انہوں نے تمہارے لیے رکھ لیا تھا۔ ایسے ہی کسی خاص موقعے کے لیے۔۔۔"

صنوبر نے حتی الامکان لہجے کو خوش گوار رکھا۔۔۔ بلکہ کچھ حد تک شوخ بھی' مگر نیلوفر کے جامد تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ کئی دن سے اسی طرح کے موڈ میں تھی۔۔۔ سب سے ناراض اور تقدیر سے شاکی۔۔۔ سب سے زیادہ خفا وہ اماں سے تھی جن کی بے حد لاڈلی ہونے کے باوجود بھی انہوں نے ذرا پروا نہیں کی تھی اور لے کر اس کا رشتہ زبردستی ایک ایسے شخص کے ساتھ طے کردیا تھا جو اس کے مقابلے کم پڑھا لکھا اور خالص کاروباری گھرانے سے تھا۔ یہ رشتہ آپی کے توسط سے آیا تھا۔ اسی لیے تاسف کم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ آپی سے اس کی خوب بنتی تھی۔ وہ اس کی پسند' ناپسند جانتی تھیں۔ اس کی خواب آشنا تھیں' پھر بھی۔۔۔ پھر بھی۔۔۔

صنوبر کپڑے رکھ کر جاچکی تھی۔ باہر بڑے کمرے سے آتی آوازوں میں ہلچل اور جوش صاف محسوس ہوتا تھا۔ آج اس کی رسم تھی۔ برائے نام مہمانوں نے آنا تھا اور اس کے ہاتھ پہ شگن کے پیسے دھر کر' انگلی میں انگوٹھی ڈال کر جیسے بہت بڑا معرکہ سر کرنا تھا۔ اس کی الجھن بڑھتی جارہی تھی۔ عجیب سی چڑ تھی جو اسے

ہر چیز سے محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر بے دلی سے کپڑے تبدیل کیے اور دوبارہ ٹھس ہو کر بیٹھی رہی۔

صنوبر نے اندر جھانکا تو شکر کا کلمہ پڑھتی قریب چلی آئی۔ ہلکی پھلکی سی جیولری اور ذرا سا میک اپ کرنے سے نیلوفر عرف نیلو جچ گئی۔

باہر مہمان آچکے تھے۔ صنوبر اسے لیے بڑے کمرے میں چلی آئی' جہاں چند زائد صوفے اور کرسیاں رکھ کر مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔۔۔ اور سب سے بڑے صوفے پر جو خاتون ٹھسے سے پھیل کر بیٹھی تھیں' وہی مسرت بانو تھیں۔ آج کے دن کی مہمان خصوصی اور نیلوفر کی ہونے والی ساس۔

نیلوفر ان کے قریب پہنچی تو انہوں نے اپنے اور دوسری مہمان خاتون کے درمیان میں جگہ بناتے ہوئے اسے بٹھایا اور اونچی آواز میں واری صدقے جانے لگیں۔ ساتھ آئی تمام رشتہ دار عورتوں کے چہروں پر ستائش اور رشک کے تاثرات نے انہیں پور پور ٹھنڈ ڈال دی تھی۔ وہ ایک بار پھر شروع ہوئیں۔

"میں قربان جاؤں۔۔۔ چاند ہے میری نوں (بہو) ماں صدقے' ماں واری۔۔۔ میری آنکھوں کا نور۔۔۔ میرا چین اور سرور۔۔۔"

"اوئے۔۔۔ چین اور سرور! گانا نہیں سنانا۔۔۔ رسم کرنی ہے۔ اتنا واری' قربان ہو ہو جارہی ہے۔۔۔ یہ نہ ہو کہ اگلے حق مہر میں تیری قربانی ہی مانگ لیں۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ ہاہا!"

کیسی غضب کی سبکی کی تھی شیخ جی نے اور اوپر سے کوئی اور ہنسے نہ ہنسے خود ہنس کر ضرور جلتی پہ تیل ڈالتے تھے۔ مسرت بانو نے کینہ توز نگاہوں سے شیخ جی کو گھورا۔۔۔ تیور کڑے تھے۔ شیخ جی سمجھ گئے کہ گھر چل کر ستھری ہونے والی ہے۔ مسرت بانو نے مارے باندھے پرس میں سے انگوٹھی نکالی اور بسم اللہ کہتے نیلوفر کی انگلی میں ڈال دی۔ مبارک سلامت کا شور اٹھا۔ نیلوفر کی امی عافیہ خاتون نے سب سے پہلے سمدھن کا منہ میٹھا کروایا اور اس کے بعد کسی کو کہنے کی حاجت نہیں ہوئی۔۔۔ ساتھ آئے سب ہی مہمانوں نے جی بھر کر منہ میٹھے کیے۔ عافیہ خاتون کو فکر ہوئی کہ کہیں سب اپنے پیٹ مٹھائی ہی سے نہ بھر لیں۔۔۔ انہوں نے جھٹ کھانا لگوایا۔

شیخ جی سب سے پہلے ٹیبل پر موجود تھے۔

چمچے سے چمچہ ٹکراتا رہا۔ سالن سے بھری پلیٹیں ٹیبل پر الٹتی رہیں۔ نیلوفر نے بڑے کمرے کے آخری کونے پہ بیٹھے اپنے سسر کو دیکھا جو پلیٹ کو منہ لگا کر شوربہ پی رہے تھے اور قطرے گر گر کر ان کی سفید قمیض پر اضافی "بٹن" بناتے جارہے تھے۔ اس نے تاسف سے آنکھیں موند لیں۔۔۔ سامنے چھوٹی تپائی پر صنوبر ایک پلیٹ میں چاول اور تھوڑا سا سالن رکھ گئی تھی مگر اس نے نظر بھی نہیں ڈالی تھی۔ اس کا جی ہر شے سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ اندر دکھ پھیلتا جارہا تھا اور مایوسی بھی۔۔۔

☼ ☼ ☼

"نیلو۔۔۔ نیلو۔۔۔" اس کے برابر میں لیٹی فیروزہ آپی نے اسے پکارا۔۔۔ وہ سو نہیں رہی تھی مگر سوتی بنی ہوئی تھی۔

"نیلوفر۔۔۔ گڑیا! بات تک کرنا گوارہ نہیں ہے کیا؟" فیروزہ آپی نے اسے کندھے سے پکڑ کر ہلایا تو وہ کوفت سے اٹھ بیٹھی۔ آپی بھی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ چند ثانیے اس کی شکل دیکھے گئیں' پھر نرمی سے اس کے ماتھے پہ آئے بال پیچھے کیے۔ ایک گہری سانس کھینچی اور اس سے مخاطب ہوئیں۔

"نیلو۔۔۔ چندا! مجھے معلوم ہے کہ تم مجھ سے بلکہ ہم سب سے ناراض ہو۔ ہم نے تمہارے خوابوں کو توڑا ہے۔ تمہاری مرضی کے خلاف تمہارا رشتہ طے کردیا۔۔۔ یہ بہت بڑا جرم ہے ہمارا! لیکن میری جان! تم جو خواب دیکھتی تھیں ان کے پنپنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ تم چاہتی تھیں کہ تمہاری شادی میری طرح

ایک پڑھے لکھے شخص سے ہو' جو دو جمع دو' پانچ نہ کرتا ہو' بلکہ دو جمع دو' چار پڑھاتا ہو۔۔۔۔ تمہیں ایک پُرآسائش اور اخلاقیات سے پر بہترین ماحول فراہم کرسکے۔۔۔ تمہارے ساتھ آپ جناب سے بات کرے۔ تمہاری ہر مشکل کو وہ تمہاری آنکھوں میں پڑھ کر حل کردے۔ کھانے کی مشین نہ ہو' متحرک اور ہرفن مولا۔۔۔ ہے نا!" فیروزہ آپی ایک پل کو رک کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولیں۔

"تمہیں کیا لگتا ہے کہ صرف تمہارے شوہر کی ایک بھاری ڈگری تمہیں یہ سب دلا دیتی۔۔۔ ہم۔۔۔ م۔۔۔ کیا میں نے پالیا؟ نہیں نیلو۔۔۔ میں نے کچھ نہیں پایا' مجھے پڑھائی کی اہمیت سے انکار ہرگز نہیں' نہ ہی پڑھے لکھے آدمی کی وقعت میں گھٹا رہی ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم جس ماحول سے تعلق رکھتے ہیں اور جس طبقے میں ہمیں بیاہ کر جانا ہوتا ہے وہاں پر یہ فارمولا اپلائی نہیں ہوتا۔ یہ ذرا اونچے لوگوں کی باتیں ہیں۔ ہمارے ہاں تو ساری تعلیم اور اخلاقیات ایک سے اوپر روٹی میسر نہ ہونے پر مغلظات کی شکل میں لس لس سے برآمد ہوتی ہیں۔ تمہارے معظم بھائی پڑھے لکھے ہیں۔ اچھی جاب پر ہیں۔ میرے لیے یہ فخر کی بات تھی مگر اس فخر کو پھپھوندی تب لگی جب مجھے اور معظم کو ان کی آٹھ بہنیں بیاہنی پڑیں۔ دو دیوروں کی انجینئرنگ کی پڑھائی۔۔۔ بیمار سسر اور سخت گیر ساس کی چڑھائی۔۔۔ اور پھر میرے اپنے تین بچوں کے اخراجات۔۔۔ پھٹا ہوا دس کا نوٹ تک ٹیپ لگا کر میں نے جوڑا ہے۔ اپنی نندوں کی شادی کرنے کے لیے۔۔۔ شادی کے بارہ سالوں میں' میرے حصے میں بارہ جوڑے بھی نہیں آئے۔ معظم کی محدود آمدنی نے مجھے کبھی ساٹھ روپے والی چاٹ کی پلیٹ کھانے کی بھی اجازت نہیں دی۔ میرے بچوں نے فن لینڈ' پلے لینڈ اور سند باد جیسی جگہوں کے صرف نام سنے ہیں۔ کبھی دیکھے نہیں۔ معظم بہت اچھا بولتے ہیں مگر صرف اوروں کے سامنے۔۔۔ گھر میں وہ زخمی شیر کی مانند غراتے ہیں۔ بچے ان کے آتے ہی ادھر ادھر دبک جاتے ہیں۔ کھانے کی میز پر اگر معظم کو اضافی روٹی چاہیے ہو اور وہ غلطی سے ہاٹ پاٹ میں موجود نہ ہو تو ان کے غصے سے پھولتے پچکتے نتھنے دیکھ کر میں جھٹ اپنی روٹی آگے کردیتی ہوں اور خود بعد میں روکھا سالن کھا کر شکر کا کلمہ پڑھتی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ چانپ والی بوٹی کا ذائقہ کیسا ہے' کیونکہ میرے حصے میں کبھی سادی بوٹی بھی نہیں آئی اور کبھی ادھر آؤں تو امی کے گوشت پکانے کے باوجود میرا دل کبھی کیا ہی نہیں کہ میں جی بھر کر کھالوں۔۔۔ سوچتی ہوں اچھا ہے' زبان اس ذائقے سے ناآشنا ہی بھلی۔

گھر والوں اور حالات کے ستائے معظم پہ مجھے ترس بھی آتا ہے۔ صرف اڑتیس سال کی عمر میں ان کا آدھے سے زیادہ سر سفید ہوچکا ہے۔ ان کی زبان تلخی کے زہر سے نیلی پڑچکی ہے۔ وہ جو مجھے شادی کے شروع میں پیار سے فیری کہتے تھے' اب کھوتی کہتے ہیں اور بچوں کو بلانے کے لیے خبیث' بدمعاش' لعنتی۔۔۔ تم جیسی زندگی کی چاہ کرتی ہو۔۔۔ میں نے اسے جی بھی لیا نیلو۔۔۔ اور یقین کرو میں پور پور تھک چکی ہوں۔ اسی لیے میں نے امی پہ زور دیا تھا کہ یہاں تمہارا رشتہ طے کردیں۔۔۔ کم از کم زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے بھی اوپر تک تمہیں ترسنا تو نہیں پڑے گا۔۔۔ پیٹ بھر کر کھاؤ گی' اوڑھو پہنو گی اور کل کو بچے ہوں گے تو من چاہا پڑھاؤ گی۔۔۔ یہ سب پیسے سے ہوتا ہے نیلو۔۔۔ غربت کی چنگیر پر رکھی ڈگری سے نہیں۔۔۔ اور میری بات یاد رکھنا کہ جس گھر میں آسائش ہو گی وہاں گنجائش ہو گی۔ تم پیار سے وہیں اپنی منوا سکو گی جہاں آسودگی ہو گی' کیونکہ پیار سے جو منوایا جاتا ہے اسے ڈیمانڈ کہا جاتا ہے اور ڈیمانڈ پوری کرنے کے لیے جیب خالی نہیں ہونی چاہیے۔" نیلو پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ فیروزہ آپی اس قدر تنگی میں زندگی گزار رہی ہیں۔ وہ تو معظم بھائی کے لب و لہجے کا دم بھرتی تھی۔ وہی معظم بھائی جو آپی کو یہاں آکر آپ جناب سے بلاتے تھے۔ گھر میں انہیں کھوتی کہہ کر پکارتے تھے۔ اس کی پی اے پاس انتہائی نفیس سی آپی

کو...

اور اس کی آپی نے کبھی بھی بھرم نہیں کھویا تھا۔ وہ ہمیشہ پرانے اور گھسے ہوئے کپڑے پہنتی تھیں۔ اکثر اس کے اور صنوبر کے پرانے جوڑے بھی لے جاتیں... یہ کہہ کر کہ ان کی نند پہن لے گی... اور پھر اسی جوڑے کو انہوں نے آپی کو کئی بار پہنے دیکھا... پوچھنے پر وہ یہی کہتیں کہ بھئی میری نند کے بڑے نخرے ہیں... ایک بار پہن کر کام والی کو دینے لگی تھی... میں نے جھپٹ لیا کہ اچھا بھلا تو ہے' ابھی رہنے دو... میں دو چار دفعہ پہن کر دے دوں گی۔"

اور ان لوگوں کو کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ فیروزہ آپی کے گھر میں کام والی تو آتی ہی نہیں۔

اف... زندگی تجھے جینے کے لیے کتنے دکھ اٹھانے پڑتے ہیں۔ اس رات آپی کے گلے لگ کر اس نے وعدہ کیا تھا کہ اب اس کی طرف سے کوئی شکایت نہیں ہوگی اور اگر اس کے نصیب میں یہی ساتھی لکھا ہے تو نصیب وہ بدل نہیں سکتی مگر ساتھی کو تو بدلا جا سکتا ہے نا۔

☼ ☼ ☼

کتنی ہی رسموں کے بعد اسے کمرے میں بالآخر پہنچایا گیا تھا۔ اس کی اکلوتی نند صبغہ اسے سہولت سے بٹھا گئی تھی۔ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے اس نے اپنے جہیز کے فرنیچر پر نگاہ کی تو بے اختیار دل دکھ سے بھر گیا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سب کن عذابوں سے بنا تھا۔ کیا' کیا' کہاں سے جوڑا گیا تھا۔ دکھتی گردن کو اس نے پیچھے ٹکا لیا اور آنکھیں موند لیں۔ یہاں پہنچ کر ہونے والی رسمیں یک دم بند آنکھوں کی پتلیوں پر لہرانے لگیں۔ ہونٹ بے اختیار مسکرانے لگے۔

جس وقت اس کی رخصتی ہو رہی تھی۔ عین اسی وقت اس کی ساس اور سسر میں تکرار ہو گئی۔ گاڑی ڈرائیو کرنے والا اس کا نندوئی یعنی صبغہ کا میاں تھا اور پیچھے دولہا' دلہن براجمان تھے۔ اگلی سیٹ خالی تھی' سو اسی... پر "تو' میں میں" ہو گئی۔

مسرت بانو کہیں کہ "میں تو اپنے لوں' پتر کے ساتھ جاؤں گی۔"

جبکہ شیخ جی کا فرمان تھا کہ "تو اپنی بہنوں کے ساتھ نکل... شاباش... میں لاڑے کا ابا ہوں' اس لیے گڈی میں بیٹھ کر آؤں گا۔"

"لے دس... ایویں... میرا اکو اک پتر اور میرے بغیر وو ہٹی لے کر گھر جائے... کم از کم اس کو گڈی سے نکالنے کے لیے تو کوئی زنانی چاہیے نا..." مسرت بانو نے کمر پہ ہاتھ ٹکاتے ہوئے کہا۔

"تو وہ تجھ سے پہلے ہی کئی کھڑی ہوں گی آگے... تو فکر نہ کر... چل پراں ہو شاباش' جلدی سے کسی گڈی میں بیٹھ جا' ورنہ رہ جائے گی ادھر ہی..."

شیخ جی نے گاڑی کے دروازے کے آگے تن کر کھڑی مسرت بانو کو ہاتھ سے پرے کرنا چاہا۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں۔

نیلوفر کے میکے والے کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔

شیروانی اور گلے میں پڑے ہاروں سے الجھتا ضیغم چڑ کر اپنے بہنوئی سے بولا۔ "یار نوید... اماں ابا کو لڑنے دے' تو گاڑی اسٹارٹ کر اور نکل لے... یہ دونوں ہنستے مسکراتے چنگ چی پر آجائیں گے... راستے میں مجھے پتا ہے کہ ابا' اماں سے پیسے لے کر پان بھی کھلاتے لائیں گے... ہاہاہا... ہاہا!"

نوید اور ضیغم دونوں قہقہہ مار کر ہنس دیے... نیلوفر کو شدید الجھن محسوس ہوئی۔ اسی وقت دوبارہ ضیغم کی آواز سنائی دی۔

"ایک تو مجھے لگتا ہے کہ پورے گوجرانوالہ کے ہار میرے ہی گاٹے (گلے) میں ڈال دیے ہیں انہوں نے..."

(تو اتار دیں بھلا... آپ کو کس پاگل نے کہا ہے یہ گولڈ میڈل مستقل سجائے رکھیں۔) نیلوفر نے دل میں کڑھتے ہوئے سوچا۔

"اوپر سے یہ شیروانی... لگتا ہے یار نوید' درزی نے ڈنڈی ماری ہے۔ جب پہنی تھی تو ٹھیک تھی... بس

کھانا کھانے کی دیر ہوئی ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے کسی نے مجھے تھیلے میں پھنسا دیا ہے۔ یار میں تو کہتا ہوں ان کو لڑانے دے' ورنہ یہ شیروانی' چر جانی ہے۔"

اسی وقت اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر مسرت بانو دھڑام سے بیٹھیں۔ باہر کھڑے شیخ جی انہیں کچا چبا جانے والی نظروں سے دیکھتے نیلوفر کے میکے والوں کو الوداع کہنے لگے۔

"چل پتر نوید۔۔۔ اس سے پہلے کہ ضیغم کے ابا جی دوبارہ آؤ انگالیں 'ٹر پتر۔ پہلے ہی ستھرا ونگل ہوگیا ہے ادھر۔۔۔"

مسرت بانو نے بیٹھتے ساتھ ہی زوردار دھپ نوید کے کندھے پہ رسید کرتے' اسے چلنے کو کہا۔۔۔ جو بے دھیانی میں کندھے کے بجائے اس کے کان پر لگی' جس سے اس کی نظر کا چشمہ اچھل کر نیچے اس کے پیروں کے۔۔۔ پاس جا کر گرا۔۔۔ وہ بے زاری سے نیچے جھک کر اسے تلاشنے لگا۔

مسرت بانو۔۔۔ جن کی نظریں مسلسل شیخ جی پر۔۔۔ تھیں' رخ پھیر کر قدرے خفگی سے بولیں۔

"اوئے منڈیا۔۔۔ نیچے کدھر چھپ رہا ہے۔۔۔ اوپر ہو جا پتر۔ شیخ جی نے بھلا تیری پھینتی تھوڑی نہ لگانی ہے۔"

"میرا نظر کا چشمہ نیچے گر گیا تھا۔ امی جی! وہ اٹھا رہا تھا۔۔۔ آپ بھی ناں۔۔۔"

نوید نے قدرے چڑ کر "امی جی" کو جواب دیا جو جواباً "امی جی کو چڑا گیا۔

"ایک تو۔۔۔ تو بھی چشمے کے بغیر "انا کاں" (اندھا کوا) بن جاتا ہے۔ کتنی بار کہا ہے "کیزر" لگوا لے آنکھوں میں۔۔۔ مگر نا جی!"

"کیزر نہیں امی جی لیزر۔۔۔ لیزر۔۔۔"

"آہو۔۔۔ وہی۔۔۔ وہی۔۔۔"

مسرت بانو نے یوں نخوت سے ہاتھ جھٹک کے کہا کہ نوید کو لگا اسے "دفع دور" کہا ہے۔

گھر پہنچتے ہی مسرت بانو بڑی عجلت میں اتریں۔

"مر جاتیاں! ساری کی ساری "شریکنیاں"

دروازے پر ہی کھڑی ہیں۔۔۔ میں جانتی ہوں' انہوں نے میرے حصے کی رسموں پر ہاتھ مارنا ہے۔۔۔ جو میں ہونے نہیں دوں گی۔۔۔ لو بھلا! اکو اک پتر اور میں ہی پیچھے رہوں۔۔۔ نا جی نا!"

کہتے ساتھ ہی مسرت بانو بھیڑ میں سے جگہ بناتیں وہاں پہنچیں' جہاں خاندان کی دیگر عورتیں **جمگھٹا** لگائے کھڑی تھیں۔ ایک خاتون کے ہاتھ میں تیل کی شیشی تھی۔۔۔ سامنے مووی میکر ان کو فوکس کیے ہوئے تھا۔ مسرت بانو سیدھی ان ہی کے پاس پہنچیں اور جھپٹ کر تیل کی شیشی خود لے لی۔ پھر مسکراتے ہوئے سامنے مووی والے کو دیکھتے پوز دینے لگیں۔۔۔

صبغہ نے آگے بڑھ کر بھابھی کو گاڑی سے نکالا۔ مووی کیمرے کی تیز روشنی میں نیلوفر سہج سہج چلتی گھر کی دہلیز تک پہنچی۔

مسرت بانو نے مصنوعی استقبالیہ مسکراہٹ سجا کر' گردن اکڑا کر دہلیز پر تیل کی شیشی سے ایک موٹی دھار کی صورت سرسوں کا تیل انڈیلا۔

"اوپالی۔۔۔ (بھابھی) تھوڑا پاؤ۔۔۔ کوئی تلک (پھسل) گیا تے سیاپا پے جائے گا۔"

مسرت بانو کی نند نے پیچھے سے تنبیہہ کی مگر انہوں نے نخوت سے بھنویں اچکا کر نند کو گھورا۔۔۔ وہ بے چاری چپ کی چپ ہو گئی۔ اب یہ گھڑی ہی بری تھی یا کسی نے دھکا دیا تھا۔ مسرت بانو کا پاؤں تیل پر پڑا اور وہ سب کے پیروں میں چاروں شانے چت جا گریں اور۔۔۔ "شریکنوں" میں سے کسی نے اٹھانے کو ہاتھ بھی نہ بڑھایا۔ وہی نند ہنسی دباتے۔۔۔ منہ میں کام

والے دوپٹے کا گولہ سا پھنسا کر اٹھانے کو آگے آئی۔

"میں کہا تھا نا پالی۔۔۔ اتنا تیل نہ پا' کوئی تلک جائے گا۔۔۔ اب اپنا ہی چوکلا۔۔۔ (کولہا) تڑوا لیا نا۔"

بڑی مشکل سے چیخیں مارتی مسرت بانو کو اٹھا کر صحن میں پڑے کاؤچ پر لٹایا گیا۔

اور پھر ادھر پڑے پڑے ہی مسرت بانو نے دیکھا کہ جن رسموں کو کرنے کے چکر میں وہ اتاؤلی ہوئی جا رہی

تھیں' اب وہی رسمیں ان کی دیورانیاں اور بھابھیاں وغیرہ ادا کر رہی تھیں۔ وہ ہائے وائے کرتی نیم دراز بے بسی سے انہیں دانت کچکچا کر دیکھتی رہیں۔ شیخ جی کو پتا چلا تو خوب ہنسے... پیٹ ہلا ہلا کر بولتے رہے۔

"ڈڈی شوخی! کس نے کہا تھا بوہے پہ تیل روڑنے کو۔ اس سے تو اچھا تھا یہ جو لکڑی کی طرح سر کے ہیبے (بال) اڈے ہوئے ہیں' انہی کو تیل ڈال کر بٹھا لیتی قسمے! ایسا لگتا ہے جیسے انگیٹھی موندی (الٹی) ماری ہو... ہاہاہا... ہاہا!"

شیخ جی اور پیچھے کھڑی نند کا ــــــ ہنسنا برداشت نہ ہو سکا تو مسرت بانو نے کاؤچ کے قریب ہی رکھا اسٹیل کا گلاس اٹھایا اور شیخ جی کے پیٹ پہ دے مارا... شیخ جی کی "اوئی" کے ساتھ ہی نند پیچھے سے کھسک گئی۔

"ذرا ٹڈ (پیٹ) ہولا رکھیں شیخ جی... اتنے جھٹکوں سے یہ بو سکی چر جانی ہے۔ اب جائیں ذرا کچن میں نائن ہوگی۔ بھیجیں اسے ذرا' آکر میری مالش کردے' ورنہ صبح اٹھنے جوگی نہیں رہوں گی... ہائے... ان کم بختوں نے مجھے نظر لگادی... جاتے ہوئے کیسی مسرت نذیر لگ رہی تھی۔ آتے ساتھ ہی "عابدہ پروین" جیسا پٹاکا (پٹاخہ) وج گیا... ہائے... ان کمینیوں نے ساری رسمیں کرلینی ہیں... ہائے... میرا اکواک پتر..."

شیخ جی ناک بھوں چڑھاتے واپس ہولیے تھے اور مسرت بانو... حسرت بانو بنی بے بسی سے کیمرے کی چکاچوند میں اپنی دیورانی اور نند کو' نیلوفر کا ہاتھ لگوا کر کالا بکرا صدقہ کرنے کی رسم نبھاتے دیکھ رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

ضیغم کمرے میں داخل ہوا تو نیلوفر کا ارتکاز ٹوٹا۔ وہ یک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ضیغم نے ایک نظر اپنی دلہن پر ڈالی اور شیروانی کے بٹن کھولتا سامنے صوفے پہ ٹک گیا۔ وہ بھی کچھ گھبرایا ہوا تھا یا اس وقت نیلوفر کو محسوس ہو رہا تھا۔ جھکی نظر سے وہ سامنے بیٹھے شخص کے وجود کی بے چینی صاف محسوس کر سکتی تھی۔ اس نے ذرا کی ذرا نظر اٹھائی... اور پھر ٹھٹک کر کچھ دل میں ٹوٹ سا گیا۔

گول مٹول سا سراپا اس کے سامنے تھا۔ سرخ و سفید خون چھلکاتا صحت مند چمکتا چہرہ... کلین شیو سر پر گھنے سلکی گولڈن براؤن سے بال... نین نقش خوب صورت دکھتے تھے مگر چہرے کے گوشت میں کہیں چھپ چھپا گئے تھے۔ میک اپ کے باوجود اتنی تازگی نیلوفر کو اپنی جلد میں محسوس نہیں ہوئی جتنی اسے ضیغم کی جلد لشکارے مارتی لگی تھی' مگر سب باتوں سے ہٹ کر اس کا دھیان صرف اور صرف اپنے جیون ساتھی کے ہاتھی جیسے بدن پہ اٹک گیا تھا۔

ضیغم نے بمشکل سانس کھینچتے ہوئے نیلوفر کو دیکھا۔ اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ جھینپ کر مسکرا دیا' نظر جھکائی' پھر اٹھائی' پھر آدھی جھکا کے واپس اٹھالی اور بولا...

"آپ بہت پیاری لگ رہی ہیں... لوفر..." نیلوفر کے اعصاب کو جھٹکا لگا... بے حد ناگواری سے اس نے تصحیح کی۔

"نیلوفر... نیلوفر نام ہے میرا..."

"وہی کہا تھا جی... بس اس وقت "اندرونی حالت" کی وجہ سے پورے لفظ کو دھکا نہیں لگا... آدھا ہی ادا کرسکا... نیلو... فر..." نیلوفر کو اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی' تب ہی اس کا منہ دیکھنے لگی۔

"میرا مطلب ہے... میرے اندر... میرے معدے میں گڑبڑ ہے..."

"اوہ..." ضیغم کی وضاحت پر وہ بس اتنا ہی کہہ سکی تھی۔

"اصل میں بارات نکلنے سے پہلے جب مہمان اکٹھے نہیں ہوئے تھے' تو امی نے زبردستی کھانا کھلا دیا کہ نہ جانے اور کتنا ٹائم لگے... مگر کھانا کھاتے ہی بارات نکلنے کے لیے تیار کھڑی تھی... پھر بارات کا کھانا کھایا... واپس آیا ہوں تو یار دوستوں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے پھر اتنا کچھ کھلا دیا۔ اب بندے میں اتنی بھی

گنجائش تو نہیں ہوتی نا۔"

نیلوفر نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہتی ہو' نہیں' خیر ایسی بھی اب بات نہیں۔

ضیغم کھسیانی سی ہنسی ہنس دیا... شاید کوئی مزید وضاحت بھی کرتا مگر اسی لمحے دھاڑ سے دروازہ کھولتی اس کی اماں مسرت بانو اندر داخل ہوئیں۔

"کی ہویا میرے پتر نوں... ماں صدقے' ماں واری! مجھے تو "پھوتی" (ملازمہ) نے بتایا کہ تیرے پیٹ میں تکلیف ہے۔ میں اسی وقت اپنی تکلیف بھول بھال اٹھ کھڑی ہوئی۔ بڑے سیاپوں سے سیڑھیاں چڑھتی آئی ہوں... چل میرا بچہ... چل شاباش... یہ پھکی کھا اور پھر آرام کر... ہائے ہائے! آج تو ہم دونوں ماں پتر کو زمانے نے نظروں میں ہی لے لیا ہے۔ سب مرن جوگیاں کہہ رہی تھیں کہ اپنا ضیغم تو آج بالکل معمر رانا لگ رہا ہے' بس لگا دی نظر۔"

"ہونہہ! معمر رانا کا موٹا ورژن..." نیلوفر جی ہی جی میں بدبدائی اور ماں کو بیٹے کے چونچلے اٹھاتے دیکھے گئی۔ اس کی طرف ساس کا دھیان تک نہیں گیا تھا اور یہ خاصی دھیان طلب بات تھی۔

"بڑی جان مارنی پڑے گی نیلو... یہاں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ نیچے سے اوپر سب ہی کو تربیت کی اشد ضرورت ہے... کمر کس اور شروع ہوجا بس..."

ایک ٹھنڈی اور لمبی سانس اپنے اندر اتار کر نیلوفر ایک مشکل عزم کا دل میں اعادہ کرتے دھیرے سے بیڈ سے اتر آئی۔ آنے والے کئی دن اس کے صبر کا امتحان لینے والے تھے۔

☼ ☼ ☼

ولیمہ بھی قدرے عافیت میں گزر گیا... غنیمت تھا کہ اس دن کوئی حادثہ نہیں ہوا۔ مکلاوے کی رسم بھی پوری ہوئی۔ اس کے میکے میں خوب ناز اٹھائے گئے ضیغم کے۔ اس کے قیمتی لباس اور ضیغم کی لیٹسٹ ماڈل کی کرولا گاڑی کی پورے محلے میں دھوم مچی تھی۔ سب ہی اس کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔ آخر اکلوتا کھاتے پیتے گھرانے کا سپوت' جس کا جثہ اس کے متمول ہونے کی گواہی دیتا تھا اور بھلا کیا چاہیے تھا۔ دو تین دن میں اتنا تو نیلوفر کو اندازہ ہو ہی چکا تھا کہ ضیغم اور ابا جی (شیخ جی) کھانے پینے کے از حد شوقین ہیں اور مسرت بانو کھلانے کی۔

ابا جی کا رویہ اس کے ساتھ بے حد مشفقانہ اور دوستانہ تھا' جبکہ مسرت بانو... جن کو اس نے بھی امی کہنا شروع کردیا تھا۔ وہ ذرا موڈی تھیں۔ موڈ ہوا تو سارا وقت اسے مسکرا مسکرا کر دیکھے جاتیں۔ اتنا کہ اسے شبہ سا ہونے لگتا کہ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو اور کبھی اتنی سنجیدہ ہو جاتیں... جبڑے ایسے بھینچے ہوئے کہ اسے یقین ہو جاتا کہ آج ان کی داڑھ میں درد ہے۔

روز ہی کہیں نہ کہیں دعوت ہوتی' جہاں جانے کے لیے ضیغم کا بس نہ چلتا کہ وقت سے کہیں پہلے چلا جائے۔ ہر دعوت پر جانے سے پہلے مسرت بانو اپنے "کاکے" کو تاکید کرتیں کہ "میرا پتر... رج رج کے کھانا کھائیں... شرما شرمی بھوک تھوڑی نہ کریں۔"

اور پتر جی ایسا رج رج کے کھاتے کہ کھلانے والوں کا رج ہو جاتا۔ نیلوفر مارے شرم کے بس ذرا ذرا سا ٹونگے جاتی کہ شاید اس کے نہ کھانے سے ہی پیچھے کچھ بچ جائے۔ شیخ جی بھی اس معاملے میں پیچھے تھوڑی تھے۔

کسی دعوت پر کوفتوں کا ڈونگا جب دوسری بار خالی ہوا تو خاتون خانہ جو رشتے میں ضیغم کی چچی لگتی تھیں' فرمانے لگیں۔

"پا جی... مسالا تے سارا الحمدللہ... تسی مکا و تا... ہن اندر دو تن کوفتے وچارے پتیلے وچ ہال ہال کر رہے نے بیبے... او تسی انج کرو کہ بوجے (جیب) وچ پالو..."

جواباً "شیخ جی ہنس ہنس کر لال ہو گئے۔ انہیں یہ جملہ یقیناً "طنزیہ" نہیں اعزازیہ لگا تھا۔

اللہ اللہ کر کے یہ دعوتوں کا "اذیت ناک" دور تمام ہوا تو نیلوفر کی جان میں جان آئی۔ اتنی شرمندگی تو اس

نے تب نہیں اٹھائی تھی جب ایف اے میں وہ مضامین میں سپلی آئی تھی۔ جتنی ان پندرہ میں دنوں میں وہ اپنے شوہر اور سسر کے ہاتھوں اٹھا چکی تھی۔ سپلی والا داغ تو بعد میں اس کی اچھی کارکردگی نے دھو ڈالا تھا مگر یہ سارے دعوتوں کے قصے تو تمام عمر کے لیے رشتے داروں کے ہنسنے کا سامان کر گئے تھے۔ اس کے میکے والوں کی تو خیر تھی کیونکہ وہ سب ہی عظیم اور اس کے گھرانے سے مرعوب تھے مگر سسرالی رشتے داروں میں تو دوپٹوں میں منہ چھپا کے ہنسنے والیاں اور پھر ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہونے والیوں کو خود اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

ساری ساری رات اس نے شیخ جی یعنی اپنے سسر کو تیزابیت کی وجہ سے صحن میں ٹہلتے دیکھا تھا۔ مرغن کھانے ان کی صحت کے لیے وبال تھے مگر وہ کھاتے تھے۔ خود عظیم کا یہ حال تھا کہ رات کو سرہانے پھکی کی ڈبی رکھ کے سوتا تھا جسے ہر بار آنکھ کھلنے پر پھانکتا تھا۔ اتنا کھانا ہضم کیے بغیر بستر پر ڈھیر ہونے کا یہی نتیجہ نکلنا تھا نا۔

چند دن میں ہی نیلوفر کی ہمت جواب دینے لگی تھی۔ دلہناپے کے دن تھے۔ آنا جانا بھی لگا تھا' سو خاموشی سے سب کی روٹین بھانپ لی تھی۔ بڑا مشکل کام تھا ان تین افراد کو بدلنا... دوسری صورت یہی تھی کہ نیلوفر خود بھی ویسی ہو جائے جیسے یہ سب... مگر یہ پہلی والی سے بھی زیادہ مشکل اور تکلیف دہ تھا۔

نیلوفر جو کافی دیر سے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے یہی سب سوچنے میں مصروف تھی۔ تھک ہار کر تکیہ سیدھا کر کے لیٹ گئی۔ منہ پھیر کر ایک نظر عظیم پر ڈالی' جس کی ڈکار اور خراٹے اس وقت ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔ اس نے تکیہ اٹھا کر سر کے اوپر دھرا اور خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کی۔

"ہو جائے گا... سب صحیح ہو جائے گا... دھیرے سے آرام سے اور پیار سے..."

☆ ☆ ☆

صبح وہ حسب معمول فجر میں اٹھ گئی تھی۔ نماز پڑھ کر وہ نیچے جھانکتی رہی مگر کسی کے جاگنے کے آثار نہ تھے۔ اس نے ایک دوبار عظیم کو اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ عظیم نے چندھیائی آنکھوں سے پہلا سوال یہی پوچھا تھا۔

"کیا ہوا... ناشتا بن گیا کیا۔"

نیلوفر نے کوفت سے اسے دوبارہ سو جانے کا مشورہ دیا تھا۔ کچھ دیر یوں ہی صوفے سے بیڈ پر اور بیڈ سے واپس صوفے پہ بیٹھ بیٹھ کر وقت گزارا اور پھر جوں ہی ذرا سا کھٹکا محسوس ہوا' وہ جھٹ باہر کو دوڑی... تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے کچن میں پہنچی مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ سوائے کام والے "چھوٹے" کے جو فٹافٹ کیبنٹ سے پلیٹیں نکال کر شاپر میں رکھ رہا تھا۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ شیخ جی باہر ناشتا کرتے ہیں' ان کے لیے لے کر جا رہا ہوں۔ اس نے حیرت سے کچن میں ناشتے کے آثار ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر وہاں تو جیسے مکھی بھی پھیرا مار کر نہیں گئی تھی۔ چھوٹے نے اس کی حیرت بھانپتے ہوئے دانت نکوسے۔

"چھوٹی باجی جی... وڈے باجی (شیخ جی) گھر میں ناشتا نہیں کرتے جی... محلے والے کراتے ہیں' صرف بانڈے (برتن) ہمارے ہوتے ہیں جی۔"

"ہائے... یہ تو اچھی بات نہیں... کیا کہتے ہوں گے سب محلے والے اس حرکت پہ..." نیلوفر جیسے خود سے مخاطب ہوئی۔

"چول... چول کہتے ہیں جی! میں نے خود اپنے ان نکے نکے کانوں سے سنا ہے۔" چھوٹے نے اپنے بڑے بڑے پیلے دانت دکھائے۔ نیلوفر نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ جھٹ برتن اٹھا کر باہر نکل گیا۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور فریج کھول کر کھڑی ہو گئی۔ نہ کم نہ زیادہ... دو تین قسم کے سالن تھے اور پھل وغیرہ... انڈے نظر آئے تو اس نے شکر کیا اور آٹا نکال کر کاؤنٹر پر رکھا۔ پراٹھے بنائے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس لیے پوری کی طرح خستہ اور ذرا جم

میں ہلکے پراٹھے۔ اگلے دس پندرہ منٹ میں کھانے کی میز پر تیار رکھے تھے۔ مزے دار پھولا پھولا سا آملیٹ بھی یقیناً "سب کو پسند آتا۔ چائے تھرماس میں تھی۔ خود کو سراہ کر وہ فوراً" اوپر بھاگی... تاکہ ضیغم کو ناشتے کے لیے اٹھا سکے۔ جو کہ خود ایک بہت بڑا کام تھا۔ اسے ناشتا ٹھنڈا ہونے کی بھی فکر تھی۔ حیرت انگیز طور پر ضیغم فٹافٹ اٹھ بیٹھا۔ اس نے تو بس اتنا ہی کہا تھا۔

"اٹھ جائیں' ناشتا تیار ہے... ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

آنکھیں مسلتا کچھوے کی سی چال چلتا ضیغم واش روم میں گھسا تو یہ جھٹ مسرت بانو کے کمرے کی طرف بھاگی۔

مسرت بانو کا کمرہ کچن کے بالکل سامنے تھا۔ ان کو اٹھا کر وہ کچن میں چھوٹے کے لیے ناشتا رکھنے چلی گئی۔ وہاں سے کچھ منٹوں بعد وہ ڈائننگ روم میں آئی تو ٹیبل پر ماں بیٹا سوئی سوئی شکلیں لے کر پہنچ چکے تھے۔

اس نے مسکراتے ہوئے ایک دفعہ پھر سلام کیا اور ناشتا سرو کرنے لگی۔ سب کچھ ابھی تک گرم اور تازہ تھا۔ گرم گرم خستہ پراٹھے کے ساتھ... آملیٹ!

مسرت بانو کی نیم چندی آنکھیں کھل گئیں۔ انہوں نے ڈیلے پھاڑ کر آملیٹ کو گھورا تھا۔ نیلوفر جی ہی جی میں گھبرائی "شاید ان کے ہاں آملیٹ 'حلوے' کو نہ کہتے ہوں۔

ضیغم نے آدھا پراٹھا ٹھکانے لگا بھی دیا تھا' جب مسرت بانو نے یک دم اس کا ہاتھ روک دیا۔ ضیغم کا چلتا منہ بھی بڑی مجبوری کی حالت میں رکا تھا۔

"نیلوفر پتر... یہ کیا ہے؟" مسرت بانو نے آملیٹ کی پلیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"امی! اس کو آملیٹ کہتے ہیں ہمارے ہاں..."

نیلوفر کو ابھی بھی یہی وہم تھا کہ یہ لوگ آملیٹ کو کچھ اور نہ کہتے ہوں۔

"تو پتر! یہ کھایا بھی تمہارے ہاں ہی جاتا ہو گا۔ ہمارے ہاں تو اکثر اے سی لگا کر سکون سے لمبے لیٹ کر آم کھایا جاتا ہے یا آم کھا کر لمبے لیٹا جاتا ہے... اے ہونہہ! اے ساڈا آملیٹ... ہاہاہا... ہاہا۔"

مسرت بانو نے ٹھٹھا لگایا تھا مگر ہنسنے والی وہ واحد تھیں۔ ضیغم بھی نیند سے بھری آنکھوں سے نوالہ ہاتھ میں لیے ہونق سا ماں کو دیکھ رہا تھا۔ سمجھ کچھ نہیں آئی تھی۔ نیلوفر نے صفائی دینے کی کوشش کی۔

"اصل میں امی جی... میں نے سوچا کہ صبح صبح اتنا بھاری ہو جائے گا ناشتا... اس لیے سالن گرم نہیں کیا۔"

"کیوں پتر... ہمارے ناشتے کے ساتھ وٹے بندھے ہوتے ہیں... اور سالن میں ایسا کیا ہے... ایک قورمہ پڑا ہے' تو دوسرا چکن مکھنی ہے۔ پراٹھوں کے ساتھ تو سواد ہی ان سالنوں کا آتا ہے۔"

نیلوفر زچ سی ہوتی سر جھکا گئی۔ سارا موڈ غارت ہو گیا تھا۔ پہلی کوشش 'پہلا پھاہ (پھندا)' والی بات ہوئی تھی۔ اس نے اگلے حکم کے لیے ساس کا منہ تکا۔

"جا میری بچی! چل شاباش... سالن گرم کر کے لے آ' میرے ضیغم نے تو کبھی انڈہ چکھا بھی نہیں... اس کے حلق سے سالن کے بغیر پراٹھا کہاں اترتا ہے۔ جا شاباش اور ذرا جلدی کر اب... ورنہ یہ پاپڑ جیسے پراٹھے ہوا وچ اڈنے (اڑنے) لگ جائیں گے۔"

مسرت بانو نے چٹکی سے ایک پراٹھے کو ہوا میں لہرایا۔ انداز سراسر تمسخرانہ تھا۔ اس نے ایک تاسف زدہ نگاہ ناشتے کے لوازمات پر ڈالی۔ وہ مڑنے لگی تھی' جب پیچھے سے شیخ جی کی آواز آئی۔

"آہو پتر... تیری سس کو کہاں چنگا لگتا ہے اتنا نازک سا پراٹھا... یہ تو کبھی پوری کھائے تو دو پوریاں اکٹھی جوڑ کر کھاتی ہے۔ خود پراٹھے بناتی ہے تو پرت کے نیچے اتنی موٹی آٹے کی تہہ نکلتی ہے کہ بندہ اک ہور پراٹھا بیل لے... قسمے۔"

"ہاں... ہاں... ساری عمر میرے ہاتھ کے پراٹھے کھا کھا کر اتنا وڈا ٹڈ کر لیا... اب انہی پراٹھوں میں کیڑے پیار ہے ہو شیخ جی تسی..."

مسرت بانو کا منہ پھول گیا تھا۔ شیخ جی نے لاپروائی سے انہیں دیکھ کر سر جھٹکا اور نیلوفر کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ چپ چاپ ضیغم کے ساتھ والی کرسی پر ٹک گئی۔

"پتری! آج ذرا ان دونوں کو یہ ہی ناشتا کرنے دو۔ ورنہ ہمارے ہاں تو آنڈے فرج میں اتنا عرصہ پڑے رہتے ہیں کہ نمانے چوچے نکل آئیں۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ ہاہا!"

شیخ جی کو اپنی بات پر ہنسنے کے لیے کبھی کسی دوسرے فرد کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ وہ اکیلے ہی بہتیرے تھے۔ مسرت بانو نے چڑ کر وہی ناشتا زہر مار کرنا شروع کر دیا تھا۔ ضیغم بھی نیم مدہوش سا نوالے ٹونگ رہا تھا۔

نیلوفر نے بھی آدھا پراٹھا اپنی پلیٹ میں رکھا اور تھرماس میں سے چائے سب کے کپوں میں ڈالنے لگی۔ جبکہ شیخ جی نے بڑے ٹھسے سے پراٹھے پر ایک بڑا سا پیس آملیٹ کا رکھ کر بڑے بڑے نوالوں کی صورت میں نگلنا شروع کر دیا تھا۔ نوالہ چباتے ہوئے ان کا دھیان ضیغم کی طرف گیا تو بولے۔

"پتر۔۔۔ اس بوستی کو نیچے لانے سے پہلے پانی کی بھری بالٹی میں ایک ڈوبا (ڈبکی) دے دینا تھا۔"

"شرم کریں شیخ جی! جوان پتر کو نوں کے سامنے باتیں سنا رہے ہیں۔ اب یہ کوئی ننھا کاکا نہیں ہے جسے آپ جو مرضی کہہ دیں۔ ماشاء اللہ بیوی والا ہو گیا ہے۔"

مسرت بانو کو بیٹے کی عزت افزائی ہضم نہیں ہوئی تھی۔

"آج میں دکان پر آؤں گا ابا جی۔۔۔ پکا ارادہ ہے میرا۔ میں نے ہی نیلوفر کو جلدی اٹھانے کو کہا تھا۔" ضیغم نے منمناتی آواز میں کہا۔ اسے بھی امید نہیں تھی کہ بیوی کے سامنے ایسی سبکی اٹھانی پڑے گی۔

"جی۔۔۔ جی۔۔۔ ابا جی! انہوں نے مجھے کہا تھا اٹھانے کو۔۔۔" نیلوفر نے اس کے جھوٹ کو تقویت دی تھی۔ کچھ بھی تھا۔۔۔ شوہر تو تھا اور اس کی عزت بھی۔

"چنگی گل اے پتر۔۔۔ اب تو آگئی ہے تو ذرا اس کو انسان بناؤ۔۔۔ ورنہ اس کی ماں نے تو کھلا کھلا کے اسے "گیسی غبارہ" بنا چھوڑا ہے۔"

شیخ جی طنز کا آخری تیر پھینک کر ناشتے میں مصروف ہو گئے تھے۔ ضیغم نے بھی رفتار تیز کی تھی جبکہ مسرت بانو نہ جانے کیوں نیلوفر کو کینہ توز نگاہوں سے وقفے وقفے سے گھورے جا رہی تھیں۔۔۔ اور نیلوفر کو یہ سوچ کر سکون محسوس ہو رہا تھا کہ کم از کم کوئی تو تھا جو اس کے لیے مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کے سر کا ڈنڈا لہراتا رہتا تو وہ مکمل نہ سہی۔۔۔ کچھ تو ضیغم کے اندر تبدیلی لا سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

یہ اس کا پچھلے چار گھنٹوں میں کمرے کا پانچواں چکر تھا۔ ہر چکر میں وہ ضیغم کو اسی پوزیشن میں الٹا لیٹ کر ٹیب کے ساتھ مگن دیکھ رہی تھی۔ آتے ہی اسے کہا کہ اٹھ کر ذرا نیچے چلا آئے یا کم از کم لیٹنے کے بجائے بیٹھ ہی جائے مگر اس نے جیسے سن کر بھی ان سنا کیے رکھا۔ اس دوران نیلوفر نہ صرف رات کے کھانے کے لیے چانپ پلاؤ دم دے چکی تھی' بلکہ ساتھ فرنی بھی تیار کی تھی۔ اپنے اور ضیغم کے ڈھیر کپڑوں کو استری کیا تھا مگر آفرین تھا اس مال کے بچے پر جو اس قدر لیٹ کر تھکتا نہیں تھا۔ نہ ہی اکتاتا تھا۔ اب شیخ صاحب کی دکان سے واپسی پر وہ پھر کمرے میں آئی تھی اور ارادہ یہی تھا کہ ضیغم کو لے کر ہی نیچے اترے گی' تاکہ باپ بیٹا شام کی چائے پر اکٹھے ہوں۔ کوئی گپ شپ ہو۔۔۔ ورنہ تو سارا دن منہ کی بھاپ ہی نہ نکلتی تھی۔ مسرت بانو کو زیادہ بات چیت کرنا پسند نہ تھا۔ وہ بھی صرف اس کے ساتھ' ورنہ آس پڑوس میں یا ٹیلی فون پہ ان کی خوش مزاجی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ضیغم سے باتیں کرتی تو چار باتوں کے بعد ہی اس پر سستی طاری ہو جاتی اور وہ کسل مندی سے انگڑائی لیتے ہوئے کہتا۔ "کتنا بولتی ہو تم نیلو۔۔۔ اگلے بندے کو مفت میں تھکاتی ہو۔"

☼ ☼ ☼

نیلوفر، ضیغم کو بلانے کمرے میں آئی تو صد شکر وہ اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ چھوٹا سا روم فریج کھولے جانے کیا کھانے کو ڈھونڈ رہا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز پہ پلٹا تو ہاتھ میں کوک کا ٹن تھا۔ بڑی مشکل سے نیلوفر نے خود کو غصے میں آنے سے روکا اور تیزی سے پاس آکر ٹن جھپٹ کر چہرے پر بشاشت پیدا کرتے ہوئے بولی۔

"نیچے چلیں... ابا جی بلا رہے ہیں۔ آپ کی خاطر ابھی تک انہوں نے چائے بھی نہیں پی۔ کہنے لگے کہ آپ کو بلا لاؤں تو دونوں باپ بیٹا مل کر پئیں..."

نیلوفر کو ضیغم کی تعجب سے پھٹی آنکھیں دیکھ کر احساس ہوا کہ وہ کچھ نہیں کافی زیادہ جھوٹ بول گئی ہے۔ ابا جی اور ضیغم کے تعلقات ہرگز اتنے شان دار نہیں تھے کہ نوبت یہاں تک آتی کہ ابا جی کے حلق سے پتر کے بغیر چائے بھی نیچے نہ اترتی۔

"یہ تم میرے ابا جی کے بارے میں ہی بات کر رہی ہو نا... وہی والے ابا جی ہیں نا جو ہمیشہ سے میرے ابا جی ہیں... وہی والے ابا جی ہیں نا جو..."

"جی... جی... بالکل وہی والے ابا جی ہیں جو آپ کو میدے کی بوری بولتے ہیں۔ ہو بہو وہی والے ابا جی ہیں جو آپ کو گیس غبارہ بھی کہتے ہیں۔"

نیلوفر نے ضیغم کا کھلا منہ اور پوری کھلی آنکھیں دیکھ کر اتنے پر بس کر دیا۔ اسے لگا شاید ضیغم کو برا لگا ہے۔ دل کو تاسف نے گھیر لیا۔ بھلا اسے یہ سب دہرانے کی کیا ضرورت تھی۔ باپ بیٹے کو جو بھی کہے۔ وہ درمیان میں کیوں کودے۔

"سوری ضیغم... آپ کا دل دکھا۔ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔"

"ہاں! واقعی آئندہ مذاق میں بھی ایسا مت کہنا۔ میرے تو ہوش اڑا دیے تم نے... میں بھی کہوں ابا جی اور میرا انتظار کریں چائے پہ... جس دن ایسا ہوا اس دن ہائے صدمے سے ہائے وائے کرے گی توبہ..."

ضیغم نے زنانہ انداز میں ماتھے پر ہاتھ مار کر توبہ بولا تو نیلوفر کا دل کیا کہ وہ تھپڑ تو وہ بھی دھر ہی دے۔ اتنے بڑے بچے میں عقل نام کی چیز تو ہے ہی نہیں۔

کیا سوچ رہی تھی وہ اور یہ "ہمپٹی ڈمپٹی" کس بات کو رو رہا تھا۔ لو جی آج ایک نیا نام میں نے بھی دے دیا۔ "ہمپٹی ڈمپٹی" نیلوفر کو بڑے زور کی ہنسی آئی جو اس نے بمشکل دبائی۔ کیسا فٹ بیٹھ رہا تھا یہ نام ضیغم پہ...

وہ ضیغم کو لیے نیچے چلی آئی۔ مسرت بانو چائے کے ساتھ شامی کباب تل لائی تھیں۔ ضیغم کو آتا دیکھ کر شیخ جی نے گرم گرم چائے کی لمبی سی سڑکی لی... ضیغم نظر چراتا، سامنے والے صوفے پر ٹک گیا۔ نیلوفر بھی ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ شیخ جی نے ایک بار پھر اونچی آواز میں چائے سڑکی۔ ضیغم نے بوکھلا کر ہاتھ میں پکڑا شامی کباب چائے میں ڈبو دیا... شامی بے چارہ ٹوٹ کر اندر ہی کھو گیا۔

"ایس ملراں دیاں نظراں لگ لگ کر ہی میرا پتر مارا ہو گیا اے... پہلے تے فیر باہر نکل جاندا سی، جدوں دا ویاہ ہویا اے... ہور وی ہو گیا اے ایہوں۔"

"تو نکلے نا باہر... کس نے روکا ہے، بلکہ بیوی کو لے کر جائے، ذرا اس کی بھی ہوا خوری ہو جائے گی۔" شیخ صاحب چائے کا کپ میز پر پٹختے ہوئے بولے۔ نیلوفر خاموشی سے چائے پیتی رہی۔ مسرت بانو جو بیوی کو ساتھ لے جانے کے ذکر پر پہلے ہی چیں بہ چیں ہو رہی تھیں، لہجے کو سرسری سا بناتے ہوئے بولیں۔

"نہ وہ جھلّی کو بھلا باہر لے جا کر کی کرے گا... میں تے کہنا سی گلی کے نکڑ پر بنے پان والے کھوکھے تک ہی ہو آئے۔ بے چارہ... تسی پورا ٹبر نال ٹورن لگ گئے۔"

"پورا ٹبر نئیں... صرف نیلوفر پتر کا کہا ہے۔ تو اپنی لت نہ اڑا بیچ میں۔"

شیخ صاحب نے بڑے موقع پر بیوی کی بولتی بند کی تھی۔ مسرت بانو منہ پھیر کر چائے کے بڑے بڑے گھونٹ بھرنے لگیں (درحقیقت خون کے)

"ہاں وئی... اپنا ضیغم میں تو کہتا ہوں نیلوفر پتر کو راہوالی کی قلفی کھلا کے لا، واپسی پر وہ ہم دونوں کی بھی پکڑ لانا..."

شیخ صاحب نے قلفی کا ذائقہ منہ میں محسوس کرتے۔ چسکے لیتے ہوئے رائے دی۔

"نئیں' نئیں ابا جی۔۔۔ راہوالی کی قلفی تو بالکل نہیں۔" ضیغم نے ساری گفتگو کے دوران پہلی دفعہ زبان کھولی' وہ بھی اس لیے کہ شامی کباب ختم ہو چکے تھے اور چائے کے آخری دو گھونٹ بمشکل بچے تھے۔ انہیں حلق سے اتارتے ہوئے وہ پھر سے بولا۔

"وہاں ایک ہی سڑک پر کوئی ستر قلفی والے ہیں۔۔۔ سب ہی نے اپنے اپنے وادے کی یہ۔۔۔ وڈی ساری تصویر لگا کر ساتھ لکھا ہوا ہے "اصلی پرانی مشہور راہوالی کی قلفی" اب مجھے کم از کم پہچان نہیں ہوتی کہ کس بابے کی تصویر والی قلفی اصلی ہے۔۔۔"

"وہ ہی جس کی اپنی شکل قلفی ورگی ہے۔۔۔ ہی ہی ہی" شیخ جی نے ٹھٹھا لگایا اور اسی خوشی میں ایک زوردار سڑکی لی۔ مسرت بانو جھٹ سے بولیں۔

"تو ٹھہر میرا پتر۔۔۔ امیں وی چلنی آں نال۔۔۔ مینوں پتا اے اس بابے دی تصویر دا۔۔۔ چوپی امبی (چوسی کیری) ور گا منہ اے اودا۔۔۔"

"نہیں' نہیں امی جی۔۔۔! آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں۔ میں اچھی طرح پہچانتی ہوں راہوالی کی اصلی قلفی والے کو۔ سب سے زیادہ رش وہیں تو لگا ہوتا ہے۔۔۔ دھوکا ہوتا ہی نہیں۔"

نیلوفر نے لپک کر ساس کے چلنے پر بند باندھا تھا۔ وہ سچ میں چاہتی تھی کہ ضیغم کے ساتھ کہیں اکیلی نکلے تاکہ اس کی برین واشنگ کا عمل شروع کیا جاسکے۔ گھر میں تو یا ضیغم ہر وقت اونگھتا تھا یا ٹونگتا تھا۔۔۔ تیسری صورت میں مسرت بانو ہر وقت سر پر سوار رہتی تھیں۔ اب اگر قسمت سے موقع مل ہی رہا تھا تو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اس نے چائے کے خالی برتن فافٹ اکٹھے کیے اور کمرے سے چادر اٹھا لائی۔ لپک جھپک ضیغم کو گاڑی کی چابی پکڑا کر' سلام دعا لیتی۔۔۔ ضیغم کے ساتھ بیرونی دروازے کی طرف چلتی نظر سے اوجھل ہو گئی۔ مسرت بانو ہق دق دیکھتی ہی رہ گئیں جبکہ شیخ صاحب ان کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر زور زور سے ہنسنے لگے۔ مسرت بانو بے دھیانی میں شیخ صاحب کا جھٹکے کھاتا پیٹ دیکھتے چلی گئیں۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح حیرت انگیز تھی۔ شیخ جی اپنے گھر کے صحن میں درمیانے سائز کی میز پر چنا بہترین ناشتہ نوش فرما رہے تھے۔ مسرت بانو بھی اس تبدیلی پر خوش تھیں مگر اظہار نہیں کر رہی تھیں۔ نیلوفر نے آج شیخ جی کے جاگنے سے بھی پہلے ان کی مرضی کا ناشتہ تیار کر کے میز پر لگا دیا تھا۔۔۔ جس وقت شیخ جی کمرے سے باہر آئے۔ وہ چائے سے بھرا تھرماس ٹیبل پر رکھ رہی تھی۔

"چھوٹا" بھی مستعدی سے دیگر لوازمات لا لا کر میز پر رکھ چکا تھا۔ نیلوفر نے بڑے اصرار سے سسر کو باہر جانے سے منع کیا اور سب کے ساتھ ناشتہ کرنے کو کہا۔

شیخ جی ناشتے پہ ایک نظر ڈالتے ہی ڈھیر ہو گئے اور پھر کچھ ہی دیر میں وہ تینوں وہیں ناشتہ کر رہے تھے۔۔۔ ضیغم لاکھ کوششوں کے باوجود بھی اٹھنے سے انکاری تھا۔ چھوٹا باہر جا کر تمام محلے دار صاحبان کو شیخ جی کے گھر میں ناشتہ کرنے کی اطلاع پہنچا چکا تھا۔ وہ سب بھی حیرت سے واپس ہو لیے تھے۔۔۔

قیمہ بھرے پراٹھے کا ایک بڑا سا نوالہ لیتے شیخ جی کے آگے چائے کا بھرا ہوا مگ دھرا تھا۔ نیلوفر چھوٹے چھوٹے لقمے لیتی اپنے سسر کی اسپیڈ چیک کر رہی تھی۔ جس رفتار سے ان کے سامنے کے لوازمات ختم ہوتے جا رہے تھے۔۔۔ نیلوفر کو جلد از جلد اپنا مدعا بیان کر دینا چاہیے تھا۔ وہ چاہتی تو نہیں تھی کہ ساس کے سامنے یہ موضوع چھیڑے مگر اب مجبوری تھی۔

"ابا جی! ایک بات کہنی تھی آپ سے۔۔۔"

"ایک چھوڑ کے دو بول پتر۔۔۔! ساتھ میں ذرا یہ پراٹھا بھی ادھر کھسکا۔۔۔"

نیلوفر نے فوراً" اگلا پراٹھا پلیٹ میں رکھا۔ مسرت بانو کے حواس بھی چوکس تھے۔

"وہ اصل میں ابا جی۔۔۔ میں چاہ رہی تھی کہ آپ

ضیغم کو بھی دکان پر لے جایا کریں۔ سارا دن کرنے کو کچھ نہیں ہوتا تو سست سے رہتے ہیں۔ وہاں کم از کم آپ کا ہاتھ تو بٹائیں گے ناں۔۔۔"

مسرت بانو کی آنکھوں سے یکدم چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں پراٹھے کا نوالہ یوں چبایا جیسے اس میں نیلوفر کا "قیمہ" ہو۔

"نہ۔۔۔ نہ پتر! یہ ہوائی کس نے اڑائی کہ تیرا کھسم وہاں میرا ہاتھ بٹاتا ہے۔۔۔ سارا ٹیم وہاں بیٹھ کے وہ جتنا مجھے ستاتا ہے اتنا تو گھر بیٹھ کے بھی نہیں رلاتا ہے۔ وہاں بیٹھا اپنے بوتھے کی سلفیاں بناتا رہتا ہے۔۔۔ جی تو میرا چاہتا ہے کہ موبائیل کو ایلفی لگا کر بوتھی سے چپکا دوں۔۔۔ پکی سلفی بن جائے گی۔"

نیلوفر بے ساختہ ہنس دی۔

"تو ہنس رہی ہے پتر۔۔۔ میرا وس (بس) چلے تو میں موبیلوں (موبائیلوں) کے کیمرے مکا ہی دوں۔ ایک ہی توری جیسی شکل کی بار بار فوٹو لیتے ہیں۔۔۔ جیسے کبھی نہ کبھی بدل جانی ہو۔ ایسی فوٹو آتی ہے جیسے کسی نے پیچھے سے وال پٹ (بال کھینچ) کے بٹھایا ہو۔"

"پھر بھی اباجی۔۔۔! آپ لے جایا کریں۔۔۔ آہستہ آہستہ عادت ہو جائے گی انہیں بھی۔۔۔"

"ٹھیک ہے پتر۔۔۔ اتو کہتی ہے تو تیار کر دیا کر روزانہ لے جایا کروں گا۔۔۔ ویسے فیدہ (فائدہ) کوئی نہیں ہونا۔" ایک نوالے میں باقی کا سارا پراٹھا لپیٹ کر منہ میں رکھتے ہوئے شیخ جی نے مایوس کن نتائج کی پیش گوئی کی تھی۔

نیلوفر کے دل پر بوجھ بڑھ گیا تھا۔ اس طرح سے ضیغم کو بھیجنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جب تک کہ کوئی ایسا عملی قدم نہ اٹھایا جائے جو اس کے اندر پھرتی اور چستی پیدا کرنے کا موجب ہو۔ وہاں جا کر بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہنا تھا تو یہ کوئی ایسا معرکہ نہیں تھا۔ کچھ اور۔۔۔ کچھ اور۔۔۔ کوئی ایسی کمزوری جس کی بنیاد پر ضیغم کی روٹین بدلی جا سکے۔ مسرت بانو کی تیز گھورتی نگاہوں کو نظر انداز کرتی نیلوفر اس وقت بڑی تیزی سے سوچوں کے تانے بانے بنتی کسی نتیجے پر پہنچنے والی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ امی کے ساتھ اسکول سے گھر پہنچی تو خلاف معمول گھر میں اودھم مچا تھا۔ دونوں چھوٹے بھائی یونیفارم میں ہی چھلانگیں مارتے پھر رہے تھے ورنہ ان کے گھر آنے سے پہلے وہ کپڑے بدل کر کھانا کھا کے سو بھی چکے ہوتے تھے۔ آپی اور صنوبر کو کل رات نانی دو دن کے لیے اپنے گھر لے گئی تھیں۔ چھوٹی خالہ کی شادی تھی ایک ہفتے بعد ...... مگر ان دونوں سے رہا نہیں گیا اور ابھی سے چار جوڑے لے کر چلتی بنیں۔ وہ خود امی کے بغیر کبھی بھی نہیں رہتی تھی اس لیے اصرار کے باوجود نہ گئی۔ وہ تینوں بہنیں ایک ہی اسکول میں تھیں اور امی اس اسکول کی ایس ایم تھیں۔ اس لیے بھی دونوں تسلی سے چلی گئی تھیں۔

امی نے فکر مندی سے صحن میں طائرانہ نظر ڈالی۔ صفائی ہوئی تو تھی مگر یقیناً" دونوں لڑکوں نے دنگل مچا رکھا تھا جبھی ایک آدھ گملے لڑھک گئے تھے جن کی مٹی صحن میں بکھری ہوئی تھی۔ تیزی سے صحن عبور کر کے امی نے کچن کا جالی والا دروازہ کھول کر جھانکا۔۔۔ سب صاف تھا یہاں تک کہ چولہے پہ کسی چیز کے پکنے کے آثار بھی نہیں تھے۔ امی نے سیدھا رخ اپنے کمرے کی جانب کیا۔

اس نے دیکھا کہ بیڈ پر ابو کروٹ کے بل لیٹے لال بھبھوکا چہرہ لیے کراہ رہے تھے۔ امی نے بوکھلا کر چادر اتار کر کرسی پر رکھی اور پرس ڈریسنگ پر اچھالا۔۔۔ آگے بڑھ کر ابو کو سیدھا کیا تو انہوں نے ذرا سی آنکھیں کھول کر دوبارہ موند لیں۔ امی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔۔۔ اب وہ جانتی تھی کہ باقی کا سارا دن امی اور ابو کا ایسے ہی لاڈوں میں گزرنے والا تھا۔ اس کے وجود پر یکدم بیزاری سی چھا گئی۔ وہ ست روی سے چلتی تینوں بہنوں کے مشترکہ بیڈ روم میں چلی آئی۔ بیگ اور جوتے ٹھکانے پر رکھنے کے بعد وہ یونیفارم سمیت بیڈ پر ڈھیر ہو گئی۔ امی اور ابو کے بارے میں سوچتے سوچتے وہ یونہی بھوکی سو گئی تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔

ابو مہینے میں دو تین مرتبہ بیوی سے اس قسم کے لاڈ اٹھواتے تھے۔ کبھی سچ میں بخار ہی ہوتا اور کبھی کچھ بھی نہ ہوتا مگر اس چکر میں سارا دن وہ پانچوں بہن بھائی خود ہی مارے باندھے کچھ نہ کچھ کھا ہی لیتے۔۔۔ ہوم ورک بھی کر ہی لیتے۔۔۔ اور زیادہ تر وقت برباد کرتے۔ امی بھی ابو کے لیے سوپ لے کر کمرہ بند ہو جاتیں۔۔۔ کبھی یخنی لیے پردہ پوش ہو جاتیں۔ بچوں نے کیا کھایا کچھ کھایا بھی یا نہیں۔۔۔ انہیں رتی بھر پروا نہ ہوتی۔

دوسروں کی نظر میں امی کی یہ صفت سونے سے تولے جانے کے لائق تھی۔ مگر وہ سب بہن بھائی چڑنے لگے تھے۔ وہ کوئی بہت چھوٹی بچی نہیں تھی۔ آٹھویں میں تھی۔۔۔ بڑی آپی میٹرک کر رہی تھیں جبکہ صنوبر چھٹی میں۔۔۔ دونوں بھائی جڑواں تھے اور بے حد شرارتی بھی۔۔۔ کلاس ٹو میں تھے۔

وہ بہت بچپن سے اپنے گھر کے ماحول کو دوسروں کے گھروں سے مختلف دیکھ رہی تھی۔ پہلے اتنا محسوس نہیں کرتی تھی مگر اب محسوس بھی کرتی تھی اور کڑھتی بھی تھی۔

اس کے ابو ایک صحت مند اور مضبوط ڈیل ڈول والے دراز قد آدمی تھے۔ خوش اطوار' شائستہ اور بے حد۔۔۔ سگھڑ۔ گھر چلانے کے تمام اصول و ضوابط انہیں ازبر تھے۔ کام والی ماسی لے کر دھوبی تک کا حساب کتاب بڑے ماہرانہ انداز میں کرتے تھے۔ کچن کا مینیو ترتیب دینے میں ان کا جواب نہیں تھا۔ کچن کیبنٹس کی صفائی ہو یا واش رومز میں تیزاب ڈلوانا ہو۔۔۔ وہ بڑی باریک بینی سے سر پر کھڑے ہو کر کرواتے تھے۔ امی کے ڈریسنگ کا سارا تزئین و آرائش کا سامان ان ہی کی توجہ کا مرہون منت تھا۔ چھٹی والے دن صبح صبح صحن کی کیاری میں لگے موتیے کے پودے سے پھول چن کر امی کے لیے خوب صورت گجرا وہی تیار کرتے تھے اور امی نہال ہو ہو جاتی تھیں۔۔۔ اور ابو انہیں نہال رکھنے میں ماہر ہو چکے تھے۔ یہ تھی ان کے گھر کی بظاہر نارمل مگر درحقیقت ابنارمل سی صورت حال۔۔۔!

نیلوفر کی نظر میں اس گھر کا مرد امی تھیں اور عورت' ابو تھے۔ امی کی حیثیت اس گھر کے سربراہ کی سی تھی جو سارے گھر والوں کی کفالت کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھیں۔ وہ بہت چھوٹی عمر سے ابو کو کسی ماہر امور خانہ داری کی مانند گھریلو امور نمٹاتے دیکھ رہی تھی۔۔۔ اور یہ سچ تھا کہ اس کے ابو نے کبھی کوئی "کمائی والا کام" نہیں کیا تھا۔ ان کی زندگی ایسی عورت کی طرح تھی جو کسی دور افتادہ گاؤں میں پیدا ہوتی ہے' روٹیاں تھوپتی جوان ہوتی ہے اور اپنے بچے بیاہتے ہی مر جاتی ہے۔۔۔ نہ کوئی مقصد' نہ کوئی مصرف۔۔۔!

اس کے امی' ابو کی پسند کی شادی تھی مگر اس پسند کا علم بھی صرف ان ہی دونوں کو تھا۔۔۔ دونوں رشتے دار تھے اور دونوں کے ہی گھر والے نہایت سخت اور ہٹ دھرم۔۔۔! ایسے میں جب ان دونوں میں ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی کے جذبات پیدا ہوئے تو دونوں نے ہی چپ سادھے رکھی۔ اب یہ نہایت حسین اتفاق تھا کہ جنت بی کو اپنے بیٹے اظہر کی دلہن کے طور پر اس کی ماں عافیہ خود بخود پسند آ گئی اور دونوں میں معاملہ نمٹ گیا۔ اظہر نے بھی ماں کے آگے بھاپ نہ نکالی مبادا وہ "قرار" کو "انکار" میں بدل دیں۔

باؤ جی کی چلتے بازار میں چار' پانچ دکانیں تھیں۔۔۔ سب کی سب کرائے پر اٹھا رکھی تھیں۔۔۔ سوائے ایک کے' جس پر وہ خود بھی بیٹھتے تھے۔ اظہر طبیعتاً "سہل تھے' اکلوتے تھے۔۔۔ کبھی بھی دکان پر نہ بیٹھے۔ باؤ جی نے لاپروائی برتی اور بیٹے کو ڈھیل دیے رکھی۔۔۔ نتیجتاً" اظہر گھر کے ہو کر رہ گئے۔ باؤ جی اور جنت بی نے اکلوتے ہونے کی وجہ سے شروع سے ہی ہتھیلی کا پھپھولا بنا رکھا تھا۔۔۔ گھر سے باہر زیادہ کھیل کود کی بھی اجازت نہیں تھی اور باہر گلی سے آتی بچوں کی آوازوں سے دھیان ہٹانے کے لیے جنت بی' اظہر کو اپنے ساتھ لگائے رکھتیں۔

یوں بات تھالی' پیالی کو اٹھا کر سنک میں رکھنے سے شروع ہوئی اور پھر یہ قصہ اتنا طویل ہوا کہ اظہر جنت بی کی غیر موجودگی میں غضب کا بگھار لگانا بھی سیکھ گئے۔۔۔

کوئی سا بھی پلاؤ ہو۔۔۔ اظہر کے لیے اسے بنانا بالکل ایسا ہی ہو گیا' جیسے کسی بچے کا آنکھ میچ کر ٹھیک نشانے پر کنچا لگانا۔ ماں باپ اظہر کے سگھڑاپے پر پھولے نہ سماتے ۔۔۔ جنت بی نے چولہا چوکا تو نہیں مگر کپڑے استری کرنا' چائے بنانا اور اس کے برتن دھو دینا۔۔۔ اس طرح کے دیگر کئی چھوٹے بڑے کام مستقل اظہر کے حوالے کر دیے۔ کھانے کے ساتھ سلاد چٹنی بنانا بھی انہی کی ذمہ داری تھی۔ کپڑے' برتن اور صفائی ستھرائی کے لیے دو ملازمائیں آتی تھیں ورنہ کچھ بعید نہ تھا کہ اظہر ان کاموں میں بھی مہارت پا جاتے۔

گھر میں روپے پیسے کی فراوانی تھی۔۔۔ دکانوں کا کرایہ اس قدر تھا کہ اگر باؤ جی چاہتے تو خود بھی بے شک گھر بیٹھ رہتے۔ مگر اپنے معاملے میں انہوں نے عقل مندی سے کام لیا اور دکان سنبھالے رکھی۔ ان تمام باتوں نے اور گھر کے ماحول نے مل کر اظہر کے اندر موجود "مردانہ اعتماد" کو پھپھوندی لگا دی۔ بس ایک کام انہوں نے نہ جانے کیسے کر لیا۔۔۔ جو خاندانی تقریبات میں جنت بی کے ساتھ چپکے بیٹھے اظہر نے عافیہ کو پسند کر لیا اور نظروں ہی نظروں میں پیغام بھی پہنچا دیا۔ عافیہ کا گھرانہ سفید پوش تھا۔۔۔ سات بہنیں تھیں اور دو نابالغ بھائی۔۔۔ !عافیہ تیسرے نمبر پر تھیں۔ غریبی تھی مگر وضع داری تھی۔ عافیہ کی دونوں بڑی بہنیں ٹھکانے لگ چکی تھیں۔۔۔ والد نے ایک نیکی یہ کی تھی کہ بی۔ اے سے کم کوئی نہ بیاہی اور والدہ نے یہ ثواب کمایا کہ کوئی گھریلو ہنر ایسا نہ تھا جو بیٹیوں کے ہاتھوں میں نہ تھمایا۔ عافیہ کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے گھر بیٹھ کر ایم۔ اے اردو کر لیا تھا۔ جاب کی اجازت مانگی مگر باپ کی ایک کڑی نگاہ نے دہلا دیا' سو چپکی ہو بیٹھیں۔۔۔ پھر بھلا کیسے ممکن تھا کہ والد جہاں دروازے کے باہر کسی محلے کے لونڈے کا غیر ضروری چکراتا محسوس کرتے۔۔۔ باقی کا سارا دن تھڑے پر کرسی رکھ کر بیٹھ رہتے' ساتھ بائیں ہاتھ میں یہ موٹا تازہ بانس کا ڈنڈا تھام لیتے۔۔۔ کیا مجال کہ پھر کوئی پھیری والا بھی پھیرا لگا جائے۔۔۔

ایسے میں اپنی کسی بیٹی کی پسند کی شادی کروانے سے بہتر وہ اسے مار کر سب سے آخری کوٹھری میں دبا دینا پسند کرتے۔۔۔ لہٰذا عافیہ' اظہر کی پسندیدگی نگاہوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔۔۔ !بس قسمت نے یاوری کی اور جنت بی رشتہ ڈال گئیں۔ کچھ دن بعد ہاں کہلوا دی گئی اور یوں عافیہ' جنت بی کے آنگن میں دھنک رنگ آنچل لہرانے کے لیے چلی آئیں۔

جنت بی کی چھوٹے گھر سے لڑکی لانے کے پیچھے صرف یہ نیت تھی کہ پیٹ بھر کھائے گی' من چاہا پہنے گی تو وہ جس ڈھب پہ چلانا چاہیں گی۔۔۔ چل پڑے گی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ عافیہ ہو بہو ان کی سوچوں کا عکس نکلیں۔ جنت بی نے جس انداز میں بیٹے کی پرورش کی تھی۔۔۔ بھلے وہ لاکھ کم گو اور بردبار محسوس ہوتے تھے مگر در حقیقت غور کرنے پر ان کی شخصیت کی کجیاں صاف دکھائی دیتی تھیں۔ دادی نے انہیں "لاڈو" بنا کر پالا تھا اور اب یہ عالم تھا کہ پاؤ بھر دہی لینے جاتے تو زبان لڑکھڑا جاتی۔۔۔ کنپٹی سے پسینہ رینگ کر ٹھوڑی تک چلا آتا۔۔۔ ہاں! گھر میں خوب چہکتے' کبھی چار رشتے دار عورتیں اکٹھی ہو جاتیں تو خاطر کے ساتھ ساتھ زمانے بھر کے قصے دہراتے اور واپسی پر تمام خواتین مہمانوں کی زبان پر یہی بات ہوتی کہ

"ایسا سگھڑاپا تو ہماری بیٹیوں کو نصیب نہ ہوا جیسا جنت بی کے لڑکے کو۔۔۔ واللہ! جس گھر جائے گا وارے نیارے ہو جائیں گے۔۔۔" ہاتھ پر ہاتھ مار کر ٹھٹھا لگایا جاتا۔

اظہر نے پڑھائی بھی کی تھی۔۔۔ کوئی ان پڑھ یا عقل سے عاری شخص نہ تھے۔۔۔ مگر میٹرک پرائیویٹ' ایف اے پرائیویٹ اور بی اے کی تیاری تو کی مگر پیپرز نہ دیے۔

عافیہ سے شادی ہوئی تو گویا ہفت اقلیم کی دولت مل گئی۔ دن رات مستی و بے خودی میں گزرنے لگے۔ عافیہ خوشی سے دیوانی ہو گئیں کہ میاں ایسا پاگل ہوا میرے پیچھے کہ کام دھندا سب چھوڑ چھاڑ میری ہی شکل نیارے جاتا ہے۔ عافیہ کے آتے ہی جنت بی نے کھانا بنانے کے لیے بھی ملازمہ رکھ لی۔۔۔ نت نئے

پکوان بنتے اور جنت بی کے حکم پر عافیہ ٹرے سجا کر کمرے میں لے جاتیں۔ کیسی فرشتہ صفت ساس ملی تھیں انہیں... عافیہ بار بار نظر بد سے محفوظ رہنے کے لیے دعائیں مانگا کرتیں۔ وہ یہی سوچتیں کہ خاص ان کے لیے جنت بی نے دل اتنا بڑا کیا... ورنہ کون اپنے اکلوتے بیٹے کو بہو کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھنے دیتا ہے...

وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ اس سب میں نیا کچھ بھی نہیں تھا۔ اظہر ہمیشہ سے گھر کے ہی تھے اور جنت بی بڑی حکمت عملی سے چل رہی تھیں۔ دلہناپے کے دن گزرے تو عافیہ نے کچن میں جھانکا... سوچا کہ ملازمہ کے ساتھ ہاتھ بٹائیں کچھ اپنے بھی جوہر دکھائیں... مگر یہاں بھی جنت بی آڑے آگئیں کہ ساری عمر یہی کچھ کرنا ہے... میاں کو خوش رکھا کرو بس...! پہلی دفعہ عافیہ نے سوچا کہ ہر وقت کمرے میں بیٹھ کر میاں کو کیسے خوش رکھوں، کتنی باتیں کروں... اب تو انہیں وہ تمام ڈائیلاگ زبانی ___ یاد ہو چکے تھے جو دن کے اٹھارہ گھنٹے اظہر دہراتے تھے۔ انہیں انتظار تھا کہ کب اظہر بھی باؤ جی کے ساتھ کام پر جانا شروع ہوں اور واپسی کے لیے وہ تمام دن گھڑیاں گنیں۔ مگر یہاں ایسی کوئی صورت حال نظر نہیں آتی تھی۔ رشتے داروں میں، میکے میں اور ادھر ادھر... محض چند ایک جگہوں پر اظہر، عافیہ کے ساتھ گئے ورنہ جنت بی ہی جاتیں اور مل ملا کر چلی آتیں اور پھر ایک دن عافیہ پر آشکار ہوا کہ اظہر تو کبھی کام پر گئے ہی نہیں... باؤ جی جاتے تھے اور کماتے تھے اور ان کی کمائی کس کی تھی... اظہر کی! قصہ ختم!

یہ بات جنت بی نے دو ٹوک انداز میں عافیہ کو سمجھائی تھی اور وہ ہمیشہ کے لیے سمجھ گئیں۔ دوبارہ کبھی بھی شوہر کو کام پہ بھیجنے کی بات نہیں کی......! شروع میں بے حد جھنجلائیں... سارا دن میاں سر پر سوار رہتے اور ساری رات وہ میاں کا خوابیدہ چہرہ دیکھ دیکھ بیزار رہتیں۔ کبھی ایسا بھی کسی کے ساتھ ہوا تھا بھلا کہ شوہر بتاتا ہو... "آج کپڑے دھونے والی ماسی آئے گی... پردے دھلوانے کی باری ہے، تو جوڑوں کے لیے کلف بھی بنا لینا...!"

"آج صغراں کو کہو کچن کیبنٹ صاف کرلے اور... مسالوں والے ڈبے بھی خالی کرکے دھوئے... دالوں کے ڈبے بھی چیک کرے کہیں کیڑا نہ لگ گیا ہو...!"

"جالے اتارنے ہیں، پنکھے صاف کرنے ہیں، فینائل والا پوچا صوفے اٹھوا کر لگوانا ہے، واش رومز میں تیزاب ڈلوانا ہے... وغیرہ وغیرہ...!"

عافیہ حیران ہوتیں کہ اتنا پرفیکٹ شیڈول سیٹ کر رکھا تھا اظہر نے... کہ کیا کوئی عورت کرے گی۔ اچار، چٹنیاں، مربے... یہ سب بنانا عافیہ نے میاں جی سے سیکھا... اور خوب سیکھا!

رفتہ رفتہ عافیہ اسی روٹین کی عادی ہوتی چلی گئیں۔ اور کیوں نہ ہوتیں... کچھ بھی تھا، جیسا پہننا اوڑھنا اور کھانا پینا... برتنا اور جی کھول کر لٹانا، انہیں یہاں ملا تھا، ویسا تو وہ خواب میں بھی نہیں سوچتی تھیں... اور ان کی آنکھیں نہ جانے کب تک بند رہتیں... جو باؤ جی ایک جھٹکے میں ختم ہوکے سب کی زندگیوں کو جھٹکا نہ دے جاتے۔ سب آنکھیں پھاڑے بیٹھے رہ گئے...!

جنت بی رونے کرلانے سے فارغ ہوئیں تو کوئی ڈھائی تین ماہ تو ہو ہی چکے تھے باؤ جی کو بیتے... ابھی بھی کھٹک اس لیے گئیں کہ تیسرا مہینہ شروع ہوگیا تھا... صرف پہلے مہینے دکانوں کا کرایہ ملا... اس کے بعد تمام شد...! جس دکان پر باؤ جی خود بیٹھتے تھے وہ تب سے بند ہی تھی جب سے وہ فوت ہوئے۔ جنت بی نے چار بندے بلوا کر دکانوں پر بھیجے تو وہاں نیا ہی تماشا بپا تھا۔ کرائے دار ملی بھگت سے قبضہ جما کر بیٹھ گئے اور کرایہ دینے سے صاف انکار...! کہا کہ باؤ جی نے ان تمام سے قرض لے رکھا تھا جس کی ادائیگی نہیں کی گئی سو دکان بھول جاؤ اور گھر کو جاؤ...! سب کو معلوم تھا کہ یہ سب بکواس ہے... مگر دکانوں پر مونچھیں مروڑتے غنڈوں سے نمٹتا کون... اظہر محمود!... ناں! اظہر میاں تو ان دنوں ایسے بولائے پھرتے تھے کہ بس چلتا تو اتنے چھوٹے ہو جاتے کہ نمک دانی میں سما پاتے۔ نہ کسی کی نظر پڑتی نہ کسی کو نظر آتے

جہاں حق دار جی کڑا کر کے میدان میں نہ اترے وہاں رشتے دار گردن کٹوانے کیوں چل پڑتے۔۔۔ لہٰذا سب ہی چپکے ہو بیٹھے۔ پہلی دفعہ جنت بی بھر کر میدان میں آئیں اور بیٹے کو بے بھاؤ کی سنائیں۔۔۔!

اظہر آنکھیں پھاڑے ماں کو دیکھے جا رہے تھے۔۔۔ حیرت سی حیرت تھی۔ عافیہ نے شوہر کو آزردہ دیکھا تو برداشت نہ کر سکیں اور تن کر ساس کے سامنے آن کھڑی ہوئیں۔ پھر تو وہ طعنے شروع ہوئے کہ اگلے پچھلے کھاتے سب برابر کیے گئے۔ جنت بی کا موقف کہ "ارے مرد بن مرد' جائے تے ڈگرے (ٹکڑے) کر کے آوے انہاں بے ایماناں دے۔" جب کہ عافیہ بضد کہ "ساری عمر موم کا گڈا بنائے رکھا۔ اب آگ دامن کو لپکنے لگی تو اسی کو پکڑ کر جھونک دیں۔"

کئی دن تک جنگ جاری رہی۔۔۔ ہمت کر کے اظہر اپنے دو تین کزنز کے ساتھ گئے بھی تو منہ کی کھا کر واپس آئے۔ اگلے پکے کام کروا کر بیٹھے تھے۔۔۔ ایسے ایسے حساب کتاب کھول کر بیٹھ گئے کہ وہیں بیٹھے بیٹھے اظہر میاں دکانوں پر نفرین بھیج بیٹھے۔ جنت بی روتی پیٹتی رہ گئیں۔۔۔ کیس کرنے کو کہا مگر اظہر ٹس سے مس نہ ہوئے۔ عافیہ بھی اس معاملے میں شوہر کی ہم نوا تھیں کہ آخر دن رات کا ساتھ تھا۔۔۔ جانتی تھیں کہ صاحب بہادر کتنے پانی میں ہیں۔

کچھ بھی تھا عافیہ کو شوہر کی زندگی عزیز تھی اور اظہر تو ایک تھپڑ کی مار تھے۔۔۔ دوسرے کی نوبت ہی نہ آتی! دو بچیاں تھیں۔۔۔ تیسری کی آمد تھی۔۔۔ ایسے میں خاوند کی جان کا رسک کم از کم وہ ہرگز نہیں لے سکتی تھیں۔ جنت بی چار دن بولتیں۔۔۔ پھر اٹوانی کھٹوانی لے کر پڑ جاتیں جیسے ہی تھوڑی ہمت جمع ہوتی۔۔۔ پھر بولتیں۔۔۔ مگر سنتا کون!

باؤ جی کی دکان بند پڑی تھی۔۔۔ چند ماہ جمع جتھے سے کام چلا اور پھر عافیہ کو سب سے پہلے احساس ہوا کہ آئندہ نہیں چلنے والا۔ عافیہ نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے جنت بی کے سامنے ساری صورت حال رکھی۔ جواباً "خاموشی سے بے نقط سنیں اور پھر دونوں ساس بہو سر جوڑ کر اس مسئلے کا حل سوچنے لگیں۔۔۔ خوب سوچ بچار کے بعد طے پایا کہ باؤ جی والی دکان کو بھی کرائے پر چڑھا دیا جائے مگر ہو کوئی قابل بھروسا اور قریبی جان پہچان والا! کیونکہ اظہر اس قابل ہرگز نہیں تھے کہ وہ دکان چلاتے۔۔۔ لہٰذا عافیہ نے اپنے بہنوئی سے رابطہ کیا کہ کوئی بھی قابل اعتماد شخص جو وقت پر کرایہ دے سکے۔۔۔ اس کے حوالے دکان کر دیں۔ بہنوئی بھلے مانس تھے۔۔۔ انہوں نے خود کو ہی پیش کر دیا۔

سو اس طرح معقول کرائے پر دکان عافیہ کے بہنوئی نے لے لی۔۔۔ مگر ماضی کی تابناکی جیسے کسی اندھیرے کابک میں جا گری تھی۔۔۔ کرایہ اس آمدن کا چوتھائی بھی نہ تھا جو باؤ جی کی زندگی میں گھر آتی تھی۔ ایسے میں عافیہ کے ہاں صنوبر کی پیدائش نے گویا مزید طبق روشن کر دیے۔ جنت بی بیمار پڑ گئیں۔۔۔ ان کی جان کو روگ کی صورت پچھتاوے چمٹ گئے تھے۔ ہاتھ ملتیں اور اظہر کی تربیت کا ماتم مناتیں۔۔۔ پرکھوں کی جائیداد غیر چٹ کر گئے تھے۔

اس رات بھی عافیہ اور اظہر اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ جب انتہائی خاموشی میں یک دم دونوں کی آواز ایک ساتھ گونجی۔

"سنو عافیہ!۔۔۔" اظہر پلٹ کر بولے۔

"بات سنیں۔۔۔!" اسی لمحے عافیہ کے منہ سے نکلا اور پھر مبہم سی مسکراہٹ نے دونوں کے ہونٹوں کا احاطہ کیا۔ دونوں کی نظر سے نظر ملی اور سب کچھ جیسے طے ہو گیا۔

بند کمرے میں آئندہ زندگی کا لائحہ عمل بے حد خاموشی سے ترتیب پا گیا۔

✡ ✡ ✡

اگلی صبح عافیہ معمول سے بھی جلدی اٹھی تھیں۔۔۔ بچیوں کو اسکول بھیج کر ماسی سے گھر صاف کروایا۔۔۔ میاں اور ساس کو ناشتہ کروایا۔۔۔ پھر تین ماہ کی صنوبر کو نہلا دھلا کر ساس کو لا تھمایا اور خود کمرے میں جا گھسیں، باہر نکلیں تو نفیس سے لباس میں تک سک سے تیار

بیگ تھامے اور کچھ کاغذات بائیں ہاتھ میں لیے چلی آئیں۔ جنت بی حیران پریشان منہ اٹھائے دیکھے گئیں' ساتھ ہی بے دھیانی میں سوئی ہوئی صنوبر کو زور زور سے تھپکیاں دینے لگیں۔

"اماں ... ! میں اسکول میں نوکری کے لیے درخواست دینے جارہی ہوں... دعا کیجیے گا!... حالات آپ کے سامنے ہی ہیں... خرچے منہ پھاڑے کھڑے ہیں اور اس کے علاوہ کوئی حل نہیں۔"

جنت بی کے پوچھنے سے پہلے ہی عافیہ نے دو فقروں میں ان کی حیرت رفع کردی... جواب میں ان کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔

"واپسی کب ہوگی ... !" اٹکے ہوئے ... الفاظ جنت بی کی زبان سے ادا ہوئے۔ ان کے گھر کی کب کوئی عورت کمانے نکلی تھی۔ آج تک بھلا۔

"آج تو سی۔ وی ڈراپ کروں گی اماں ... ایک دو اچھے سکول ہیں نظر میں... بڑی اچھی تنخواہ دیں گے۔ بس آپ میرے آنے تک صنوبر کو دیکھ لیجیے گا... اس کے دودھ کے دو فیڈر تیار کرکے فریج میں رکھ دیے ہیں... آپ گرم کرکے پلادیجیے گا۔"

اور پھر اس دن سے جنت بی ہی صنوبر کی دیکھ بھال کرنے لگیں۔ عافیہ کو نوکری مل گئی... پڑھی لکھی تھیں... ذہین تھیں اس لیے جگہ بنانے میں وقت نہ لگا۔ بچیاں بھی اپنے ہی اسکول میں داخل کروادیں... اس طرح سے کم از کم ایک بچی کی فیس کم دینی پڑتی تھی'

اس دوران عافیہ کے ہاں دو بیٹے ہوئے... ایسے میں اسکول بھی جاتی رہیں اور بچے بھی پیدا کیے... مگر گھر کی طرف سے انہیں کسی قسم کی کوئی ٹینشن نہیں تھی' کیونکہ اظہر تھے ناں! اظہر نے اس انداز میں گھر کے تمام امور سنبھالے کہ جنت بی بیٹے کے جوہر دیکھ دیکھ کر سارا دن شرم سے پانی پانی ہوتی رہتیں...

عافیہ نے کھانا بنانے کے لیے بھی ایک ملازمہ کا بندوبست کیا... وہی کپڑے بھی دھوتی اور استری بھی کرتی... صفائی والی الگ تھی۔ مگران دونوں کی نگرانی' کپڑوں کی چھانٹی... صفائی ستھرائی کا جائزہ...

گوشت' سبزی اور دوسرے مسالہ جات کا دھیان... ہر چیز گویا اظہر کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ گیٹ سے لے کر چھت تک... پورا گھر اظہر کے "سگھڑاپے" کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ بچوں کے اسکول سے آتے ہی ان کا یونیفارم تبدیل کروانا' نہلانا دھلانا' کھانا کھلانا اور پھر سلانا... اظہر کسی "اچھی امی" کی طرح ہی یہ فرائض سرانجام دیتے۔

عافیہ کو بے فکری سی بے فکری تھی... گھر آتیں تو ہر چیز طریقے قرینے سے جگہ پر... کھانا وقت پر اور پھر چائے کا شغل بھی جاری!

ہاں! یہ ضرور تھا کہ عافیہ کے رویے میں اظہر کے حوالے سے کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی بلکہ عافیہ جیسے مزید ممنون و معتقد ہوگئی تھیں خاوند کی... اور اظہر بھی گردن اکڑائے... شام کو سارے دن کی روداد بیوی کے گوش گزار کرتے اور عافیہ واری صدقے ہوئی جاتیں... ! کتنی خوش قسمت تھیں وہ... کیسے شان دار تھے اظہر کہ ان کا اس قدر ساتھ دے رہے تھے۔ ورنہ وہ بھلا کیسے اسکول اور گھر کو سنبھال پاتیں... اوپر سے پانچ بچے... !

اور یہی وہ خاموش معاہدہ تھا جو بند کمرے میں ان دونوں میاں بیوی کے درمیان طے پایا تھا۔ جنت بی جو یہی غم پالے بیٹھی تھیں کہ گھر کی بہو کمانے نکل کھڑی ہوئی ہے' اگر جو جان لیتیں کہ یہ نادر خیال ان کے ہی نادر سپوت کے زرخیز ذہن سے پھوٹا ہے تو یقیناً" کھڑے قد سے گرتیں۔ ابھی تو اس سارے میں انہیں بہو کی ہٹ دھرمی اور بیٹے کی بے بسی محسوس ہوتی تھی... اور پھر اسی دکھ کو سینے پہ سجائے وہ ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند گئیں۔

جنت بی جاتے جاتے ایک نیکی کر گئیں ... اپنے دونوں پوتوں ... داور اور یاور کو جو فقط چھ برس کے تھے ... بلا کا چالاک اور ہوشیار بنا گئیں۔ انہیں پردوں میں لیے رکھنے کی بجائے... دنیا کو پرکھنے کا موقع دیا تھا۔ وہ دونوں کم عمری سے ہی پوری گلی میں ادھم مچائے رکھتے... دکان سے سودا سلف تک لے آتے ... اور

ٹھیک ٹھیک حساب کتاب کے ساتھ لاتے۔ عافیہ کو آنے والے وقت کی سنگینی سے بچانے کے لیے جنت بی نے بے حد مثبت اقدام کیے تھے۔۔۔ اور اس کے لیے عافیہ مرتے دم تک ان کی شکر گزار تھیں۔

وقت بیتا تھا تو بھی کے تھوڑے کس بل نکل گئے تھے۔ مگر اظہر نے جیسے وقت کے ہوش ٹھکانے لگانے کا عہد باندھا تھا۔۔۔ مجال ہے، جو ان کی شخصیت میں رتی بھر تبدیلی آئی ہو۔ اس پر ساس کی وفات کے بعد عافیہ نے دل جوئی کر کر کے مزید دماغی خلل میں اضافہ کر دیا تھا۔ مختلف حیلے بہانوں سے وہ عافیہ سے لاڈ اٹھواتے۔۔۔ کبھی بیمار پڑ کر۔۔۔ کبھی ناسٹلجیک ہو جاتے تو کبھی "شوخے کاکے" بن جاتے جو ریں ریں کرتا ماں کا پلو تھامے رہے، جب تک کہ سو نہ جائے۔ بچیاں بڑی ہو رہی تھیں۔ باپ کو دیکھتی تھیں اور سمجھتی بھی تھیں۔ فیروزہ تو کم گو سی۔۔۔ اپنے آپ میں مگن رہنے والی' معاملہ فہم سی لڑکی تھی' مگر نیلو فر بہت حساس تھی اور سب سے زیادہ بے زار بھی۔ بھلا مرد بھی ایسے جیا کرتے ہیں! اس کے اندر کی گھٹن وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔ امی پہ اسے بے حد غصہ آتا کہ وہی تھیں جنہوں نے ابو کو بگاڑ رکھا تھا۔

اس کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا تھا جب کوئی اس سے پوچھتا کہ۔۔۔ "والد کیا کرتے ہیں۔۔۔!"

گھر سنبھالنا' اس کی دیکھ ریکھ کرنا بھلے کوئی عیب نہیں مگر اس صورت میں۔۔۔ جبکہ اس کے ابو بھی۔۔۔ انتہائی ضرورت کے علاوہ دروازے سے باہر بھی نہ جھانکتے ہوں تو پھر یہ "عیب" ہی تھا۔

زندگی اسی ڈھب پر بیتے جا رہی تھی۔۔۔ آپی نے ایف ایس سی میں بہت اچھے مارکس لیے تھے۔۔۔ ارادہ انٹری ٹیسٹ میں بیٹھنے کا بھی تھا۔۔۔ وہ خود میٹرک فرسٹ ڈویژن سے کلیئر کر چکی تھی۔۔۔ آگے کے منصوبے بن رہے تھے جب ایک ہی دن میں دو قیامت خیز حادثے رونما ہو گئے۔ امی اسکول جانے سے پہلے ابو کو لازمی چائے بنا کر دیتی تھیں' یہ ان کی محبت کی حد ہی تھی کہ وہ آج بھی ابو پر پروانہ وار نثار ہوتی تھیں۔۔۔

امی چائے بنا کر کمرے میں گئیں تو پتھر ہو گئیں۔ ابو ہمیشہ کے لیے امی کا ساتھ چھوڑ کر جا چکے تھے۔۔۔ پتا نہیں کس لمحے ان کی سانسوں کی ڈوری ٹوٹ گئی اور امی کو خبر بھی نہ ہوئی۔۔۔ لمحوں میں کہرام مچ گیا۔۔۔ بچے امی کی حالت دیکھ گلا پھاڑ کر رونے لگے۔۔۔ تھوڑی دیر میں ارد گرد کے لوگوں کے علاوہ امی اور ابو کے رشتے دار بھی اکٹھے ہونے شروع ہو گئے۔ سب کے لیے یہ بے حد دکھ بھرا حادثہ تھا۔۔۔ ابھی ابو کی عمر ہی کیا تھی' محض پینتالیس برس کی عمر میں وہ دنیا سے منہ موڑ گئے تھے۔

امی کا سکتہ ٹوٹا تو ان کے رونے کی آوازوں سے۔۔۔ نیلو فر کو اپنا دل' پھٹتا محسوس ہوا۔۔۔ وہ یک ٹک ابو کا چہرہ دیکھے جاتی اور آنسو لڑی کی صورت اس کے چہرے کو بھگو رہے تھے۔ اسے نہ جانے کیوں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ابو ایک قید سے آزاد ہوئے تھے۔۔۔ آج ابو ہمیشہ کے لیے گھر سے باہر جانے والے تھے۔۔۔ وہ جی بھر کر ابو کو دیکھے گئی۔۔۔ نہ جانے وہ اور کتنا وقت یونہی ستون سے ٹیک لگائے' ٹکٹکی باندھے رہتی' جب یکدم اس کے کانوں میں کچھ گھٹی گھٹی سی آوازیں پڑیں۔

"بازار میں آگ لگی ہے۔۔۔ کئی دکانیں خاک ہو گئیں' انہی میں اظہر کی دکان بھی تھی۔۔۔ اللہ توبہ! ایسی بری گھڑی کسی پر نہ آئے۔۔۔ ایک ہی وقت میں دو ہولناک سانحے' بہتر یہی ہے کہ عافیہ کو دکان کا نہ بتائے کوئی۔۔۔ یہ نہ ہو کہ کوئی اور آفت منہ دیکھ لے۔۔۔"

مگر عافیہ تک یہ خبر پہنچ گئی۔۔۔ پتا نہیں کون ہمدرد تھا جس نے گلے لگتے ہوئے' روتے روتے دونوں دکھوں کا ہی پرسا دے دیا۔۔۔ عافیہ غش کھا گئیں اور پھر جنازہ اٹھ گیا مگر عافیہ کی بے ہوشی نہ ٹوٹی۔۔۔ کوئی تباہی سی تباہی تھی جو ایک ہی دن میں اس گھر کے مکینوں پر ٹوٹی تھی۔

اگلے کئی دن تک گھر میں کوئی بھی ایک دوسرے سے ایک لفظ تک نہ بولا۔۔۔ جیسے سب الفاظ ہی ابو کے ساتھ دفن ہو گئے تھے۔ نیلو فر بولائی سی پھرتی تھی۔۔۔ ابو یاد آتے تھے۔۔۔ ہر ہر کونا۔ چپہ چپہ ابو کی یاد سے مہکتا تھا۔ وہ کیا گئے جیسے سارا گھر ہی تلپٹ ہو کر رہ گیا۔ عافیہ

نے اسکول سے چھٹی لے رکھی تھی اور سارا دن کمرہ بند رہتی تھیں۔ ایسے میں گھرداری کا بار ان دونوں بہنوں پر آن پڑا۔ کیسے تڑپ تڑپ روئی تھیں جب گھر کے کتنے ہی اُمور نپٹائے نہ نپٹتے۔۔۔ ابو یاد آتے اور خوب یاد آتے۔۔۔ پتا نہیں کیسے کرتے تھے یہ سب ان دونوں کو تو فرزانہ اور کھانا بنانے والی ماسی نے چند دن میں ہی ناکوں چنے چبوا دیے۔

چند دن میں ہی سارا راشن ختم۔۔۔ ابھی مہینے کی تیرہ تھی۔ دھوبی چلا آیا کہ اس کا حساب کرنے والا تھا۔۔۔ دودھ والے کو بھی یاد آگیا۔۔۔ اب کون ان کے کھاتے کھنگالتا۔۔۔ نیلوفر کمپنشس چیک کرتے ہوئے ماسی سے لڑپڑی اور کھڑے کھڑے فارغ کردیا۔۔۔ ہر چیز ہی ختم تھی۔۔۔ ایسا اندھیر مچ گیا تھا۔ اس گھر کی تو جیسے "ماں" مرگئی تھی۔ داور اور یاور گندے سندے پھرتے تھے۔ صحن میں رکھے گملے سوکھ رہے تھے، کیاریاں سوکھے پتوں سے اٹی پڑی تھیں۔۔۔ چھوٹے چھوٹے جالے لگنا شروع ہوگئے تھے۔ فرزانہ آتی۔۔۔ دو چار ہاتھ مارتی اور چلی جاتی۔ فیروزہ کی چار دن میں حالت خراب ہوگئی۔۔۔ سب کے ناشتے کھانے بنا بنا کے، عادت ہی کہاں تھی۔۔۔ ابو نے تو کبھی انہیں گھر آئے مہمانوں کی خاطر میں بھی نہیں الجھایا تھا۔ تنگ آکر فیروزہ عافیہ کے پاس گئی اور گود میں منہ چھپا کر بے حد روئی۔۔۔ اتنا کہ خود ساختہ خاموشی کے پیرہن میں جابجا سلوٹیں ابھرنے لگیں۔۔۔ عافیہ کو باہر آنا پڑا اور ان کے آنے کی دیر تھی جیسے یکدم جادو کی چھڑی سے سب کچھ صحیح ہوتا چلا گیا بہت مشکل ہی سہی مگر عافیہ کو یہ یقین کرنا پڑا کہ اب اظہر نہیں تھے اور آئندہ کبھی نہیں ہوں گے۔۔۔!

سب کچھ معمول پر آتے ہی ایک دفعہ پھر معاشی تنگی گھیرا تنگ کرنے لگی۔ عدت کا تیسرا مہینہ چل رہا تھا۔۔۔ پاس جو تھا وہ ہی لگ رہا تھا اور ابھی ایک ماہ باقی تھا۔ دکان خاک ہوچکی تھی۔۔۔ کوئی ہمدرد کوشش کرتا تو اس خاک کی ڈھیری کو بیچ کر چار پیسے حوالے کرتا۔۔۔ مگر کون! بہنوئی کا تو خود کا لاکھوں کا سامان غرق ہوگیا۔ گھر میں بیٹھے ڈپریشن سے نبرد آزما تھے۔۔۔ ایسے میں عافیہ نے دکان کو پس پشت ڈال کر جیسے تیسے عدت پوری کی اور اسکول کی راہ لی۔۔۔ اب جو تھا بس یہی تھا اور یہ جو بھی تھا، ناکافی تھا۔ فیروزہ نے کسی سے کہہ کہہ کر بغیر ٹیوشنز پکڑلیں۔۔۔ بی کام میں ایڈمیشن لے لیا۔۔۔ کالج سے واپسی پر ٹیوشنز پڑھاتی ہوئی ساڑھے چھ بجے گھر پہنچتی، نیلوفر نے گھر پر چند محلے کے بچے بلانے شروع کیے۔۔۔ دھیرے دھیرے عافیہ بھی بیٹھنے لگیں تو تعداد بڑھ گئی اور یوں اچھے خاصے بچے جمع ہوگئے۔۔۔ پہلے سے نہ سہی مگر حالات بہت بہتر ہوتے چلے گئے۔

اکثر رات کی تنہائیوں میں اظہر کو سوچتے سوچتے عافیہ سسکتیں تو ایک بات ضرور سوچتیں کہ کسی بردے داری بی کی سی زندگی گزاری تھی اظہر نے۔۔۔ کیسے کیسے طعنے، کیسی کیسی باتیں سنی تھیں عافیہ نے اظہر کے حوالے سے۔۔۔ مگر دونوں نے بیچ میں ایک دوسرے سے ٹوٹ کر محبت کی تھی اور غضب کی نباہی تھی۔۔۔ لیکن آئندہ۔۔۔ آنے والے کل کے لیے جو کہ ان کی بچیوں کا ہوگا۔۔۔ ایک بات تو طے تھی کہ "اظہر جیسا مرد۔۔۔ ہرگز نہیں!"

مگر وہ نہیں جانتی تھیں کہ ان کی ایک بیٹی کا نصیب آنے والے کل میں، ماضی کے عکس چرائے۔۔۔ ان کا تمسخر اڑاتا اور چڑاتا چوکڑیاں بھر رہا ہے۔

فیروزہ کے لیے سب سے پہلا رشتہ ہی کالج لیکچرار کا آیا۔۔۔ خوش مزاج سا معظم اور اس کی تعلیمی قابلیت پھر صرف گورنمنٹ کالج کی لیکچرر شپ انہیں اس قدر بھائی کہ کنوارے بہن بھائیوں کی طویل لائن کو نظر انداز کرگئیں۔

اس کے بعد ان کی نازک سی کومل انداز و اطوار والی فیروزہ تھی اور معاشی تگ و دو کی ایک طویل جنگ۔۔۔! ایک دفعہ پھر انہیں مات ہوئی تھی۔ دن رات گدھے کی طرح کام کرتا داماد۔۔۔ صبح کا گیا، رات آٹھ بجے گھر آنے والا فیروزہ کا شوہر۔۔۔ صرف بیوی کی ذات پر چند روپے خرچ کرنے کا مجاز نہیں تھا۔۔۔ انہیں لگا جیسے اظہر ان کے گرد منڈلاتے۔۔۔ انہیں تمسخر سے دیکھتے

اور پھر یک دم خفا ہو کر منہ پھیر لیتے... جیسے غصہ کرتے ہوں کہ اس سے بڑھ کر عیش تو مجھ نکمے نے گھر بیٹھے تمہیں کروا دیے... جو تمہارا داماد اچھی بھلی آمدن کے باوجود چند دن میری بیٹی کو سکھ کے نہ دے سکا!

عافیہ بے بسی سے فیروزہ کی آزمائشیں ختم ہونے کے لیے دعائیں کرے جاتیں۔ نیلو فر ان کی فکر و پریشانی کو غیر ضروری خیال کرتی تھی کیونکہ تب تک وہ فیروزہ کے نجی حالات سے ناواقف تھی... اس کے سامنے تو بہترین لب و لہجے میں اردو اور انگلش بولتے معظم بھائی ایک بہترین لائف پارٹنر تھے... ذاتی طور پر وہ خود بھی اپنے لیے ایسے ہی سوبر اور نفیس شخص کا ساتھ چاہتی تھی۔ اس کا ماسٹرز مکمل ہو چکا تھا۔ مگر بہت ضد کرنے پر بھی عافیہ نے اسے نوکری کی اجازت نہیں دی تھی... حالانکہ اچانک سے ٹیوشن کے لیے آنے والے بچوں میں کمی ہو گئی تھی... ایسے میں عافیہ کی تنخواہ سارا بار اٹھائے ہوئے تھی... نہ جانے کیسا ڈر بیٹھ چکا تھا دل میں، جو نکالے نہیں نکلتا تھا۔ انہیں لگتا جیسے نیلو فر نے نوکری شروع کی تو پھر ساری عمر کرے گی۔

دوسری طرف نیلو فر کی ضد اور اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔

عافیہ نے رشتے کے لیے کچھ لوگوں کو کہہ رکھا تھا کہ ایک دن فیروزہ صبح صبح ناشتے کے وقت بچوں سمیت چلی آئی۔ آکر سکون سے ہلکا پھلکا ناشتہ کیا اور پھر امی کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھ گئی۔ نیلو فر کچن میں برتن دھوتے... گاہے بگاہے دونوں پر نظر ڈالتی... عافیہ کا نفی میں ہلتا سر اور پھر رک کر سوچ میں پڑ جانا... فیروزہ کا گھٹنا پکڑے قدرے لجاجت سے سرگوشیاں کرنا... کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔

مگر اگلے آنے والے دنوں میں جو کچھ ہوا، وہ سب اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ آناً فاناً "اس کا رشتہ بھی طے ہو گیا، وہ بھی خالص کاروباری آدمی سے... شاید ایف اے تھا یا بی۔ اے... اس نے پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی... دکھ کی انتہا تھی کہ یہ رشتہ لائی تھی اس کی بہن... ایسا رشتہ، وہ بھی اپنی پڑھی لکھی اور سلجھے اطوار والی بہن کے لیے۔

مسرت بانو فیروزہ کی ساس کی رشتے داری میں آتی تھیں۔ پہلے فیروزہ کی شادی میں اور پھر اس کے کافی عرصے بعد ایک آدھ دفعہ اتفاقاً "فیروزہ کے سسرال میں مسرت بانو نے نیلو فر کو دیکھا تھا۔ فیروزہ کے تینوں بچوں کی دفعہ نیلو فر اور صنوبر باری باری چند دن کے لیے بہن کے ہاں جاتی رہی تھیں... انہی دنوں میں مبارک باد دینے کے لیے آئی ہوئی مسرت بانو، نیلو فر کو اپنے شہزادے کے لیے پسند کر چکی تھیں۔ معلوم ہوا تھا کہ لڑکی کا باپ بھی نہیں اور ماں نوکری کر کے بڑی مشکل سے اولاد پال رہی ہے (ان کے خود کے ذہنی معیار کے مطابق)۔ ایسے میں انہیں یقین تھا کہ ضیغم کا رشتہ ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

عافیہ نے تو فیروزہ کے بے حد اصرار پر محض اس لیے ہامی بھر لی تھی کہ وہ ساری عمر کی معاشی مشقت کے بعد تھک سی گئی تھیں اور پھر فیروزہ کے حالات بھی ان کے سامنے تھے۔ یہاں کم از کم یہ گارنٹی تو تھی کہ لڑکے کے والد کی بازار میں کپڑے کے ہول سیل کی بہت بڑی دکان تھی اور وہ بھی ذاتی... جو لا محالہ کل کو اولاد ہی کی تھی... کم از کم کرائے پر تو نہیں چڑھی ہوئی تھی... جیسا خود اظہر کی دکانوں کا حال تھا۔ روپے پیسے کی بے حد ریل پیل تھی اور بقول لڑکے کی ماں یعنی مسرت بانو کے... "میرا ضیغم تو صبح کا گیا رات گئے تک دکان سنبھالتا ہے... کاروبار کو چار چاند اسی کے دم سے لگے ہیں۔"

اب یہ تو شادی کے بعد نیلو فر پر کھلا کہ لڑکا صبح سے رات گئے تک بستر ہی سنبھالے رہتا ہے۔ بڑا موڈ ہوا تو لاؤنج میں تشریف لا کر وہاں کے ماحول کو چار چاند لگا دیتے تھے اور کھا کھا کر جان بنا رہے تھے اور جس رات فیروزہ اور نیلو فر کے درمیان راز و نیاز ہوئے، اس لمحے نیلو فر نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ خود کو ہرگز ہرگز عافیہ نہیں بننے دے گی۔ آنے والے وقت میں اگر اسے روپے پیسے کی تنگی کا سامنا کرنا پڑا تو وہ کمانے نہیں نکلے گی... اس کے شوہر کو ہی یہ کام کرنا پڑے گا، چاہے آلو چنے کی ریڑھی لگائے... ! اگر اس کا شوہر کاروباری

آدمی ہے' زیادہ پڑھا لکھا نہیں تو ٹھیک ہے... یہ کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں کہ وہ اپنی ماں کو ذہنی اور روحانی طور پر پریشان کرے۔ اس کی ماں کی آسودگی اگر اس کے یہاں شادی کرنے میں ہے تو اسے کوئی اعتراض نہیں' بھلے دل کرلایا تھا... رویا تھا... مگر ماں خوش تھی۔

ایک عہد... صرف ایک عہد جو اس نے خود سے کیا تھا وہ یہ کہ "اپنے شوہر کی ان شخصی خامیوں کو ہرگز قبول نہیں کرے گی جنہیں معاشرہ گوارا نہ کرے... جن کو لے کر کل کو اس کی اولاد شرمندہ ہو... جیسے وہ اپنے بچپن میں ہوتی تھی... وہ عافیہ کی طرح ہار نہیں مانے گی' بلکہ ان خامیوں کو رفع کرنے کی کوشش کرے گی... خواہ جیسے بھی ہو...!

زندگی جوہڑ کے پانی کی مانند ٹھہری ہوئی ہرگز نہیں ہونی چاہیے بلکہ یہ سمندر کی طرح تاحد نظر وسیع اور گہری ہو تو پرکیف لگتی ہے ورنہ اس میں سے سڑاند اٹھتے دیر نہیں لگتی...!

☆ ☆ ☆

نیلوفر کے ہاتھ ضیغم کی ایک کمزوری آگئی تھی... وہ ڈرپوک تھا' کیم شحیم ہونے کے باوجود وہ ذرا سا ورکانے پر سہم جاتا تھا... لڑنے بھڑنے والی خصلت نہیں تھی اس کی۔

نیلوفر کو اسی کمزوری کا فائدہ اٹھانا تھا جو اتفاقیہ اس کی نظروں میں آئی تھی۔

وہ لوگ قلفی کھا کر واپس آرہے تھے جب ارد گرد پھرتے گجرے بیچنے والے آدمیوں میں سے اچانک ایک ڈرائیونگ سیٹ کی طرف سے نمودار ہوا اور تیز' تیکھی آواز میں بولا...

"گجرے لینے جے پاء جی... چالی (چالیس) روپے دے دو۔" ضیغم بہت بری طرح سے ڈرا... ڈر تو نیلوفر بھی گئی تھی کیونکہ اس بے ہودہ شخص نے اپنا چہرہ بھی تھوڑا سا اندھیر گھسیڑ لیا تھا۔

ضیغم کے چہرے پر پسینہ پھوٹ پڑا... اس نے جھٹ سے شیشہ اوپر چڑھایا تو گجرے والا پھرتی سے پیچھے ہٹتا کچھ بڑبڑانے لگا... صاف پتا لگ رہا تھا کہ گالیوں سے تو اضع کر رہا تھا... ضیغم نے فوراً" سے پیشتر گاڑی آگے بڑھادی۔ نیلوفر کے بھی اوسان بحال ہوئے' مگر ابھی چند کوس بھی نہ گئے ہوں گے کہ ایک فلائنگ کوچ والا تیزی سے اوور ٹیک کرتا ان کے آگے آیا تھا... ضیغم میاں تو پہلے ہی حواسوں سے باہر تھے' غیر ارادی طور پر گاڑی سائیڈ سے نکالنے کی کوشش میں کوچ کے ساتھ ہلکا سا ٹکرا گئے... بس جی... کوچ والے نے اسپیڈ بڑھاتے ہوئے ان کی گاڑی کے بالکل آگے گاڑی لاکر کھڑی کردی... ناچار ضیغم کو بریک لگانے پڑے تھے۔

کوچ ڈرائیور نے اتر کر پہلے اپنی گاڑی کو ملاحظہ کیا اور پھر نقصان کا اندازہ لگاتے ہوئے نتھنے پھلاتا ان لوگوں کی گاڑی کے قریب چلا آیا۔ نیلوفر ضیغم کو ٹھوکے دیے جارہی تھی کہ آرام سے گاڑی سے اتر کر بات کریں... زیادہ مسئلہ ہوا تو نقصان پورا کردیں... مگر ضیغم صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے' نہ ہی شیشہ نیچے اتارا۔ کوچ کا ڈرائیور زور زور سے ہاتھ مارے جارہا تھا۔ لوگ اکٹھے ہوچکے تھے... اتنے لوگوں کو دیکھ کر ضیغم نے حوصلہ پکڑا اور شیشہ نیچے اتار لیا... یکدم کان پھاڑنے والا شور گاڑی کے اندر پھیل گیا... بھانت بھانت کی بولیاں' اور گھاگ مجمع...!

"میرا نقصان پورا کرو باؤ جی... ساری گڈی چھل گئی اے میری..." ڈرائیور تڑخ کر بولا تھا۔

"غلطی تمہاری ہے... میری نہیں سمجھے!" ضیغم نے غیر محسوس طریقے سے شیشہ... ذرا سا واپس اوپر چڑھایا۔

"میں تو آگے تھا جی... پچھوں تسی آئے ہو اور گڈی رگڑ دی میری...!" ڈرائیور دو قدم آگے بڑھا تو ضیغم کے چھکے چھوٹ گئے... جھٹ سے جیب میں سے پانچ ہزار کا نوٹ نکالا اور باہر اچھال دیا جو سیدھا ڈرائیور کے قدموں میں گرا... ڈرائیور کو ہتک محسوس ہوئی' غصے سے انگارہ ہوتے ہوئے اس نے آستینیں چڑھائیں۔

"اوئے... اوئے تو سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو... فقیر ہوں میں کیا... تیرے جیسے تو میرے بائیں ہاتھ کی مار ہیں... تیری تو...!"

یکدم اردگرد کھڑے دو تین تگڑے سے آدمیوں نے ڈرائیور کو تھاما اور ٹھنڈا کرنے لگے... تھوڑا سا گھسیٹ کر پیچھے کیا تو ڈرائیور دو قدم سرک گیا۔ ضیغم نے ڈرائیور کو پرے ہٹتے دیکھا تو چمک کر بولا۔

"ابے او...! یہاں پر چھوڑ رہا ہوں... لحاظ آگیا' ماڑا آدمی ہے تو... ذرا میرے محلے میں آ' پھر دیکھ تیری کیا درگت بناتا ہوں میں..." نیلوفر نے بے یقینی سے رخ موڑ کر ضیغم کو دیکھا...

ڈرائیور بازو چھڑوا کر دوبارہ گاڑی کی طرف لپکا تو ضیغم نے باقی کا شیشہ چڑھایا اور اسپیڈ سے گاڑی دوڑا دی۔ نیلوفر میں پلٹ کر دیکھنے کی ہمت نہیں تھی... وہ تو بس ضیغم کے رویے پر حیران تھی... اتنا بزدل اور اتنا کم ہمت!

"محلے میں آئے گا ڈرائیور تو آپ کیا بگاڑ لیں گے اس کا... ذرا مجھے بھی بتائیں..." نیلوفر نے تیکھے لہجے میں ضیغم سے پوچھا جس کے چہرے پر ابھی بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"ارے پاگل ہوئی ہو کیا... میں کیا تمہیں لڑنے مرنے والا آدمی لگتا ہوں...؟ میں ایسے پھڈوں میں نہیں پڑتا' پرسنالٹی خراب ہوتی ہے... وہ تو میں نے اماں کو آگے کر دینا تھا بس... وہ اکیلی ہی سب پر بھاری پڑتی ہیں... آخر کو پہلوانوں کے شہر کی ہیں' ہمیشہ لاج رکھتی ہیں۔"

ضیغم کے انداز میں ماں کے لیے فخر تھا۔ نیلوفر کو احساس ہوا کہ اباجی ضیغم کو بلغم کیوں کہتے ہیں۔ اور خود اس نے جو "ہمپٹی ڈمپٹی" نام رکھا تھا تو نگینے کی طرح فٹ تھا... وہ سچ میں ایک موٹا تازہ انڈہ ہی تو تھا جو کہیں گر جائے تو اٹھ نہ پائے۔

☆ ☆ ☆

"کیا ہوا نیلی پری... اس طرح کیوں ٹہلے جا رہی ہو؟"

پہلے ہی سنگل پسلی ہو... ایسے تو بالکل ہی مرغی ہڈی کی طرح ہو جاؤ گی..." ضیغم نے کچر کچر نمکو چباتے ہوئے نیلوفر کے دبلے پتلے جسم کو نشانہ بنایا تھا۔

"آپ کو تو بس ہر بات میں کھانے کی چیز ہی نظر آتی ہے۔ میری کم از کم پسلی تو ہے ناں... آپ کی تو گننا چاہو تب بھی ممکن نہیں' ماشاء اللہ سے پسلیوں کی کوشنگ (گوشت) ہی خاصی موٹی ہے..."

"ہاں' ہاں! تم رہ گئی تھیں... تم بھی کہہ لو۔ اب میں کسی "کٹ کیٹ چاکلیٹ" کے ریپر کی طرح تو اپنی کوشنگ اتارنے سے رہا..." ڈھیر ساری نمکو ایک ساتھ منہ میں انڈیلتے ہوئے خاصے آزردہ انداز میں اس نے گلہ کیا۔

"دیکھا... مثال بھی دی تو وہ بھی چاکلیٹ کی... میں آپ کو وارن کر رہی ہوں' اگر آپ کے یہی حالات رہے تو آپ کی شکل "ہمپٹی ڈمپٹی" سے ملنے لگے گی..." اپنے تئیں طنز اچھال کر نیلوفر نے کن اکھیوں سے ضیغم کو دیکھا جس کی آنکھوں میں حسرت سی اتر آئی تھی۔

"آ... ہاہ! کون سائی بات ہوگی... میں نے میٹرک تک "اقبال ہائی اسکول" میں پڑھا' اور وہاں کا بچہ بچہ مجھے "آنڈا" کہتا تھا اور تو اور ہمارے ریاضی کے پنجابی ماسٹر کہ ہر دفعہ مجھے ٹیسٹ میں انڈہ دیتے اور کاپی میرے سر پر مارتے ہوئے کہتے...

"نکما... آنڈا جیانہ ہووے تے...!"

"ہاہا... ہاہا!" نیلوفر کے حلق سے قہقہہ برآمد ہوا۔ "تو میں بھی یہی کہتی ہوں آپ کو..."

"آنڈا جمنانہ ہووے تے...!"

ضیغم نے بھنوئیں اچکا کر کہتے ہوئے اسے گھورا تو نیلوفر ہنسی روکتے ہوئے سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

"چھوڑیں ان باتوں کو... ایک بہت بڑا مسئلہ ہو گیا ہے' آج میں زرینہ کے ساتھ چھت پر سے دھلے کپڑے اتارنے گئی تو یونہی ذرا سا آگے ہو کر گلی میں جھانکا تو یقین کیجیے میرے پیروں سے زمین نکل گئی...

وہ کوچ والا ڈرائیور جس کے ساتھ آپ کا جھگڑا ہوا تھا ناں... وہ گلوپان شاپ کے باہر کھڑا تھا اور منہ چلاتا ارد گرد کے سارے مکان تاڑ رہا تھا... مجھے یقین ہے کہ ہو نہ ہو وہ آپ کو ہی ڈھونڈتا یہاں تک پہنچا ہے ...اب کیا ہوگا؟"

ضیغم کے گلے میں نمکو ایسی اٹکی کہ یکدم کھانس کھانس کر تتر برا ہونے لگا... لال ٹماٹر رنگت اور آنکھوں سے نکلتا پانی دیکھ کر نیلوفر نے فوراً" فریج سے جوس کا کین نکالا اور ضیغم کے منہ سے لگا دیا۔ ذرا اوسان بحال ہوئے تو چنگ چی کے انجن جیسی آواز حلق سے نکلی۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ' وہی کوچ والا تھا... اور کیا تمہیں یہ بھی یقین ہے کہ وہ مجھے ہی ڈھونڈ رہا تھا؟"

"نا' نا... آپ کو نہیں آپ کی والدہ ماجدہ کو' آپ نے ہی تو کہا تھا کہ اس سے نمٹنے کے لیے امی اکیلی ہی کافی ہیں۔" نیلوفر نے ایک اور طنزاً اچھالا تھا۔

"پاگل ہوئی ہو کیا...؟ اب کیا میری اماں ایسے لفنگوں کے منہ لگیں گی؟"

"تو پھر آپ لگنے کے لیے تیار ہو جائیں..." نیلوفر نے اطمینان سے رائے دی۔

"ابا سے کہتا ہوں' وہ نپٹ لیں گے اس سے..."

"ابا تو آپ کو ٹوکری میں ڈال کر اسے پکڑاتے ہوئے کہیں گے۔ "یہ لو بیٹا! یہ میرے گھر کا سب سے بڑا آلو ہے... تم رکھ لو!"

"سچ کہتی ہو... ابا مجھے کسی سبزی سے زیادہ اہمیت ہی کہاں دیتے ہیں... آلو سے یاد آیا' تھوڑے سے آلو کی فرائز ہی بنالاؤ... تب تک میں کچھ سوچتا ہوں..." ضیغم نے ٹیک لگا کر... آنکھیں موندتے ہوئے کہا۔

"کیا سوچیں گے آپ... آپ کی سوچ انڈے سے شروع ہو کر مرغی پر ختم ہو جاتی ہے... اور کر بھی کیا سکتے ہیں آپ..."

"بہت کچھ کر سکتا ہوں بس یہ لڑائی وڑائی جیسا پنچ کام مجھ سے نہیں ہوتا..."

"لو جی! قصہ تمام!" نیلوفر نے ہاتھ جھاڑے۔

"بس پھر آپ کا اللہ ہی حافظ ہے۔"

"پھر کیا کروں... تم کچھ سوچو یار... ورنہ کہیں وہ سچ میں میری ٹھکائی نہ کر دے..." ضیغم متفکر ہوا تھا۔

"مم م م...! ترکیب... ترکیب... ہاں ایک ترکیب تو ہے میرے ذہن میں... مگر آپ عمل کریں گے تو بات بنے گی..."

"دیکھو! زیادہ مشکل کام نہ ہو۔ کوئی آسان آسان سا حل بتانا جو کرنے میں مجھے کم از کم نانی ہرگز یاد نہ آئے..."

"چلیے... آپ دادی کو یاد کر لینا' ویسے تو یقیناً" کبھی توفیق نہیں ہوئی ہوگی..."

"ارے نہیں' دادی مرحومہ کو تو میں بے حد یاد کرتا ہوں۔ کیونکہ انہوں نے مجھے مکھن کے پیڑے بڑی چاہ سے کھلائے ہوئے ہیں... اور۔"

"اور نتیجتاً" آج آپ ہو بہو مکھن کا پیڑہ بن چکے ہیں۔" نیلوفر نے بات کاٹ کر جملہ مکمل کیا۔

"اور اب خاموشی سے جو میں کہتی ہوں ویسا کرتے جائیں' ورنہ ڈرائیور سے "کٹ" کھائیں اور یہ نہ ہو کہ ایک آدھ مکا جبڑے پہ پڑے اور بتیسی ہل جائے۔ پھر یہ ہیوی ڈیوٹی خوراکیں خواب خیال ہو کر رہ جائیں گی۔"

"اچھا... ٹھیک ہے! کہو' میں سن رہا ہوں اور عمل کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔" ضیغم نے مسکینیت سے کہا۔

نیلوفر کھسک کر قریب ہو گئی اور پھر جوں جوں نیلوفر ترکیب بتاتی جا رہی تھی ضیغم صاحب کے چہرے پر بے چارگی چھاتی جا رہی تھی۔

اگلی صبح سب نے حیرت انگیز منظر دیکھا... ضیغم میاں تڑکے ہی کمرے سے نمودار ہو کر ناشتے کی میز پر تھے۔ نہائے دھوئے اور سجے سجائے۔ شیخ جی تو تھے سو تھے' مسرت بانو کے حواس بھی جاتے رہے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس قدر لشکا پشکا' سیٹ میٹ ہو کر اترنے والا ان کا "کاکا" ہے۔ مارے حیرت کے

انہوں نے اپنی انگلی دانتوں میں دبائی تو۔ شیخ جی فٹ بولے۔

"وڈ نہ لینا کہیں انگلی۔۔۔ زیادہ نہ سہی ٹیٹنس کا ٹیکا تو ضرور لگوانا پڑ جائے گا تجھے۔۔۔ "ہاہا۔۔۔ ہاہا"

مسرت بانو نے غصے سے سامنے میز پر رکھا اسٹیل کا چمچہ شیخ جی کو دے مارا جو سیدھا ان کے ہلتے پیٹ سے ٹکرا کر زمین بوس ہو گیا۔

ضیغم نے خاموشی سے ناشتا کیا تھا۔۔۔ کسی کی بات کا خاص جواب نہیں دیا۔۔۔ نیلو فر جانتی تھی کہ وہ ڈرا ہوا ہے۔

دکان پر جاتے ہوئے شیخ جی تو مسلسل طنز کرتے رہے جبکہ مسرت بانو نے بیٹے کا صدقہ نکالا۔۔۔ سات مرچیں وار کر چولہے میں جھونکیں تو شیخ جی بلبلا اٹھے۔

"او تیرا بیڑہ تر جائے۔۔۔ مرچیں پیس لیتی تو ایک ویلے کی ہانڈی میں ڈل جاتیں۔۔۔"

چاروں قل اور آیت الکرسی کا دم کر کے مسرت بانو نے پتر کو شوہر کے حوالے کیا تھا اور ڈبڈبائے لہجے میں بولیں۔

"اس کا خیال رکھنا شیخ جی۔۔۔ کھانے پینے میں کمی نہ کرنا۔۔۔"

"نہ۔۔۔ میں کوئی اس کی ساس ہوں۔۔۔ جو مجھے نصیحتیں کر رہی ہے۔۔۔ کوئی پہلی دفعہ نہیں چلا تیرا یہ "ڈرم" اور ہمیشہ کی طرح جا کر خراٹے ہی مارے گا یا پھر اپنی چھلے آلو جیسی شکل کی سلفیاں بنائے گا۔۔۔ ہونہہ!"

"پہلی دفعہ نہیں چلا مگر ایسے ویلے پہلی دفعہ چلا ہے اللہ خیر سے واپس لائے۔" مسرت بانو نے جذباتی ہو کر نادیدہ آنسو پونچھے۔

"فکر نہ کر۔۔۔ اس کی خیریت تجھے۔۔۔ وہ کیا چیز ہے منحوس۔۔۔ فیس بک۔۔۔ آہو وہی۔۔۔ وہاں سے مل جائے گی کیونکہ اپنی تصویر وہیں چپکاتا ہے۔۔۔ عقل کا انا (اندھا) اتنا ہے کہ نوید (داماد) مجھے بتا رہا تھا کہ گدی پر بیٹھ کر تصویر کھینچی تیرے اس "لڈو" نے تصویر میں اس کے تھوبڑے کے بالکل پیچھے اللہ دتہ کھڑا تھا لنگی پہن کر۔۔۔ بغیر بنیان اور قمیص کے۔۔۔ اس "سیانے کال" نے تصویر کے اوپر لکھا "دی ایٹ میریٹ ہوٹل" لے دس۔۔۔ پیچھے نیم ننگا کالا کھڑا ہے اور یہ آگے بیٹھا چولیں مار رہا ہے۔۔۔ ہاہا۔۔۔ ہاہا!"

حسب معمول شیخ جی بے حد ہنسے اور اس دفعہ تو حیرت انگیز طور پر مسرت بانو بھی ہنسیں۔۔۔ دیکھا دیکھی نیلو فر۔۔۔ کے دانت بھی نکل آئے اور جب سب ہنس ہی رہے تھے تو ضیغم کو بھلا کیا مسئلہ تھا۔۔۔ وہ بھی ہنس دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ایک ہفتہ۔۔۔ خوش اسلوبی سے گزر چکا تھا۔ نیلو فر بے حد خوش تھی۔۔۔ ضیغم روز شیخ جی کے ہمراہ دکان پر جا رہا تھا۔ تھوڑا چڑچڑا ہو رہا تھا۔۔۔ سالوں کی روٹین غارت ہوئی تھی آخر۔۔۔ سارا سارا دن سستی سے پڑے رہنا اور لیٹ لیٹ کر تھک جانا اور پھر اونگھنا موقوف ہو گیا تھا لہٰذا طبیعت میں بیزاری ایک قدرتی امر تھا۔۔۔ مگر کیا کرتا۔۔۔ وہ کوچ ڈرائیور دو دفعہ مزید نیلو فر نے گلی میں دیکھ لیا تھا اور بے حد پریشانی کے عالم میں ضیغم کو بھی اطلاع دے دی تھی۔۔۔ اب ضیغم کا خوف زدہ ہونا تو بنتا تھا ناں!

مگر کب تک۔۔۔؟ نیلو فر دیکھ رہی تھی کہ ضیغم ڈھیلا پڑ رہا ہے۔۔۔ اس لیے ایک صبح تیاری میں مدد کرواتے ہوئے اس نے کہا۔

"ضیغم! میں سوچ رہی ہوں وہ منحوس ڈرائیور محلے میں یہاں وہاں سے سن گن لیتا دکان پر پہنچ گیا تو ظاہر سی بات ہے کہ سیدھا گدی سنبھال کر بیٹھے بندے کی طرح ہی جائے گا اور وہاں اس نے آپ کو دیکھ کر دھر لیا تو پورے بازار میں۔۔۔ اف۔۔۔ سوچیں۔۔۔ توبہ!"

نیلو فر نے ایسا شاندار منظر تخلیق کیا کہ ضیغم نے باقی کے سین کی ڈائریکشن خود ہی دے لی۔۔۔ وہ پٹ رہا تھا۔۔۔ بری طرح سے کٹ کھا رہا تھا۔۔۔ سامنے کے چار دانت اکھڑ کر ادھر ادھر لڑھک گئے تھے۔۔۔ کوئی بچا نہیں رہا تھا۔۔۔ سارا بازار۔۔۔ اتنی دنیا۔۔۔ تماشا۔۔۔ اف!

"تو اب میں اور کیا کروں... دکان سے اوپر آسمان ہے کیا اس پر لٹک جاؤں...!"

وہ بے چارہ روہانسا ہو کر بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔ مٹھیوں میں بال جکڑ کر... نیلوفر کو یکدم اس پر ترس سا آیا مگر یہ ڈھیل دینے کا وقت نہیں تھا۔ وہ فوراً" آگے بڑھ کر اس کے ساتھ آ بیٹھی اور ایک گہری سانس اندر کھینچتے ہوئے گویا ہوئی۔

"آپ دل تو چھوٹا مت کریں... اس مسئلے کا سیدھا اور آسان حل ہے کہ آپ بجائے سارا دن بے مصروف گدی پر بیٹھ کر وقت برباد کرنے کے ورکرز کے ساتھ مصروف رہا کریں۔ اس طرح ایک تو آپ کا وقت اچھا گزرے گا اور اگر وہ ڈرائیور پہنچ گیا تو اتنے آدمیوں میں آپ کو کیسے ڈھونڈے گا... دیکھیے گا چند دن میں آپ کا کام میں دل بھی لگ جائے گا اور وہ کوچ ڈرائیور دسیوں چکر بھی لگالے تب بھی آپ کو ڈھونڈ نہیں سکے گا..."

ضیغم کے چہرے پر تاثرات اس بات کی دلیل تھے کہ وہ نیلوفر کی بات پہ عمل کرنے کو تیار تھا... کام مشکل ضرور تھا مگر اب بیچ رستے میں آ کر نیلوفر کسی صورت ضیغم کی ہمت ٹوٹنے نہیں دے سکتی تھی... بس کچھ اور وقت درکار تھا اور پھر ضیغم اس سیٹ اپ کا عادی ہو جاتا۔

شیخ جی کی زوردار عجلت بھری آواز کانوں میں پڑی تو ضیغم ہڑبڑا کر تیزی سے اللہ حافظ کہتا نیچے بھاگا۔ نیلوفر نے سکون سے کنڈی چڑھائی اور ڈریسنگ ٹیبل کے نچلے دراز سے موبائل نکال کر ایک کال ملائی۔

"سلام بھائی! جی میں ٹھیک۔ اب وہ موقع آگیا ہے بھائی... آپ بندے بھیجیں... جی بالکل' باقی سب میں سنبھال لوں گی۔"

دو چار مبہم سی باتوں کے بعد نیلوفر نے جلدی سے کال ڈس کنیکٹ کر دی تھی۔ ایک لمبا سانس خارج کر کے' سیل فون واپس جگہ پر رکھا اور دروازہ کھول کر ایک اچٹتی سی نگاہ بیڈ روم پر ڈالتی... سیڑھیاں اترتی چلی گئی...!

★ ★ ★

اگلے دن کی بات تھی... ضیغم کو گئے ابھی تین گھنٹے بھی نہیں بیتے تھے کہ وہ حواس باختہ اور پھولا سانس لیے گھر میں داخل ہوا تھا۔ مسرت بانو کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے... بہتیرا پوچھا مگر ضیغم نے دانت سے دانت نہ اٹھایا... کمرے میں جا کر بے دم سا ہو کر لیٹ رہا۔ نیلوفر نے بھی خود سے کچھ نہ پوچھا... انتظار کرتی رہی کہ کب وہ خود ہی کچھ بتاتا ہے اور ہوا بھی یہی کہ جوں ہی ذرا دماغ ٹھکانے آیا تو خود ہی فرفر سب بتایا۔

دکان پر آج اس کو ڈھونڈتے ڈھانڈتے ڈرائیور کے گرگے پہنچ ہی گئے آخر... وہ تو اچھا ہوا کہ نیلوفر کے مشورے کے مطابق وہ "گدی" پر نہیں تھا بلکہ باقی ورکرز کے ساتھ مسلسل گاہکوں کو نمٹا رہا تھا۔ اس دوران اسے ذرا بھی فرصت نہیں ملتی تھی... اچھا بھلا مگن تھا کہ اچانک اس کی نظر دکان سے باہر گئی تو سب کچھ نظروں میں گھوم گیا... تین موٹے تازے' ہٹے کٹے بے نتھے بیل جیسے غنڈے دکان میں داخل ہو رہے تھے... ایک لمحہ لگا تھا اسے انہیں پہچاننے میں۔ وہ الٹے قدموں وہاں سے کھسکتا ہوا دکان کے پیچھے اسٹور روم میں جا کر چھپ گیا تھا... پتا نہیں کتنی دیر بعد جب وہ باہر آیا تو ایک دو لڑکوں نے اسے بتایا کہ "ضیغم بھائی... ابھی کچھ لفنگے سے آدمی آپ کا پتا کرنے آئے تھے۔ ہم سے بھی پوچھا... آپ نظر نہیں آئے تو کہہ دیا کہ کسی کام سے نکل گئے ہیں... وہ دوبارہ آنے کا کہہ گئے ہیں..."

اتنا سننا تھا کہ ضیغم کا رنگ فق اور طبق روشن ہو گئے... مزید ٹھہرنے کا یارا نہ تھا لہٰذا ان ہی قدموں گھر چلا آیا تھا۔

اب وہ نیلوفر کو ساری کتھا کہانی سنانے کے بعد اس کا بے حد ممنون تھا کہ آج اس کے مشورے کی وجہ سے وہ پٹنے سے بچ گیا تھا... اگر وہ گدی پر بیٹھا ہوتا تو...! اس سے آگے ضیغم کی آنکھوں کے سامنے مکے لہراتے تھے' ٹھڈے پڑتے نظر آتے تھے اور پورے جسم پر جگہ جگہ نیل بہار دکھاتے تھے...!

نیلوفر نے ضیغم کو کچھ دیر آرام کا مشورہ دیا اور خود

اسے چھوڑ کر نیچے چلی آئی... ابھی مسرت بانو کو بھی ڈھیروں تسلیاں دینی تھیں... وہ تو پہلے ہی اس کے لیے دل میں گرہ لگائے بیٹھی تھیں... بیٹے کی ایسی حالت تو انہیں مزید برگشتہ کرنے کے لیے کافی تھی... مگر اس سے بھی ضروری اگلے اسٹیپ پر عمل کرنا تھا... اور اس کے لیے نیلوفر کا ہوم ورک مکمل تھا۔

☼ ☼ ☼

ٹھیک دو دن بعد صبح گیارہ بجے کے قریب دروازے پر دستک ہوئی... "چھوٹے" نے دروازہ کھولا تو باہر آرڈر پر منگوایا ہوا سامان۔ پہنچانے کے لیے آدمی کھڑے تھے۔ بازار میں ہڑتال کی وجہ سے آج شیخ جی اور ضیغم دونوں گھر پر تھے۔ ضیغم تو سو سو کر اگلی پچھلی ساری کسر پوری کر رہا تھا جبکہ شیخ جی لنگی بنیان پہنے... صحن کے بیچوں بیچ چارپائی ڈالے بیٹھے تھے... سر بیگم سے سرسوں کے تیل کی خوب جم کر مالش کروائی تھی اور اب چھوٹے سے پنڈلیوں پر تیل ملوا رہے تھے کہ درمیان میں یہ رخنہ آگیا... چھوٹے کی اطلاع پر شیخ جی چارپائی پر لیٹے لیٹے ہی بولے...

"اوئے چھوٹے... ! جا کر کہہ دے 'ہم نے کچھ نہیں منگوایا' لے دس... بھلا شیخوں نے بھی آرڈر پر کبھی کچھ منگوایا ہے... شاباش...!"

نیلوفر جو کچن میں مصروف تھی... سن کر فوراً" باہر آئی اور واپس مڑتے چھوٹے کو روک دیا۔

"وہ... ابا جی! اصل میں 'میں نے منگوایا تھا کچھ سامان... یہ باہر میرا ہی آرڈر ہے..."

اس کے انداز میں جھجک تھی۔ اسے آج ڈلیوری کی امید نہیں تھی... ورنہ کم از کم فوری سوال جواب سے تو بچ جاتی...

"اوئے پتر... کیا منگوا لیا تو نے... وہ بھی اتنا وڈا وڈا سا..."

"میں آپ کو ساری بات سمجھاتی ہوں... فی الحال آپ سامان اندر منگوائیں اور یہ پکڑیں پیسے۔" نیلوفر نے مٹھی میں دبے نیلے نیلے کئی نوٹ شیخ جی کی طرف بڑھائے۔

"یہ آپ ان آدمیوں کو دے دیں۔"

"اوئے پتر... ! اتنے سارے پیسوں میں تو میرا اک واری فیرولیمہ ہو سکتا ہے... بلکہ تیری نئی سس کو ہنی مون پر لہور لے جا کر گھما پھرا کر واپس بھی لے آوں گا۔" اتنے پیسے دیکھ کر شیخ جی کے ہوش کے ساتھ ساتھ خیالات بھی خاصی اونچی اڑان بھر رہے تھے۔

"اوہو ابا جی! یہ پیسے میری سلامیوں کے ہیں... آپ پلیز ان آدمیوں کو دے کر سامان اندر منگوائیں۔"

ناچار شیخ جی کو جانا پڑا... آدمیوں نے سامان ڈیوڑھی میں رکھا تو شیخ جی پیٹ کھجاتے ہوئے بولے۔

"ایدے وچ کی بلا اے منڈیا..." اس آدمی نے جواباً" ہنکارا بھرتے ہوئے شیخ جی کے پیٹ کا جائزہ لیا اور بولا۔

"یہ جس کو آپ کھجا کر بے حال ہو رہے ہیں۔ بس اس کو ہڑپ کر لینے والی بلا ہے اس میں۔"

"زیادہ چھچھورا نہ بن... سیدھی طرح بول... ورنہ سامان بھی رکھ لوں گا اور پیسہ بھی نہیں دوں گا۔" شیخ جی کا طیش میں آنا لازمی تھا... مقابل بھی صورت حال دیکھ کر فوراً" سنجیدگی سے سامان کی نوعیت بتانے لگا۔

"چل پھر قیمت تھوڑی کم کر..." شیخ جی بولے۔

"فکس پرائس ہے جی..."

"چل دو تین ہزار تو کم کرناں... اتنی بڑی رقم ہے یہ..."

"نہیں جی! فکس ہے... آرڈر پر منگوائے سامان کی قیمت طے شدہ ہوتی ہے۔" وہ آدمی زچ سا ہوا۔

"چل میرا پتر... ایک ہزار تو چھوڑ..." شیخ جی نے پچکارا۔

"او جناب... ! نہیں ہو سکتی۔"

"او یار... ! چل پانچ سو تو چھوڑ..."

"نہیں جی! آپ مجھے پوری قیمت دیں ورنہ میں سامان واپس لے جاتا ہوں۔"

"جا او ئے شوہدیا.....! دو سو ہی چھوڑ دے۔" شیخ جی کا انداز لجاجت زدہ تھا۔ اس آدمی نے جیب سے دو سو روپے نکالے اور شیخ جی کی ہتھیلی پر دھپ کر کے رکھے اور بولا۔

"یہ میں پلے سے دے رہا ہوں..... اب مجھے میرے سامان کی پوری رقم دیں..... وہ کمپنی کی ہے....."

"ہونہہ.....! چول ہی ماری آ..... لے پکڑ..... بڑا آیا' دفع ہو جا فوراً" ..... پھٹ لے ورنہ میرا غصہ پھوٹ پڑے گا۔" شیخ جی کی ٹون ہی بدل گئی وہ آدمی حیرت سے دیکھتا پیسے تھام کر بڑبڑاتا ہوا واپس پلٹ گیا اور شیخ جی دو سو روپے لنگی کے بل میں اڑستے ہوئے بڑے فخر سے سر دھنتے سوچ رہے تھے۔

"آخر کچھ تو چھڑایا میں نے..... ورنہ شیخ کیسے ہوتا!"

ضیغم بڑی بے بسی سے اپنے سامنے پڑی رننگ مشین کو دیکھ رہا تھا..... تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک نظر نیلوفر پر بھی ڈال لیتا جو دونوں بازو سینے پر لپیٹے آنکھوں میں عزم اور ہونٹوں پر شرارت لیے اسے دیکھ رہی تھی۔ یہی وہ بلا تھی جو نیلوفر نے آرڈر پر ضیغم کے لیے منگوائی تھی..... آٹومیٹک تھی..... اچھی کمپنی کی..... مگر ضیغم کو اسے دیکھ دیکھ ہول اٹھ رہے تھے۔ اسے کیا پتا تھا کہ ایک ہفتہ پہلے نیلوفر نے جو اتنی محبت اور مان سے اس سے موٹی رقم ہتھیائی تھی..... یہ کہہ کر کہ "آپ کے لیے سرپرائز گفٹ آرڈر کیا ہے"..... وہ یہ گفٹ تھا۔ اس سے تو اچھا تھا کہ وہ نیلوفر کو ایک خوب صورت سا لاکٹ سیٹ گفٹ کر دیتا..... اتنی بڑی رقم برباد کر دی۔ ضیغم کے دل سے تاسف ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

نیلوفر اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھتی اس کے قریب آئی اور گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔

"ایک تو آپ کا فائدہ سوچوں اور ساتھ میں اتنی باتیں بھی سنوں..... کیا حاصل ہوا مجھے اتنا کچھ کر کے۔ آپ تو راضی نہ ہوئے ناں....." اس نے شعوری کوشش سے آواز میں رقت پیدا کی۔

"ایسا نہیں ہے نیلو..... مگر میں اتنا سیاپا نہیں کر سکتا' مجھ سے کہاں ایکسرسائز ہوتی ہے اور اماں تو مجھے ہرگز نہیں کرنے دیں گی۔ ان کو تو میری باڈی بے حد پسند ہے۔" ضیغم کے لہجے میں فخر اتر آیا تھا۔ نیلوفر زچ ہو کر بولی۔

"باڈی نہیں وڈا سارا باڈا ہے آپ کا..... کس خوش فہمی میں ہیں آپ..... آج اسی باڈی کی وجہ سے دس قدم چلتے ہیں تو سانس پھول جاتی ہے..... مشقت والا کام آپ سے نہیں ہوتا..... سستی آپ پر سوار رہتی ہے۔ ہارٹ بیٹ آپ کی نارمل نہیں رہتی..... اور پھر سب سے بڑا نقصان اس خوب صورت "باڈی" کا یہ ہو رہا ہے کہ اس کی وجہ سے آپ اس کوچ ڈرائیور کے ذہن میں سما گئے..... ہوتے کوئی آپ بھی سلم اور اسمارٹ تو وہ کبھی آپ کو اتنا نوٹس نہ کرتا اور آج اسی باڈی کی وجہ سے..... کہیں بھی اچانک وہ سرِ راہ آپ کو ٹکرا جائے تو کیا آپ فوری بھاگ پائیں گے.....؟"

نیلوفر نے جوش سے پھولتی سانسوں کو ہموار کیا اور ایک ابرو اچکائے اسے دیکھنے لگی۔ ضیغم کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیں تھی..... چند لمحے بعد وہ جیسے کسی خیال کے زیرِ اثر بولا۔

"کہہ تو تم صحیح رہی ہو..... میں تو اپنے وزن کی وجہ سے ایک کرسی نہیں پھلانگ سکتا..... بھاگ کیسے سکتا ہوں....."

"اسی لیے ضیغم..... میں چاہتی ہوں کہ آپ بھاگیں نہیں بلکہ مقابلہ کریں..... آپ میں چستی ہوگی تو ایک کی دو دھریں گے..... جسم بے ڈھنگا ہونے کے بجائے سڈول ہوگا تو مقابل کے بازوؤں سے مچھلی کی طرح پھسل کر سامنے سے وار کر سکتے ہیں۔"

نیلوفر تو جیسے ضیغم کے آگے پوری فلم چلا رہی تھی..... جس میں وہ ہیرو تھا اور اپنے کسرتی بازوؤں سے اس کوچ ڈرائیور کا منہ مکوں سے لال کیے جا رہا تھا۔ وہ ڈرائیور اس پر جھپٹتا تو وہ کمال پھرتی سے جھکائی دے جاتا۔ پورا بازار اس کے "ہیروٹیک اسٹنٹس" دیکھنے کے لیے ارد گرد جمع ہے۔ وہ ڈرائیور کو یہاں سے مارتا وہاں سے پچھاڑتا اور خود ہاتھ نہ آتا۔

"واہ...!" اپنی ہی جھونک میں بے اختیار ضیغم کے منہ سے نکلا۔

"کیا واہ...!" نیلوفر حیران ہوئی۔

"کچھ نہیں ٹھیک ہے نیلو...! آج سے بلکہ ابھی سے!" ضیغم نے اپنی جگہ چھوڑی اور بڑے اسٹائل سے قمیص اتار کر بیڈ پر اچھالی اور یوں جا کر رننگ مشین کے بیلٹ پر کھڑا ہوا جیسے اس کوچ ڈرائیور کے سینے پر کھڑا ہو۔ نیلوفر نے خوشی کے احساس کو دباتے ہوئے احتیاط سے اسٹارٹ کا بٹن پریس کیا اور وہیں کرسی پر ٹک کر رینگتی ہوئی بیلٹ پر نظریں جمادیں...!

☼ ☼ ☼

"تین ماہ بعد۔"

شیخ جی کے گھر مہمانوں کا تانتا بندھنا شروع ہو گیا تھا۔ چاچی، مامی، پھوپھی، تائی سبھی شریک محفل تھیں۔ مسرت بانو مستانی چال چلتی ادھر سے ادھر منڈلا رہی تھیں۔ شیخ جی اندر بیٹھک میں مردوں کی ٹولی کو ہمراہ لیے بیٹھے تھے... ابھی کھانا لگنے میں ٹائم تھا اس لیے تواضع کے لیے فروٹ چاٹ، چنا چاٹ اور دہی پھلکیاں درمیان میں رکھی میزوں پر دھری تھیں... اس دعوت خاص کی "خاص" وجہ کچھ نہیں تھی... بس مسرت بانو نے گھر میں کچھ ترامیم کروائی تھیں۔ کچن کی لک کو مکمل بدل دیا گیا تھا... گھر کے بیچوں بیچ جو صحن تھا اس کو کور کر کے ایک بیڈ روم کا مزید اضافہ کیا گیا تھا اور باقاعدہ ٹی وی لاؤنج بھی بن چکا تھا... جس میں لگی لمبی چوڑی ایل ای ڈی کی چمکتی اسکرین پل بھر کو آنے والے کو روک لیتی تھی۔ کار پورچ بنوا کر چھوٹے سے داخلی دروازے کو وسعت دے کر آہنی گیٹ نصب کروایا گیا تھا۔ اب اتنا کچھ ہو گیا تھا تو مسرت بانو رشتے داروں کو بلا کر دکھاتیں کیوں ناں...! یہ کیسے ہو سکتا تھا! لہٰذا اب جبکہ سب نے گھوم پھر کر خوب اچھی طرح سارے گھر کا جائزہ لے لیا تھا تو مسرت بانو کو ٹھنڈ پڑ گئی تھی۔ مگر ابھی اصل شے کو پردہ سیمیں پر جلوہ افروز ہونا تھا... بس ذرا انتظار!

وہیں کار پورچ میں سب سے کٹ کر تین نفوس اس وقت کھڑے نسبتاً "ہلکی آواز میں بات چیت کرنے میں مگن تھے اور وہ تینوں افراد تھے نیلوفر، صبغہ اور نوید!

"میرے پاس حقیقتاً" الفاظ نہیں ہیں صبغہ اور نوید بھائی! کہ میں کس طرح سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ ایک کام جسے میں آخری حد تک ناممکن خیال کرتی تھی آج صرف آپ دونوں کی وجہ سے ممکن ہوا۔"

نیلوفر کا عاجزی اور تشکر سے بھرپور لہجہ اس کے احساسات کی ترجمانی کر رہا تھا۔ صبغہ نے آگے بڑھ کر اسے خود سے لگا لیا اور بولی۔

"بھائی کی فکر صرف تمہیں ہی تو نہیں تھی نیلو... ہم دونوں کو بھی تھی... سچ کہوں تو میں امی اور بھائی کو سمجھا سمجھا کر ہار چکی تھی... یہ تو جب تم بیاہ کر یہاں آئیں اور تم نے مجھ پر اپنے ارادے ظاہر کیے تو میں نے بھی دوبارہ امید باندھ لی... ہاں! نوید کا ضرور شکریہ بنتا ہے کہ آخر کوچ ڈرائیور کی طرف سے بھیجے جانے والے غنڈے ان ہی کے تھے..." صبغہ نے شرارت سے نوید کو دیکھا تو وہ کھل کر مسکرا دیا... اور بولا۔

"بھئی یہ کون سا مشکل کام تھا... فیکٹری کے ہی دو چار صحت مند سے بندے بھیجتا رہا ہوں... ضیغم کو دھمکانے کے لیے... ہاں! نتائج بے شک توقع سے زیادہ مثبت رہے... باقی تو آپ کی لگن اور عزم تھا بھابھی۔ جس نے آج آپ کو یہ دن دکھایا۔"

نوید نے پورے دل سے نیلوفر کو سراہا تو وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ کوئی ان تینوں کو ادھر یوں کھڑا دیکھ کر ٹھٹک نہ جائے... اس ڈر سے صبغہ نوید کو دو چار ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اندر لے گئی... جبکہ نیلوفر وہیں برآمدے کی سیڑھیوں کے اوپر والے اسٹیپ پر ٹک گئی۔ کچھ دیر میں اس کے میکے والے پہنچنے والے تھے۔

وہ نوید اور صبغہ کا احسان جی جان سے مانتی تھی... اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ جس طرح سے اس نے

ضیغم کے دل میں کوچ ڈرائیور کا خوف ڈال کر اس کی سست رفتار زندگی کو ایک نیا موڑ دیا تھا... اگر کوئی مددگار نہ ہوتا تو وہ اکیلی صرف اپنا سر ہی پھوڑ سکتی تھی۔ سوئے اتفاق کہ صبغہ نے اس کی پریشانی بھانپ لی اور پھر وہ اس پر مکمل طور پر کھل گئی... اس گھر کے افراد میں صبغہ اس کی سب سے بڑی مددگار ثابت ہوئی... ان دونوں نے مشترکہ طور پر ضیغم کی بہتری اور بھلائی کے لیے کام کیا تھا۔

صبغہ نے اس کی ہمت ٹوٹنے نہیں دی تھی... اور آج اس کی لگن اور عزم کا پھل اس کے سامنے تھا... اس کی نظروں کے سامنے ضیغم کا سراپا لہرا گیا تو بے اختیار ایک خوب صورت سی مسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں کو چھوا... مگر اگلے ہی پل اس کا ارتکاز ٹوٹ گیا۔ گیٹ پر دستک ہو رہی تھی 'یقیناً" اس کے میکے والے پہنچ چکے تھے۔

جس وقت وہ ہنستی مسکراتی سب کو ساتھ لیے لاؤنج میں داخل ہوئی تو عین اسی وقت ضیغم سیڑھیاں اترتا بے نیازی سے دبا میں ہاتھ سے گھڑی کا اسٹریپ بند کرتا... جیسے سارے ماحول پر چھا گیا۔ سب کی نظریں ضیغم پر اٹھیں اور پھر جم گئیں۔ خود عافیہ خاتون' صنوبر اور فیروزہ حیرت زدہ تھیں... جبکہ وہ شہزادہ سا آن بان سے تمام رشتے داروں سے ملتا ملاتا' مسکراتا دھیرے دھیرے اپنی بیوی کے پاس آرہا تھا۔ نیلوفر کا دل فخر سے بھر گیا۔ آج اس جیسا قسمت کا دھنی کون تھا...!

ضیغم یکسر تبدیل ہو چکا ہوگا... یہ کسی کے گمان میں نہیں تھا۔ مسرت بانو پتر کی بلائیں لیتی تھک نہیں رہی تھیں اور کیوں نہ لیتیں... پتر کی چھب ہی ایسی تھی! سلم' اسمارٹ اور ہینڈسم سا ضیغم سب کی زبانیں گنگ کر گیا تھا۔ بلیک پینٹ پر وائٹ شرٹ... خوب صورت آرمی کٹ... معمولی سی بڑھی ہوئی شیو اور اس سارے میں اس کا بے حد نمایاں ہوتا کسرتی جسم تناتنا سا مضبوط اور توانا مردانہ جسم...! نیلوفر کو تو جیسے ہر طرف سے طاہرہ سید کی گنگناتی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"یہ محفل جو آج سجی ہے... اس محفل میں ہے کوئی ہم سا... ہم سا ہو تو سامنے آئے۔"

آٹھ بجے کا وقت تھا... رات کا کھانا کھا کر تقریباً" سبھی مہمان واپس جا چکے تھے... سوائے صبغہ اور نوید کے یا پھر ابھی تک نیلوفر کے میکے والے ادھر ہی تھے۔ خوش گپیاں تھیں کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ چائے کا دور چل رہا تھا موضوع محفل ضیغم ہی کی ذات تھی۔ مسرت بانو کا لہجہ مسرت سے لبریز تھا' وہ رہ رہ کر بھی رشتے داروں کے حیرت و رشک سے بھرے جملے دہرائے جا رہی تھیں' جو سب نے ضیغم کو دیکھ کر ادا کیے تھے۔ ضیغم... نوید اور اپنے سالوں کے ساتھ بیٹھا ہلکی پھلکی گفتگو میں مگن تھا... کسی کسی وقت وہ جیب سے موبائل نکال کر ایک نظر اس پر بھی ڈال لیتا' نیلوفر کی نگاہیں تو بس اسی کا طواف کیے جا رہی تھیں۔

مزے کی بات شیخ جی اب کوئی طنزیہ جملہ نہیں اچھالتے تھے۔ بیٹے پر... آخر کو پچھلے تین ماہ سے ضیغم نے کاروبار میں اس طرح سے ہاتھ بٹانا شروع کیا تھا کہ شیخ جی کو لگتا جیسے وہ خود اناڑی ہوں...!

ایک ذرا سی گرومنگ نے ضیغم کو اناڑی سے کھلاڑی بنا دیا تھا... اس کی بول چال' رنگ ڈھنگ اور اطوار سب ہی میں اعتماد اتر آیا تھا... جبکہ محض چند ماہ پہلے تک کسی بھی محفل میں ضیغم کی شخصیت انتہائی دبی ہوئی محسوس ہوتی تھی... اور اس کے لیے وہ خود بھی جی جان سے نیلوفر کا ممنون تھا... پیار تو وہ اس سے پہلے بھی کرتا تھا مگر اب تو نثار ہونے کو تیار رہتا تھا۔ ابھی بھی ایک میٹھی سی نظر نیلوفر پر ڈال کر دوسری موبائل پر ڈالی... جس کی اسکرین روشن ہو رہی تھی۔ ضیغم کے چہرے کے تاثرات یکدم تبدیل ہوئے اس نے کال ریسیو کر کے سیل فون کان سے لگایا... وہ صرف ہوں' ہاں میں جواب دے رہا تھا۔

نیلوفر جانتی تھی کہ پچھلے تین ماہ میں جم جانے کی وجہ سے ضیغم کے یار دوستوں میں اضافہ ہوا تھا... اب تو ہر دوسرا لڑکا اس کے دوستوں میں شامل تھا... اس

وقت بھی نیلوفر کو یہی گمان گزرا کہ کسی دوست کی کال ہو گی۔۔۔ وہ رخ پھیر کر فیروزہ آپی سے باتیں کرنے لگی' چند منٹ بعد یکدم ضیغم پورے جوش سے کھڑا ہوا اور بولا۔

"ابا جی۔۔۔ اماں! میں ذرا کام سے جا رہا ہوں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے تک آجاؤں گا۔"

"پر پتر کدھر چلا ہے ایس ویلے۔۔۔" شیخ جی چائے کی لمبی سی سڑکی لے کر بولے۔

"بس ابا جی! سمجھیں میں پچھلے چھ ماہ کا حساب بے باق کرنے جا رہا ہوں۔۔۔ بڑا لمبا انتظار کیا ہے میں نے' سولی پر لٹکا رہا ہوں۔۔۔ آج میں اس کوچ ڈرائیور سے اگلے پچھلے سارے کھاتے کلیئر کر کے آؤں گا۔"

نیلوفر' صبغہ اور نوید کے اوسان پل بھر میں خطا ہو گئے تھے۔ کون سا کوچ ڈرائیور؟ تینوں کی نظروں میں ایک دوسرے کے لیے سوال تھا۔ نوید نے ہی تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

"یار ضیغم۔۔۔! کون سا کوچ ڈرائیور۔۔۔ اور کون سا کھاتہ۔۔۔!"

"یار نوید! تم نہیں جانتے اس خبیث نے چھ ماہ سے میری نیندیں اڑا رکھی تھیں' میرے دماغ کا دہی بنا کر رکھ دیا تھا۔۔۔ بلکہ میرے دماغ کی لسی بن چکی تھی۔۔۔"

"تو شہزادے اب تو مکھن نکلوانے جا رہا ہے کیا۔" شیخ جی نے درمیان سے بات اچک کر لقمہ دیا۔

"ابا جی! میں نے اپنے دو تین بدمعاش ٹائپ دوستوں کو اس کا پتا لگانے کو کہا تھا۔۔۔ اتنا تو میں جانتا تھا کہ اس کی کوچ اڈے پر کس وقت آکر کھڑی ہوتی ہے اور کب نکلتی ہے۔۔۔ بس گھیرے میں نہیں آرہا تھا وہ سانڈ' آج پکڑا گیا۔ اب ایسی مار ماروں گا کہ اگلے چھ مہینے کے لیے وہ گھر میں بند رہے گا۔"

ضیغم نے ہتھیلی پر مکا مارا' جیسے ہتھیلی نہیں اس ڈرائیور کا تھوبڑا ہو۔

"ہاں۔۔۔! جی او میرا شیرا! آج میرے پتر نے ثابت کر دیا کہ وہ پہلوانوں کے شہر سے ہے۔۔۔ جا میرا شہزادہ۔۔۔ ذرا دو ہاتھ میری طرف سے بھی لگا دینا۔۔۔"

شیخ جی نے ہلا شیری دے کر مہر ثبت کر دی تھی اب نوید اسے روک نہیں سکتا تھا' اس ڈرائیور کو اب کم از کم چند مکے تو ضرور پڑنے تھے نوید نے بے بسی سے نیلوفر کو دیکھتے ہوئے کندھے اچکائے اور نیلوفر روہانسی ہوئی اپنی ماں بہنوں کو دیکھ رہی تھی جو مسرت بانو کے ساتھ مل کر ایسے ضیغم کو وداع کر رہی تھیں جیسے کسی محاذ پر بھیج رہی ہوں۔

مسرت بانو نے سات مرچیں وار کر چولہے میں جھونکی تھیں' عافیہ خاتون نے پانچ سو روپے کا نوٹ وار کر صدقہ کیا اور سالیوں نے آیت الکرسی کا حصار باندھا۔۔۔ جبکہ دونوں سالے ہمراہ ہو لیے کہ ضیغم بھائی ذرا ہمارے ہاتھوں کی صفائی بھی کروا دیں۔۔۔

لو جی۔۔۔ یہاں تو سبھی کچھ الٹا ہو گیا تھا' لگتا تھا ضیغم کو "اوور ڈوزنگ" ہو گئی تھی' وہ نیلوفر کی ڈیمانڈ سے زیادہ "بہادر" ہو گیا تھا۔ پہلے والے ضیغم کو بدلنے کے لیے کیا کچھ نہیں کرنا پڑا تھا اب اس والے ضیغم کو بدلنے کے لیے وہ کیا کرے جو "واٹر گن" سے "شاٹ گن" میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس نے بے چارگی سے صبغہ کو دیکھا۔۔۔ صبغہ نے نوید کو' جبکہ نوید کھسیانی ہنسی ہنستا دونوں کو دیکھ کر رہ گیا۔۔۔ نیلوفر دھپ سے صوفے پر سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اب اس کا کیا حل ہو؟ ایک دفعہ پھر پہلے سے بھی بڑا سوالیہ نشان اس کی نظروں کے سامنے ترمروں کی صورت ناچنے لگا تھا۔۔۔!

فرح بخاری

# پیغام اچھا

نبیل کا فارورڈ میسج پڑھ کر وقار کے لب مسکرا اٹھے' یہ میسج بھی پتا نہیں کہاں کہاں گھوم آتے ہیں۔ جو لطیفہ اس نے پچھلے روز عدنان کو بھیجا تھا آج اسے نبیل کی طرف سے موصول ہوا تھا۔ نبیل اس کا کزن تھا اور فیصل آباد میں رہتا تھا جبکہ عدنان اس کا کلاس فیلو تھا اور یہیں راولپنڈی میں رہائش پذیر تھا۔ بظاہر نبیل اور عدنان کا آپس میں کوئی تعلق نہیں تھا اور بظاہر تو فارورڈ میسج کی آپس میں کڑیاں ملانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ لاپروائی سے ریکٹ صوفے پر پھینک کر باہر نکلا۔

کبھی سنا کرتے تھے کہ کتابیں ہمیں دنیا کی سیر کراتی ہیں' لیکن اب تو یہ میسجز ہی ہمیں گھمانے کے لیے کافی ہیں۔ "گھمانے کے لیے" اس نے اپنے الفاظ کے دہرے معنوں پر غور کیا اور ہنس پڑا۔

"ہاں ویسے گھما ہی تو ڈالا ہے ہماری زندگیوں کو۔" مسکراتے ہوئے اس نے موبائل فون جیب میں رکھا اور اپنی سائیکل باہر نکال کر پارک کے کنارے گول سڑک پر رواں دواں ہو گیا۔ موسم بہترین تھا اور دل و دماغ تو آج کل بلاوجہ ہی معطر رہتے تھے۔ مسکراہٹ بھی بات بے بات یوں ہی ہونٹوں پہ سجی رہتی تھی۔

آج کل ساری دنیا ہی اسے نئی نئی لگنے لگی تھی۔ شاید یہ عمر ہی ایسی تھی۔ جدھر نگاہ اٹھاؤ حسن ہی حسن نظر آتا۔ ہر چہرہ دلکش اور ہر بات پیاری لگتی تھی۔ چال میں ایک غرور سا جھلکنے لگا تھا۔ خود پر اٹھنے والی نظروں میں ستائش کا عنصر' ہواؤں میں اڑائے پھرتا۔۔۔ اور کیوں نہ ہو۔۔۔ عمر کا انیسواں برس اور ایک مردانہ حسین اٹھان۔۔۔ آئینہ ہی بہت کافی تھا مغرور کرنے کو۔ اسے بھی اچھا لگتا تھا آئینے کے سامنے وقت گزارنا۔ بالوں کے نت نئے اسٹائل بنانا' ماڈرن ڈریسنگ کرنا' میوزک سننا' پھر اکیلے میں ان ہی گانوں کو گنگناتے رہنا۔۔۔ دوستوں کی محفل میں اپنی باتوں اور چٹکلوں سے چھا جانا۔۔۔ اور ہاں بھئی!۔۔۔ سب سے اہم' لڑکیوں کے موضوع پر بولنا اور بولتے چلے جانا۔۔۔!

پر اب پچھلے کچھ دنوں سے اس معاملے میں وہ ذرا محتاط سا دکھائی دینے لگا تھا۔ دل کو جیسے ایک ٹھکانہ' ایک پڑاؤ مل گیا تھا۔ وہ موہنی صورت اور شرمیلی ہنسی کی مالک۔۔۔ اپنے نام کی طرح حسین اور نازک۔۔۔ کومل رحیم' جب سے زندگی میں آئی تھی' کوئی اور موضوع بھاتا ہی نہ تھا' لیکن اس کی مجبوری یہ تھی کہ وہ ہر کسی سے اس بارے میں بات نہیں کر سکتا تھا۔ قدم جب ایک جگہ پر جم گئے تو طرح طرح کی احتیاطیں بھی دامن گیر ہو گئیں۔۔۔ محلے کی لڑکیوں' بہنوں کی سہیلیوں اور کزنز پر پھٹے ڈھول کی طرح تبصرے کرنے والے کو اب اپنے محبوب کی رسوائی ہرگز قبول نہ تھی۔ کچھ کومل بھی حد درجہ محتاط طبیعت کی تھی۔ کال ملاتے ہی سب سے پہلے عہد و پیمان طے ہوتے کہ وہ کسی سے اس تعلق کا ذکر نہیں کرے گا اور اس محبت کو صرف اپنے تک محدود رکھے گا۔ وقار اس کے دل موہ لینے والے انداز پر اس کا مزید گرویدہ ہو جاتا۔

"بھئی تمہارے کہے کا خیال نہیں رکھوں گا تو بولو کہاں جاؤں گا' تمہاری ناراضی افورڈ نہیں کر سکتا۔ بے فکر رہو۔۔۔ تمہیں اس پاگل نے دل کی گہرائیوں سے چاہا ہے۔۔۔ میں تمہیں ہمیشہ اس دل کے نہاں خانوں میں چھپا کر رکھوں گا۔۔۔ بس تم اس دل کی قدر کرنا۔" آخر میں وہ سنجیدہ ہو جاتا تو کومل ہنسنے لگتی۔





”بھروسا نہیں ہے کیا....؟“

”تم پر بھروسا نہیں ہے تو پھر اپنی ذات پر یقین بھی بے کار ہے۔“

”آج اتنے سنجیدہ کیوں ہو....؟“ کومل اس کے انداز پر چونکی۔

”بس یار....! جب اپنے آس پاس نظر ڈالتا ہوں تو لگتا ہے سب کچھ سراب ہے۔ نہ باتیں سچی ہیں نہ وعدوں میں کوئی دم۔“ وقار کا سنجیدہ لہجہ عجیب تھکا تھکا سا تھا۔

”ایسا کیا ہوا وقار.... بتاؤ نا؟“ کومل سچ مچ پریشان ہوگئی۔

”وہ میرا دوست ہے نا عدنان.... وہی جس کے بارے میں تمہیں بتایا تھا کہ اسے اپنی پڑوسن سے پیار ہوگیا ہے۔“

”ہاں۔ ہاں۔ کیا ہوا.... کیا انکار ہوگیا وہاں سے....؟“

”جی نہیں....“ وقار نے آہ بھری۔ ”اسے ایک بار پھر پیار ہوگیا ہے۔ انٹرنیٹ پر کسی اور لڑکی سے۔“

”ہائیں....“ کومل کی چیخ نما آواز موبائل سے ابھری تو وقار اس کی معصومیت پر ہنس پڑا۔

”جی جناب.... یعنی پڑوسن آؤٹ اور انٹرنیٹ والی ان.... اب مجھ سے پوچھنے آتا ہے پڑوسن سے نجات کے نسخے۔“

”اوہ....“ وہ ہنسنے لگی۔ ”تو تم کیوں اداس پریشان بیٹھے ہو۔ کہیں پڑوسن کو اپنا کندھا پیش کرنے کی خواہش تو نہیں ہو رہی....“ کومل نے شوخی سے چھیڑا تو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ہنس پڑا، حالانکہ دل لوگوں کے پل پل بدلتے رویوں پر اتنا جل کڑھ رہا تھا کہ وہ بہت کچھ بولنا چاہتا تھا، لیکن کومل کا شوخ موڈ دیکھ کر اس نے بھی

اپنا لہجہ تبدیل کرلیا۔

☆ ☆ ☆

"پلیز یار... بس ایک گھنٹے کی بات ہے۔"

"اچھا میرے بھائی... ٹھیک ہے...." سلمان نے بائیک کی چابی وقار کو تھمائی۔ "لیکن مجھے راجا بازار سے ذرا پہلے ڈراپ کرتے جاؤ۔ تمہاری سائیکل پر اتنی دور نہیں جا سکتا۔"

"ٹھیک ہے... پھر یہ میری سائیکل اپنے گھر میں کھڑی کرلو۔" وقار نے باقاعدہ اٹھا کر اپنی سائیکل اسٹیپس پر چڑھائی۔ کومل اپنی کسی دوست کی سالگرہ میں شریک ہونے جارہی تھی اور چونکہ اکیلی تھی تو ملنے کا سنہری موقع تھا۔ دونوں نے یہ طے کیا تھا کہ وقار اسے گھر سے سہیلی کے گھر تک ڈراپ کرے گا۔ وقار کے لیے یہ خوشی بھی بہت بڑی تھی۔ اب بس بائیک کا بندوبست کرنا تھا۔ اس سے پہلے ہمیشہ ایسے موقعوں پر نصیر بھیا اس کے کام آتے تھے۔ وہ اس کے ماموں زاد بھی تھے اور بہنوئی بھی... ان کا گھر بھی نزدیک تھا۔ وہ بلا جھجک دور کے کام بھیا کی بائیک پر نمٹا آتا تھا' لیکن آج کومل کو لے جانے کے موقع پر اتفاقاً" وہ بائیک سمیت کہیں گئے ہوئے تھے۔ وقت بھی کم تھا۔ لہٰذا اسے سلمان سے مدد مانگنی پڑی۔

"ہاں جی... تو سرکار کی سواری کہاں تشریف لے جارہی ہے۔" پیچھے سے سلمان نے ہلکے سے اس کا کندھا چھوا۔

"ہمیں ایک ضروری کام سے جانا ہے۔" وقار نے صاف ٹالا۔

"اچھا بچو... اب ہمیں بھی چلاؤ گے۔" سلمان نے اس مرتبہ زور سے اس کے بازو پر چٹکی کاٹی... اور وقار چلتی بائیک پر اچھل پڑا۔ "کیا مصیبت ہے یار!"

"کون ہیں یہ کومل صاحبہ...؟" سلمان نے ایک ہی جھٹکے میں دھماکا کیا۔ وقار کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔

"کک... کون...؟"

"کک... کون نہیں... کک... کومل..." سلمان نے ہنس کر تصحیح کی۔

"ابھی تمہارے موبائل پر میسج آیا ہے... کک... کومل کا... "آہم..." اس نے کھنکھار کر گلا درست کیا۔ "میں دس منٹ میں گھر سے نکل رہی ہوں اور سڑک کے دائیں طرف پیدل پٹرول پمپ تک چلتی جاؤں گی۔ تم وہیں آجانا۔" اس نے باقاعدہ زنانہ آواز میں میسج پڑھا اور وقار نے بے ساختہ پینٹ کی جیب پر ہاتھ مارا۔

"میرا موبائل۔"

"جی آپ کا موبائل جو سائیکل اوپر چڑھاتے ہوئے گر گیا تھا۔"

"لاؤ یار... تنگ مت کرو..." اس نے بگڑے موڈ کے ساتھ ہاتھ پیچھے کیا۔

"پہلے "ان" سے ملواؤ..." وہ بھی خبیث تھا ایک نمبر کا... وقار دل ہی دل میں سخت جھنجلایا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ بھاؤ بھی نہ دیتا اس سلمان کو... لیکن اب وہ بائیک کے احسان تلے دب چکا تھا... اوپر سے کمینگی یہ کہ موبائل پر بھی قبضہ کیے بیٹھا تھا۔ اگلے میسج سے پہلے وہ ہر حال میں موبائل لینا چاہتا تھا۔

"اوکے۔ ملواتا ہوں... لاؤ موبائل...."

"ویری گڈ... اب آرام سے بائیک چلاؤ اور مڑو نہیں۔ اتر کر دیتا ہوں تمہارا موبائل..." سلمان نے گھر کا تو وہ بھی اس بار چپ چاپ بائیک چلاتا رہا۔

کومل ہلکے آسمانی رنگ کے لباس میں جیسے آسمان سے اتری کوئی حور لگ رہی تھی... گھبرائے گھبرائے انداز میں انگلیاں چٹخاتی وہ سڑک کنارے چل رہی تھی جب وقار نے بائیک عین اس کے قریب روکی۔

"السلام علیکم...!" سلمان نے جھٹ بائیک سے اتر کر وقار سے پہلے مودبانہ سلام عرض کردیا۔ کومل نے الجھ کر وقار کو دیکھا۔

"یہ میرا دوست ہے سلمان... تم سے ملنے کا بہت

شرق تھا اسے...." وقار صحیح معنوں میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ کومل جواباً" خاموش ہی کھڑی رہی۔

"اچھا ہم چلتے ہیں یہاں کافی رش ہے۔" وقار نے جان چھڑانے کے لیے فوراً" ہی کہہ دیا۔

"ہاں۔ ٹھیک ہے۔ میں بھی یہیں سے کچھ پکڑ لیتا ہوں.... اوکے 'باس....' ریورس میں چلتے ہوئے اس نے ماتھے پہ ہاتھ لے جا کر سلام کیا اور وقار اس کی سائیڈ سے بائیک آگے بڑھا تا لے گیا۔

"یہ کون تھا....؟ اور کیوں ملنا چاہتا تھا مجھ سے...."

کومل نے دو ہی منٹ میں پیچھے سے سر نکالا۔

"ارے وہ تو میں نے یونہی کہہ دیا.... آج اس کی بائیک لایا ہوں اور اسے یہاں ڈراپ کرنا تھا تو ساتھ لانا پڑا۔"

"یہ اس کی بائیک ہے...." کومل نے نئی چمچماتی بائیک پر دھیان دیا۔

"ہاں۔ نصیر بھیا کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ اس لیے سلمان سے مانگنا پڑ گئی.... ہاں تو.... کہاں ہے تمہاری سہیلی کا گھر...." وقار نے یاد دلایا۔

"او۔ ہاں.... اس کا گھر ہمارے کالج کی طرف ہے۔

تم اس سائیڈ پہ لے لو.... میں بتاتی جاؤں گی۔"

"آج تو بڑی زبردست ڈریسنگ کی ہے۔" وقار کی بائیک نے ردھم پکڑا۔

"صرف ڈریسنگ اچھی ہے....؟" کومل نے شوخ کھنکتی آواز میں شکوہ کیا تو باقی کا راستہ وقار نے اس کی تعریف میں کاٹ دیا جو بلاشبہ پھولوں' رنگوں' تتلیوں اور بہاروں کا سارا حسن اور دلکشی اپنے اندر سمیٹ لائی تھی۔

☆ ☆ ☆

"کیا مصیبت ہے...." وقار نے غصے سے موبائل ہی پلنگ پر پٹخ دیا۔ کوئی آدھے گھنٹے سے وہ کومل کا نمبر ٹرائی کر رہا تھا' لیکن نمبر مسلسل بزی آرہا تھا اور پچھلے چند روز سے ایسا متواتر ہو رہا تھا۔ ایک دن تو وہ ٹھیک ٹھیک اس پر برس پڑا' لیکن کومل نے فوراً" ہی اس معاملے کی وضاحت کر دی تھی۔ اس نے پہلی مرتبہ ایک مہینے والا پیکیج کروایا تھا جو اب گھر کے سب ہی افراد کے کام آرہا تھا۔ لہٰذا کبھی تو اس کی امی اپنی بڑی بیٹی سے بات کر رہی ہوتیں تو کبھی بھابھی اپنے میکے کا نمبر ملا لیتی' کبھی چھوٹی بہن کو سہیلیوں سے کوئی کام پڑ جاتا اور کبھی دادی جان کو لاہور والے بیٹے کی یاد ستانے لگتی.... وقار تو تنگ ہی آگیا اس کم بخت پیکیج سے....

پیکیج نہ ہوا.... آسمان کے تارے توڑنا ہو گیا.... اللہ کی قسم یہ تو ایک ہفتہ بھی مشکل سے نکالے گا۔ اس نے کان کی لو کھجاتے ہوئے ایک آخری کوشش کی' لیکن ادھر ہنوز ایک ہی تکرار.... چار بجے کے قریب کہیں کومل بی بی کو توفیق ہوئی۔

"سوری وی۔۔۔ دراصل باجی کا اپنی ساس سے جھگڑا ہو گیا تو اس لیے ای کی باتیں ذرا لمبی ہو گئیں۔"

"تو ڈیئر۔ ہمیں بھی اس پیکیج کا کوئی فائدہ ہو گا یا نہیں۔۔۔؟"

"اچھا۔۔۔؟" وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ "کروائے کوئی اور فائدہ کسی اور کو۔۔۔"

"نہیں۔۔۔؟" وقار کی خاک سمجھ میں آیا۔ "کیا مطلب۔۔۔؟"

"ارے کچھ نہیں۔۔۔ اچھا سنو۔ ابھی تو تم نے اکیڈمی جانا ہے نا۔۔۔ میں رات کو فون کروں گی۔ ٹھیک دس بجے۔۔۔ اوکے۔" وہ وقار سے زیادہ عجلت میں لگ رہی تھی۔ فوراً ہی اجازت لے کر فون رکھ دیا۔ وہ بھی سر جھٹک کر اکیڈمی جانے کی تیاری کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

"اف۔۔۔" وقار نے کوئی دسویں مرتبہ وال کلاک کی طرف دیکھا۔ ساڑھے دس بج گئے تھے اور ابھی تک کومل کا فون نہیں آیا تھا۔ بمشکل جمائیوں پر قابو پاتے ہوئے اس نے پلنگ کی پشت سے ٹیک لگائی۔ لیٹنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس نے وقت گزاری کے لیے سائیڈ ٹیبل سے بک اٹھالی جو اکیڈمی سے واپسی پر عدنان نے یہ کہہ کر اسے تھمائی تھی کہ کل وہ اسے کالج کی لائبریری میں جمع کروا دے' کیوں کہ عدنان کو اگلے روز کالج نہیں جانا تھا۔ یہ مختلف شعراء کے منتخب کلام پر مبنی ایک شاعری کی کتاب تھی۔۔۔ آج کل ویسے بھی شاعری اسے کافی پسند تھی۔ اچھے اور معیاری اشعار بطور میسجز وہ بھی ادھر ادھر بھیج دیا کرتا تھا۔۔۔ ساغر صدیقی کی ایک غزل نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کی تو اس نے تین چار مرتبہ اسے بغور پڑھ کر ٹیکسٹ کے لیے پسند کر لیا۔ چھ اشعار کی غزل میں وقار کو تین اشعار کافی حسب حال لگے۔ اس نے بھرپور دلچسپی سے موبائل ہاتھ میں لے کر اشعار لکھنا شروع کیے۔ آخر میں ایک مرتبہ چیک کر لینے کے بعد "فار سم ون اسپیشل" لکھ کر کومل کو سینڈ کر دیا اور کچھ مزید مواد ڈھونڈنے کے لیے باقی غزلیں پڑھنے لگا۔

کوئی دس یا پندرہ منٹ گزرے تھے کہ موبائل کی بپ بجی۔ یہ میسج کی ٹون تھی۔۔۔ وقار نے فوراً موبائل اٹھایا یقیناً "کومل فری ہو چکی تھی۔۔۔ لیکن۔۔۔ اپنا بھیجا ہوا میسج دوبارہ وصول کر کے اس نے حیرت سے موبائل کو دیکھا۔۔۔ جلدی میں وہ یہ بھی نہیں دیکھ پایا تھا کہ پیغام کس کی طرف سے آیا ہے۔۔۔ اس نے بیک پہ لے جا کر نام اور نمبر چیک کیا تو اس کے جلتے سلگتے حواسوں پر گویا پوری چھت آن گری۔ میسج سلمان کی طرف سے آیا تھا۔ پوری بات سمجھنے میں وقار کو مشکل سے چند سیکنڈ لگے۔۔۔ جو میسج اس نے اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے کومل کو بھیجا تھا۔ وہ کومل نے سلمان کو بھیج دیا اور سلمان جیسے لاابالی اور کھلنڈرے لڑکے سے بھلا کہاں کسی احتیاط کی توقع کی جا سکتی تھی۔ بنا کچھ سوچے سمجھے اس نے ہمیشہ کی طرح وہ میسج 'سینڈ ٹو آل' کر دیا تھا۔

تو یہ ہیں وہ حضرت جنہوں نے کومل کو پیکیج کروا کر دیا اور ان ہی کے متعلق وہ فرما رہی تھیں کہ پیکیج کروائے کوئی اور' فائدہ کسی اور کو۔۔۔ تو یعنی محبت کے سفر میں جیت بائیک کی ہوئی تھی۔۔۔ سلمان کی نئی نویلی بائیک' وقار کے خلوص' وفا اور محبت پر دھول اڑاتی کافی آگے نکل گئی تھی اور وقار کی پوری زندگی کو ایک فارورڈ میسج نے بری طرح تھما ڈالا تھا۔





نمرہ احمد

# نمل

فارس غازی انٹیلی جنس کے اعلا عہدے پر فائز ہے۔ وہ اپنے سوتیلے بھائی وارث غازی اور اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں چار سال سے جیل میں قید ہے۔ سعدی یوسف اس کا بھانجا ہے جو اس سے جیل میں ہر ہفتے ملنے آتا ہے۔

سعدی یوسف تین بہن بھائی ہیں' ان کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ حنین اور اسامہ' سعدی سے چھوٹے ہیں۔ ان کی والدہ ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ چلاتی ہیں۔ زمر' سعدی کی پھپھو ہے۔ وہ چار سال قبل فائرنگ کے ایک واقعہ میں زخمی ہو جاتی ہے۔ فائرنگ کا الزام فارس غازی پر ہے۔ فارس غازی کو شک تھا کہ اس کی بیوی اس کے بھائی کے ساتھ انوالو ہے۔ اس نے جب فائرنگ کی تو زمر اس کی بیوی کے ساتھ تھی۔ فائرنگ کے نتیجہ میں بیوی مر جاتی ہے اور زمر شدید زخمی ہو جاتی ہے۔ ایک انگریز عورت اپنا گردہ دے کر اس کی جان بچاتی ہے۔ یقین ہے کہ اس کا ماموں بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا گیا ہے۔ اس لیے وہ اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے' جس کی بنا پر زمر اپنے بھتیجے سعدی یوسف سے بدظن ہو جاتی ہے۔ بدظن ہونے کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ زمر جب موت و زندگی کی کشمکش میں ہوتی ہے تو سعدی اس کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی پڑھائی اور امتحان میں مصروف ہوتا ہے۔





## مکمل ناول

جواہرات کے دو بیٹے ہیں۔ ہاشم کاردار اور نوشیرواں۔

ہاشم کاردار بہت بڑا وکیل ہے۔ ہاشم اور اس کی بیوی شہرین کے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے۔ ہاشم کی ایک بیٹی سونیا ہے۔ جس سے وہ بہت محبت کرتا ہے۔

فارس غازی' ہاشم کی پھپھو کا بیٹا ہے۔ جیل جانے سے پہلے وہ ہاشم کے گھر میں' جس میں اس کا بھی حصہ ہے' رہائش پذیر تھا۔ سعدی کی کوششوں سے فارس رہا ہو جاتا ہے۔

والد کے کہنے پر زمر سعدی کی سالگرہ پر اس کے لیے پھول اور ہاشم کی بیٹی سونیا کی سالگرہ کارڈ لے کر جاتی ہے۔ سعدی' ہاشم کی بیوی سے ہاشم کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ مانگتا ہے۔ شہرین اپنے دیور نوشیراں سے' جو اپنی بھابھی میں دلچسپی رکھتا ہے' بہانے سے پاس ورڈ حاصل کر کے سعدی کو سونیا سالگرہ میں دے دیتی ہے۔

پاس ورڈ ملنے کے بعد سعدی ہاشم کے کمرے میں جا کر اس کے لیپ ٹاپ پہ فلیش ڈرائیو لگا کر ڈیٹا کاپی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

چیف سیکریٹری آفیسر خاور' ہاشم کو اس کے کمرے کی فوٹیج دکھاتا ہے' جس میں سعدی کمرے میں جاتے ہوئے نظر آتا ہے' ہاشم خاور کے ساتھ بھاگتا ہوا کمرے میں پہنچتا ہے' لیکن سعدی اس سے پہلے ہی وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمرے میں لیپ ٹاپ سے ڈیٹا کاپی کرنے آیا تھا اور شہرین نے نوشیرواں کو استعمال کر کے پاس ورڈ سعدی کو دیا تھا۔ دوسری جانب بڑے ابا زمر کو یہ بتا دیتے ہیں کہ زمر کو کسی یورپین خاتون نے نہیں بلکہ سعدی نے گردہ دیا تھا۔ یہ سن کر زمر کو بے حد دکھ ہوتا ہے۔

نوشیرواں ایک بار پھر ڈر کر لینے لگتا ہے اس بات پر جواہرات فکر مند ہے۔
بعد میں سعدی لیپ ٹاپ پہ فائلز کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فائلز ڈیمیج ہو جاتی ہیں۔
سعدی حنین کو بتاتا ہے کہ وہ گیم کے ہائی اسکورز کی فہرست میں پہلے نمبر پر نہیں ہے' حنین حیران ہو کر اپنی گیم والی سائٹ کھول کر دیکھتی ہے تو پہلے نمبر "آنس اپور آفٹر" لکھا ہوتا ہے۔ وہ علیشا ہے ورجینیا سے۔ حنین کی علیشا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

اب کہانی ماضی میں آگے بڑھ رہی ہے۔ فارس' زمر سے لاء کی کچھ کلاسز لیتا ہے۔ ندرت اس سے شادی کا پوچھتی ہیں۔ وہ لاپروائی سے زمر کا نام لے لیتا ہے۔ ندرت خوش ہو کر ابا سے بات کرتی ہیں۔ ان کی ساس فارس کو اجڈ اور بدتمیز سمجھتی ہیں اور اس کے مقابلے میں فہد سے زمر کی بات طے کر دیتی ہیں۔ وارث غازی' ہاشم کے خلاف منی لانڈرنگ کیس کے پر کام کر رہا ہے۔ اس کے پاس مکمل ثبوت ہیں۔ اس کا باس فاطمی ہاشم کو خبردار کر دیتا ہے۔ ہاشم' خاور کی ڈیوٹی لگاتا ہے کہ وہ وارث کے پاس موجود تمام شواہد ضائع کرے۔ وارث کے ہاسٹل کے کمرے میں خاور اپنا کام کر رہا ہے۔ جب وارث ریڈ سگنلز ملنے پر اپنے کمرے میں جاتا ہے۔ پھر کوئی راستہ نہ ہونے کی صورت میں بہت مجبور ہو کر ہاشم' خاور کو وارث کو مار دینے کی اجازت دے دیتا ہے۔ دوسری صورت میں وارث' فارس کو وہ سارے شواہد میل کر دیتا۔ وارث کے قتل کا الزام ہاشم' فارس پہ ڈلواتا ہے۔

زرتاشہ کو قتل اور زمر کو زخمی کرنا بھی فارس کو وارث کے قتل کے الزام میں پھنسانے کی ہاشم اور خاور کی منصوبہ بندی ہوتی ہے۔ وہ دونوں کامیاب ٹھہرتے ہیں۔' زرتاشہ مر جاتی ہے۔ زمر زخمی حالت میں فارس کے خلاف بیان دیتی ہے۔ فارس جیل چلا جاتا ہے۔ سعدی زمر کو سمجھاتا ہے کہ فارس ایسا نہیں کر سکتا۔ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ زمر کہتی ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی اور اپنے بیان پر قائم رہتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ زمر کی ناراضی کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وارث کے قتل کے وقت بھی اس کی شادی لیٹ ہو جاتی ہے اور وہ اپنی شادی روک کر فارس کے لیے مقدمہ لڑتی ہے۔ اب وہی شخص اپنے اس قتل کو چھپانے کے لیے اسے مارنا چاہتا ہے۔ وہ بظاہر اتفاقاً" بچ جاتی ہے مگر اس کے دونوں گردے ضائع ہو جاتے ہیں۔ اور اس حادثے کی صورت اس کی شادی ٹوٹ جاتی ہے۔
حنین کی نیٹ فرینڈ علیشا دراصل اورنگ زیب کی بیٹی ہے جسے وہ اور ہاشم تسلیم نہیں کرتے۔ وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے حنین سے دوستی کرتی ہے اور پڑھائی کے لیے کاروار سے پیسے کے لیے غیر قانونی پاکستان آتی ہے۔ مگر ہاشم اس سے بہت برے طریقے سے پیش آتا ہے اور کوئی مدد نہیں کرتا۔ زرتاشہ اور زمر کے قتل کے وقت فارس اور حنین وارث کیس کی ایلی بائی کے سلسلے میں علیشا کے پاس ہی ہوتے ہیں مگر علیشا ہاشم کی وجہ سے کھل کر ان کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔

زمر فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ فارس کے خلاف بیان دے گی۔ گھر میں اس فیصلے سے کوئی بھی خوش نہیں' جس کی بنا پر زمر کو دکھ ہوتا ہے۔
جواہرات' زمر سے ملنے آتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ فارس کے خلاف بیان دے۔ وہ زمر کے ساتھ ہے' اسی وقت زمر کا منگیتر اس کو دیکھنے آتا ہے۔ اس کی ہونے والی ساس یہ رشتہ ختم کرنا چاہتی ہے۔ جواہرات اس کے منگیتر کو اپنی گاڑی میں بٹھالیتی ہے اور اسے آسٹریلیا بھجوانے کی آفر کرتی ہے۔
سعدی' فارس سے ملنے جاتا ہے تو وہ کہتا ہے ہاشم اس قسم کا آدمی ہے جو قتل بھی کر سکتا ہے اور وہ فارس سے مخلص نہیں ہے۔
سعدی کو پتا چلتا ہے کہ اسے اسکالرشپ نہیں ملا تھا۔ زمر نے اپنا پلاٹ بیچ کر اس کو باہر پڑھنے کے لیے رقم دی تھی۔ اسے بہت دکھ ہوتا ہے۔
زمر کو کوئی گردہ دینے والا نہیں ملتا تو سعدی اسے اپنا گردہ دے دیتا ہے۔ وہ یہ بات زمر کو نہیں بتاتا۔ زمر بدگمان ہو جاتی ہے کہ سعدی اس کو اس حال میں چھوڑ کر اپنا امتحان دینے ملک سے باہر چلا گیا۔

سعدی' علیشا کو راضی کرلیتا ہے کہ وہ یہ کہے گی کہ وہ اپنا گردہ زمر کو دے رہی ہے' کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر زمر کو پتا چل گیا کہ گردہ سعدی نے دیا ہے تو وہ کبھی سعدی سے گردہ لینے پر رضامند نہیں ہوگی۔

ہاشم حنین کو بتا دیتا ہے کہ علیشا نے اورنگ زیب کاردار تک پہنچنے کے لیے حنین کو ذریعہ بنایا ہے۔ حنین اس بات پر علیشا سے ناراض ہوجاتی ہے۔

ہاشم' علیشا کو دھمکی دیتا ہے کہ وہ اس کی ماں کا ایکسیڈنٹ کروا چکا ہے اور وہ اسپتال میں ہے۔ وہ علیشا کو بھی مروا سکتا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ اور اس کی ماں بھی امریکن شہری ہیں۔

جواہرات' زمر کو بتاتی ہے کہ زمر کا منگیتر حماد شادی کر رہا ہے۔

فارس کہتا ہے کہ وہ ایک بار زمر سے مل کر اس کو بتانا چاہتا ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا جا رہا ہے۔ وہ ہاشم پر بھی شبہ ظاہر کرتا ہے' لیکن زمر اس سے نہیں ملتی۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمپیوٹر سے ڈیٹا چرا کر لے جاچکا ہے۔ وہ جواہرات سے کہتا ہے کہ زمر کی شادی فارس سے کرانے میں خطرہ ہے' کہیں وہ جان نہ جائے کہ فارس بے گناہ ہے' لیکن وہ مطمئن ہے۔ جواہرات' زمر کو بتاتی ہے کہ فارس نے اس کے لیے رشتہ بھجوایا تھا' جسے انکار کر دیا گیا تھا۔ زمر کو یقین ہو جاتا ہے کہ فارس نے اسی بات کا بدلہ لیا ہے۔ زمر' جواہرات کے اکسانے پر صرف فارس سے بدلہ لینے کے لیے اس سے شادی پر رضامند ہو جاتی ہے۔

ڈیڑھ ماہ قبل ایک واقعہ ہوا تھا جس سے سعدی کو پتا چلا کہ ہاشم مجرم ہے۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ نوشیرواں نے ایک ڈراما کیا تھا کہ وہ کوریا میں ہے اور اغوا ہو چکا ہے۔ تاوان نہ دیا گیا تو وہ لوگ اس کو مار دیں گے۔

ہاشم' حنین اور سعدی کو آدھی رات کو گھر بلاتا ہے اور ساری سچویشن بتا کر اس سے پوچھتا ہے' کیا اس میں علیشا کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔

وہ حنین سے کہتا ہے کہ تم اس کے بارے میں پتا کرو۔ حنین' کمپیوٹر سنبھال لیتی ہے۔ سعدی اس کے ساتھ بیٹھا ہوتا ہے۔ تب ہی ہاشم آکر اپنا سیف کھولتا ہے تو سعدی کی نظر پڑتی ہے۔ اس کو جو کچھ نظر آتا ہے۔ اس سے اس کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔

اس میں وارث کی بیٹیوں کی تصویر ہوتی ہے۔ جو وارث ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ ہاشم کے سیف کے کوڈ آئینے میں دیکھ لیتا ہے اور کمرے سے اس کے جانے کے بعد سیف کھولتا ہے۔ اس سے ایک لفافہ ملتا ہے جس میں اس ریسٹورنٹ میں فائرنگ کے فوراً" بعد کی تصویر ہوتی ہے' جس میں زمر خون میں لت پت نظر آتی ہے اور ایک فلیش ڈرائیو بھی ملتی ہے۔

تب اسے پتا چلتا ہے کہ ہاشم مخلص نہیں تھا۔ یہ قتل اسی نے کرایا تھا۔

حنین' نوشیرواں کی پول کھول دیتی ہے' وہ کہتی ہے کہ نوشیروا پاکستان میں ہی ہے اور اس نے پیسے اینٹھنے کے لیے اغوا کا ڈراما رچایا۔

سعدی وہ فلیش سنتا ہے تو سن رہ جاتا ہے۔ وہ فارس کی آواز کی ریکارڈنگ ہوتی ہے۔ جس میں وہ زمر کو دھمکی دیتا ہے۔

سعدی بار بار سنتا ہے تو اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ جعلی ہے۔ وہ فارس کے وکیل کو فارغ کر دیتا ہے۔ جو ہاشم کا آدمی تھا۔

سعدی' زمر کے پاس ایک بار پھر جاتا ہے اور اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ فارس بے گناہ ہے۔ وہ کہتا ہے اس میں کوئی تیسرا آدمی بھی ملوث ہو سکتا ہے۔

"مثلاً" کون؟" زمر نے پوچھا۔

"مثلاً"... مثلاً" ہاشم کاردار۔" سعدی نے ہمت کر کے کہہ ڈالا۔ زمر سن سی ہو گئی۔

زمر کو ہاشم کاردار کے ملوث ہونے پر یقین نہیں آتا سعدی زمر سے کسی اچھے وکیل کے بارے میں پوچھتا ہے تو وہ ریحان خلجی کا نام لیتی ہے۔ سعدی فارس کا وکیل بدل دیتا ہے۔

حنین علیشا کو فون کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ وہ جیل میں ہے کیونکہ اس نے چوری کی کوشش کی تھی۔
ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی نے وہ آڈیو حاصل کرلی ہے جس میں فارس کا جعلی فون ٹیپ ہے لیکن وہ مطمئن ہے کہ جج تو ان کا ہے۔
ہاشم کی بیوی شہرین ایک کلب میں جوا کھیلتی ہے اس کی سی سی ٹی وی فوٹیج ان کے کیمروں میں ہے۔ اسے غائب کرانے کے لیے سعدی کی مدد لیتی ہے۔
ریحان خلجی عدالت میں زمر کو لاجواب کر دیتا ہے۔ یہ بات فارس کو اچھی نہیں لگتی۔
فارس جیل سے نکلنا چاہتا ہے لیکن اس کا ساتھی غلطی سے زمر کو اس میں استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زمر کا غصہ فارس کے خلاف مزید بڑھ جاتا ہے۔
زمر فارس سے ملتی ہے تو فارس کہتا ہے کہ ایک بار وہ اس کے کیس کو خود دیکھے۔ فارس کہتی ہے کہ وہ زمر سے معافی نہیں مانگے گا۔
جیل سے علیشا حنین کو خط لکھتی ہے وہ حنین سے کہتی ہے تم میں اور مجھ میں ذہانت کی علاوہ ایک اور چیز مشترک ہے وہ ہے ہماری برائی کی طرف مائل ہونے والی فطرت۔ اس لیے کسی کی کمزوری کو شکار مت کرنا۔ گناہ مت کرنا ورنہ کفارے دیتے عمر بیت جائے گی۔
حنین کو اپنا ماضی یاد آجاتا ہے جب اس نے کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا تھا اور وہ شخص صدمہ سے دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ وہ کفارہ کے لیے آگے بڑھنے سے انکار کر دیتی ہے۔ وہ سعدی کو یہ ساری بات بتاتی ہے تو سعدی کو شدید صدمہ ہوتا ہے۔
اورنگ زیب نوشیرواں کو عاق کرنا چاہتے ہیں۔ یہ جان کر جواہرات غصہ سے پاگل ہو جاتی ہے۔ وہ اورنگ زیب کو قتل کر دیتی ہے اور ڈاکٹر سے مل کر اسے بلیک میل کر کے پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی اپنی مرضی کی حاصل کر لیتی ہے۔
زمر' فارس کی طرف سے مشکوک ہے۔ وہ اسے تہ خانے میں بنے کمرے میں جانے سے منع کرتا ہے لیکن زمر نہیں مانتی' وہ کمرے میں جاتی ہے تو وہ دیوار پر کچھ تصویریں لگی دیکھتی ہے' یہ وہ لوگ ہیں جو فارس کے مجرم ہیں۔
جسٹس سکندر (فارس کے کیس کے جج) وارث غازی کا باس الیاس فاطمی' ڈاکٹر توقیر بخاری' ڈاکٹر ایمن بخاری (فارس کی سائیکالوجسٹ) اور دوسرے لوگ۔ فارس کہتا ہے کہ وہ ان سب سے اپنے ساتھ کی گئی ناانصافی کا انتقام لے گا۔
سعدی جب نوشیرواں سے ملنے جاتا ہے تو ڈاکٹر سارہ کو ساتھ لے جاتا ہے۔ سعدی کو امید ہے کہ ڈاکٹر سارہ نے سب کو بتادیا ہوگا۔
ہاشم نے حنین سے وہ یو ایس بی مانگی جو سعدی نے اس کے لیپ ٹاپ سے چرائی تھی۔ حنین نے دے دی تو زمر اور فارس کو بہت غصہ آتا ہے لیکن حنین بتاتی ہے کہ اس نے اصلی یو ایس بی نہیں دی تھی۔
ہارون عبید مشہور سیاست دان جواہرات کے حسن کے اسیر ہیں۔ وہ ایک اسے ہیرا تحفہ میں دیتے ہیں۔ زمر' احمر کو اپنا کوئی کام کرنے کے لیے کہتی ہے۔ احمر ہارون عبید کی الیکشن کمپین چلا رہا ہے۔ آب دار ہارون عبید کی بیٹی ہے' جو سعد کے ساتھ پڑھتی رہی ہے۔
فارس' زمر سے کہتا ہے کہ اس نے تین وجوہات کی بنا پر زمر سے شادی کی ہے۔
(1) زمر کے والد کے احسانات (2) شادی کرکے وہ سب کو یہ تاثر دینا چاہتا ہے' وہ سب کچھ بھول کر نئی زندگی شروع کر چکا ہے۔
تیسری وجہ وہ زمر کے اصرار کے باوجود نہیں بتاتا۔
حنین ہاشم کے بارے میں زمر کو بتا دیتی ہے۔ زمر کسی تاثر کا اظہار نہیں کرتی لیکن اسے ہاشم پر بہت غصہ ہے۔ زمر اسے اپنے جرم کے بارے میں بتاتی ہے تو زمر کہتی ہے کہ ایک او سی پی ایک معمولی سی لڑکی کو دھمکی سے بلیک میل نہیں ہو سکتا۔ اس کی موت کسی اور وجہ سے ہوئی ہے۔

سعدی کی یاد میں ایک تقریب منعقد کی گئی ہے' جہاں احمر شفیع' ڈاکٹر ایمن بخاری اور ڈاکٹر توقیر بخاری بھی شریک ہیں۔ زمر اور فارس' حنین کو تقریر کرنے کا کہہ کر باہر نکل آتے ہیں۔

ڈاکٹر ایمن بخاری اور ڈاکٹر توقیر بخاری کا نیا تعمیر شدہ شان دار اسپتال جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ فارس اور زمر واپس تقریب میں آجاتے ہیں۔

حنین اور زمر' ہاشم کی سیکرٹری حلیمہ کا نام سن کر چونک جاتی ہیں۔

ہاشم' سعدی سے کہتا ہے کہ حنین اس کے کہنے پر اس سے ملنے ہوٹل آرہی ہے۔ سعدی پریشان ہو جاتا ہے' پھر ہاشم اس کو فون پر حنین کا پروفائل دکھاتا ہے' تب وہ جان لیتا ہے کہ حنین چھ منٹ پہلے قرآن پاک کی وہ آیت پڑھ چکی ہے جو اس نے اپنے کمپیوٹر میں لوڈ کی تھی۔ سعدی پورے یقین سے کہتا ہے کہ "حنین ہاشم سے ملنے نہیں آئے گی۔" اور واقعی ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہاشم تلملا کر رہ جاتا ہے۔

جسٹس سکندر کی ایک ویڈیو جس میں وہ اوسی پی کو قتل کر رہے ہیں' ٹی وی چینلز پر چل جاتی ہے۔ یہ وہی ویڈیو ہے جو سعدی نے اوسی پی کے گھر سے حاصل کی تھی۔

زمر ڈاکٹر کے پاس جاتی ہے تو اس کو پتا چلتا ہے کہ اس کا واحد گردہ جو سعدی نے دیا تھا۔ ناکارہ ہو چکا ہے۔



## —۱۷—
# سترہویں قسط

### آدمی کے دو دل

ساری امیدیں ترک کردو' اے اندر داخل ہونے والے!
میں نے دیکھے یہ الفاظ افسردہ رنگ میں لکھے
جہنم کے دروازے کی چوٹی پہ
پوچھا "ان کا مطلب کٹھن ہے میرے لیے اے استاد"
اور کسی تجربہ کار کی طرح وہ جل بولا
"یہاں تمام شک ترک کر دیا جانا چاہیے
یہاں ساری بزدلی مٹا دینی چاہیے۔
ہم اس جگہ آچکے ہیں
کہا تھا جس کا ذکر میں نے تم سے
تم دیکھو گے یہاں دردناک لوگوں کو
جو حکمت' خیر سے محروم ہو چکے ہیں۔"
یہ کہہ کر تھاما اس نے میرا ہاتھ محفوظ انداز میں
اور جب مجھے کچھ اطمینان ہوا تو وہ
لے گیا مجھے پُراسرار جگہ کے اندر
وہاں آہ و بکا' شکایات' بین
گونجتے تھے بنا ستارے کی ہوا میں
ان کو سن کر اسی جگہ
میں بہت رویا!
مختلف زبانیں' بولیاں خوفناک
غصے کے تلفظ' درد کی باتیں
اونچی سرکش آوازیں' ساتھ ہاتھوں کی دھمک
کسی گولے کی طرح اس سیاہ!
دائمی ہوا میں گھوم رہی تھیں
اور میں جس کا سر خوف سے بندھا تھا' بولا
"اے استاد' یہ کیا سنتا ہوں میں؟
کون ہیں یہ درد سے مغلوب لوگ؟"
وہ کہنے لگا مجھ سے
"اس بدبخت طریقے سے رکھی گئی ہیں
ان لوگوں کی اداس روحیں' جو
رہتے تھے بدنامی یا نیک نامی کے بغیر۔

نہ یہ باغی تھے خدا سے
نہ ہی یوفادار تھے اس کے
بلکہ جیتے تھے صرف اپنی ذات کے لیے
جنتوں نے ان کو نکال دیا کہ انصاف کم نہ ہو جائے
اور جہنم کے نچلے گڑھے ان کو لینے پہ راضی نہیں
کہ جہنمیوں کو ان سے کوئی شان نہیں مل سکتی

دنیا ان کو اب کوئی شہرت نہیں دے گی
راحت اور انصاف، دونوں ان کو حقیر سمجھتے ہیں
سو ان سے مخاطب نہ ہو، بس دیکھو اور گزر جاؤ۔"

☼ ☼ ☼

پولیس موبائلز کی نیلی سرخ بتی جل بجھ رہی تھی۔ اہلکار ہتھکڑی لگے فارس کو ایک وین میں بٹھا رہے تھے۔

"مسز زمر! ہمیں گھر کی تلاشی لینی ہے۔" سرمد شاہ نے قریب کھڑی لیڈی پولیس اہلکاروں کی طرف اشارہ کرتے اسے مخاطب کیا۔ زمر کا ذہن مفلوج تھا۔ اس نے لیڈیز اہلکاروں کو دیکھا، پھر اے ایس پی کو۔ ذہن بیدار ہونے لگا۔ اس نے ایک ہاتھ دروازے کی ناب اور دوسرا چوکھٹ کی لکڑی پہ جمایا۔ سفید پڑتے چہرے کو سخت بنانے کی کوشش کی مگر جب بولی تو آواز میں لرزش تھی۔

"اتنے سال جتنے کام کیے ہیں میں نے آپ کے، یا آپ نے میرے، کیا ان میں سے کوئی اس قابل ہے کہ آپ ہمارے گھر داخل نہ ہوں؟"

"مسز زمر! میرے پاس سرچ وارنٹ ہے، لیکن ابھی مجھے یاد آیا کہ مجھے اپنے بیٹے کو دس منٹ کی کال کرنی ہے۔" سختی سے کہتے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "دس منٹ بعد، میں آپ کے گھر میں داخل ہوں گا۔"

زمر نے جلدی سے اثبات میں سرہلاتے دروازہ بند کردیا۔ پھر مڑی تو دھکا سا لگا۔ سامنے حنین اور سیم کھڑے تھے۔ خوف زدہ، پریشان۔

"وہ ماموں کو لے گئے زمر؟ اب کیا ہوگا؟" حنین بہت ڈر گئی تھی۔ سیم کو کہنی سے پکڑ رکھا تھا۔ زمر آگے آئی۔ حنہ کی آنکھوں میں دیکھا۔

"حنین! پولیس نے ہمیں دس منٹ دیے ہیں۔ پھر وہ گھر کی تلاشی لیں گے۔"

"اوہ گاڈ۔" حنہ نے سیم کی کہنی چھوڑی۔ "بیسمنٹ۔ ہمارے کاغذ۔ ہمارے لیپ ٹاپس، موبائلز ان کو غائب کیسے کریں؟"

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" زمر سیم کے پاس آئی جو بالکل چپ، الجھا ہوا کھڑا تھا۔ زمر نے اس کے دونوں ہاتھ تھامے۔ اس کے ہاتھ سرد تھے، سیم کے گرم تھے۔

"آپ خوف زدہ ہیں، پھپھو؟"

زمر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے نم آنکھوں سے سرہلایا۔ "میں بہت بہت خوف زدہ ہوں۔"

"میں آپ کے ساتھ ہوں، آپ مت ڈریں!" وہ فکرمندی سے بولا تھا۔

"سیم... میری بات سنو!" وہ بے ربط سانسوں کے درمیان کہہ رہی تھی۔ "سعدی نہیں ہے، فارس بھی نہیں ہے، اس گھر میں کوئی مرد نہیں ہے، سوائے... سوائے تمہارے۔ اسامہ! تم آج سے اس گھر کے بڑے مرد ہو۔ میری آنکھوں میں دیکھ کر کہو کہ تم اس گھر کے بڑے مرد ہو۔"

"میں اس گھر کا بڑا مرد ہوں۔" اس نے زمر کے ہاتھ تھامے دہرایا۔

"اوکے!" اس نے چند گہرے سانس لیے۔ "اب تم کچن کی کھڑکی سے باہر کودو، پولیس تمہیں نہیں روکے گی۔ ہاشم کی بالکونی میں جاؤ۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ۔ دروازے کا شیشہ ان بریک ایبل (نہ ٹوٹنے والا) ہے۔ لیکن اگر وہ نہ کھولے تو تم گملا اٹھا کر اس کے دروازے پہ تب تک مارتے رہو جب تک وہ نکل نہیں آتا۔ جب وہ نکلے، تو تم اس کو کہو گے کہ زمر آپ کو بلا رہی ہیں۔ اور اسامہ! تم اس کو لیے بغیر واپس نہیں آؤ گے۔"

اسامہ ہاتھ چھڑا کر کچن کی طرف بھاگا۔ زمر نے بے

اختیار کنپٹی مسلی۔ فارس کی بے یقینی' ایک دم اتنی ساری پولیس کی نفری کا ان کے سامنے ہونا' جیسے حملہ کرنے کو تیار ہوں' ابا کی غیر موجودگی' وہ طے نہیں کر سکی کہ کیا زیادہ بھیانک تھا۔

دس منٹ بعد دروازہ بجنے لگا۔ زمر نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھا۔ سامنے سیم کے ساتھ ہاشم چلتا آرہا تھا' ایسے کہ سیم نے اس کی آستین کلائی سے پکڑ رکھی تھی۔

"شکر... آپ آگئے ہاشم!" اس نے دروازہ کھول دیا۔ ہاشم پریشانی اور قدرے غصے سے پولیس اہلکاروں کو دیکھتے ان تک آیا۔

"زمر! کیا ہو رہا ہے یہ؟ فارس کو اریسٹ کر کے لے گئے وہ؟ مجھے پہلے کیوں نہیں بلایا؟ اور اس کو گرفتاری کیوں دینے دی' ہاں؟" زمر کے پیچھے کھڑی حنین بس اس کو دیکھ کر رہ گئی۔ (تم قتل کرو ہو یا کرامات کرو ہو؟)

"ہاشم! مجھے خود نہیں معلوم' سب بہت جلدی میں ہوا۔" زمر نے ان دونوں کو اندر آنے دیا اور دروازہ بند کر دیا۔ اے ایس پی اب سائرن پہ ان کو دروازہ کھولنے کا کہہ رہا تھا۔

"ان کو میرے گھر سے نکالیے ہاشم! کسی بھی طرح۔ یہ یہاں سے کچھ بھی لیے بغیر جائیں گے۔ پلیز!" اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔ ہاشم نے لمحے بھر کو ان آنکھوں میں دیکھا اور پھر واپس باہر نکل گیا۔ سیم بھی ساتھ گیا۔ زمر اور حنہ اونچی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھنے لگیں۔

ہاشم اے ایس پی سے سختی سے کچھ کہہ رہا تھا' وہ نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ ہاشم نے موبائل پہ نمبر ملا کر چند الفاظ کہے اور پھر فون اے ایس پی کو دیا۔ وہ متذبذب سا (اس امر سے ناواقف کہ جسٹس سکندر کی طرف سے آنے والے احکامات اسی شخص کے ہوتے ہیں) فون پہ لیس سر لیس سر کرتا رہا پھر ناخوشی سے فون ہاشم کو تھمایا اور اہلکاروں کو اشارہ کیا۔ ہاشم اب سختی سے' ان کو باہر دفعان ہونے کا کہہ رہا تھا۔

"ہاشم ہماری مدد کیوں کر رہے ہیں؟"

"اس نے ہمیشہ کی طرح یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ ہمارا سب سے بڑا مخلص ہے۔" زمر سرگوشی میں بولی۔ نظریں وہیں جمی تھیں۔ سیم بھی سنجیدہ سا وہیں کھڑا تھا۔ اس دن لگا وہ بڑا ہو گیا ہے۔ سعدی کی طرح۔

اہلکار اب واپس جا رہے تھے' ان کو گھر سے کچھ نہیں ملا' یہی لکھنا تھا اب۔ پھر ہاشم اندر آیا۔

"پولیس اب آپ کو تنگ نہیں کرے گی' میں نے ان کا دماغ درست کر دیا ہے لیکن یہ قمرالدین چوہدری کون ہے؟" اس نے ناسمجھی سے زمر کو دیکھتے پوچھا۔ اس نے تکان سے شانے اچکائے۔

"مجھے کچھ نہیں پتا۔ فارس تو یہ سمجھ رہا ہے کہ اسے اس کیس میں' میں نے پھنسایا ہے!"

"اوہو!" اس نے افسوس کیا۔ "آپ لوگ ہماری طرف آجائیں' یہاں اکیلے رہنا درست نہیں۔"

"نہیں ہاشم! ہم ٹھیک ہیں۔ گھر کے باہر آپ کے گارڈز ہیں نا۔ ہمیں کس کا ڈر ہو گا۔" بہت ممنونیت سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "اور جو آج رات آپ نے کیا' اس کا بدلہ میں کیسے اتار پاؤں گی!"

"ایسے مت کہیں ہم فیملی ہیں۔" وہ نرمی سے بولا پھر گھڑی دیکھی۔ "مجھے ایک ڈنر پہ جانا ہے' آر یو شیور' آپ لوگ ادھر ٹھیک ہیں؟"

"ہم ٹھیک ہیں۔" حنین پہلی دفعہ بولی' وہ بھی بے رخی سے۔ ہاشم نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا' ہلکا سا مسکرایا' اور سر کو خم دیا۔ حنین کے دل میں کچھ ڈوب گیا تھا۔ بہت عرصے بعد "نگاہ" ملی تھی۔ آہ! وہ کرامات کر کے قتل کرتا تھا!

اس کے جاتے ہی اسامہ سارے دروازے' کھڑکیاں بند کرنے لگا۔ بولٹ' کنڈیاں' لاکس' ایک کے بعد ایک چڑھانے لگا۔ وہ دونوں وہیں صوفے پہ بیٹھ گئیں۔ تھکی' پریشان۔

"ماموں آپ کو الزام کیوں دے رہے تھے؟" حنہ کو یاد آیا۔ زمر نے افسردہ نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

"کاروارز کامیاب اس لیے ہوتے ہیں کیونکہ وہ ایک دوسرے کو سب بتاتے ہیں اور ہم ناکام اس لیے کیونکہ ہم باتیں چھپانے کی غلطی کرتے ہیں۔ ہم نے فارس کو یہ سب نہ بتا کر غلطی کی ہے۔"

"پھر اب ہم کیا کریں؟"

زمر نے گہری سانس لی' بالوں سے پونی کھینچ کر اتاری' اور ان کو جوڑے میں لپیٹتے اٹھی۔ "پھر یہ کہ ہم اپنی غلطیوں کو ٹھیک کریں!" رنگت ابھی تک نچڑی ہوئی تھی۔

"مگر کیسے؟ ماموں پھر سے جیل چلے گئے' ہم پھر سے وہیں آگئے' سب ساڑھے چار سال پہلے جیسا ہو رہا ہے۔"

"کچھ بھی ویسا نہیں ہے۔" وہ موبائل پہ احمر کا نمبر ملاتے ہوئے بولی تھی۔

☼ ☼ ☼

حاصل ہوا ہے کیا مجھے اس بھاگ دوڑ میں
سب منزلوں کو پا کے بھی رسوا تھا میں بڑا

ہارون عبید کی رہائش گاہ کے ڈرائنگ روم میں انٹرویو کی نشست ہو رہی تھی۔ کیمروں کی روشنی۔ ٹاک شو کا عملہ۔ وہ مدھم اور شائستہ انداز میں اینکر پرسن کو سوال کا جواب دے رہے تھے۔ کونے میں کھڑا احمر اپنے ٹیب سے چند پوائنٹس کو چیک کر رہا تھا جب اس کا فون تھرتھرایا۔ اس نے نکال کر دیکھا۔ زمر۔ موقع محل نہیں تھا۔ سائلنٹ کر دیا۔ ایک' دو' تیسری دفعہ بیل آئی تو وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔

"سوری' میں ذرا..."

"احمر! فارس اریسٹ ہو گیا ہے۔" وہ بے ربط سانسوں کے درمیان بولتی جا رہی تھی اور وہ حق دق سن رہا تھا۔

"بے فکر رہیے' میں کچھ کرتا ہوں۔ نہیں تھانے نہیں جاؤں گا' جا بھی نہیں سکتا۔ میں عبید صاحب سے کہہ کر کسی کو فون کرواتا ہوں۔"

زمر کو ڈر تھا کہ فارس اس کو دیکھ کر غصہ نہ ہو جائے' وہ نہ کہتی تب بھی اس کا نکلنا ناممکن تھا۔

بریک کا وقفہ جیسے ہی لیا گیا' وہ ہارون کے پاس آیا'

اور جھک کر سرگوشی میں اپنے دوست فارس غازی کی گرفتاری کا مژدہ کہہ سنایا۔ "سر! آپ ایک کال کر دیں تو وہ اس پہ پر چا نہیں کاٹیں گے۔"

ہارون نے بے نیاز نگاہ اس پہ ڈالی۔ شلوار سوٹ میں ملبوس' وہ تمکنت کے ساتھ اونچی کرسی پہ بیٹھے تھے۔ "اوکے میں صبح دیکھتا ہوں۔"

احمر کی آنکھوں میں بے چینی پھیلی۔ "سر! صبح تک دیر ہو جائے گی' ایک دفعہ پر چا کٹ گیا تو وہ پھنس جائے گا۔"

"احمر!" انہوں نے ٹھنڈی سی نظر اس پہ ڈالی۔ "میں نے کہا نا' میں صبح دیکھوں گا۔"

احمر پر اوس پڑ گئی۔ "جی بہتر۔" سنجیدگی سے سیدھا ہوا اور کونے میں جا کھڑا ہوا۔ اب میک اپ گرل بریک کے دوران ہارون صاحب کے بال ٹھیک کر رہی تھی' اینکر موبائل پہ بات کر رہا تھا' کیمرہ مین اور دو افراد کسی بات پہ بحث کر رہے تھے۔ اس سارے شور میں اسے اپنا آپ کسی کمین نوکر سے بڑھ کر نہیں لگ رہا تھا۔

خفگی سے گردن موڑی تو کھڑکی سے باہر نیم تاریک لان میں وہ چلتی نظر آئی۔ گاڑی کے ساتھ کھڑی وہ بیگ اور بلی کی باسکٹ اپنی نگرانی میں اندر رکھوا رہی تھی۔ احمر کو روشنی کی کرن نظر آئی۔ وہ تیزی سے باہر بھاگا۔

"آپ میرا ایک کام کر سکتی ہیں؟" عقب میں آ کر پکارا تو آبی اپنی ایڑیوں پہ گھومی۔ اسے دیکھ کر آنکھوں میں شک و شبہ ابھرا۔ "کیا کام؟"

"آپ مجھے ناپسند کرتی ہیں' اور میرے کام کو بھی جو واقعی شاید کوئی اچھا کام نہیں ہے۔"

وہ ایسے پہلے کبھی نہیں بولا تھا۔ آبی کے ماتھے کے بل غائب ہونے لگے۔ "کیا ہوا ہے؟"

"میرا دوست فارس غازی' وہ بے قصور ہے' اور پولیس اس کو گرفتار...." چند الفاظ اس نے پھولی سانسوں میں ادا کیے۔ ہارون کی بے حسی کا بھی نہ چاہتے ہوئے شکوہ کر گیا۔ آبدار بالکل سن ہو گئی۔

"مجھے یقین ہے' اس کو ان ہی لوگوں نے پھنسایا ہے جنہوں نے سعدی کے ساتھ یہ سب کیا ہے۔ مگر یہ بہت غلط ہو رہا ہے۔"

"آپ اندر جائیں' احمر صاحب! میں کر لوں گی۔" وہ سنجیدگی سے بولی تھی' اور اس کی آنکھوں میں کوئی عجیب بے بس غصہ بھی تھا جو احمر نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

تھانے کا پوچھ کر' چند مزید سوال کر کے وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ احمر پہلے سے زیادہ پریشان نظر آنے لگا تھا۔ معلوم نہیں اس نے ٹھیک کیا یا غلط۔

☼ ☼ ☼

جس طرح ترک تعلق پہ ہے اصرار اب کے
ایسی شدت تو میرے عہد وفا میں بھی نہ تھی

رات ہر پل مزید سیاہ اور سرد ہوتی جا رہی تھی۔ زمر کو اس کمرے میں بیٹھے کافی دیر ہو گئی جب اہلکار فارس کو لے کر آئے۔ زمر نے نگاہ اٹھا کر اس کو دیکھا۔ فارس بس ایک تیز نظر اس پہ ڈالتا سامنے رکھی کرسی پہ بیٹھ گیا۔

"ہینڈ کفس!" زمر نے اشارہ کیا۔ ایک اہلکار نے آگے بڑھ کر اس کی ہتھکڑی کھول دی۔

"آپ اپنے کلائنٹ سے بات کر سکتی ہیں۔" ایس آئی' جو اس کیس کا آئی او (تفتیشی افسر) بھی تھا' کمرے سے نکل گیا۔ دروازہ بند ہوا تو خاموشی چھا گئی۔

"آپ کو یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟ حنہ اور سیم کو اکیلے چھوڑ کر؟" وہ درشتی سے گویا ہوا۔

"وہ گاڑی میں ہیں۔ ان کی ذمہ داری میرا مسئلہ ہے میں اٹھا لوں گی۔" پرس سے دو کاغذ نکال کر اس کے سامنے کیے۔

"یہ تمہارے لیگل رائٹس ہیں' یاددہانی کے لیے ان کو پڑھ لو۔ پولیس کے کسی سوال کا جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ صبح وہ تمہیں عدالت میں پیش کر کے جسمانی ریمانڈ لیں گے۔"

"زمر بی بی! مجھے اپنے تمام حقوق معلوم ہیں۔" فارس نے اس کی آنکھوں میں برہمی سے دیکھا۔ "اور

آپ میری وکیل نہیں ہیں' اس لیے فکر نہ کریں۔"

"تم چاہو یا نہ چاہو' میں تمہاری وکیل ہوں۔"

"مجھے مقدمے میں پھنسا کر آپ مجھے نکلوانے کی کوشش کا دکھاوا کر کے سب کی نظروں میں معتبر بننا چاہتی ہیں' جانتا ہوں۔"

"فارس! میں نے یہ نہیں کیا تمہارے ساتھ!" وہ تحمل سے بولی۔ وہ ہر بات کی تیاری کر کے گھر سے نکلی تھی۔ "تمہارے ہر الزام کا جواب ہے میرے پاس' لیکن میں یہاں وضاحتیں دینے نہیں آئی۔ تمہیں یہ یاد دلانے آئی ہوں کہ ہم ایک ٹیم تھے اور ٹیم ہیں۔"

وہ اسی طرح چبھتی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

"مجھے آپ کے ایک لفظ پہ بھی اعتبار نہیں ہے۔"

زمر نے ضبط کی کوشش کرتے گہری سانس لی اور اٹھی۔ "میں جانتی ہوں' تم بے گناہ ہو' تم تو شاید اس مقتول کو جانتے بھی نہیں' بجائے کہ۔۔۔"

"میں اس کو جانتا بھی تھا' اور جیل میں اس کو دو دفعہ پیغام بھی ہے۔ خوش؟" وہ بھی کھڑا ہوا۔ زمر بس اس کو دیکھ کر رہ گئی۔

"اس لیے زمر بی بی۔ آپ میری وکیل نہیں ہیں۔ صبح کورٹ آنے کی زحمت مت کیجیے گا۔"

"اپنے رائٹس پڑھو اور خاموش رہنا۔" وہ پرس اٹھاتی' اس کو خفا نظروں سے دیکھتی باہر نکل گئی۔

زمر جس لمحے گاڑی میں آ کر بیٹھی تھی' قریب میں ایک لش چمکتی کار آ رکی۔

ڈرائیور نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور اندر سے آبدار نکلی۔ سرخ اسکارف چہرے کے گرد کندھے پہ لمبی چین کے پرس پہ ہاتھ رکھے وہ ۔۔۔ سوٹ میں ملبوس ملازم کے ساتھ سیدھی آگے چلتی گئی۔

☆ ☆ ☆

ترک دنیا کا سماں' ختم ملاقات کا وقت
اس گھڑی اے دل آوارہ کہاں جاؤ گے؟

فارس کو دوبارہ لاک اپ میں بند کر دیا گیا تھا اور وہ سلاخوں کے پیچھے ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ غصہ' بے سکونی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ رک کر ایک زوردار مکا سلاخوں پہ مارا۔ ہاتھ کی پشت سے جلد پھٹ گئی۔ مگر درد کسے ہونا تھا؟ غصہ' بے بسی' ہر چیز پہ غالب تھی۔

تب ہی آہٹ ہوئی۔ اہلکار آئے۔ لاک اپ کھولا' اور اسے باہر لے آئے۔ ایس ایچ او کے روشن سے آفس میں داخل ہوتے وہ ٹھٹکا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں سکڑیں۔ سامنے آبدار بیٹھی تھی۔ چائے رکھی جا رہی تھی۔ سوٹڈ بوٹڈ ملازم ساتھ کھڑا تھا۔ آہٹ پہ آبی نے گردن موڑی۔

"مجھے احمر نے بھیجا ہے مگر مجھے دیر ہو گئی۔ یہ ایف آئی آر کاٹ چکے ہیں۔" وہ نرمی سے کہنے بولی۔ کسی نے فارس کے سامنے بھی چائے کا کپ رکھا۔ وہ چبھتی نظروں سے آبی کو دیکھتا بیٹھ گیا۔ غصہ اب غائب ہو چکا تھا۔

"آپ آج بھی چائے نہیں پئیں گے کیا؟" آبی نے مسکرا کر سادگی سے کپ کی طرف اشارہ کیا۔

"میم! آپ کو دیر ہو رہی ہے۔" باوردی ملازم نے دبے لفظوں سے یاد کروایا۔ آبدار نے گہری سانس بھری۔ اور ایس ایچ او کو دیکھا۔ "کل بابا آپ کو خود فون کریں گے' تب تک مجھے امید ہے کہ آپ ہمارے دوست پہ کسی قسم کا تشدد نہیں کریں گے۔"

"بالکل' آپ بے فکر رہیں۔" اس نے فرض شناسی سے یقین دہانی کروائی۔ اب کے آبی نے چہرہ گھما کر افسوس سے فارس کو دیکھا۔ "مجھے شرمندگی ہے کہ میں آپ کے کوئی کام نہیں آسکی۔ میری سری لنکا کی فلائٹ ہے' مجھے ائیرپورٹ پہنچنا ہے۔"

"ایس ایچ او صاحب! ہمیں پرائیویسی مل سکتی ہے؟"

آبدار ذرا چونکی' پھر سر کے خم سے ایس ایچ او کو اشارہ کیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ سب وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ روشن کمرے کا دروازہ بند ہوا تو پیچھے خاموشی چھا گئی۔

"جی کہیے؟" آبدار سکون سے اس کی طرف رخ

کیسے پوچھنے لگی۔

"آپ سری لنکا جا رہی ہیں؟"

آبی نے سر ہلایا۔

"پوچھ سکتا ہوں کیوں؟" اس کی نگاہیں آبدار کی آنکھوں پہ جمی تھیں۔

آبدار نے ایک لمحے کے توقف سے جواب دیا۔

"اپنی ریسرچ کے سلسلے میں۔"

"وہ جو آپ کلینکل ڈیتھ سے گزرنے والے مریضوں پہ کرتی ہیں۔ اچھا ٹھیک۔" وہ ٹیک لگا کر بیٹھا' انگلی ٹھوڑی تلے رکھے کچھ سوچا۔

"یعنی کہ آپ کسی مریض کا انٹرویو کرنے جا رہی ہیں۔"

آبدار نے اس دفعہ دو تین سیکنڈ کا توقف کیا۔

"جی!" اس کی آنکھوں میں سایہ لہرایا تھا۔ وہ مضطرب نظر آنے لگی تھی۔

"کیا وہ مریض سعدی یوسف ہے؟" وہ اسی انداز میں بولا۔

آبی کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ گئے۔ "سوری؟"

"آبدار بی بی!" وہ آگے کو ہوا۔ اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ہلکا سا مسکرایا۔ "مجھے معلوم ہے' آپ کے والد اس کے اغوا اور روپوشی میں ملوث ہیں' اور یہ بھی کہ وہ سری لنکا میں ہے۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ اپنے والد کے لیے کتنی حساس ہیں۔"

"مجھے نہیں معلوم' آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" وہ ناراضی سے کہتی اٹھی۔

"واپس بیٹھو!" وہ اتنے کاٹ دار انداز میں بولا کہ آبی کے کان سرخ ہو گئے۔ وہ واپس بیٹھی۔

"مجھے اونچی آواز سے مت ڈرائیں' میں کسی سے ڈرتی نہیں۔" اس کی آنکھوں میں دیکھ کر ہلکا سا غرائی۔

"میں آپ کو اچھی طرح سمجھ چکا ہوں۔ آپ خطرناک ہیں۔ نہ کہ سادہ اور معصوم۔ مگر آپ کا ضمیر زندہ ہے۔ آپ خود اچھی ہیں' مگر برا کرنے والوں کو روکتی نہیں ہیں۔ نیوٹرل رہتی ہیں۔"

"میں آپ کے کسی الزام کا جواب دینے کی پابند نہیں ہوں۔"

"اس ملک میں آبدار بی بی! انصاف ہے نہ قانون۔ یہاں جج' جیوری اور جلاد ہمیں خود بننا پڑتا ہے اور اگر آپ چاہتی ہیں کہ میری جلادیت آپ کی رہائش گاہ تک نہ پہنچے تو آپ کو ایک سائیڈ منتخب کرنی ہوگی۔"

ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔ "ظالم کی' یا مظلوم کی۔ بولیے آپ کس کے ساتھ ہیں؟ اور میری باتوں کو ہلکا مت لیجیے گا۔ یہ ہتھکڑیاں ..." کلائیاں اٹھا کر دکھائیں۔ "مجھے روک نہیں سکتیں۔"

"مجھے واقعی نہیں پتا' آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"بی بی! کسی انسان کے سینے میں دو دل نہیں ہوتے۔ یا آپ مظلوم کے ساتھ ہیں یا ظالم کے۔ آپ کس کے ساتھ ہیں؟"

وہ دبے دبے غصے اور بے بسی سے اسے دیکھے گئی۔ بولی کچھ نہیں۔

"اگر وہ زندہ سلامت ہمارے خاندان کو واپس مل گیا تو میں آپ کے خاندان کو چھوؤں گا بھی نہیں' یہ میرا وعدہ ہے۔ آپ کو بدلے میں میرا صرف ایک کام کرنا ہوگا۔" اس کی آنکھوں سے ایک لمحے کے لیے بھی نگاہ ہٹائے بغیر وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ آبی کی آنکھوں کے کٹورے بھیگے مگر وہ چپ رہی۔ فارس نے ہاتھ بڑھا کر پین ہولڈر سے قلم نکالا' نوٹ پیڈ سے کاغذ پھاڑا' چند لمحے کے لیے سوچا' پھر اس پہ چند حروف لکھے۔ HAMAN اور ان کو کانٹے کا نشان لگا کر کاٹا' پھر کاغذ کو چار تہہ لگا کر اس کی طرف بڑھایا۔ "یہ اس کو دے دیجیے گا۔"

آبی نے بھیگی آنکھوں سے کاغذ کو دیکھا' مگر چھوا تک نہیں۔ "یہ کیا ہے؟"

"یہ اس کی آزادی کا پروانہ۔ وہ سمجھ جائے گا۔"

آبی نے کاغذ کو نہیں چھوا۔ فارس آگے بڑھا' اس کا پرس کھولا' اور کاغذ اندر ڈال دیا۔ وہ اسے روک بھی نہ سکی۔ عامل تو ہم خود ہپناٹائز ہو چکی تھی۔

فارس نے پیچھے ہو کر بیٹھے' کان کی لو مسلتے اسے دیکھا۔ "فیصلہ آپ کا ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"
ناراضی' غصہ' بے بسی' ہر جذبہ اس کی بھیگی آنکھوں میں ہلکورے لے رہا تھا۔ وہ پرس لیے اٹھی اور دروازے تک گئی۔ پھر رکی۔ "کنفیوشس نے کہا تھا' انتقام کے سفر پہ نکلنے سے پہلے تمہیں چاہیے کہ دو قبریں کھودلو' ایک اپنے دشمن کی اور دوسری اپنی!"
"تو پھر بے فکر رہیے کیونکہ میں اپنی قبر کھود کر ہی اس سفر پہ نکلا تھا!" آبی مڑ کر اسے دیکھ بھی نہ سکی' بس تیزی سے باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

اور کچھ دیر میں لٹ جائے گا ہر بام پہ چاند
عکس کھو جائیں گے' آئینے ترس جائیں گے

جس وقت زمر واپس گاڑی میں آکر بیٹھی تو فرنٹ سیٹ پہ موجود اسامہ اور پیچھے بیٹھی حنین بے چینی سے آگے ہوئے۔ "کچھ پتا چلا؟"
"ہاں۔ مقتول قمرالدین کچھ عرصہ فارس کے ساتھ جیل میں رہا تھا۔ دس اگست کو اس کو اغوا کیا گیا' اور انیس اگست کو دو آدمی اس کی لاش اس کے گھر پھینک گئے' پوسٹ مارٹم کے مطابق قتل 28 اور 29 اگست کی درمیانی رات ہوا تھا۔ ان دو آدمیوں میں سے ایک شخص ناظم پکڑا گیا ہے' وہ بھی فارس کے ساتھ جیل میں تھا' اس کی شہادت پہ پولیس نے فارس کو گرفتار کیا ہے۔ ناظم کا کہنا ہے کہ آدمی کو گولی فارس نے ماری تھی۔"
"ظاہر ہے' وہ جھوٹ بول رہا ہے۔" سیم فوراً" بولا
زمر نے گہری سانس لی۔
"ہاں' ظاہر ہے۔ خیر' کل پولیس فارس کو عدالت میں پیش کرکے جسمانی ریمانڈ لے گی۔"
"جسمانی ریمانڈ کیا ہوتا ہے؟"
"یعنی کہ پولیس کچھ دن کے لیے ملزم کو تھانے میں رکھ کر اس سے تفتیش کرے گی۔" زمر سیٹ بیلٹ پہنتے ہوئے بتا رہی تھی۔ "مرڈر کیس ہے' چودہ دن کا ریمانڈ مل سکتا ہے۔ لیکن اکٹھا نہیں۔ تین' تین' پانچ پانچ دن کرکے۔"
"یعنی اتنے دن وہ اس ... اس اے ایس پی کی تحویل میں ہوں گے؟" حنین بے بسی سے بولی تھی۔
"نہیں' یہ کیس اس کے تھانے کا نہیں ہے۔ جو ایس آئی اس کے ساتھ ہمارے گھر آیا تھا' یہ اس کا کیس ہے' سرمد شاہ صرف معاون تھا کیونکہ ناظم کو سرمد شاہ کے علاقے سے اسی کی مدد سے گرفتار کروایا گیا ہے۔"
"یعنی اگر سرمد شاہ نہ ہوتا تو یہ سب اتنا آسان نہ ہوتا۔" حنین نے کیا سوچ کر یہ کہا تھا' زمر جانتی تھی' مگر اب اس بات پہ کیا تبصرہ کرتی۔
گھر میں ایک عجیب تنہائی کا احساس ہر کونے سے ٹپک رہا تھا۔ ابا اور ندرت کو ان کی واپسی تک لاعلم رکھنے کا فیصلہ کرکے وہ تینوں زمر کے کمرے میں آگئے۔ دروازے بند کیے' سیم نے ایک ایک چٹخنی اور لاک چڑھایا۔ خوف ان کے آس پاس سانس لے رہا تھا۔
"میں اور حنہ بیڈ پہ سو جائیں گے' تم صوفے پہ سو جاؤ۔" زمر نے نرمی سے اسے پکارا جو آج ایک دم بڑا بڑا اور سنجیدہ سا نظر آنے لگا تھا۔
"نہیں' میں اپنے کمرے سے میٹرس لے آیا ہوں' نیچے ڈال لوں گا۔ یہ صوفہ بہت سخت ہے' اس کے ساتھ کا لاؤنج میں ہے نا' ایک دن میں لیٹا اس پہ تو دو دن کمر دکھتی رہی میری۔" زمر نے بے اختیار اس خالی صوفے کو دیکھا۔ دل کو زور سے کسی نے جیسے مٹھی میں لیا تھا۔
رات قطرہ قطرہ پگھلتی رہی۔ تینوں کھلی آنکھوں کے ساتھ چھت تکتے لیٹے رہے۔ پھر حنہ بولی۔
"یہ قتل 28 اگست کی رات کو ہی کیوں ہوا؟"
"ہم دونوں کو پتا ہے یہ سب کسی نے جان بوجھ کر اسی رات کروایا جب ہسپتال والا واقعہ ہوا۔ لیکن ..." وہ الجھ گئی تھی۔ "وہ یہ سب تب ہی کرواسکتے ہیں جب ان کو آگ لگنے سے پہلے معلوم ہو چکا ہو کہ فارس یہ کرے گا! دیکھو آگ کا سن کر ان کا شک فارس کی

طرف جانا تو بنتا ہے' مگر ان کو "پہلے" کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟ یہ صرف میرے اور فارس کے درمیان تھا' ہم نے کسی سے فون پہ بھی ڈسکس نہیں کیا۔"

سیم خاموش لیٹا ان کی باتیں سنتا رہا۔

"وہ اس سے کچھ نہیں چھپا رہی تھیں۔ گھر والوں سے باتیں چھپانے کے نتائج کبھی اچھے نہیں نکلتے۔"

"ہو سکتا ہے' ان کو پہلے معلوم نہ ہو' صرف اتفاق ہے اسی رات۔"

"اتفاق سے اسی رات اسی شخص کا قتل ہوا جس کا فارس سے کوئی تعلق بھی تھا؟ میں اسے اتفاق نہیں مان سکتی۔"

"کیا کوئی شخص ماموں کا جعلی alibi نہیں بن سکتا؟ کورٹ میں کہہ دے کہ فارس غازی اس رات میرے ساتھ تھا؟"

"استغفراللہ حنین! یہ جرم ہے' پرجری ہے' گناہ کبیرہ ہے!" وہ خفا ہوئی تھی۔

حنہ شرمندہ ہو گئی۔ "میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

ادھر قصر کاروار کی اسٹڈی کی کھڑکیوں پہ بارش کی ننھی بوندیں گر رہی تھیں۔ دھندلے شیشے کے پار دیکھو تو ہاشم کے سامنے ناخوش سا خاور کھڑا تھا۔

"سر! آپ کو گھر کی تلاشی سے روکنا نہیں چاہیے تھا' میری ساری محنت کو اس ایک چیز نے کمزور کر دیا ہے۔"

"وہ لڑکا میرا دروازہ توڑنے والا تھا۔ میں کیسے نہ کھولتا؟ ہم یہ سب خود پر سے شک ہٹانے کے لیے ہی کر رہے ہیں۔"

"یہ بھی ہے۔ بہرحال' میں سب درست کر لوں گا۔ غازی اگلے کئی سال جیل سے باہر نہیں آئے گا۔"

اور ان سب سے دور' تھانے کے نیم اندھیرے کمرے میں تیز روشنی کا بلب جھول رہا تھا اور میز کے سامنے بیٹھا آئی او پوچھ رہا تھا۔ "آغاز تفتیش ہے' میں آرام سے پوچھ رہا ہوں۔ تمہارا قمرالدین سے کس بات پہ جیل میں جھگڑا ہوا تھا؟"

"آرٹیکل تیرہ کے تحت مجھے خاموش رہنے کا حق ہے۔" وہ ٹیک لگا کر بے نیاز سا بیٹھا تھا۔

"تم 28 اور 29 اگست کی درمیانی شب کہاں تھے؟" آئی او نے بھی تحمل سے پوچھا۔

"آرٹیکل تیرہ کے تحت مجھے خاموش رہنے کا حق ہے۔"

اور وہ عجیب' وحشت زدہ سی رات اسی طرح قدم بہ قدم روشنی کی جانب بڑھتی رہی۔

☼ ☼ ☼

کھلا یہ راز کہ آئینہ خانہ ہے دنیا
اور اس میں مجھ کو تماشا بنا گیا اک شخص

کولمبو ایک ساحلی شہر تھا۔ ہوا ہمہ وقت پرنم رہتی تھی۔ ساحل کے قریب چند ہوٹلز کی بلند و بالا عمارتیں تھیں۔ ان میں نیلے شیشوں سے ڈھکا ایک اونچا اور عالیشان ہوٹل بھی تھا۔ اس کی ریسپشن پہ روشنیاں' ٹورسٹ' گہما گہمی' غرض ہر وہ عنصر بکھرا تھا جو کسی بھی ہوٹل کا خاصا ہوتا ہے۔ ایسے میں سرخ اسکارف والی خاموش سی آبدار کو فصیح ریسپشن سے دائیں جانب لے جا رہا تھا۔ وہ سوٹ میں ملبوس' دبلا پتلا' اونچا سا مرد تھا' سر بالوں سے صاف' سیاہ چکنا سا۔ رنگت بھی بے حد سیاہ۔ جیسے کوئی حبشی ہو اور دانت اتنے ہی سفید۔

"آیئے۔" وہ گراؤنڈ فلور پہ موجود کھلے سے کچن میں آئے جہاں قطاروں میں کاؤنٹرز بنے تھے اور سفید یونیفارم میں ملبوس باورچی کام کرتے نظر آ رہے تھے۔ فصیح آگے چلتا ہوا پینٹری میں آیا۔ دروازہ بند کیا۔ وہ دونوں اندر تنہا رہ گئے تو اس نے دیوار پہ لگے سوئچ بورڈ کو ہاتھ سے دبا کر ایک طرف سلائیڈ کیا' نیچے ایک کی پیڈ تھا۔ اس نے چار نمبر پریس کیے تو دیوار میں درز سی ابھری اور پھر۔۔۔ دیوار ایک طرف سلائیڈ ہو گئی۔ آگے لفٹ کے بند دروازے تھے اور ساتھ ایک آلہ لگا تھا۔ فصیح نے بٹن دبایا' پھر اپنی تھوڑی آلے میں رکھی' روشنی کی لکیر نکلی' اس کی آنکھ کے retina کو تشخیص کیا' ہرا سگنل بجا اور دروازہ کھل گیا۔

"کتنے لوگ اس جگہ سے آگے جا سکتے ہیں؟"

لفٹ میں سوار ہوتے اس نے پوچھا تھا۔

"صرف تین لوگ۔ میں' اس کچن کا ہیڈ شیف جو ہمارا اہم آدمی ہے' اور ہاشم کاردار۔ ان کے علاوہ کوئی اس لفٹ کو نہیں کھول سکتا۔"

"کیا میری ماں کو بھی اسی جگہ رکھا تھا بابا نے؟" وہ آہستہ سے بولی۔ فصیح احتراماً" خاموش رہا۔

لفٹ ایک فلور نیچے گئی۔ دروازے کھلے۔ آگے راہداری تھی۔ اس کے اختتام پہ ایک اور دروازہ تھا۔ اس کو کھولنے کے لیے تین لاکس تھے۔ پہلے فصیح نے کوڈ داخل کیا۔ آبدار نے کن اکھیوں سے دیکھا۔ نائن ٹو تھری سکس۔ پھر انگلیاں رکھیں' فنگر پرنٹ او کے ہوا۔ تو اوپر لگے آلے میں ٹھوڑی رکھی تاکہ شعاع اس کی آنکھ کو شناخت کرلے۔ بالآخر دروازہ کھل گیا۔ اندر ایک لاؤنج سا بنا تھا۔ چند گارڈز ادھر موجود تھے اور ایک کونے میں بنے کچن میں فلپینو میڈ کام کررہی تھی۔

فصیح نے آبی کے قریب سرگوشی کی۔ "یہ میری انجیو ہے۔ اس کو ہم نے یہی بتایا ہے کہ یہ انڈیا میں ہے۔ لڑکے کو بھی یہی معلوم ہے۔"

آبی نے صرف ایک گلہ آمیز نظر اس پہ ڈالی اور آگے آئی۔ سامنے ایک کمرے کے دروازے پہ گارڈز پہرہ دے رہے تھے۔

"آپ دیکھ سکتی ہیں۔ وہ صرف ایک مہمان ہے۔"

"پہلے میں سمجھی تھی کہ صرف وہ قیدی ہے' لیکن یہ گارڈز' یہ ملازمہ یہ سب قیدی ہیں۔" آبدار شاکی نظروں سے اسے دیکھ کر بولی تو وہ خاموش ہوگیا۔

میری آہٹ پہ باہر نکلی تو ان دونوں کو دیکھ کر چونکی۔ نگاہیں آبدار پہ جا ٹھہریں۔

"مس آبدار!؟" اسے حیرت ہوئی۔

"مس آبدار کو سعدی یوسف سے ملنا ہے۔" آبی میری کو جواب دے کر سنجیدہ سی فصیح کے ساتھ دوسرے کمرے میں آگئی۔

"یہ ایک عام سا سائنس دان تم لوگوں کے لیے اتنا خاص کیوں ہے؟ تم اس جیسے دس سائنس دان خرید سکتے ہو۔" بالآخر وہ بول اٹھی۔

"میں نے بھی ہارون صاحب سے یہی کہا تھا۔ لیکن ہاشم نے انہیں شیشے میں اتارا ہوا ہے۔ لڑکے کے پاس ہاشم کے راز ہیں' ان کی حفاظت کے لیے وہ اسے یہاں مقید رکھنا چاہتا ہے' اسے مار نہیں سکتا' اور چاہتا ہے سارا خرچا بھی ہم کریں۔" فصیح بھی ناخوش تھا۔ "مگر جس دن ہارون صاحب کو لگا کہ یہ بالکل ناکارہ ہے' اس دن وہ اس سے جان چھڑالیں گے۔"

آبدار کا دل خراب ہونے لگا' مگر چہرے پہ سپاٹ سا تاثر رکھے وہ منتظر بیٹھی رہی۔ وہ مسلسل اضطرابی انداز میں انگلیاں مروڑ رہی تھی۔

آہٹ پہ بھی اس نے جنبش نہ کی' یہاں تک کہ وہ اس کے سامنے کرسی پہ آبیٹھا۔ اب کے آبدار نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ وہ چھوٹے گھونگھریالے بالوں والا دبلا پتلا نوجوان تھا جس کی رنگت سنولائی ہوئی تھی۔ بیٹھتے کے ساتھ ہی وہ بغور ادھر ادھر کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ (فرار ہونے کے لیے کسی روزن کی تلاش میں شاید۔) پھر آبدار کو دیکھا اور پھر اس کے عقب میں کھڑے فصیح کو۔

"سعدی یوسف! یہ آبدار عبید ہیں' ایک اہم تھراپسٹ۔ تمہیں ان کے ساتھ ایک سیشن کرنا ہے' یہ کاردار صاحب کا حکم ہے۔"

سعدی نے باری باری ان دونوں کو دیکھا' ابرو تن گئے۔ "کاردار صاحب کو کہو کہ اپنے احکامات اپنے ملازموں تک..." ان دونوں کی طرف اشارہ کیا "محدود رکھیں تو بہتر ہوگا۔"

"آرام سے!" فصیح نے سختی سے ہاتھ اٹھا کر اسے گھورا۔ "یہ ہارون عبید کی صاحبزادی ہیں تم...."

"تھینک یو فصیح! کیا تم ہمیں اکیلا چھوڑ سکتے ہو؟" وہ گردن اٹھا کر فصیح کو حتمی نظر سے دیکھتے بولی تو وہ خاموش ہوا' پھر باہر نکل گیا اور دروازہ بند کردیا۔ آبدار نے نگاہوں کا رخ اس کی طرف پھیرا' وہ تندی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"سو تم ہاشم کاردار کے مہمان ہو۔" سپاٹ سا گویا ہوئی۔

"آپ کو کیا چاہیے مجھ سے؟" وہاں بھی اتنا ہی شک و شبہ تھا۔

"مجھے نہیں۔ کرنل خاور کو تمہارے وکیل کا نام چاہیے۔ ڈور نمبر ون' تم مجھے وکیل کا نام بتادو۔ ڈور نمبر ٹو۔ میں تمہیں (ہپناسس) کے ذریعے کمپرومائیز ڈیوزیشن میں لے آؤں جہاں تم کمزور پڑ کر اس کا نام لے دو گے۔ اب بتاؤ سعدی یوسف! پہل میں کروں یا تم کرو گے؟"

سعدی دھیرے سے مسکرایا اور آگے کو ہوا۔ "ان جادوگروں نے کہا' اے موسیٰ پہلے آپ ڈالیں گے (عصا) یا پہلے ہم ڈالیں (اپنی رسیاں)' سو ہاشم کا اگلا پتا ایک ہپناٹسٹ کو میرے سامنے لانا ہے؟"

اس نے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"یا تو ہاشم نے آپ کو میرے بارے میں تمام معلومات نہیں دیں' یا آپ نے اس کو ہپناٹزم کے بارے میں تمام معلومات نہیں دیں۔ کیونکہ آپ کسی کو اس کی مرضی کے برخلاف ہپناٹائز صرف تب کر سکتی ہیں جب وہ کمزور اعصاب کا مالک ہو۔ میرے جیسا آدمی اتنی آسانی سے ہپناٹائزڈ نہیں ہوتا۔"

آبدار بس تاسف سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ ایک معصوم' نرم' مسکراتا لڑکا جو کیفے میں بیٹھا خود سے بڑی نیچر کو سمجھا رہا تھا' وہ کہیں کھو گیا تھا۔ یہ تلخ' طنزیہ لہجے اور زخمی آنکھوں والا نوجوان کوئی اور تھا۔

"سعدی یوسف!" اس نے گہری سانس لی۔ "میں فرعون کے ساحروں میں سے نہیں ہوں۔ کیونکہ ڈور نمبر تھری' یہ ہے کہ تم ان دونوں راستوں سے انکار کردو اور میں خاموشی سے واپس چلی جاؤں' کیونکہ نہ مجھے تمہیں ہپناٹائز کرنے میں دلچسپی ہے' نہ وکیل کا نام جاننے میں۔ میں کلینکل ڈیتھ پہ ریسرچ کر رہی ہوں' سنا تھا تم بھی کلینکل ڈیتھ کا شکار ہوئے تھے۔ خاور اور بابا سے میں نے یہی کہا ہے کہ مجھے تمہارا تجربہ سننے میں دلچسپی ہے' یہ بھی جھوٹ ہے۔" ایک سانس میں بولتے ہوئے وہ رکی۔

سعدی نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔ "پھر کیوں آئی ہو تم؟"

"صرف یہ دیکھنے کہ بابا واقعی کسی انسان کو قید کر سکتے ہیں یا نہیں!"

"اوہ اچھا' تو تم انسانی ہمدردی کے تحت آئی ہو۔ یوں کرو' جاکر ہاشم سے کہو' ڈاکٹر مایا کے متبادل کے طور پہ لڑکیوں کو بھیجنا چھوڑ دے۔"

"میں سمجھی نہیں؟" اس نے واقعی ناسمجھی سے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

سعدی اسی طرح زخم خوردہ سا مسکرایا۔ "اگر تمہارے اندر اتنی انسانی ہمدردی ہوتی' تو نوشیرواں کو اپنے منگیتر سے یوں بری طرح نہ پٹواتیں۔"

آبدار کے ابرو تعجب سے اکٹھے ہوئے۔ "کیا؟"

"اور اس پہ مستزاد' تم اسی کیفے میں بیٹھی تھیں جب تمہارا منگیتر اس کو پیٹ رہا تھا' ایسے ظاہر مت کرو جیسے تمہیں یاد نہیں۔ تم ہماری یونیورسٹی میں کچھ عرصے کے لیے آئی تھیں۔ میں ایک دفعہ کوئی چہرہ دیکھ لوں تو بھولتا نہیں ہوں۔!" آنکھوں میں اس لڑکی کے لیے غصہ تھا۔

وہ بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔ "نہ میں تمہیں جانتی ہوں' نہ تم مجھے جانتے ہو' تو مجھ سے اتنے خفا کیوں ہو؟"

"تم ہارون عبید کی بیٹی ہو' ہارون عبید آئل کارٹیل کا اہم رکن ہے۔ تمہارا چہرہ دیکھ کر مجھے دو سیکنڈ میں ساری کہانی سمجھ میں آگئی ہے۔ ہاشم نے مجھے ہارون عبید کے ہاتھوں بیچ دیا ہے۔ ہاشم کا کردار "فرعون" ہے جس کے پاس بہت طاقت ہے' اور تمہارا باپ' جانتی ہو وہ کون ہے؟"

آبدار نے نم آنکھوں سے اسے دیکھا' بولی کچھ نہیں۔

"وہ فرعون کے زمانے میں تھا' جس کے پاس بے انتہا دولت تھی' جس کے خزانوں کی کنجیاں کئی اونٹ مل کر اٹھاتے تھے۔ اس کا نام تھا قارون" فرعون اور قارون' دونوں اللہ کے نافرمان تھے۔ دونوں ایک

سے گناہگار تھے۔ تم بھی ان کی سائیڈ پہ ہو۔"
"میں ان کے کسی کام میں شریک نہیں ہوں۔"
اس کا گلا رندھا۔ "تم مجھے نہیں جانتے۔ میرے بارے میں اتنے برے نتیجے قائم مت کرو۔ نہ میں تمہاری دشمن ہوں نہ ان کے ساتھ ہوں۔ میں غیر جانب دار ہوں!"
سعدی تلخی سے مسکرایا۔

"Those who lived withouten infamy or praise !"

(رہتے تھے بدنامی اور نیک نامی کے بغیر)
آبدار کو دھچکا لگا۔ حیرت اور دکھ سے آنکھیں ساکت ہوئیں۔ "تم میرا موازنہ دانتے کی جہنم کے جہنمیوں سے کر رہے ہو؟ تم کیسے کسی انسان کے بارے میں اتنے ججمینٹل ہو سکتے ہو!"
سعدی چند ثانیے ان ہی شک و شبے کے سیاہ سرمئی بادلوں کے درمیان کھڑا اس کو دیکھتا رہا۔
"اگر تم واقعی ان کی آلہ کار نہیں ہو، جس میں مجھے شک ہے' اور اگر تم واقعی اتنی ہی غیر جانب دار ہو جتنا تم خود کو ظاہر کر رہی ہو' تو یاد رکھنا' وہ لوگ جو ظلم کے خلاف آواز نہیں اٹھاتے' اور خود کوئی غلط کام بھی نہیں کرتے' وہ جو غیر جانب دار ہوتے ہیں' اللہ ان کو ان کی نمازوں اور صدقات کے باوجود عذاب سے محفوظ نہیں رکھے گا۔ میں کوئی نیک آدمی نہیں ہوں' نہ مجھے خود پہ کوئی غرور ہے' مگر میں نے ظلم کے سامنے نیوٹرل رہنے کے بجائے "سائیڈ" منتخب کی ہے۔ میں جانب دار ہوں اور مجھے فخر ہے اپنی جانب داری پہ۔ سو میں تمہیں ایک نصیحت کرتا ہوں ینگ لیڈی۔" آگے کو جھک کر' اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے' چبا چبا کر بولا۔ "غیر جانب دار رہنے والوں کو فلاح اور بقا کی ساری امید ترک کر دینی چاہیے۔ کیونکہ جب عذاب آئے گا تو وہ صرف ان لوگوں پہ نہیں آئے گا جو برے کام کرتے تھے۔ اللہ نے نہیں بنائے کسی انسان کے سینے میں دو دل۔ اگر آپ کا دل اچھے لوگوں کے ساتھ نہیں ہے تو وہ برے لوگوں کے ساتھ ہے۔"

کرسی جارحیت سے دھکیل کر اٹھا۔
"ڈور نمبر تھری' میں انکار کرتا ہوں' تم چلی جاؤ۔ اللہ حافظ۔" اور کندھے جھٹکتا باہر نکل گیا۔
آبدار گود میں ہاتھ رکھے' اسی طرح ڈوبتے دل کے ساتھ بیٹھی رہی۔ پرس میں مڑا تڑا سا کاغذ بھی ویسا ہی رکھا تھا اور اس لڑکے کا انداز اس کاغذ کے لکھنے والے جیسا ہی تھا۔ اس کو جب پہلی دفعہ دیکھا تھا' تو وہ کسی کو امید دلا رہا تھا' آج جب دیکھا تو وہ امید توڑ رہا تھا۔ یہ وہ نہیں تھا جس کو اس نے کیفے میں دیکھا تھا! وہ کہاں کھو گیا تھا؟

☆ ☆ ☆

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا' نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی' وہاں جینے کی پابندی
صبح کی چمکیلی کرنیں چھن چھن کر زمر کے کمرے میں گر رہی تھیں۔ سیم کا میٹرس ہٹ چکا تھا' زمر آئینے کے سامنے کھڑی تیار ہو رہی تھی۔ گھونگھریالے بال جوڑے میں بندھے تھے' اور سفید لمبی قمیص کے اوپر وہ بلیک منی کوٹ پہنے ہوئی تھی۔ تب ہی حنہ نے اندر جھانکا۔
"آج کیا ہو گا کورٹ میں؟"
"فارس کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جائے گا' پھر پولیس اس کا ریمانڈ لے گی اور اس کو واپس تھانے لے جا کر حوالات میں بند کر دیں گے۔" اپنا بیگ اور فائلز اٹھا کر وہ گھومی تو چوکھٹ میں کھڑی حنہ نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔
"یہ بلیک کوٹ' یہ کیس فائلز' یہ کورٹ روم ٹرائلز!" ٹھنڈی سانس لی۔ "یہ ہمیشہ میری فینٹسی رہے ہیں۔ بی اے کلیئر کرنے کے بعد میں نے سوچا تھا کہ آگے نہیں پڑھوں گی' لیکن اب میرا دل کر رہا ہے کہ میں بھی لاء کروں۔"
زمر جواب دیے بنا اپنی چیزیں اٹھائے باہر آئی۔ حنین ساتھ سیڑھیاں اترتے کہہ رہی تھی۔
"میں اور سیم بھی آپ کے ساتھ جائیں گے'

دیکھیں انکار مت کیجیے گا۔" وہ سفید اور سیاہ جوڑے میں ملبوس' بال سلیقے سے فرنچ چوٹی میں گوندھے' کندھے پہ لمبی اسٹریپ کا پرس لیے تیار تھی۔ تیار تو سیم بھی تھا۔ کالر کف والی ڈریس شرٹ' اور نہا کر گیلے بال سلیقے سے پیچھے کو جمائے وہ صوفے پہ بیٹھا' جوتے کے تسمے باندھ رہا تھا۔

زمر نے گہری سانس لی۔

"تم دونوں کہیں نہیں جارہے۔ فارس کو برا لگے گا۔"

"میں جیل بھی گئی تھی ایک بار' جب وہ ہتھکڑیوں میں ہوں تو زیادہ احتجاج نہیں کرتے۔ خیر آپ نہ لے کر جائیں ہم ٹیکسی لے لیں گے۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" زمر نے شانے اچکا دیے۔ وہ دونوں پرجوش سے اس کے ساتھ باہر نکلے تھے۔

سیشن کورٹ کے احاطے کے باہر جب زمر نے گاڑی روکی تو حنہ نے ستائشی نظروں سے اس قدیم طرز کی عمارت کو دیکھا۔

"مجھے بھی وکیل بننا ہے' زمر!" اور ایک عزم لیے باہر نکلی۔ زمر آہنی گیٹ تک اسی خاموشی سے آئی' پھر رکی' حنہ کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔

"میرا ہاتھ پکڑلو!"

حنین کی آنکھوں میں خفگی اتری' اسے بہت برا لگا تھا۔ "اللہ۔ زمر! میں کوئی بچی تھوڑی ہوں۔"

زمر کچھ کہتے کہتے رکی' پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔ دونوں اس کے دائیں بائیں چلتے ہوئے ساتھ آئے۔ گیٹ کے اندر سیم مردوں والے حصے سے گزر گیا۔ وہ خواتین کی تلاشی والے کمرے سے گزریں۔ سامنے کچہری کے وسیع میدان نظر آرہے تھے۔ کہیں سبزہ' کہیں عمارت۔ حنین نے قدم بڑھایا تو دل جوش سے بھر گیا۔ پہلی دفعہ کورٹ جارہی تھی۔ "واؤ"۔ ماموں کی گرفتاری اور متوقع ڈانٹ کا احساس بھی۔

چند ہی قدم کا راستہ طے کرکے حنین کو احساس ہوا کہ وہاں بہت لوگ تھے۔ اکثریت براق چمکتی سفید شرٹ اور سیاہ ٹائی وسیاہ کوٹ والے تیز تیز چلتے وکلاء کی تھی۔ لوگ آجا رہے تھے' تیز تیز۔ ہر قدم کے ساتھ رش بڑھتا جارہا تھا۔ عورتیں کم تھیں' تھیں تو وہی سیاہ کوٹ' سفید دوپٹے والی' جو بڑے مزے سے کہیں بیٹھی تھیں یا چل رہی تھیں۔ مردوں کی طرح اونچے قہقہے لگا رہی تھیں۔ وہ تینوں قدم قدم آگے بڑھتے رہے۔ درمیان میں کتنے پلاٹ سے بنے تھے جہاں میزیں ہی میزیں تھیں' ہر ایک پہ کسی وکیل کا نام لکھا تھا' وہ وکلاء کے اوپن ایئر آفس تھے۔ صرف ایک میز؟ اور ان پہ جگہ جگہ لوگ بیٹھے تھے۔ لوگ ہی لوگ۔ حنہ کا دل ایک دم گھٹن کا شکار ہونے لگا۔ مگر وہ چلتی رہی۔

وہاں لوگ اتنی تیزی سے چلتے آرہے تھے' گویا سامنے والے سے ٹکرانے کا ارادہ ہو اور اتنا شور کہ الاماں۔ کانوں میں بھانت بھانت کی آوازیں پڑ رہی تھیں۔ مختلف زبانیں... بولیاں ورد ناک... تفصیلے لہجے تلفظ... درو کی باتیں۔

"جی مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ ہی پلیڈ کریں اور..." ساتھ سے گزرتے وکیل کی رفتار کا ساتھ دینے کی کوشش کرتا ایک شخص کہہ رہا تھا۔

"استغاثہ کے دونوں گواہوں کو ڈس کریڈٹ کرنے..." کوئی اور قریب میں بولا تھا۔ وہ لاشعوری طور پہ زمر کے قریب ہوگئی جو اطمینان اور سنجیدگی سے چل رہی تھی۔ چند زینے عبور کیے اور وہ عمارت کے اندر داخل ہوئے۔

وہاں بھی مردوں کا وہی سمندر تھا۔ لوگ چڑھے ہی چلے آرہے تھے۔ حنین زمر کے مزید قریب ہوگئی۔ اب وہ آگے پیچھے کے بجائے صرف سامنے دیکھ رہی تھی۔ شور ہی شور اور طویل راہداریاں جن کے اختتام پہ ایک اور راہداری شروع ہوجاتی۔ کونوں میں وکلاء کی میزیں تھیں۔ جیسے جس کو جہاں جگہ ملی' بیٹھ گیا ہو۔ اتنی صبح بھی اتنا رش۔ اس نے ایک ساتھ اتنے مرد... وہ بھی اتنی تیزی سے چلتے' پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ حنین کا دل گھبرانے لگا' عجیب سی وحشت' خوف

سالے سے گھیرنے لگا۔

یکدم ایک راہداری کا موڑ مڑا تو اگلی راہداری 'جو برآمدے کی طرح تھی (یعنی ایک طرف عمارت اور دوسری طرف لان تھا) وہاں سے دو پولیس اہلکار' زنجیروں میں مقید دو قیدیوں کو لا رہے تھے۔ آف وائٹ' میلے میلے کرتوں' جھاڑ جھنکاڑ جیسی داڑھیوں' اور پیلے دانتوں سے ہنستے قیدی' جن کے ہاتھ پیر زنجیروں میں تھے۔ وہ ایک دم سے سامنے آئے تھے' ان کے چہرے۔۔۔ اف۔۔۔ حنہ خوف سے جم گئی' مگر زمر نے کہنی سے کھینچ کر اسے سائیڈ پہ کیا۔ وہ دونوں ہنستے ہوئے انہیں دیکھتے آگے بڑھ گئے۔ حنین کے پاؤں کانپنے لگے۔ سو وہ بمشکل دو قدم مزید چل پائی۔

"مجھے گھر جانا ہے' واپس" وہ ہمت ہار چکی تھی۔ زمر نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"میں نے کہا تھا تم لوگوں کو نہیں آنا چاہیے۔"

"میں تو ٹھیک ہوں۔" سیم واقعی ٹھیک نظر آ رہا تھا مگر وہ رو دینے کے قریب تھی۔

"آپ مجھے واپس چھوڑ کر آئیں۔ ابھی اسی وقت۔" اس نے نم آنکھوں سے زمر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ گہری سانس لے کر واپس مڑ گئی۔

واپسی پہ کورٹ رومز کے کھلے دروازے ان کے بائیں ہاتھ تھے۔ حنہ نے وحشت اور خوف کے احساس کے باوجود گاہے بگاہے اندر بھی جھانکا۔ ایک سو دس دفعہ لعنت ہو امریکی ڈراموں پہ۔ سو کورٹ رومز بالکل بھی امریکی ڈراموں جیسے نہ تھے۔ ہاں بھارتی فلموں سے تھوڑی بہت مشابہت رکھتے تھے' مگر بھارتی فلموں والے کورٹ رومز گندے' میلے اور لوگوں سے کھچا کھچ بھرے ہوتے تھے۔ یہ صاف ستھرے تھے۔ لکڑی کا کام بھی سنہرا چمک دار تھا۔ مگر ڈراموں' فلموں کے برعکس ان میں وہ کرسیوں کی لمبی لمبی دو قطاریں نہیں تھیں۔ بلکہ کرسیاں تو صرف دو تین پڑی تھیں۔ باقی اوپر جج کا بنچ اور دونوں طرف کٹہرے بنے تھے۔ شور ہی شور۔ سو ڈراموں والی پُرتقدس خاموشی ناپید تھی۔

گاڑی میں واپس بیٹھتے ہوئے اس نے زمر سے کہا تھا۔

"میں بالکل' بالکل' بالکل بھی وکیل نہیں بننا چاہتی۔" اور خفگی سے اندر بیٹھ کر دروازے لاک کر دیے۔ سیم کو بھی اندر بٹھا لیا۔ وہ ناخوش تھا مگر اسے اپنی بہن کا خیال رکھنے کے لیے وہاں بیٹھنا تھا کیونکہ وہ گھر کا بڑا مرد تھا۔

زمر بار بار گھڑی دیکھتے جب واپس آئی تو مجسٹریٹ کے کمرے کے باہر اسے احمر کھڑا نظر آیا تھا۔ اس نے بھی زمر کو دیکھ لیا۔ سو تیزی سے قریب آیا۔

"مسز زمر۔" وہ فکرمند لگ رہا تھا۔ "میں نے بہت کوشش کی مگر آئی ایم سوری۔ میں پرچہ کٹنے سے نہیں روک سکا۔ ہوا کیا ہے؟"

"اس کو پھر سے فریم کیا گیا ہے۔ مرڈر کیس ہے اور اس کے پاس alibi بھی نہیں ہے۔"

"اوہ ہو۔" وہ ادھر ادھر متلاشی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ زمر کو معلوم تھا کہ اسے کس کا انتظار ہے۔

"احمر! آپ کے یہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

"وہ میرا دوست ہے۔"

زمر نے گہری سانس لی۔ "فی الحال وہ ایسا نہیں سمجھتا۔" احمر نے ابرو تعجب سے بھینچے۔ وہ جواباً "جتنے مختصر الفاظ استعمال کر سکتی تھی' کر کے ساری کتھا سنا ڈالی۔ احمر کی فکرمندی' پریشانی میں بدلی۔

"جی' میں نے یہی کہا تھا ہوٹل والوں سے کہ میں جسٹس ڈپارٹمنٹ سے ہوں' اور کیا کہتا؟ اس روز وہ ہارون صاحب کی رہائش گاہ پہ آیا تھا تو اس نے مجھ سے سوال جواب کیے تھے' میں نے محتاط جواب دیے' جھوٹ نہیں بولا۔"

"اور ہاں' آپ نے مجھے ٹیکسٹ بھیجا تھا کہ آپ کو کال کروں؟ وہ ٹیکسٹ میں نے صبح دیکھا' کیونکہ وہ مجھ سے پہلے فارس کھول چکا تھا۔" اور اس کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی ملامتی ہو گیا۔ "ایسی کیا خاص بات تھی؟"

احمر ایک دم شرمندہ ہو گیا "وہ تو۔۔۔ کچھ بھی نہیں تھا۔" ذرا ٹھہر کر بتانے لگا۔ "میں شادی کر رہا ہوں فاطمہ

ہے ' کمپنی ٹیم میں میرے ساتھ کام کرتی ہے ' میں اسے منگنی پر کیا تحفہ دوں ' یہی پوچھنا چاہتا تھا ' پلیز برامت مانیے گا ' نہ میں آپ کا کوئی کولیگ ہوں نہ دوست ' مگر آپ سے زیادہ میرے حلقہ احباب میں کوئی sophisticated (نفیس طبع) نہیں ہے۔ صرف اس لیے۔۔۔ میں غازی کو وضاحت دے دوں گا۔"

زمر بس اس کو دیکھ کر رہ گئی۔ "خیر ' مبارک ہو آپ کو۔ مگر اس وقت ' آپ کو دیکھ کر وہ کچھ الٹا سیدھا بول دے گا۔ آپ ابھی چلے جائیں ' جب وہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو میں آپ کی ملاقات کروا دوں گی۔" اور وہ متامل ' متذبذب سالوٹ گیا۔

زمر کافی دیر اس راہداری میں کھڑی رہی۔ لوگ اسی طرح آجا رہے تھے۔ وہ ویران ' اداس نظروں سے سب دیکھتی رہی۔ ذہن بار بار اس کینڈل لائٹ ڈنر میں کی گئی اس کی سلگتی باتوں پہ بھٹک جاتا ' مگر نہیں ' ابھی یہ سب نہیں سوچنا تھا۔

دفعتاً" وہ سیدھی ہوئی۔ پولیس اہلکار اسے لا رہے تھے۔ وہ رات والی جینز اور گرے شرٹ میں ملبوس تھا۔ ایک رات میں ہی شیو بڑھی ہوئی لگ رہی تھی۔ زمر کو دیکھ کر اس کی سنہری آنکھیں سکڑیں ' ان میں چبھن اتری ' مگر منہ میں کچھ چباتا آگے بڑھتا رہا۔ وہ ہلکا سا مسکرائی ' مگر اگلے ہی پل مسکراہٹ غائب ہوئی۔ فارس کے قریب ' سیاہ کوٹ اور ٹائی میں ملبوس ' خلجی صاحب چلتے آرہے تھے۔

"ڈونٹ یو ڈیئر!" زمر کے سر پہ لگی ' تلووں پہ بجھی۔ وہ قریب آئے تو وہ بظاہر مسکرا کر خلجی صاحب کی طرف گھومی۔

"آپ یہاں ' خیریت ہے خلجی صاحب؟"

"یہ میرے وکیل ہیں۔" وہ چبھتی آنکھیں زمر پہ جمائے بولا۔ زمر نے سلگتی نظروں سے اسے دیکھا مگر ہنوز مسکراتے ہوئے بولی۔

"آخری اطلاعات تک تمہاری وکیل میں تھی۔"

خلجی صاحب فون پہ بات کر رہے تھے ' سر کے اشارے سے اسے سلام کیا۔ فارس چند قدم چل کر اس کے بالکل مقابل آکھڑا ہوا ' جتنی اجازت اس کی زنجیر اس کو دیتی تھی اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"زمر بی بی۔۔۔! مجھے آپ سے کسی اچھائی کی امید نہیں ہے۔" دبی سرگوشی میں بولا۔ وہ اس سے لمبا تھا ' زمر کو سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھنا پڑ رہا تھا۔

"ان سے ہے؟"

"وہ میرے ساتھ وفادار ہیں۔" چبا چبا کر الفاظ ادا کیے۔

"اچھا!" زمر دانت پہ دانت جما کر مسکرائی ' پھر سر کو خم دیا اور وہاں سے ہٹ گئی۔ خلجی صاحب فون بند کر چکے تھے ' اب اس سے حال احوال دریافت کرنے لگے۔ وہ جواب دیتی چند قدم آگے چلی آئی۔ پھر مزید چند قدم یہاں تک کہ وہ دونوں فارس کی حد سماعت سے دور ہو گئے۔ وہ تیکھی نظروں سے ان دونوں کو بات کرتے دیکھنے لگا۔

چند منٹ بعد وہ واپس اس کی طرف آئے۔ خلجی صاحب نے خوشگوار انداز میں زمر کو دیکھتے ہوئے فارس کو مخاطب کیا۔

"تم فکر نہ کرنا ' زمر اچھے سے سب ہینڈل کر لیں گی۔ میں پھر اپنے آفس کی طرف جاتا ہوں۔" فارس کا شانہ تھپکا اور زمر کو گرم جوشی سے الوداع کہہ کر وہ آگے چلتے گئے۔

زمر نے مسکرا کر فارس کو دیکھا۔ "وفادار ' ہاں؟"

"کیا کہا ہے آپ نے ان سے؟" وہ خشک انداز میں بولا تھا "بلکہ کس بات سے بلیک میل کیا ہے ان کو؟ ایک یہی کام تو آتا ہے آپ کو۔"

"جب تم چار سال جیل میں لوگوں سے لڑ جھگڑ کر اپنے لیے دشمن بنا رہے تھے نا ' تو میں ایک سیاسی عہدے پہ کام کر رہی تھی۔ یہاں لوگ میری بات ٹالا نہیں کرتے۔" وہ بھی اتنی ہی تلخی سے بولی تھی۔

"ہاں ' میں نے تم سے چند جھوٹ بولے تھے۔ احمر کو بھی میں نے ہائر کیا تھا لیکن تمہارے خلاف نہیں۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جو تم سمجھ رہے ہو۔ دیکھو ' ابھی وقت کم ہے ' تمہارا نام ابھی پکارا جائے گا۔ اس وقت کو

لڑنے میں ضائع مت کرو۔ ویسے بھی زیادہ سے زیادہ تین ہفتے بعد ٹرائل شروع ہو جائے گا، تم ان تین ہفتوں میں جتنے وکیل ڈھونڈ سکتے ہو ڈھونڈ لو، میں کسی ایک کو بھی تمہاری طرف نہیں رہنے دوں گی، اس لیے ان تین ہفتوں کے لیے مجھے اپنا وکیل رہنے دو۔ جس دن ٹرائل شروع ہو، اس دن تم فیصلہ کرلینا۔ مجھے فائر کر دینا میں چلی جاؤں گی، لیکن اس سے پہلے نہیں۔ اوکے!"

غصے اور سمجھانے کے ملے جلے انداز میں وہ بول بول کر چپ ہوئی تو وہ بھی چند لمحے سوچتا رہا۔

"آپ کو اگر میرا وکیل رہنا ہے تو ایک کام کریں۔"

زمر گہری سانس بھر کر رہ گئی۔ "کہو!"

"شہزا ملک.... وہ لڑکی.... اے ایس پی کی کزن اور سالی.... وہ دو دن پہلے کوما سے نکل آئی ہے، سو آپ نے اس امر کو یقینی بنانا ہے کہ وہ نیاز بیگ کو جیل سے نکلنے نہ دے۔ کیسے؟ یہ میرا درد سر نہیں ہے!" حکم صادر کر کے وہ پلٹ گیا۔

زمر اسے دیکھ کر رہ گئی۔ راہداری میں بھانت بھانت کی بولیاں ہنوز گونج رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

جسے گئے ہوئے خود سے ایک زمانہ ہوا
وہ اب بھی تم میں بھٹکتا ہے اب بھی آجاؤ

گالف کلب کے سبزہ زاروں پہ زمردی قالین سا چڑھا لگتا تھا۔ فضا میں آتے سرما کی مہک تھی، گھاس بھی گویا لمبی لیٹی یہ نرم گرم دھوپ سینک رہی تھی۔

وہ دونوں گھاس پہ آگے چلتے جا رہے تھے۔ ہارون نے ٹی شرٹ کے اوپر پی کیپ اوڑھ رکھی تھی، اور جواہرات نے گھٹنوں تک آتا سادہ کرتا پہن رکھا تھا، اور بال جوڑے میں بندھے تھے۔ اتنے عام سے حلیے میں بھی وہ نازک اور خوب صورت لگ رہی تھی۔ پچھلے ماہ اس نے آنکھوں کی کاسمیٹک سرجری (آئی لڈ لفٹ) کروائی تھی جس سے اس کی آنکھیں زیادہ بڑی اور گہری لگنے لگی تھیں۔

"میں تمہیں آج بھی پہلے کی طرح گالف میں ہرا سکتا ہوں۔" ہارون عبید مسکرا کر اس کی طرف چہرہ کر کے بولے۔

"برسوں پہلے میں ایک بے وقوف لڑکی تھی، جو تمہاری باتوں میں آکر تمہارے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب دیکھنے لگی تھی۔" وہ بھی بتانے والی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ہارون ٹھہر گئے۔ اس کو قدرے افسوس سے دیکھا۔

"یہ رشتہ ختم کرنے میں تم نے پہل کی تھی۔"

"اتنے دن بعد تم نے یہ ذکر چھیڑ ہی دیا ہے تو اپنی تصحیح کرلو ہارون۔" وہ سینے پہ بازو لپیٹتے اس کے سامنے آئی اور سرد مسکراہٹ کے ساتھ اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "ہمارے درمیان کبھی کوئی رشتہ نہیں تھا، تم اور میں اچھے دوست تھے، بلکہ دوستوں سے بڑھ کر تھے، پھر ہم نے شادی کا فیصلہ کیا تھا، اور ہمارے خاندان کو اس پہ اعتراض نہیں تھا۔"

"اور پھر تم نے مجھے ٹھکرا کر اورنگ زیب سے شادی کی تھی۔"

"یہ وہ چوائس تھی جس پہ میں پچھلے اڑتیس سال سے پچھتا رہی ہوں۔ ہارون! لیکن یہ مت بھولنا کبھی کہ میں نے تمہیں اس لیے ٹھکرایا تھا کیونکہ تم اپنی ایرانی کزن کے ساتھ انوالوڈ تھے۔ اور تم جانتے ہو کہ میں تمہاری بے وفائی سے واقف ہو گئی تھی، پھر بھی تم کتنے دھڑلے سے میری آنکھوں میں دیکھ کر مجھ سے شکوہ کر لیتے ہو کہ میں نے تمہیں ٹھکرایا تھا۔" ملکہ کی اٹھی گردن اور مسکراہٹ ہنوز برقرار تھی۔ ہارون نے گہری سانس لی۔

"تمہیں اتنی پرانی باتیں یاد ہیں اورنگ زیب کی موت کے بعد ان دو سالوں میں....."

"ایک سال دس ماہ میں....." اس نے میکانکی انداز میں تصحیح کی مگر وہ بولتے رہے۔ "کتنی دفعہ میں نے چاہا کہ ہم کم از کم دوستی کے رشتے میں پھر سے منسلک ہو جائیں لیکن تم ہر دفعہ پرانی باتوں کو کیوں درمیان میں لے آتی ہو۔"

"ہارون!" وہ ایک قدم آگے ہوئی اور شیرنی جیسی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈالیں۔

"تم میرے صرف دوست نہیں بننا چاہتے۔ میں جانتی ہوں۔ تمہارے پاس ہم سے زیادہ دولت ہے لیکن ہمارے پاس تم سے زیادہ طاقت ہے' ہم دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے' اس لیے ہم ساتھ کام کررہے ہیں' لیکن میرا اعتماد تم کئی برس پہلے کھو چکے تھے۔ اگر تمہیں دوبارہ سے مجھ سے کوئی تعلق استوار کرنا ہے تو اس کے لیے تمہیں میرا اعتماد چاہیے اور اعتماد میں بھیک میں بھی نہیں دیتی۔ اسے تمہیں کمانا ہوگا۔" اور پھر دلکشی سے مسکرائی۔ "سو محنت کرو' ہارون! شاید کہ تم کھویا ہوا اعتماد کمالو۔"

پھر سر کے خم سے اشارہ کیا۔ ملازم فوراً" تابع داری سے کٹ لیے آگے آئے۔ ہارون صرف مسکرائے اور کھیل کی طرف متوجہ ہوئے۔ دور دور تک پھیلے سبزے کا ہر تنکا دلچسپی سے یہ کھیل دیکھنے کا منتظر تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ دل کہ اب ہے لہو تھوکنا ہنر جس کا
وہ کم سے کم ابھی زندہ ہے' اب بھی آجاؤ

انیکسی تک واپس جاتے ہوئے زمران دونوں کو بتا رہی تھی۔

"پانچ دن کا جسمانی ریمانڈ مل گیا ہے پولیس کو۔ چودہ دن تک وہ اس میں توسیع کرواتے رہیں گے' پھر فارس کو جوڈیشل کردیا جائے گا یعنی کہ....."

ان کے اگلے سوال سے پہلے اس نے وضاحت۔

"اس کو جیل بھیج دیا جائے گا اور باقاعدہ مقدمہ شروع ہوگا۔ پہلے پراسیکیوٹر اپنے دلائل دے گا' پھر ہم دیں گے' پھر پراسیکیوٹر اپنے گواہ پیش کرے گا' پھر ہم کریں گے۔ اس کارروائی میں عرصہ لگ جاتا ہے' لیکن سب سے اچھی بات یہ ہے کہ جج مقدمے کے دوران کسی بھی دن کسی بھی وجہ سے ملزم کو بری کرسکتا ہے۔ بے گناہ ثابت کرنا گناہ گار ثابت کرنے سے زیادہ آسان ہوتا ہے۔"

دونوں جواب میں کچھ نہ بولے۔

مگر گھر کے دروازے پہ پہنچ کر حنہ کے منہ سے "اوہ" نکلا اور زمر کا ایک دم دل بیٹھ گیا۔ ندرت کی گاڑی جس میں صداقت ان کو ڈرائیو کرکے گاؤں لے گیا تھا' وہ وہاں کھڑی تھی۔ ایک دریا کے پار اترنے پر ایک اور دریا کا سامنا! زمر نے لاؤنج کا دروازہ کھولا تو سامنے بڑے ابا فکر مند بیٹھے تھے' اور ندرت پریشان سی نظر آرہی تھیں۔ زمر نے فون بند کر رکھا تھا اور حنہ اپنا فون گھر چھوڑ گئی تھی۔ یقیناً" انہوں نے کئی کالز کی ہوں گی۔

"زمر!" ندرت گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر پریشانی سے اٹھیں۔ "فارس کو کیوں لے کر گئی ہے پولیس؟ جیسے ہی جواہرات نے بتایا' ہم فوراً" آگئے۔"

"یا اللہ' یہ مسز جواہرات بھی نا!" حنین غصے سے بڑبڑاتی آگے آئی اور ندرت کو شانوں سے تھام کر واپس بٹھایا۔

"زمر! بتاؤ کیا ہو رہا ہے یہ سب؟" ابا بھی بے چین تھے۔ وہ تھکی تھکی سی سامنے بیٹھی اور تفصیل' تسلی اور امید کے ساتھ بتانے لگی۔ ندرت بے ساختہ رونے لگی تھیں۔

"اس ملک میں کوئی قانون' کوئی دستور نہیں ہے کیا؟ جب دیکھو میرے بھائی کو مقدمات میں پھنساتے رہتے ہیں۔ اللہ غارت کرے ان کو۔"

"آمین!" حنہ بڑبڑائی تھی۔ اس آمین کہنے میں بھی دل ٹوٹ کر سو بار جڑا تھا۔

ندرت کو حنہ اوپر کمرے میں لے گئی۔ باقی سب بھی بکھر چکے اور وہ دونوں اکیلے رہ گئے' تو ابا نے آہستہ سے اس سے پوچھا تھا۔

"کیا وہ باہر آجائے گا؟"

"مجھے واقعی نہیں پتا ابا!" وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ ابا غمگین سے بیٹھے اس کے لہجے پہ غور کرتے رہ گئے۔

☼ ☼ ☼

دلیلوں سے دوا کا کام لینا سخت مشکل ہے

مگر اس غم کی خاطر یہ ہنر بھی سیکھنا ہو گا

کولمبو کی نم فضاؤں میں لپٹے ہوٹل کی بیس منٹ میں اٹھا پٹخ جاری تھی۔ پہریدار سعدی کے کمرے کی دیوار پہ ایل سی ڈی ٹی وی لگا رہے تھے۔ ڈی وی ڈیز کا ایک چھوٹا کارٹن' پھل' چاکلیٹس' خشک میوے' جوس کے ڈبے' نئے کپڑے' تازہ ریلیز ہوئے بیسٹ سیلرز۔ سعدی عدم دلچسپی سے ان چیزوں کو دیکھ رہا تھا جو وہ لوگ لا لا کر اس کے کمرے میں رکھ رہے تھے۔ وہ سیاہ حبشی صورت فصیح ان کی نگرانی کر رہا تھا۔

"ان احسانات کی وجہ؟" اس نے سنجیدگی سے حبشی صورت کو مخاطب کیا۔ اس نے ایک اچٹتی نگاہ سعدی پہ ڈالی۔

"یہ ہارون عبید کی طرف سے ہے' وہ سب جو تم نے مانگا تھا۔"

"جس سے مانگا تھا' وہی دیتا تو اچھا تھا۔" وہ بے زار سا اٹھ کر لاؤنج نما کمرے میں آ گیا۔ کسی نے اسے نہیں روکا۔ وہ اس کمپاؤنڈ میں کھلا پھر سکتا تھا' اجازت مل گئی تھی۔ وہ ابھی وہاں بیٹھا ہی تھا کہ یکدم فصیح اس کے کمرے سے باہر نکلا' اور کلنگ فلم میں لپٹی چیزیں میز پہ پٹخیں۔ سعدی منجمد ہو گیا۔ اندر اس کا لائٹر' کانٹا' چند کیل وغیرہ تھے۔ نگاہیں اٹھا کر فصیح کو دیکھا۔

"سنو مائیکل اسکوفیلڈ! زیادہ اوور اسمارٹ بننے کی ضرورت نہیں ہے۔" پھر گہری سانس لے کر لہجہ نرم کیا۔ "یہاں سے نکلنا ہے تو ہارون صاحب کے لیے کام کرو۔ ایک ڈیڑھ سال کی بات ہے' پھر وہ تمہیں آزاد کر دیں گے۔"

"ارے واہ۔ یہ سن کر تو میری آنکھیں بھر آئیں!" وہ طنز سے بولا تھا۔ فصیح اسے گھورتا ہوا پلٹ گیا۔ میری ساتھ آ کر بیٹھی اور جب وہ دونوں تنہا رہ گئے تو ان نوازشات کی بابت دھیمی سرگوشی میں بتانے لگی۔

"یہ سب مس آبدار نے بھجوایا ہے۔" پہلے کی طرح وہ اب سخت نہیں رہی تھی' شاید لمبی قید سے تنگ آ گئی تھی "مگر اس لڑکی سے بچ کر رہنا۔"

"ایک اور گڈ کاپ!" اس نے شانے اچکائے۔

"نہیں سعدی!" وہ اس کو سمجھا نہیں پا رہی تھی۔ "وہ بری نہیں ہے' مگر وہ بہت چالاک ہے۔ دراصل وہ خطرناک ہے۔ دیکھو' اس کے باپ کو مسز جواہرات نے شادی کے لیے ٹھکرایا تھا' مگر ان دونوں کے درمیان اب بھی بہت کچھ باقی ہے۔ دوستی' کاروبار' چنگاریاں۔"

ذرا سانس لینے کو رکی۔ سعدی بے دلی سے سن رہا تھا۔

"اور آبدار ہے تو بہت اچھی' مگر میں اس کے ساتھ ہمیشہ غیر آرام دہ رہتی ہوں۔ اس نے اپنی ماں کو کم عمری میں کھو دیا تھا۔ پھر امریکہ چلی گئی۔ سنا ہے وہاں ایک دفعہ یہ ڈوبنے لگی تو ہاشم نے اس کی جان بچائی۔ تب ہاشم کی شادی کو شاید ایک سال ہوا تھا۔ اس دن کے بعد سے اس کا دل شہرین سے اچاٹ ہو گیا۔ اسے شہرین میں صرف خامیاں نظر آتی تھیں' مگر میں گواہ ہوں' ہاشم نے اس سے بے وفائی نہیں کی' نباہ کی بھی کوشش کی' مگر آبدار۔ وہ ہاشم کے دل میں رہتی ہے' اس لیے اس سے دور رہنا سعدی!"

"تو ہاشم نے اس سے شادی کیوں نہیں کی؟" اسے پہلی دفعہ دلچسپی محسوس ہوئی۔

"ہاشم اپنی طلاق اور باپ کی موت کے بعد سے بہت مصروف رہا ہے' لیکن اب چونکہ وہ دونوں ایک ہی شہر میں ہیں' وہ اسے اپنانے کا ضرور سوچے گا لکھ کر رکھ لو۔"

"رکھ لیا۔ لیکن اگر ہاشم اس کی اتنی پروا کرتا ہے تو اسے آبدار کو میرے پاس بھیجنا نہیں چاہیے تھا۔" اسے جانے کیوں افسوس ہوا۔

"یہی تو میں سمجھ نہیں پا رہی۔ ہاشم نے کیوں اسے آنے دیا؟"

میری نے سر جھٹکا۔ تب ہی دروازے پہ آہٹ ہوئی۔ میری جلدی سے کچن کی طرف چلی گئی۔ برقی دروازہ کھلا اور اسے سرخ اسکارف کی جھلک دکھائی دی تو اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اسی سپاٹ اور معصوم چہرے کے ساتھ چلتی آ رہی تھی۔ سعدی پہ ایک نظر ڈالی' ساتھ

موجود گارڈ سے مقامی زبان میں کچھ کہا اور آگے بڑھ گئی۔

چند لمحوں بعد وہ گارڈ کی معیت میں اسی دو کرسیوں والے کمرے میں داخل ہوا تو آبدار سینے پہ بازو لپیٹے ادھر اُدھر ٹہل رہی تھی۔ اس نے ابرو سے گارڈ کو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ دروازہ بند کر کے چلا گیا تو وہ اس کی طرف گھومی۔

"تم نے کہا اللہ نے کسی آدمی کے سینے میں دو دل نہیں بنائے۔ تم نے ٹھیک کہا تھا۔ آدمی کے پاس ایک ہی دل ہوتا ہے' مگر میں آدمی نہیں ہوں۔"

"مطلب؟" وہ مشتبہ نظروں سے اس کو دیکھ رہا تھا جو دروازے کی طرف پشت کیے کھڑی تھی۔

"ڈور نمبر فور' مجھے کرنل خاور کی مدد کرنی ہے' سو مجھے تمہارے وکیل کا نام چاہیے' اگر تم مجھے بتا دو تو میں تمہاری مدد بھی کروں گی' کیونکہ میرے دو دل ہیں' میں ... غیر جانب دار ہوں!"

"اور تم میرے لیے کیا کرو گی؟" وہ اب بھی مشکوک نظریں اس پہ جمائے ہوئے تھا۔

"یہ فارس غازی نے تمہارے لیے بھیجا ہے۔" اس نے سینے پہ لپٹے بازو کھولے اور ایک ہاتھ میں پکڑا تہہ شدہ کاغذ دور سے دکھایا۔ وہ اس سے چند قدم کے فاصلے پہ کھڑی تھی۔

"میں کیسے یقین کروں کہ تم جھوٹ نہیں بول رہیں؟"

"میری شکل پہ لکھا ہے کہ میں جھوٹ نہیں بول رہی' خیر تم اس کی لکھائی پہچان لیتا' یہ اسی نے لکھا ہے۔ لیکن ..." کاغذ والا ہاتھ پہلو میں گرا لیا۔ "میں تمہیں یہ تب دوں گی جب تم مجھے وکیل کا نام بتاؤ گے۔" سعدی آنکھیں سکیڑے کتنے ہی لمحے اسے دیکھتا رہا۔

"فارس غازی کو معلوم ہے کہ میں کہاں ہوں؟ کس کے پاس ہوں؟"

"اس کو سب معلوم ہے۔ اب نام بتاؤ۔" وہ جیسے فیصلہ کر کے آئی تھی۔

"تم سچ کہہ رہی ہو' ٹھیک ہے۔" اس نے گہری سانس لی۔ "لیکن میں وکیل کا نام صرف ہاشم کو بتاؤں گا۔"

"ہاشم درمیان میں کہاں سے آ گیا؟" اس کے ابرو ناخوشی سے بھنچے۔

"درمیان میں نہیں۔" سعدی نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ اس وقت تمہارے پیچھے کھڑا ہے۔"

آبدار کرنٹ کھا کر دروازے کی طرف پلٹی۔ وہاں کوئی نہیں تھا ... لیکن اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی' سعدی نے ایک دم جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے کاغذ کھینچ لیا تھا۔ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ اس نے اگلے ہی لمحے خود کو ششدر اور خالی ہاتھ کھڑے پایا۔

"قید خانہ انسان کو بہت کچھ سکھا دیتا ہے' مس!" محظوظ سا مسکرا کر وہ چند قدم پیچھے ہٹا اور کاغذ کھول کر ایک نظر ان الفاظ پہ ڈالی۔ پھر نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ وہ شاک سے نکل آئی تھی اور غصہ اس کی آنکھوں میں ابھر رہا تھا۔ "واپس کرو اسے۔"

"گارڈز کو بلا لو۔ وہی مجھ سے چھین سکتے ہیں اب یہ۔"

"اوکے فائن' اب تمہیں یہ مل گیا' اب مجھے نام بتا دو۔" وہ ذرا بے بسی بھری خفگی سے' سینے پہ بازو لپیٹے بولی۔

سعدی نے ایک دفعہ پھر ان حروف کو پڑھا' کچھ دیر سوچتا رہا' پھر کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"میں نے کہا نا' ہاشم کو بتا دوں گا نام' تو اسی کو بتاؤں گا۔" آبی نے آہستہ سے کاغذ تھاما۔ کچھ دیر لب کاٹتی رہی۔ غصہ قدرے کم ہوا۔

"تمہاری سمجھ میں آ گیا وہ تم سے کیا کہنا چاہتا ہے؟ ہمن کا کیا مطلب ہوا؟" آبدار نے اُلجھن سے استفسار کیا۔

"خودکشی!" وہ جل کر بولا تھا۔ اس پیغام پہ جیسے اسے غصہ آیا تھا۔

"اس نے کہا تھا' یہ تمہاری آزادی کا پروانہ ہے۔"

"ان کا دماغ خراب ہے۔"

آبدار چند قدم آگے بڑھ کر اس کے سامنے آکھڑی ہوئی اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"اس آدمی کا دماغ ہرگز خراب نہیں ہے!"

"تم نہیں جانتیں فارس غازی کو۔" وہ جھلایا تھا۔ "وہ ہاتھوں سے سوچتے ہیں' ان کا غصہ ان کی **ججمنٹ** کو دھندلا دیتا ہے۔ اسی لیے ہمیشہ مصیبت میں پھنس جاتے ہیں۔ وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ میں یہاں اتنے مہینے سے قید ہوں' ان کو معلوم ہے میں کہاں ہوں' پھر بھی مجھے بچانے نہیں آئے۔" وہ شکوہ کر گیا تھا۔

"سعدی یوسف! مجھے نہیں پتا تم انسانوں کو کتنا پہچانتے ہو' لیکن میں ایک عامل تنویم ہوں' مجھے انسانوں کو پڑھنا آتا ہے۔ اور جس فارس غازی سے میں ملی تھی' وہ ویسا نہیں ہے جیسا تم اس کو جانتے ہو۔ شاید وہ کبھی ویسا رہا ہو' لیکن اب نہیں ہے۔ مجھے نہیں پتا ان حروف کا کیا مطلب ہے' لیکن تمہیں ایک بات ذہن میں بٹھا لینی چاہیے۔"

اس کی بھوری آنکھوں میں ہمدردی سے جھانکتے آواز آہستہ کی۔

"تمہیں یہاں سے نکالنے کوئی نہیں آئے گا۔ نہ میں' نہ فارس غازی' نہ تمہارے خاندان میں سے کوئی اور۔ تمہیں یہاں سے صرف ایک شخص نکال سکتا ہے اور اس کا نام سعدی یوسف ہے۔ تمہیں اپنے آپ کو خود **ریسکیو** کرنا ہو گا۔"

"آپ کے گارڈز کی مہربانی سے انہوں نے میری لاک پک بھی آج چھین لی ہے!"

"لاک پک؟" اس کی آنکھیں تعجب سے پھیلیں۔ "تمہیں لگتا ہے یہ لاک پک سے کھلنے والے دروازے ہیں؟ یہاں ریٹینا سینسرز لگے ہیں سعدی یوسف! ان کو یہ گارڈز بھی نہیں کھول سکتے۔ ویسے میں نے تمہاری پروفائل پڑھی تھی جو فصیح نے بنا کر دی تھی۔ تم سعدی' تم فارس غازی نہیں ہو جو ہر لاک کھول لو گے یا ان گارڈز سے ہاتھاپائی کر کے یہاں سے بھاگ جاؤ گے۔ نہ تمہیں لڑنا آتا ہے' نہ گن چلانی آتی ہے' نہ ان دروازوں کے قفل کھولنا آتے ہیں۔ فصیح نے بتایا تم نے ہاشم کے ڈاکومنٹس بھی چرائے تھے مگر تم کمپیوٹرز میں بھی اتنے اچھے نہیں ہو' ان کی ان کرپشن کو بھی نہیں کھول سکے۔ نہ تم اچھے بلیک میلر ہو۔ نہ ہی پڑھائی میں تم کوئی بہت ہی اعلا وارفع تھے۔ وہ ٹیلنٹ جو تمہارے اردگرد کے لوگوں کے پاس ہے' وہ تمہارے پاس نہیں ہے!"

سعدی کی آنکھوں میں شدید ناگواری ابھری۔

"سو تمہارا مطلب ہے' مجھے کچھ نہیں آتا۔ **ایکچوئلی** جب تمہارے باپ نے مجھے قید نہیں کیا تھا اور میں اپنی دنیا میں رہ رہا تھا' تب لوگ مجھے بہت پسند کرتے تھے۔"

"کبھی سوچا لوگ تمہیں کیوں پسند کرتے تھے؟ ہر شخص کے پاس ایک خاص ٹیلنٹ ہوتا ہے' تم لاک پکس جمع کرنا چھوڑ دو کیونکہ وہ تمہارا ٹیلنٹ نہیں ہے۔ تمہیں ایک ہی چیز کرنا آتی ہے زندگی میں اور اسی چیز کی وجہ سے لوگ تمہیں پسند کرتے ہیں۔"

سعدی کے ابرو تعجب سے اٹھے۔ "کیا؟"

"تمہاری باتیں!"

"واٹ؟" اسے عجیب سا لگا۔

"سعدی! تمہاری قائل کر لینے والی زبان ہی تمہارا سب سے بڑا ٹیلنٹ ہے۔ تم لوگوں کو کنوینس کر سکتے ہو۔"

"میں نہیں کر سکتا!" اسے خود بھی یقین نہیں آیا تھا۔

"کیوں کیا تم نے ابھی مجھے کنوینس نہیں کیا کہ ہاشم میرے پیچھے کھڑا ہے؟" وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ آبی نے سر جھٹکا۔

"آل رائٹ۔ میرا کام ختم ہوا۔ تم جانو' اور ہاشم جانے!" وہ ایک گہری سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ نظر اس پہ ڈالتی باہر نکل گئی۔

سعدی ناخوشی سے کھڑا ان ہی الفاظ کو سوچتا رہا۔

☼ ☼ ☼

اپنوں کی مشکلوں سے بوجھل سا دل ہے رہتا

اکتوبر کے وسط سے موسم بدلنے لگا تھا۔ سرما کی پہلی دستک سنائی دے رہی تھی مگر تھانے کے اندر وہی خوف' وحشت اور تشدد کا موسم تھا۔ وہ ایک کمرے میں کرسیوں پہ بیٹھے تھے۔ (زمر کی وجہ سے اس کو چند سہولتیں مل جاتی تھیں جن میں یہ وقت بے وقت کی ملاقاتیں بھی تھیں۔) وہ خاموش سنجیدہ سا آنکھیں سکیڑے کر احمر کو دیکھ رہا تھا' احمر وضاحت دے رہا تھا۔

"دیکھو مسز زمر نے واقعی مجھے ہائر کیا تھا' لیکن تمہیں پھنسانے کے لیے نہیں۔ میں کلائنٹ پریویلج کے تحت تمہیں نہیں بتا سکتا تھا۔"

"کیوں ہائر کیا تھا اس نے تمہیں؟" اس کی چبھتی نظریں احمر پہ جمی تھیں۔

"وہ تو میں تمہیں اب بھی نہیں بتا سکتا' کیونکہ یہ ورک ایتھکس کے خلاف ہے۔ اگر یہ تب غلط تھا' تو اب بھی غلط ہے۔ وہ بتا دیں تو الگ بات ہے۔ لیکن مجھے ہماری دوستی بہت عزیز ہے' اس لیے میری طرف سے اپنا دل صاف کرلو۔"

"کرلیا اور کچھ؟" اس کا لہجہ ٹھنڈا اور نگاہیں ہنوز پرُتپش تھیں۔ احمر گہری سانس لے کر پیچھے ہوا۔ پھر سوچتے ہوئے کندھے اچکائے۔

"مطلب تم واقعی سوچ سکتے ہو کہ..... مسز زمر تمہیں یوں جیل بھجوا سکتی ہیں؟"

"میں بہت کچھ سوچ سکتا ہوں۔"

"مگر انہوں نے ایسا کچھ نہیں کیا غازی۔"

"تو ثابت کرو!" وہ سپاٹ لہجے میں کہہ کر پیچھے کو ہو بیٹھا۔

احمر کی آنکھوں میں اچنبھا ابھرا۔ "کیسے؟"

"مجھے ایک شخص سے ملنا ہے۔ صرف پندرہ منٹ کے لیے....." وہ کہہ رہا تھا مگر احمر کی آنکھیں پھیلیں۔ فوراً" ہاتھ اٹھا کر روکا۔

"دیکھو غازی! میں بے شک پرزن رائٹس پہ یقین رکھتا ہوں لیکن یہ رائٹس سے اوپر کی بات ہے۔" پھر آواز بے چارگی سے نیچی کی۔ "یار! تم حوالات میں ہو' پندرہ منٹ کے لیے بھی ہم تمہیں یہاں سے نہیں نکال سکتے۔"

"تمہارے پاس میرے جوڈیشل ریمانڈ تک کا وقت ہے۔ دو ہفتے!" انگلیوں کی وی بنا کر دکھائی۔ "مجھے اس شخص کے پاس جانا ہے۔ یا تو تم اور تمہاری کلائنٹ یہ سب ارینج کرکے دو گے' یا میں خود جیل توڑ کر چلا جاؤں گا' کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ کون سا آپشن بہتر ہے' اپنی کلائنٹ سے پوچھ کر بتا دینا۔"

وہ جتنی سنگینی اور قطعیت سے کہہ رہا تھا' احمر بے بسی سے اسے دیکھے گیا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے سوچا تھا کہ پرزن رائٹس جائیں جہنم میں' ارے ان قیدیوں کو تو الٹا لٹکا کر درے مارے جانے چاہئیں۔

"کون ہے وہ شخص؟"

اس نے جیسے ہار پوچھا تھا۔

☆ ☆ ☆

کئی بار دکھایا ہے ہمیں آئینہ وقت نے
ڈرتے جو ہار سے ہم' بے کار بن کر جیتے

انیکسی کے برآمدے میں نوواردِ سرما کی شام چھائی تھی۔ وہ نہیں تھا تو موسم کی گرم جوشی بھی ہر روز ناپید ہوتی جارہی تھی اور خوف کا کہر فضا میں رچتا بستا جارہا تھا۔ برآمدے میں آدھے بندھے گھنگریالے بالوں والی' زمر سینے پہ بازو لپیٹے کھڑی' سنجیدگی سے سامنے کھڑے' احمر کو سن رہی تھی جو بے چارگی سے کہہ رہا تھا۔

"پلیز مجھ پہ چلائیے گا مت' مجھے قانون بھی مت سمجھائیے گا' مجھے معلوم ہے یہ سب کتنا غلط ہے مگر وہ اس سے ملنا چاہتا ہے۔"

بات ختم کرکے اس نے ڈرتے ڈرتے زمر کے تاثرات دیکھے۔ وہ خاموش کھڑی تھی' چہرہ نارمل تھا۔

"وہ اس سے اب کیوں ملنا چاہتا ہے؟ اتنا عرصہ جب وہ باہر تھا' تب کیوں نہیں ملا؟"

"میں نے بھی یہی پوچھا تھا' وہ کہتا ہے کہ پہلے وہ آہستہ آہستہ کام کر رہا تھا' مگر اب وقت نہیں ہے۔" پیامبر نے ہچکچاتے ہوئے پیغام دیا۔

"ٹھیک ہے' وہ اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہے' تو ہم کروا دیں گے ملاقات!" وہ گہری سانس لے کر بولی۔ احمر کا منہ کھل گیا۔

"واٹ؟ مطلب کہ...." پھر منہ بند کیا' خفگی سے اسے دیکھا۔ "آپ کو اس کا مطالبہ برا نہیں لگا؟"

"نہیں۔ وہ سچائی جاننا چاہتا ہے' تو سچائی جاننے کا بہترین وقت دوران قید ہے۔ اگر وہ آزاد ہوتا تو پچھ کر بیٹھتا' لیکن اب اسے برداشت کرنا ہو گا۔" زمر نے شانے اچکائے۔ وہ ساری جمع تفریق کر چکی تھی۔

"یعنی آپ سچائی جانتی ہیں؟ آف کورس' یہ میرا مسئلہ نہیں ہے" وہ جلدی سے اپنی حد میں واپس آیا۔ "مگر ہم اس کو حوالات سے نکالیں اور پھر واپس کیسے لائیں گے؟ یہ بہت خطرناک ہے!"

"میں کرلوں گی' تھوڑی سی آپ کی مدد چاہیے ہو گی۔ اور ہاں.... ٹرائل کے لیے مجھے ایک انویسٹی گیٹر کی ضرورت ہے۔ پچیس ہزار فی گھنٹہ' رائٹ!" ذرا نرمی سے پوچھا۔

احمر اداسی سے مسکرایا۔ "مجھے آپ سے کوئی رقم نہیں چاہیے۔ میں صبح آؤں گا' ہم تب معاملات ڈسکس کرلیں گے۔" ذرا رکا۔ "ویسے میں وہی ہوں جس کو ایک زمانے میں آپ کورٹ میں کھڑی پراسیکیوٹ کر رہی تھیں اور...."

"احمر!" اس کی ایک نظر کافی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ اٹھائے جلدی سے بولا۔

"آف کورس آپ کو یاد ہے۔ میں چلتا ہوں۔"

تب ہی برآمدے کا دروازہ کھول کر حنین تیزی سے باہر نکلی' احمر کو دیکھ کر ٹھٹکی۔ پھر ذرا کی ذرا خفا نظر اس پہ ڈالی۔ احمر الوداعی کلمات کہہ کر برآمدے کے زینے اترنے لگا۔ مگر وہ دیکھنے کا خشمگیں سا انداز.... بار بار اس کو کھٹک رہا تھا۔

کمپنی آفس میں بیٹھے وہ اسی سوچ میں گم تھا جب فاطمہ نے اس کے سامنے کافی کا مگ رکھا۔ اور مقابل کرسی کھینچ کر بیٹھی۔ احمر نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ گلاسز لگانے والی گوری اور دلکش سی لڑکی تھی۔

"تمہارے خیال میں وہ مجھے ہر دفعہ اتنی ناگواری کیوں دکھاتی ہے؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔ فاطمہ نے گھونٹ بھرتے شانے اچکائے۔

"شاید تمہاری کسی بات سے ہرٹ ہوئی ہو۔"

"نہیں' میں نے تو دونوں دفعہ مختلف باتیں کہی تھیں۔ مگر مجھے ہمیشہ یہ لگتا ہے کہ وہ لڑکی.... سعدی کی بہن.... وہ مجھ سے.... ان سیکیور رہتی ہے' جیسے اسے مجھ سے کوئی خطرہ ہے۔" نفی میں سر ہلاتے وہ جیسے الجھا ہوا تھا۔ "اس لڑکی کے ساتھ کوئی مسئلہ ضرور ہے۔"

"احمر!" فاطمہ آگے ہوئی اور دلچسپی سے بولی۔ "اس کمپنی میں ہم نے کتنے مسئلے حل کیے ہیں۔ کوئی پزل پہلے ہم سے بچ سکا ہے کیا؟"

"نہیں!" وہ بھی دلچسپی سے آگے ہوا۔ "ایسا کرو' اس لڑکی کے بارے میں ہر معلومات مجھے ڈھونڈ کر دو' تاکہ ہم کوئی لنک جوڑ سکیں۔"

"راجر باس' لیکن ہم یہ کر کیوں رہے ہیں؟ اس کی فیملی تو تمہاری دوست ہے نا۔"

"ہاں وہ میرے دوست ہیں' لیکن میں متجسس ہوں اور جب تک میں اس کو حل نہیں کروں گا' مجھے چین نہیں ملے گا۔"

وہ بہت بے چینی سے کہہ رہا تھا۔ فاطمہ نے ٹیک لگاتے سر کو خم دیا اور کافی کے گھونٹ بھرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

گر وقت کبھی آتا باطل کی خدائی کا
ہم موت سے نہ ڈرتے' تلوار بن کر جیتے

کمرے میں ٹی وی کا بے ہنگم شور گونج رہا تھا۔ سعدی بیڈ پہ لیٹا تھا' پیر قینچی صورت بنا رکھے تھے اور عدم دلچسپی سے دیوار پہ نصب اسکرین دیکھ رہا تھا۔ دی گوسٹ اینڈ دی ڈارک نیس جو وہ کتنی ہی دفعہ گزرے برسوں میں دیکھ چکا تھا' اس قید خانے میں سخت کبیدہ خاطر لگ رہی تھی۔ (ٹی وی پہ صرف ڈی وی ڈی چلتی تھی' کوئی چینل نہیں آتا تھا۔)

اکتا کر اس نے ٹی وی بند کیا۔ کمرے کی خاموشی

عجیب لگنے لگی۔ اس نے سر ہاتھوں میں گرا لیا اور سوچنے کی کوشش کی کہ وہ اتنا بے سکون کیوں ہے؟ مگر اگلے ہی لمحے چونکا۔

"اسکرین" اسکرین میں سکون کب اور کس کو ملا تھا جو اسے ملے گا؟ بھلے وہ ٹی وی اسکرین ہو، کمپیوٹر اسکرین ہو یا موبائل اسکرین۔ اسکرین سستی، بے سکونی اور بے زاری عنایت کرتی ہے اگر یہ اللہ کے ذکر سے خالی ہو! وہ اٹھا اور باتھ روم چلا گیا۔ کچھ دیر بعد گیلے ہاتھ پیر اور چہرے کے ساتھ باہر نکلا اور اپنا قرآن لے کر اسٹڈی ٹیبل پہ آبیٹھا۔

"پتا ہے کیا اللہ تعالیٰ، اس اسکرین کی نماز اور قرآن کے ساتھ ہمیشہ ایک جنگ چھڑی رہتی ہے۔ جتنی زیادہ ہمارے زندگیوں میں "اسکرین" آتی ہے، اتنی ہماری نماز کم ہوتی ہے۔ اور جتنی نماز آتی ہے، اتنی ہی اسکرین خود بخود جانے لگتی ہے۔ ہم بیک وقت دو دل نہیں رکھ سکتے۔ حیا سے عاری دل، اور مومن کا دل، یہ ایک سینے میں ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ خیر، آج کون سی سورۃ پڑھوں؟"

اس نے صفحے پلٹتے سوچا۔ وہی بے ترتیب قرآن کی روٹین۔ وہ چند سورتیں آگے پیچھے سے پڑھتا تھا۔ آج بھی اس نے النمل کھول کر تعوذ اور تسمیہ پڑھا۔

"میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں دھتکارے ہوئے شیطان سے۔ شروع اللہ کے نام سے جو بہت مہربان، بار بار رحم کرنے والا ہے۔"

اس نے آیات دیکھیں۔ ملکہ سبا کو سلیمان علیہ السلام کا خط مل چکا تھا اور اس کو پڑھنے کے بعد کا قصہ کچھ یوں تھا۔

"وہ کہنے لگی۔ اے سردارو! مجھے میرے کام میں مشورہ دو، تمہارے حاضر ہوتے ہوئے میں خود سے کوئی قطعی فیصلہ نہیں کرنے والی۔ انہوں نے کہا۔ ہم قوت والے ہیں، اور سخت زور والے ہیں، اور معاملہ تمہارے ہاتھ میں ہے، تو دیکھ لو کہ تم کیا حکم دیتی ہو؟"

"سو کیا مطلب ہوا ان آیات کا؟" سعدی دانت سے نچلا لب دبائے سوچنے لگا۔

"سلیمان علیہ السلام کے مکتوب کریم جس میں لکھا تھا کہ میرے پاس مطیع و فرماں بردار بن کر چلی آؤ۔ اس کے بعد ملکہ اپنے سرداروں سے مشورہ لیتی ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ مشورے کے لیے یہاں پر "افتونی" کا لفظ استعمال ہے، یعنی مجھے فتویٰ دو۔ اللہ تعالیٰ آپ نے "مشورے" کا لفظ نہیں استعمال کیا۔ فتوے کا کیا۔ فتویٰ کہتے ہیں کسی مشکل مسئلے کے جواب کو۔ مجھے اس سے یہ سمجھ میں آیا ہے کہ فتویٰ "جواب" ہوتا ہے۔ جب مانگا جائے تب دیا جائے۔ یہ نہیں کہ جگہ جگہ اٹھتے بیٹھتے، ہم ہر کسی پہ فتوے لگاتے جائیں اور ملکہ کا قصہ ایک طرف، ہمارے ہاں ہر گلی کا مولوی، اور ہر یونیورسٹی کا اسلامک پروفیسر بھی فتوے لگا دیتا ہے، جبکہ اسلام میں ہر کوئی فتوے دینے کا اہل نہیں ہوتا ہے۔ مفتی کا مقام حاصل کرنے کے لیے خاص تقاضے پورے کرنے ہوتے ہیں۔"

وہ کہہ رہا تھا اور کمرے کا وحشت ناک سناٹا اب آہستہ آہستہ سکینت بھری خاموشی میں بدل رہا تھا۔

"ویسے انسان کو ہمیشہ مشورہ کرنا چاہیے، مشورہ انسان کو رسوائی سے بچا لیتا ہے۔ بہترین مشورہ اللہ سے مشورہ ہوتا ہے اور بہترین فتویٰ دل کا فتویٰ ہوتا ہے، آخری فتویٰ۔ خیر۔"

اس نے صفحے کو دیکھا۔

"ملکہ نے مشورہ مانگا تو سردار ان قوم نے اپنی طاقت بھی واضح کر دی اور آخری فیصلہ بھی ملکہ کے ہاتھ میں دے دیا۔ پھر آگے کیا ہوا؟" وہ پڑھنے لگا۔

"وہ کہنے لگی کہ بے شک جب بادشاہ کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو وہاں فساد کرتے ہیں، اور وہاں کے رہنے والے عزت دار لوگوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔ اور وہ اسی طرح کیا کرتے ہیں۔" سعدی کو کچھ یاد آیا۔

"اللہ تعالیٰ، یہ آخری الفاظ "اور وہ اسی طرح کیا کرتے ہیں" ان کے بارے میں دو آراء ہیں نا۔ پہلی رائے یہ ہے کہ یہ ملکہ کا ہی قول ہے، مگر مجھے دوسری رائے زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا تبصرہ ہے ملکہ کی بات پہ، کہ واقعی، طاقت کے نشے میں گم

لوگ دوسروں کی عزتوں کی پروا کہاں کرتے ہیں۔"

کمرے کی وحشت کسی حد تک کم ہو چلی تھی۔ اس کا منتشر ذہن دھیرے دھیرے 'کئی دن بعد' فوکس کر پا رہا تھا۔ وہ عربی میں اگلی آیات پڑھنے لگا۔

"اور بے شک میں بھیجنے والی ہوں ان (سلیمان) کی طرف ایک ہدیہ۔ پھر دیکھتی ہوں کہ ہمارے قاصد کس چیز کے ساتھ لوٹتے ہیں۔"

"واہ ملکہ۔ مشورہ آپ نے ضرور مانگا سرداران قوم سے 'لیکن آخر میں کی تو آپ نے اپنی ہی مرضی۔" اس نے سوچا۔

"مجھے ہمیشہ یہ آیات پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ ملکہ ایک تو اپنے سرداروں کو چیک کر رہی تھی' دوسرا وہ جنگ کے بجائے امن کے پیغام کو جسٹی فائی بھی کر رہی تھی۔ چیونٹیوں کی ملکہ کی طرح وہ بھی اپنی قوم کے لیے مخلص تھی' اور سب کا سوچتی تھی۔ وہ قطعی فیصلہ کر سکتی تھی' مگر تھی وہ ایک عورت ہی' اس کو ایک فیصلہ لینے سے پہلے بھی بہت سے لوگوں کو اس فیصلے کی وضاحتیں اور صفائیاں دینا تھیں۔ وہ ملکہ ہو کر بھی چیونٹی تھی' مگر وہ درست تھی۔ عورت اگر کبھی خاندان میں دب بھی جائے' جارحیت کا جواب بھی صلح صفائی سے دے' اور بظاہر چیونٹیوں کی طرح اندھی اور خاموش زندگی بھی گزار رہی ہو' تو وہ بھی کوئی بری بات نہیں ہوتی۔ بہت سے لوگوں کے سکون کے لیے اپنی انا کی قربانی دینا برا کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟"

سعدی نے سر جھٹکا اور توجہ اگلی آیات کی طرف مرکوز کی۔

"تو جب وہ (قاصد) آئے سلیمان کے پاس (تحفے لے کر) تو وہ کہنے لگے۔ "کیا تم مال کے ذریعے میری مدد کرنا چاہتے ہو؟ تو جو اللہ نے مجھے عطا کر رکھا ہے' وہ اس سے بہتر ہے جو اس نے تم کو عطا کر رکھا ہے۔ بلکہ اپنے تحفوں کے ساتھ تم خود ہی خوش ہوتے ہو۔ واپس جاؤ ان کے پاس' ورنہ البتہ ہم ضرور ان کے پاس ایسے لشکر لائیں گے جن کے مقابلے کی طاقت ان میں نہ ہوگی۔ اور ہم ان کو ان کی بستی سے ذلیل کر کے نکالیں گے اور وہ پست ہو کر رہیں گے۔"

"سبحان اللہ!" سعدی نے گہری سانس لی۔ "تحفے تحائف دینا پسندیدہ عمل ہے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم دیا بھی کرتے تھے' لیا بھی کرتے تھے۔ مگر سلیمان علیہ السلام نے کیوں یہ تحفہ قبول نہیں کیا؟ کیونکہ یہ رشوت تھی۔ رشوت اس شے کو کہا جاتا ہے جو جائز کو ناجائز یا ناجائز کو جائز بنانے کے لیے دی یا لی جائے۔ ملکہ کا تحفے بھیجنا اس امر کی نشان دہی تھا کہ وہ معاملہ خوشامد سے رفع دفع کرنا چاہتی تھی۔ مگر سلیمان علیہ السلام ایسے پھندوں میں نہیں آتے تھے۔" وہ رکا۔

"مگر وہ کیوں نہیں آتے تھے ایسے پھندوں میں؟ کیا اس لیے کہ وہ پیغمبر تھے؟ نہیں' بلکہ اس لیے کہ..... کہ....."

اس نے آیت میں ہی جواب ڈھونڈا۔

"اس لیے کہ انہوں نے اپنی نعمتوں کے بارے میں اعتراف کیا کہ یہ مجھے عطا کی ہیں اللہ نے۔ اور یہاں ان کے لاؤ لشکر' جنات' پرواز کی سواریاں مراد نہیں ہیں۔ یہاں مراد ہے' پیغمبری۔ کتاب کا علم۔ اللہ کا قرب۔ تو جو اللہ کے آگے سجدے میں سر رکھتا ہو' اس کا سر ان پھندوں میں نہیں پھنستا۔ ان کی یہ ساری شان' یہ انکار' یہ طریقہ' یہ ان کے اصولوں کی وجہ سے تھا۔ اور اللہ' یہ تو مجھے کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ کوئی پیغمبر کسی کو ذلیل نہیں کر سکتا' یہاں ذلیل کرنے اور پست کرنے سے مراد جنگ کی خونریزی ہے۔ سلیمان علیہ السلام ملکہ کے پورے ملک کے عوام کی آخرت کی فکر کر رہے تھے۔ اگر ملکہ اور سرداران قوم نے اسی طرح پورے ملک کو سورج کی پرستش پہ لگائے رکھا تو اس قوم کو درست راہ دکھانے کے لیے حکمران طبقے کو جنگ کے ذریعے ملک سے نکالنا بھی غلط کام نہ تھا۔"

وہ آیات اتنی دلچسپ تھیں کہ سعدی کو وقت گزرنے کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ حالانکہ اسے سب یاد تھا کہ آگے کیا ہوگا' مگر قرآن ہر دفعہ انسان پہ نئے طریقے سے کھلتا ہے۔ اب سلیمان علیہ السلام کے

دربار کا منظر بتایا جا رہا تھا۔

"سلیمان علیہ السلام نے کہا۔

"اے سردارو' کون ہے تم میں سے جو ان کے مطیع ہو کر آنے سے قبل اس (ملکہ) کا تخت اٹھا کر میرے پاس آئے۔" وہ لحظہ بھر کو ٹھہرا اور مسکرایا۔

"ملکہ نے بھی کہا یاایھاالملو (اے سردارو) سلیمان علیہ السلام نے بھی کہا' یاایھاالملو (اے سردارو) ملکہ نے بھی ان کی قوت چیک کی' سلیمان علیہ السلام نے بھی ان کی طاقت جانچنی چاہی' مگر دونوں کا انداز مختلف تھا۔ سلیمان علیہ السلام نے مشورہ نہیں مانگا' رائے نہیں مانگی' صرف جواب مانگا' کیونکہ جو وہ کرنے جا رہے تھے' وہ نبوت کا معجزہ تھا اور کچھ معاملے ایسے ہوتے ہیں جہاں آپ کو دوسروں کی آرا کے اثر سے نکل کر فیصلے کرنے ہوتے ہیں۔ سلیمان علیہ السلام نے بھی اپنی مرضی کی' ملکہ نے بھی اپنی مرضی کی' مگر مجھے ہمیشہ لگتا ہے کہ چونکہ وہ ایک عورت تھیں' اسی لیے اس کو صفائی اور وضاحتیں دینا پڑ رہی تھی۔" پھر اگلے الفاظ پہ نظر دوڑائی۔

"کہا جنات میں سے ایک عفریت (دیو) نے' میں اس (تخت) کو لاؤں گا تیرے پاس تیرے اس جگہ سے اٹھنے سے قبل' اور بے شک میں اس پہ قوی اور امین ہوں۔"

"کس جگہ سے اٹھنے سے قبل؟" سعدی نے آنکھیں بند کر کے یاد کرنا چاہا۔ چونکہ وہ عربی کا قرآن تھا' تفسیر لکھی ہوئی نہ تھی' اور دوردن سے اسکرین دیکھ دیکھ کر فوکس کم ہوتا جا رہا تھا۔ سو یہ وقت یاد آیا۔

"سلیمان علیہ السلام" کا دربار صبح سے نصف النہار تک لگا کرتا تھا' جن کا مطلب تھا کہ دربار ختم ہونے سے پہلے لے آؤں گا۔ فلسطین' جہاں سلیمان علیہ السلام تھے' سے قوم سبا کے ملک کا فاصلہ ہزاروں میل پہ محیط تھا۔ وہ جن اس کو چند گھنٹے میں عبور کر سکتا تھا' مگر اس بے چارے کو بھی اس ہدہد کی طرح اپنی امانت کی صفائی دینی پڑ رہی ہے کہ میں اس تخت کے ہیرے موتیوں سے کچھ چراؤں گا نہیں۔ سلیمان علیہ السلام کا

کتنا رعب تھا اپنی رعیت پہ۔ حضرت عمر بن خطاب فرماتے تھے کہ جو زیادہ ہنستا ہے اس کا رعب کم ہو جاتا ہے۔ مگر اپنے بڑوں کی ساری باتیں' ہمیں عین موقعے پہ کیوں بھول جاتی ہیں؟"

گردن جھکائے رکھنے سے اس کی گردن دکھنے لگی تھی' مگر یہ طے تھا کہ پڑھتے وقت' اس کو آگے پیچھے کا ہوش نہیں ہو سکتا تھا۔

"کہا اس شخص نے' جس کے پاس کتاب کا علم تھا' میں لاؤں گا اس (تخت) کو تیرے پاس تیرے پلک جھپکنے سے بھی پہلے۔" (سعدی کو محسوس ہوا' اس کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے)۔ "پھر جب دیکھا سلیمان علیہ السلام نے اس تخت کو اپنے پاس رکھا ہوا' تو کہا کہ یہ میرے رب کا فضل ہے' تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ کیا میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں۔ اور جو شکر کرتا ہے' تو یقیناً" وہ شکر کرتا ہے اپنی ہی ذات کے لیے اور جو (یعنی کفران نعمت یا ناشکری) کرتا ہے' تو میرا رب تو بہت بے نیاز' بہت عزت والا ہے۔"

سعدی نے ہلکی سی جھرجھری لی۔ ہونٹ سکیڑ کر سانس خارج کی۔

"یہ شخص کون تھا اور اس کے پاس کون سی کتاب کا علم تھا؟ آپ نے ہمیں یہ سب نہیں بتایا اللہ' بعض کہتے ہیں یہ خود سلیمان علیہ السلام ہی تھے مگر یہ قول کمزور ہے۔ زیادہ بہتر رائے ہے کہ یہ ایک انسان تھا' اسرائیلیات اس کا نام آصف بتاتی ہیں' اس کے پاس کسی خاص کتاب کا علم تھا جو جادو نہیں تھا' اور وہ پلک جھپکتے میں تخت کو سلیمان علیہ السلام کے پاس لے آیا تھا۔ لوگوں کو عموماً" یہ آیت بہت ہی fascinate (فیسی نیٹ) کرتی ہے۔ مجھے اس سے اگلے الفاظ زیادہ فیسی نیٹ کرتے ہیں۔ پلک جھپکتے میں ہزاروں میل کا فاصلہ عبور کر کے تخت آجاتا ہے سلیمان علیہ السلام کے پاس' اور وہ کہتے ہیں یہ میرے رب کا فضل ہے۔ ہمارے پاس جب پلک جھپکتے میں ہزاروں میل دور سے کوئی ای میل' کوئی فیکس' کوئی ویڈیو کال آجاتی ہے' تو تو ہم کہتے ہیں' یہ سائنس کا فضل ہے' اسکائپ

کا فضل ہے' اسکائپ کا فضل ہے۔ وائی فائی کا فضل ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ سلیمان نے اس ذی علم شخص کی تعریف نہیں کی ہوگی' یقیناً' کی ہوگی مگر پہلی تعریف اللہ کی بیان کی۔ یہ سب سائنس کے کرشمے ہیں' اسکائپ' وائی فائی' سب' لیکن ہم' پہلی تعریف اللہ کی بیان نہیں کرتے۔ اللہ ہمیں نعمتوں سے اس لیے نہیں نوازتا کہ ہم بہت نیک ہوتے ہیں' بلکہ اس لیے نوازتا ہے کہ ہم ان کے بعد بھی نیک رہتے ہیں یا نہیں۔ ذکر نعمتوں کی حفاظت کرتا ہے' اور شکر نعمتوں کو بڑھاتا ہے۔ اور اگر کوئی ناشکری کرے' اور اللہ آپ نے ناشکری کے لیے ''کفر'' کا لفظ استعمال کیا' تو اللہ ناشکروں سے بے نیاز ہے' اور ان کی تعریف کے بغیر بھی اتنا ہی باعزت ہے۔''

وہ عموماً'' اتنی لمبی سوچ بچار نہیں کیا کرتا تھا' مگر فی الحال اس قصے کو بیچ میں ادھورا چھوڑنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ کمرے میں چھائی ٹی وی کی نحوست وقت' اور قید کا احساس' سب ختم ہو کر رہ گیا تھا۔

''سلیمان نے فرمایا' بدل ڈالو اس کے لیے اس کا تخت' ہم دیکھتے ہیں کہ وہ (ملکہ) ہدایت پاتی ہے یا بے ہدایت لوگوں میں سے ہو جاتی ہے؟ تو جب وہ آگئی' اس سے پوچھا گیا' کیا اسی طرح ہے تیرا تخت؟ بولی۔

''گویا کہ یہ وہی ہے۔ اور ہم دیے گئے علم اس سے پہلے ہی اور ہم تھے اطاعت گزار۔''

''ان الفاظ میں کتنی وسعت ہے نا اللہ۔ ان کے بارے میں بھی دو آرا ہیں' ایک یہ کہ یہ پوری سطر ملکہ کا کلام ہے' دوسری یہ کہ ملکہ نے صرف تذبذب سے صرف اتنا کہا ''گویا کہ یہ وہی ہے۔'' صاف پہچانا بھی نہیں' صاف انکار بھی نہیں کیا' اور آگے کے الفاظ سلیمان علیہ السلام کے ہیں۔ یہ مجھے زیادہ بہتر رائے لگتی ہے۔ کاش قرآن پڑھنے والوں میں بھی اتنی ہی وسعت آجائے جتنی قرآن کی آیات میں ہے۔''

اس نے توجہ اگلے الفاظ کی طرف مبذول کی جہاں اللہ تعالیٰ فرما رہا تھا۔

''اور روکا تھا (ملکہ) کو اس (سورج) نے جس کی وہ عبادت کرتی تھی اللہ کے سوا۔ بے شک وہ کافروں میں سے تھی۔''

''روکا تھا؟'' وہ ایک دم چونکا۔ ''اللہ کی عبادت کرنے سے آپ کو کیا چیز روکتی ہے؟ فجر کے وقت آپ کی آنکھوں پہ کیا چیز بوجھ ڈالتی ہے اور اٹھنے نہیں دیتی؟ صرف نیند میں اتنی طاقت نہیں ہوتی۔ یہ وہ چیزیں ہوتی ہیں جن کی آپ اللہ کے سوا عبادت کرتے ہیں۔ عبادت کہتے ہیں' عاجزی و انکساری سے کسی کے سامنے جھک جانے کو۔ مجھے یاد آرہا ہے اللہ' آپ نے ایک قرآن میں بتوں کی عبادت کرنے والوں کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں کہ ''کیوں ہو تم ان کے آگے جم کے بیٹھنے والے۔'' تو جس بری چیز کے آگے ہم جم کو بیٹھتے ہیں ہمبھوت' مسحور' سحر زدہ' سے وہ ہمارے معبود ہوتے ہیں۔''

پلٹ کر ایک خفا نگاہ ٹی وی کی تاریک اسکرین پہ ڈالی۔

''اور جتنی زیادہ ان معبودوں کی مداخلت زندگی میں بڑھے گی' اتنی نماز کم ہوگی' یہ تو طے ہے۔'' پھر اس نے دھیان آج کے سبق کی آخری آیت پہ لگایا۔

''کہا گیا' ملکہ سے' داخل ہو جا محل میں (جو شیشوں کا بنا تھا) تو جب اس نے دیکھا (اس شیشے کے فرش کو) سمجھی اس کو حوض' اور پنڈلیوں سے (لباس) اوپر اٹھا لیا تو فرمایا سلیمان علیہ السلام نے' بے شک وہ ایک محل ہے چکنا شیشے کا بنا۔ تو کہنے لگی' اے میرے رب بے شک میں نے ظلم کیا اپنی جان پر اور میں اسلام لاتی ہوں سلیمان کے ساتھ' اللہ رب العالمین کے لیے!''

''شیشے کا محل!'' سعدی نے ٹھنڈی سانس بھرتے مقدس کتاب بند کی۔ ''کہتے ہیں اس محل کا کرسٹل کلیئر گلاس کا فرش تھا اور اس کے نیچے پانی بہتا تھا۔ ملکہ جو پہلے ہی اتنی متاثر ہو چکی تھی' اس اعجاز کو دیکھ کر تسلیم کرنے پہ مجبور ہو گئی کہ سلیمان علیہ السلام' اللہ کے رسول ہیں' اور جس شے پہ وہ ہیں' وہ ٹھیک ہے' اور اس کی ساری زندگی کی عبادت اور ریاضت غلط تھی۔ میں نے اللہ تعالیٰ اس آیت سے ہمیشہ ایک بات

محسوس کی ہے۔ دین کی تبلیغ کرنے کے لیے صرف تقریر نہیں کرنی ہوتی' دوسروں کو متاثر بھی کرنا ہوتا ہے۔ سلیمان علیہ السلام نے پرندے کے ذریعے خط' تخت کو لے آنے اور شفاف شیشے کے محل سے ملکہ کو متاثر کیا' کیونکہ سلیمان علیہ السلام کا معجزہ جنات' چرند پرند اور ایسی مخلوقات اور علوم کا مسخر کرنا تھا۔ انہوں نے اپنے معجزے سے ملکہ کو متاثر کیا۔ یہ قصہ پڑھ کر میرے جیسا عام انسان تھوڑا احساس کمتری کا شکار ہوجاتا ہے۔ بھئی ہمارے پاس تو نہیں ہیں شیشے کے محل' اور جنات کے لشکر' اڑنے والے تخت' دربار اور بادشاہی۔ مگر۔ ہمارا معجزہ یہ شان و شوکت ہے بھی نہیں۔ ہماری امت کا معجزہ ہے ''قرآن'' اور ہمیں قرآن سے لوگوں کو متاثر اور مسحور کرنا ہوگا۔ کبھی قرآن سنا کر اور کبھی خود چلتا پھرتا قرآن بن کر۔ تب ہماری تبلیغ دھیان سے سنی جائے گی۔''

نظریں جھکا کر ہاتھ اٹھا کر وہ اب دعا مانگنے لگا۔ چونکہ تلاوت ختم ہوچکی تھی تو کمرے کی وحشت ویسی ہی محسوس ہونے لگی۔ گو کہ وہ پہلے سے بہت کم تھی۔ مگر وہ وہاں موجود تھی' یہ چیزیں تیزی سے ختم نہیں ہوا کرتیں۔

سعدی نے نوٹ بک اٹھائی اور اس پہ وہی الفاظ لکھے جو فارس نے لکھے تھے۔ Haman۔

سلیمان علیہ السلام نے ملکہ کے ملک کے لوگوں کی دنیا و آخرت بچائی اپنی ''نعمت'' استعمال کرکے۔ اس کو اپنی جان بچانی تھی اپنا ٹیلنٹ استعمال کرکے۔ اور وہ سرخ اسکارف والی لڑکی ٹھیک کہتی تھی۔ اس کو صرف ایک چیز یہاں سے نکال سکتی تھی۔ اس کی زبان۔

ایک عزم کے ساتھ اس نے ان حروف پہ کانٹا لگایا۔ مگر یہ صرف کانٹا نہیں تھا۔

یہ صلیب تھی!

☆ ☆ ☆

یہ اداسیوں کے موسم یونہی رائیگاں نہ جائیں

کسی یاد کو پکارو' کسی درد کو جگاؤ

سرما دھیرے دھیرے شہر کو لپیٹ میں لے رہا تھا۔ انیکسی میں عجیب ہو کا عالم تھا۔ اسامہ ٹی وی سے بیزار کونے میں اسکول کا کام لیے بیٹھا تھا۔ ابا کمرے میں لیٹے تھے۔ ندرت نے ریسٹورنٹ جانا چھوڑ رکھا تھا' وہیں کچن میں گول میز پہ بے خیال' کھوئی کھوئی سی بیٹھی رہتیں۔ روز زمر سے کہتیں ان کو فارس سے ملنا ہے' پھر خود ہی ارادہ بدل دیتیں۔ ان کی نمازیں لمبی ہوگئی تھیں۔ باتیں گھٹ گئی تھیں۔ سب کے کمروں کی ترتیب بھی بدل گئی تھی۔ صداقت اب ابا کے ساتھ سوتا تھا' سیم اوپر ندرت کے ساتھ' اور حنین زمر کے ساتھ۔ کون کس سے خوف زدہ تھا' یا کون کس کا خیال رکھنا چاہ رہا تھا' یہ سوچنے کے دن نہیں رہے تھے۔

حنہ اس وقت نیچے تہہ خانہ میں تھی۔ اوپر زمر کے کمرے کی بتی مدھم تھی اور اندر وہ چہرے کے گرد دوپٹہ لپیٹے بیٹھی نماز پڑھ رہی تھی۔ سلام پھیر کر اس نے خالی خالی نظروں سے ویران کمرے کو دیکھا۔ خالی صوفے کو دیکھا۔ اس کی ان چھوئی الماری کو دیکھا۔ وہ ہوتا تھا تو اس کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ نہیں تھا تو ہر شے گواہی دے رہی تھی کہ وہ نہیں ہے۔ کیسے اس کے خاندان نے چار سال گزارے ہوں گے اس کے بغیر؟ زمر کا سر جھک گیا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے ہاتھ پیالہ سوالی کی صورت اٹھائے۔

''میں نے بہت غلط کیا اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ۔ وہ بے گناہ تھا مگر میں نے اس کا اعتبار نہیں کیا۔ میں نے اس کو اس جہنم سے نہیں نکالا۔ میں کیسے اس احساس جرم سے نکلوں؟ وہ اچھا انسان ہے مگر مجھے اس سے کوئی محبت' کوئی نفرت کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں' دل میں' میں اب بھی اسے پسند نہیں کرتی۔ مگر مجھے اس سے ہمدردی ہے۔ پلیز میری مدد کریں۔ کوئی راستہ نکالیں۔ مجھ سے بات کریں۔''

آنسو ٹپ ٹپ آنکھوں سے گر رہے تھے۔ دل بھی دکھی تھا۔ تب ہی سیڑھیاں چڑھنے کی آواز آئی' اور وہ

اپنے خاندان کے ہر بندے کی مختلف چاپ پہچانتی تھی۔ فوراً" آنکھیں رگڑیں۔

دروازہ کھلا اور حنین اندر داخل ہوئی۔ پھر بیڈ پہ گرنے کے سے انداز میں لیٹ گئی۔ دفعتاً" گردن اونچی کر کے اسے دیکھا۔ وہ جائے نماز تہ کر کے کھڑی ہو رہی تھی۔

"میں کتنی دیر پہلے آئی تھی' آپ تب بھی نماز پڑھ رہی تھیں۔"

"اتنا وقت تو لگ ہی جاتا ہے۔" وہ رسان سے کہتی میز پہ جائے نماز رکھ کر دوپٹے کو کھولنے لگی۔ حنہ کہنی کے بل اونچی ہوئی' اور ہتھیلی تلے گال رکھ کر اسے دیکھا۔

"آپ اتنی لمبی نماز میں کیا پڑھتی ہیں؟"

"ساری مسنون دعائیں!" وہ رخ موڑے کھڑی اب دوپٹے سے بال آزاد کر رہی تھی۔

"کون سی ساری دعائیں؟ میں تو سبحنک اللھم پڑھتی ہوں' پھر سورہ فاتحہ' پھر قل ہو اللہ' پھر رکوع سجدہ التحیات' درود' رب اجعلنی اور پھر سلام۔"

منٹ بھر میں حنہ کی نماز ختم ہو گئی تھی۔

"تم ہر اسٹیپ کی صرف ایک دعا پڑھتی ہو؟" وہ اسی طرح رخ موڑے بال برش کرنے لگی۔

"ہاں' تو ہر اسٹیپ کی ایک ہی دعا ہوتی ہے' ہمیں مولوی صاحب نے ایسے ہی سکھائی تھی بچپن میں۔"

زمر اس کی طرف گھومی۔ آنکھوں کا گلابی پن اب کم تھا۔ "اور مولوی صاحب نے کہاں سے سیکھی تھی نماز؟"

"اپنے مولوی صاحب سے۔ سوری۔ مطلب حدیث کی کتابوں سے۔" گڑبڑا کر تصحیح کی۔

"ہم سب کو نماز سکھائی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ انہوں نے ہر اسٹیپ کی کئی دعائیں سکھائی تھیں۔ یہ بھی فرمایا کہ جو تین دفعہ سبحان ربی الاعلیٰ سجدے میں پڑھتا ہے تو اس کا سجدہ تو ہو جاتا ہے' مگر وہ ادنیٰ درجے کا ہوتا ہے۔"

"کیا مطلب؟ ہم سبحان ربی الاعلیٰ نہ پڑھا کریں؟"

"اف! میں نے یہ کب کہا نہ پڑھا کریں۔ یہ تو لازمی ہے پڑھنا۔ مگر رکوع و سجود کو "اعلا" یعنی بہترین بنانے کے لیے دوسری دعائیں بھی پڑھنی ہوتی ہیں۔ نماز ان کے بغیر بھی ہو جاتی ہے' مگر ان کے ساتھ زیادہ اچھی ہوتی ہے۔"

"دوسری دعائیں؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ایک دم پریشان۔ "ہاں بھائی بھی شاید پڑھتا تھا' مگر مولوی صاحبان کیوں پوری نماز نہیں سکھاتے!"

"کیونکہ وہ ایک چھ سال کے بچے کو ایک دم بوجھل نہیں کرنا چاہتے اور یہ گمان کرتے ہیں کہ بڑا ہو کر خود ہی سیکھ لے گا۔ یہ ساری دعائیں احادیث کی صحیح کتب میں درج ہیں جن میں کوئی شک کی گنجائش نہیں۔ مگر بڑے ہو کر کوئی نہیں سیکھتا کیونکہ نوے فیصد مسلمانوں کو علم ہی نہیں ہوتا کہ نماز کی اور دعائیں بھی ہیں۔ یا یہ کہ قل ہو اللہ کی جگہ قرآن کی دوسری سورتیں بھی پڑھی جا سکتی ہیں۔" وہ وہیں ڈریسر کے اسٹول پر بیٹھی بال برش کرتے کہہ رہی تھی۔

حنین الجھ گئی تھی۔ "تو وہ جو ہم سنتے ہیں کہ ہمارے بزرگ لمبی لمبی نمازیں پڑھتے تھے' وہ اس لیے کہ وہ ان میں تمام دعائیں پڑھتے تھے؟"

"بالکل۔"

"میں سمجھی الفاظ ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے ہوں گے۔ سوری۔" وہ ذرا شرمندہ ہوئی۔ "اچھا' مجھے بھی بتائیں' کون سی دعائیں پڑھنی ہیں۔"

"حنہ!" وہ حنہ کی طرف گھومتے اپنے مخصوص انداز میں مسکرائی۔ "تم ایک باشعور پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ تمہیں نصیحت کرنا میرا کام ہے' تمہارے منہ میں نوالے بنا کر دینا میرا کام نہیں ہے۔ میں ناصح ہوں' استاد نہیں۔ تم اگر ناولز پڑھ سکتی ہو' کمپیوٹر استعمال کر سکتی ہو' تو تم احادیث کی کتابیں بھی خود کھول کر ساری دعائیں یاد کر سکتی ہو۔ تمہیں اپنی نماز کو اعلا بنانے کے لیے خود محنت کرنی ہوگی۔"

"اچھا!" اس کا چہرہ اتر گیا۔ (ایک دو دعائیں بتا دیتیں تو کیا ہوتا؟)

"اور تم بالکل بھی نماز نہیں پڑھتی ہو حنہ۔" اس نے نرمی سے کہا تھا۔ حنین لب کاٹتے بستر پر لکیریں کھینچنے لگی۔

"دیکھیں، میں فجر پہ نہیں اٹھ پاتی۔ فجر نہ پڑھوں تو باقی پڑھنے کا کیا فائدہ؟"

"فائدے نقصان کے لیے نماز نہیں پڑھی جاتی' ایکسر سائز اور صحت کے لیے بھی نہیں پڑھی جاتی' نماز اللہ کو خود سے راضی رکھنے کے لیے پڑھی جاتی ہے۔ دیکھو حجاب کرنا یا نہ کرنا ایک اچھی مسلمان اور ایک کم اچھی مسلمان لڑکی میں فرق کرتا ہے' سچ اور جھوٹ مومن اور منافق میں فرق کرتا ہے' مگر نماز مسلمان اور کافر میں فرق کرتی ہے۔"

"یار! اب ایک دم سے مجھے کافر تو نہ بنادیں۔"

"سوری حنہ! مگر یہ بات میں نہیں کہہ رہی۔ یہ حدیث کی کتابوں میں لکھی ہے۔ نماز کے بغیر ہم مسلمان کیسے ہوسکتے ہیں؟"

"مگر زمر! مجھ سے فجر پہ نہیں اٹھا جاتا۔ آپ کو لگتا ہے کہ میں کوشش نہیں کرتی؟ کرتی ہوں۔ الارم بجتا ہے' امی بھائی سب اٹھاتے ہیں۔ میں نہیں نہیں اٹھ سکتی۔" وہ روہانسی ہوئی۔

"الارم کلاک باتھ روم میں رکھ کر سویا کرو۔ اٹھ جاؤ گی۔" ایک وقت کے لیے اتنی نصیحت کافی تھی' وہ بال لپیٹتے اٹھی۔ "اب بتاؤ' جو کام میں نے تمہیں دیا تھا' وہ کرلو گی؟ اچھا اب یوں دل مسوس کر نہ بیٹھو' تمہیں تو اتنی ساری قرآن کی سورتیں حفظ ہیں' جب تک نماز کی دعائیں نہیں ملتیں' ان ہی کو سورہ اخلاص کی جگہ پڑھ لیا کرو۔ یاد تو ہیں ناں؟"

"وہ؟" وہ چونکی۔ "جی جی یاد ہیں۔" جلدی سے نگاہیں جھکائیں اور ٹیبلٹ سامنے کرلیا۔

ایک حافظ قرآن کے لیے کسی دوسرے کو یہ بتانا یا سمجھانا کہ وہ قرآن بھول چکا ہے' بہت مشکل' بہت تکلیف دہ تھا۔

☆ ☆ ☆

خود کو سنتے ہیں اس طرح جیسے
وقت کی آخری صدا ہیں ہم

اس رات سعدی اپنے کمرے میں آنکھوں پہ بازو رکھے لیٹا' نیند میں تھا جب ایک دم اس کے وجود میں بے چینی سی پھیلی۔ وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ چہرے پہ ہاتھ پھیرا۔ اف۔ دی گوسٹ اینڈ دی ڈارکنیس اتنی دفعہ دیکھنے کے باعث خواب بھی جنگلوں اور شیروں والے آرہے تھے۔ وہ فلم کا منظر مسلسل پوری رات خواب میں دیکھتا رہا تھا۔ کیا زندگی میں یہ غارت گر کم تھے جو اب خواب میں بھی ان ہی کو دیکھنا ہوگا؟ وہ دائیں جانب کروٹ لیتے' گال تلے دونوں ہاتھ رکھے' اسی فلم کی کہانی سوچنے لگا۔ وہ نیشنل جیوگرافک ٹائپ کے چینل نہیں دیکھتا تھا' اس کا خیال تھا کہ انسانوں کے مسائل زیادہ توجہ طلب ہیں۔ مسز کاردار دیکھتی تھیں ایسے شوز۔ اکثر اس کو بتایا کرتیں۔

وہ سونے کی کوشش کرتے ہوئے' آنکھیں موندے گھوم پھر کر اسی نہج پہ سوچنے لگا۔ جواہرات۔ وہ مادہ غارت گر کی کہانی۔ اور اگلی ملاقات میں اس کی اتنی بے عزتی کرنا۔ وہ میری سے بات کررہا تھا۔ ان کو اچھا نہیں لگا تھا۔ اس کا ذہن نیند میں ڈوب رہا تھا۔ میری کے الفاظ کی بازگشت ہر سو سنائی دے رہی تھی۔ وہ مجھ سے خائف رہتی تھیں سعدی! جیسے ان کو مجھ سے کوئی ڈر ہو۔ ان کی ایما پہ فیونا نے مجھے نوکری سے نکلوایا۔ آخری دفعہ میں نے ان کو دیکھا تھا۔ اورنگ زیب کے باتھ روم کے پچھلے دروازے سے نکلتے۔ پچھلے دروازے۔ بیک ڈور۔ پچھلا دروازہ۔

وہ ایک دم بجلی کی سی تیزی سے اٹھ بیٹھا۔ اس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا اور چہرے پہ پسینہ تھا۔ گھبرا کر وہ بستر سے اترا اور ساری بتیاں جلادیں۔ پیشانی پہ ہاتھ پھیرا۔ جسم کانپ رہا تھا۔

پھر جلدی سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ چست گارڈ نے فوراً کھولا۔

"میری کو بلاؤ۔" وہ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ گارڈ نے آواز دی۔ میری نیند سے بھری آنکھوں سے بھاگتی آئی۔

"کیا ہوا؟" وہ پریشان ہوگئی تھی۔ سعدی نے اسے اندر آنے دیا اور پھر دروازہ بند کردیا۔

"اس کمرے میں کوئی سننے کا آلہ' کوئی ریکارڈر تو نہیں ہے نا؟"

"نہیں۔ یہ لوگ اتنے فارغ نہیں ہیں کہ تمہاری باتیں سنیں۔ کیا ہوا ہے؟"

"تم نے مسز کاردار کو اورنگ زیب کاردار کے باتھ روم سے نکلتے دیکھا تھا؟" وہ سانس روک کے اس کو دیکھتے پوچھ رہا تھا۔

میری کے چہرے کا رنگ بدلا۔ آہستہ سے صوفے پہ بیٹھی۔ "ہاں۔"

وہ تیزی سے اس کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھا۔

"اگر مسز کاردار کے وہاں سے نکلتے وقت اورنگ زیب زندہ تھے تو انہوں نے وہ دروازہ ضرور لاک کیا ہوگا۔ میں نے سنا تھا' ہاشم نے باتھ روم کا دروازہ توڑ کر مردہ باپ کو وہاں سے نکالا تھا۔ یاد کرو میری! یاد کرو۔ دروازہ توڑنے سے پہلے پچھلا دروازہ چیک کیا تھا کسی نے؟"

"وہ لاکڈ تھا۔" میری خواب کی سی کیفیت میں بولی تھی۔

"کسی نے چیک کیا تھا؟ تم نے؟"

"میں کرنے لگی تھی' مگر۔ مسز کاردار نے مجھے نوشیرواں کو بلانے بھیجا' انہوں نے ہی چیک کیا تھا۔"

سعدی نے تھکی تھکی سانس اندر کھینچی۔ "اور جب دروازہ ٹوٹا تو؟"

"تو میں نے دیکھا' پچھلے دروازے کی کنڈی کھلی تھی۔ سعدی! میں فلپینو میڈ ہوں' میں گھر کے چپے چپے پہ نظر رکھتی ہوں' مجھے اچھی طرح یاد ہے' کنڈی کھلی تھی' مگر جب میں ڈاکٹر کو کال کرکے آئی تو کنڈی بند تھی۔" وہ اب بھی گویا نیند میں بول رہی تھی۔

"اور تمہیں ڈاکٹر کو کال کرنے مسز کاردار نے بھیجا ہوگا؟" میری نے اثبات میں سر ہلایا۔ سعدی اٹھا اور اسٹڈی ٹیبل کی کرسی کھینچ کر بیٹھا۔ وہ گہری سوچ میں گم لگتا تھا۔

میری جیسے نیند سے جاگی۔ "تم بھی وہی سوچ رہے ہو جو میں سوچ رہی ہوں سعدی؟"

"شش!" اس نے ہونٹوں پہ انگلی رکھی۔

"دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں میری! اور یہ بات کسی اور کو نہیں معلوم ہونا چاہیے۔" پھر انگلیاں بالوں میں پھنساتے سر نیچے گرا لیا۔ میری اب بھی بے یقین تھی' مگر وہ حیران نہیں تھی۔

"میں پچھلے ڈیڑھ دو سال سے یہی سوچتی آئی ہوں سعدی! مگر میں اتنا بڑا نتیجہ نکالنے سے ڈرتی تھی۔" اس نے جھرجھری لی۔

"تم یہاں سے نکلنا چاہتی ہو میری؟" اس نے ایک دم سر اٹھا کر پوچھا تو میری کو اس کی آنکھوں میں چمک نظر آئی تھی۔

"مجھے صرف اپنی ملازمت واپس چاہیے۔"

"ٹھیک ہے' ہم اس معلومات کو استعمال کریں گے۔"

"چھوڑو اس سب کو' سعدی! بھول جاؤ۔" وہ خائف ہوئی۔ سعدی زخمی سا مسکرایا۔

"میری! یہ طے ہے کہ ہم میں سے ایک سولی چڑھے گا اور دوسرا اپنے پرانے مقام پہ واپس آجائے گا۔ تم خطرہ مول لینے کو تیار ہو میری؟"

میری نے تذبذب سے اثبات میں سر ہلایا۔ سعدی نے سر پھر سے ہاتھوں میں گرا لیا۔ نیند جانے کتنے دن کے لیے اڑ چکی تھی۔ اسے ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ دو سال کیوں نہ سمجھ سکا؟

☼ ☼ ☼

ان ہی خوش گمانیوں میں کہیں جان سے بھی نہ جاؤ

وہ جو چارہ گر نہیں ہے اسے زخم بھی کیوں دکھاؤ؟

سرما کی اس سہ پہر ملاقاتی کمرے میں وہ جیسے ہی داخل ہوا' نگاہ سامنے بیٹھی سارہ اور ادل پہ پڑی۔ فارس کی آنکھوں میں تفکر ابھرا۔ زمر کا ایک اور احسان کہ سپاہیوں نے انہیں اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ سارہ نے سر اٹھا

کر اسے دیکھا۔ سفید دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ زرد سا لگتا تھا۔ سر کے خم سے سلام کیا۔ اہل بھاگتی ہوئی آگے آئی اور اس سے لپٹ گئی۔ اس نے جھک کر اسے گلے لگایا' پھر ساتھ لیے سامنے آبیٹھا۔ وہ خوش نہیں لگ رہا تھا۔

"آپ کو ادھر نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"تمہیں لگتا ہے ہمیں آنا چاہتی تھی؟" سارہ کی آنکھوں میں شکوہ ابھرا۔ "اہل پاگل ہو رہی تھی تمہارے لیے۔ یہ پہلی دفعہ نہیں ہے جب تم اسے چھوڑ کر گئے ہو۔" نہ گلہ نہ شکوہ۔ بس وہ دکھی تھی۔

فارس کے چہرے کا تناؤ قدرے کم ہوا۔ گردن جھکا کر دیکھا۔ وہ بالوں کی اونچی پونی باندھے' ٹھوڑی سینے سے لگائے' اس کے ہاتھ کے زخم کے نشان پہ انگلی پھیر رہی تھی۔

"آپ کیسی ہیں؟" نگاہیں اٹھا کر سنجیدگی مگر نرمی سے سارہ کو مخاطب کیا۔

"تم جیل میں ہو ہم سب کیسے ہو سکتے ہیں۔ تم باہر تھے تو ایک سکون تھا' پتا نہیں کس چیز کا مگر سکون تھا' اب نہیں رہا۔"

"میں غصہ ہوں' میں خفا ہوں تم پہ فارس!" وہ بے بس سی اس کو دیکھ کر کہہ رہی تھی جس کی شیو ذرا بڑھی تھی' اور ہونٹوں پہ کٹ کا نشان تھا' مگر آنکھوں میں وہی سپاٹ پن تھا۔ "کیوں بار بار مصیبت میں پھنس جاتے ہو؟ ہمیں کب یقین ہو گا کہ تم اب ہمیں چھوڑ کر نہیں جاؤ گے؟"

وہ ہلکا سا مسکرایا۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا سارہ۔"

"پتا نہیں سب کب ٹھیک ہو گا۔ جو سعدی کے ساتھ ہوا' جس طرح ان لوگوں نے اس کو گولیاں ماریں' پھر اس کو جانوروں کی طرح پیٹا۔" سارہ کی آنکھیں بولتے بولتے گلابی ہوئیں۔ "پھر اس کو اغوا کر کے لے گئے۔ یہ سب پتا نہیں اب کس کس کے ساتھ دہرایا جائے گا۔"

پھر سر جھٹکتے ہوئے ایک پیکٹ اہل کی طرف بڑھایا۔ "اہل! دو چاچو کو۔" اور وہ جو سارہ کی بات پہ ایک دم سے اسے دیکھنے لگ گیا تھا' ذرا چونکا۔ اہل نے فوراً" پیکٹ تھاما اور اس کو تھمایا۔

"یہ بابا کا سویٹر ہے۔ ماما نے کہا' سردی بڑھ گئی ہے بارشوں کے بعد سے' تو آپ کو چاہیے ہو گا۔" وہ شرما کر کہہ رہی تھی۔ فارس نے ایک نظر ہاتھ سے بنے بھورے سویٹر کو دیکھا' پھر اس کے سر کے بال ہولے سے تھپکے۔ بولا کچھ نہیں۔

"اپنا خیال رکھنا فارس!" وہ اب جانے کے لیے اٹھ رہی تھی۔ فارس بھی کھڑا ہو گیا۔

"عجیب بات ہے سارہ! سعدی کے بارے میں سوشل میڈیا' پولیس' رپورٹرز' سب نے کہا تھا کہ اسے "پہلے" مارا پیٹا گیا' گولی "بعد" میں ماری گئی' کیونکہ گولیاں عموماً" آخر میں ہی ماری جاتی ہیں' مگر اس کے ڈاکٹر نے ایک دن یونہی مجھے بتایا کہ ایسا لگتا ہے جیسے اسے "پہلے" گولیاں ماری گئیں' پھر مار پیٹ کی گئی۔"

"اس میں عجیب کیا ہے؟" وہ واقعی نہیں سمجھی تھی۔ فارس اس کی آنکھوں کا رنگ دیکھتے ہوئے ہلکا سا مسکرایا۔

"صرف یہی کہ آپ کو بھی درست ترتیب معلوم ہے۔" سارہ کا سانس ایک دم تھم گیا۔

"نہیں' میں تو بنا سوچے بول رہی تھی۔ اب تو اپنی کہی باتیں خود بھی نہیں یاد رہتیں۔" بہ دقت مسکرائی۔

"آف کورس' میں تو یونہی کہہ رہا تھا۔" فارس نے سر کو خم دے کر احترام سے اس کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔

☆ ☆ ☆

سارہ کے جانے کے تقریباً" آدھے گھنٹے بعد وہ زمر کے ساتھ اسی کمرے میں بیٹھا تھا۔ سارہ کے برعکس وہ جو اس ماحول کی عادی تھی' سامنے بیٹھی سنجیدگی سے نوٹ پیڈ پہ قلم گھسیٹتی اسے کل کا لائحہ عمل لکھ کر بتا رہی تھی۔ (دیواروں کے کانوں کی کیا خبر) ساتھ ہی بار بار شیشے کی چھوٹی بوتل سے پانی کا گھونٹ بھی بھرتی

اور رکھ دیتی۔

"چونکہ بدقسمتی سے میں تمہاری وکیل ہوں' اس لیے اپنے اور قمرالدین صاحب کے تعلقات کی تفصیل بتاؤ مجھے۔"

"مجھے یاد نہیں۔" وہ بے زاری سے سر جھٹک کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"فارس! ایسے نہیں چلے گا۔ میں تمہارا کیس کیسے لڑوں گی جب تم مجھے کچھ بتاؤ گے ہی نہیں؟"

"تو مت لڑیں۔ میں نے نہیں کہا لڑنے کو۔" اس نے سنجیدگی سے اسے دیکھتے شانے اچکائے۔ زمر نے بمشکل ضبط کیا۔

"میری بھی مجبوری ہے فارس غازی! کیونکہ میں نہیں بھولی کہ ہم ایک ٹیم ہیں! اس لیے مجھے کچھ تو بتاؤ تاکہ میں ٹرائل کی تیاری کر سکوں۔"

وہ ٹیک لگائے' ٹانگ پہ ٹانگ جمائے' اسے دیکھتا رہا۔ "مجھے یاد نہیں۔"

"پھر سڑو حوالات میں!" وہ کھول کر اٹھی' شیشے کی بوتل' اور فائلز اٹھائیں اور دروازے کی طرف بڑھی۔

"جیسے اس ملک میں واقعی قانون نام کی کوئی چیز ہے۔" وہ سر جھٹک کر بڑبڑایا تھا۔

زمر دروازے پہ رکی۔ مڑی نہیں۔ "کیا کہا تم نے؟"

"جائیں زمر بی بی! میرے پاس آپ سے بحث کرنے کا وقت نہیں ہے۔" اس نے ناک سے مکھی اڑائی۔

زمر دو قدم آگے آئی' فائلز میز پہ دھریں' اور غرائی۔ "میں نے پوچھا۔ کیا۔ کہا تم نے؟"

"میں نے کہا' جیسے اس ملک میں واقعی قانون نام کی کوئی چیز ہے۔"

زمر کے کان سرخ پڑ گئے' چہرہ دہکنے لگا۔ خالی ہاتھ اور بوتل والا ہاتھ میز پہ رکھ کر آگے کو جھکی۔

"کیسے کہہ سکتے ہو تم کہ اس ملک میں قانون نہیں ہے؟ اس ملک میں کوئی قانون پہ چلنے والا نہیں ہے؟ اگر اس ملک میں کوئی ایمان دار نہ ہوتا تو تمہارا بھائی کیسے ایمان دار تھا؟ یہ ملک زندہ کیسے ہے اگر اس میں قانون نہ ہو؟ اور پلیز' مت شروع کرنا میرے سامنے اپنے ٹرائل کا ذکر۔ ہاں ٹھیک ہے' نہیں ہوا تمہارا فیئر ٹرائل' تم بری بھی بلیک میلنگ کے ذریعے ہوئے تھے۔ تمہیں "انصاف" نہیں ملا عدالت سے' لیکن اپنے اس بددماغ سے دماغ میں یہ بات بٹھالو فارس غازی! کہ اس ملک' بلکہ دنیا کے ہر ملک کی عدالتیں "انصاف کی عدالتیں" نہیں ہوتیں' وہ "قانون کی عدالتیں" ہوتی ہیں۔ اگر اس ملک میں قانون نہ ہوتا تو مجرموں کو ملک سے راتوں رات بھاگنا نہ پڑتا' لوگ گواہوں کو نہ خریدتے' پاسپورٹ پہ بیک ڈیٹ میں ایگزٹ اسٹیمپ نہ لگاتے۔ اگر اس ملک میں قانون نہ ہوتا تو مجرم دھڑلے سے جرم کر کے عدالت میں تسلیم بھی کر لیتے مگر کوئی... کوئی نہیں تسلیم کرتا عدالت میں' کیونکہ اسے پتا ہے اگر تسلیم کرلیا تو فیصلہ قانون کے مطابق ہوگا۔ اسی ملک میں عدالتوں نے کئی دفعہ ہر خطرے' اور ہر دھمکی سے بے خوف ہو کر بڑے بڑے نڈر فیصلے بھی کیے ہیں۔ اسی ملک میں بڑے بڑے لوگوں کو ان چھوٹے چھوٹے ججز نے جیل بھیجا ہے۔ اگر اس ملک میں قانون نہ ہوتا تو کوئی ایک شخص بھی رات کو سو نہ سکتا' مگر ہم سب سوتے ہیں' کیونکہ سب کو معلوم ہے کہ ابھی اتنی بھی اندھیر نگری نہیں مچی۔ قانون کمزور ہے' بے بس ہے' مکروہ "ہے"۔ وہ ہے تب ہی تو اس سے گلہ ہے۔ اس ملک میں۔ فارس غازی۔ قانون۔ ہے۔ اور چاہے تم اسے مانو یا نہ مانو۔ وہ قانون' مجھ سے' تم سے' ہم سب سے اوپر ہے۔ اس لیے آئندہ میرے سامنے یہ کہنے کی ہمت نہ کرنا کہ اس ملک میں قانون نہیں ہے۔ سنا تم نے؟ سنا تم نے؟"

بے ربط سانسوں کے درمیان غصے اور برہمی سے غراتے وہ کہہ رہی تھی اور وہ خاموشی سے اسے دیکھتا سن رہا تھا' جب زور کا چھناکا ہوا۔ زمر نے جو کانچ کی

نازک بول بے حد سختی سے بھینچ رکھی تھی' وہ اس کے ہاتھ میں ٹوٹ گئی تھی۔ "آہ"۔ وہ ایک دم پیچھے کو ہوئی۔ چھن چھن' ٹکڑے نیچے گرے۔

وہ تیزی سے اس کی طرف لپکا اور اس کا ہاتھ پکڑا۔ کانچ اندر بھی لگا تھا اور خون بھل بھل گر رہا تھا۔ تیز تیز سانس لیتی زمر نے ناراضی سے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی' مگر اس نے دوسرے ہاتھ سے اس کی کلائی بھی پکڑلی' پھر ایک خفا نظر زمر کے دہکتے گلابی چہرے پہ ڈال کر آہستہ سے کانچ نکالنے لگا۔ درد کی شدت سے اس نے آنکھیں بند کرلیں پھر فورا" کھول دیں کہ ان میں پانی در آیا تھا۔

"یہی چاہتے تھے نا تم' کہ میں تمہارے سامنے ٹوٹوں؟ رووں؟" آنسو اندر اتارتی وہ اسی برہمی سے بولی تو آواز بھیگی ہوئی تھی۔

فارس نے کانچ نکالتے چونک کر اسے دیکھا' اور جیسے کچھ کہنے لگا تھا۔ جیسے انکار کرنے لگا تھا' مگر پھر خاموشی سے سر جھکائے کانچ نکالا۔ خون ایک دم تیزی سے بہنے لگا تھا۔ ہتھیلی کے عین وسط میں کٹ لگا تھا۔ اس نے ادھر ادھر کسی چیز کی تلاش میں دیکھا' مگر کچھ بھی نہ تھا' تو ایک ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑے' دوسرا ہاتھ ہتھیلی پہ رکھ کر دبایا۔ اس کے اپنے ہاتھ بھی خون آلود ہونے لگے۔ چند بوندیں نیچے بھی گری تھیں۔

دونوں اسی طرح چند لمحے کھڑے رہے' پھر اس نے نظر اٹھا کر دیکھا' وہ ان ہی گلہ آمیز نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ایک طرف میرے زخموں پر مرہم لگاتے ہو' کہتے ہو کہ میں روڈ' Bossy' غصہ ور اچھی لگتی ہوں' روتے ہوئے نہیں' اور دوسری طرف کہتے ہو۔ مجھے گرا ہوا' ٹوٹا ہوا' رسوا اور ذلیل ہوا دیکھنا چاہتے ہو؟ ان میں سچ کون سا ہے؟"

وہ اسی طرح زخم پہ ہاتھ رکھے کھڑا تھا اور وہ پوچھ رہی تھی۔

"اگر وہ ریسٹورنٹ والی باتیں سچ تھیں' تو پچھلی ہر بات جھوٹ تھی' یہ بھی جھوٹ ہے۔" اس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا' مگر اس نے مزید مضبوطی سے پکڑلیا۔

"اونہوں' ایک منٹ۔ خون رکنے دیں۔"

"پتا ہے کیا فارس!" وہ اسی شاکی انداز میں بولی تھی۔ "تم دو دلوں کے ساتھ جی رہے ہو۔ ایک میں زرتاشہ سے محبت نہ کرنے کا گلٹ (احساس ندامت) ہے' ایک میں مجھ سے بہت زیادہ محبت کرلینے کا گلٹ ہے۔ تمہارے یہ دونوں دل جھوٹ بولتے ہیں۔ زرتاشہ سے محبت تھی تمہیں' اور تمہاری سوچ سے زیادہ ہی تھی۔ یہ صرف گلٹ نہیں ہے' جس کی وجہ سے لڑ رہے ہو اس کے لیے۔ اور رہی میں!"

اس نے بھیگی پلکیں بند کرکے آنسو اندر اتارے اور جب آنکھیں کھولیں تو وہ خشک تھیں۔

"تو مجھ سے تمہیں زرتاشہ سے کئی گنا زیادہ محبت ہے' مگر وہ اتنی اونچی اور عظیم نہیں ہے کہ تم اس میں ہر چیز معاف کردو۔ نہ وہ اتنی کمزور اور کھوکھلی ہے کہ تم اس میں مجھے گرا ہوا دیکھنے کی خواہش کرو۔ اللہ نے نہیں بنائے کسی آدمی کے سینے میں دو دل۔ تمہیں اپنے دل کو ایک جگہ ایک طرف رکھنا ہوگا اور خود سے سچ بولنا پڑے گا۔"

فارس چند لمحے اسے دیکھتا رہا' دیکھتا رہا۔ پھر چہرہ جھکائے اپنا ہاتھ ہٹا کر دیکھا' ہتھیلی کے کٹ سے بہتا خون رک چکا تھا۔ اسی طرح اس نے زمر کا ہاتھ اوپر کیا' اور لبوں سے لگایا۔ آنکھیں بند کیے۔ چند لمحے' چند سانسیں۔ پھر چھوڑ دیا۔ اور دو قدم پیچھے ہٹا۔ "اپنا خیال رکھا کریں۔"

"یہ بھی جھوٹ ہے۔" زمر نے دکھ سے اسے دیکھا' اور اپنی چیزیں اٹھائے باہر نکل گئی۔

پھر الٹے قدموں واپس آئی' اور ادھ کھلا دروازہ زور سے دے مارنے کے انداز میں بند کیا۔ اس کی دھمک اب کتنی ہی دیر دونوں کے کانوں میں گونجتی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ کہانیاں ادھوری' جو نہ ہوسکیں گی پوری
انہیں میں بھی کیوں سناؤں' انہیں تم بھی کیوں سناؤ؟

اسپتال کے پرائیویٹ رومز کی راہداری میں سفید بتیاں روشن تھیں۔ چمکتے فرش پہ ان تینوں کا عکس نظر آرہا تھا۔ سفید اوور آل پہنے' موٹا چشمہ لگائے اور بال جوڑے میں باندھے حنین ایک فربہی مائل نرس سے بات کررہی تھی۔ تب ہی سیم نے اسے فکر مندی سے دیکھا۔

"حنہ! تم ویسے کرلوگی جیسے پھپھو نے کہا ہے۔"

"ہاں۔ مسئلہ ہی نہیں ہے۔" حنہ نے شانے اچکائے' فولڈر سنبھالا' عینک ناک پہ پیچھے دھکیلی اور سیم کو وہیں چھوڑ کر نرس کے ساتھ آگے چلی گئی۔

اسپتال کی وبا اور شفا سے رچی بسی فضا میں لمحے خاموشی سے پھسلتے رہے۔ ایک کمرے میں بیڈ کی پائنتی پہ بیٹھی حنین' اب گلاسز اتارے سامنے نیم دراز سنہرے بالوں والی لڑکی کو دیکھ کر اسی اعتماد سے کہہ رہی تھی۔

"آپ ساری تفصیل سن چکی ہیں' شنزا! میں ڈاکٹر نہیں ہوں' آپ سے ملنے کے لیے یہ کرنا پڑا کیونکہ باہر سیکورٹی بہت ہے۔ یہ میرے بھائی کے کیس کی تفصیلات ہیں۔"

اس نے فائل کھول کر شنزا ملک کے سامنے کی۔ وہ پیچھے کو ہوئی' بالوں میں ہیئر بینڈ لگائے' نقاہت زدہ مگر سپاٹ نظروں سے حنہ کو دیکھ رہی تھی۔

"وہ بھی اغوا ہوا تھا آپ کی طرح۔ آپ مل گئیں' وہ نہیں ملا۔ اس کو اغوا کرنے والا نیاز بیگ۔ میری فیملی کو اسے جیل میں رکھنے کے لیے آپ کے کیس کو وجہ بنانا پڑا۔ تب آپ کوما میں تھیں۔ شکر ہے کہ اب آپ ٹھیک ہیں۔" اس نے گہری سانس لی۔

شنزا اب بھی خاموش تھی۔ نرس دروازے پہ بے چین سی کھڑی تھی۔

"ایک ہفتہ آپ کو ہوش میں آئے ہوگیا ہے' لیکن آپ اپنے مجرموں کے بارے میں کوئی بیان نہیں دے رہیں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ خوف زدہ ہیں۔ آپ بہت ٹارچر سے گزرہی ہیں۔ ہم بھی گزر رہے ہیں۔ اسی لیے صرف اتنا چاہتے ہیں کہ اپنے مجرموں کا نام آپ لیں یا نہ لیں' لیکن اس شخص نیاز بیگ کو جیل سے نہ نکلنے دیں' تاکہ کل کو کوئی اور شنزا یا سعدی کو نہ اغوا کیا جاسکے اور ہاں....." اس نے اضافہ کیا۔ "آپ کو اپنے مجرموں کے خلاف کوئی مدد چاہیے ہو تو ہم آپ کے ساتھ ہیں۔"

گویا دیوار سے بولتے بولتے وہ چپ ہوگئی۔ اب مزید کیا کہے۔

"تمہیں پتا ہے' دنیا میں کتنی آوازیں ہوتی ہیں؟" وہ حنہ کے چہرے پہ نظریں جمائے تلخی سے گویا ہوئی۔

حنین کے ابرو تعجب سے اکٹھے ہوئے۔ "مسوری' میں....."

"ان گنت۔ دنیا میں ان گنت آوازیں ہوتی ہیں۔ جسم کے پتھریلی زمین پہ گھسیٹنے کی آواز' کمر سے پتھر رگڑنے کی خراشوں کی آواز.... سوکھے پتوں اور جھاڑیوں پہ کھینچے جانے کی آواز.... بیچ جنگل کے آپ کو لا پٹخنے کی آواز.... پھر گڑھا کھودنے کی.... مٹی باہر پھینکنے کی آواز.... بالوں سے کھینچ کر گڑھے میں ڈالنے کی آواز.... ہاتھوں سے مٹی اوپر ڈالنے کی آواز.... مٹی کے اوپر پتے ڈالنے کی.... پھر سوکھے چرمرتوں پہ دور جاتے بھاری بوٹس کی آواز.... پھر جنگل کی خاموشی کی آواز.... زندہ قبر کے اوپر سانپ رینگنے کی آواز.... پرندوں کے ایک دم سے درختوں سے اڑ جانے کی.... جنگلی سوروں کی آواز.... ان کے آپ کے اوپر پتوں کو سونگھتے پھرنے کی آواز.... کتوں کی آواز.... کیڑوں کے جسم پہ رینگنے کی آواز.... خنزیروں کی بدبودار سانسوں کی آواز.... رات کی تاریکی کی ہولناک آواز.... گدھوں کے اوپر منڈلانے کی آواز.... پھر دور کہیں انسانوں کی آواز.... خنزیروں کے بھاگ جانے کی آواز.... آتے قدموں کی آواز.... تمہیں پتا ہے دنیا میں کتنی آوازیں ہوتی ہیں؟"

وہ پتھریلے چہرے اور سرخ آنکھوں کے ساتھ کہہ رہی تھی اور حنین بالکل ساکت لب کھولے سن رہی تھی۔

"میں نے بہت سی آوازیں سنی ہیں' اس جنگل میں نیم مردہ حالت میں پڑے۔ میں اس لیے خاموش نہیں ہوں کہ میں خوف زدہ ہوں یا میرے ذہن پہ اثر ہو گیا ہے۔ مجھے تمہاری یا تمہارے بھائی کی مدد کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے' کیونکہ کوئی بھی حتیٰ کہ بھائی بھی اس قابل نہیں ہوتے کہ ان کے لیے کچھ کیا جائے۔ تم جا سکتی ہو۔"

ہکا بکا بیٹھی حنہ ایک دم اٹھی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ بے ترتیب سانسوں اور سفید چہرے کے ساتھ وہ تیز تیز چلتی راہداری کا موڑ مڑی تو سیم انتظار کر رہا تھا۔

"تم نے کر لیا' حنہ؟" وہ آگے چلتی گئی۔ سیم پیچھے لپکا۔ حنین نفی میں سر ہلاتی تیز تیز چلتی جا رہی تھی۔ سیم دیکھ سکتا تھا کہ وہ جس چہرے کے ساتھ گئی تھی' اس کے ساتھ واپس نہیں لوٹی تھی۔

✡ ✡ ✡

عداوت ہی عداوت ہے' محبت بھول بیٹھا ہوں
چلو کوئی تو رشتہ ہے اسے پھر یاد کرنے کو

زمر کے جانے کے بعد سے وہ لاک اپ میں قید تھا۔ دیوار کے ساتھ اکڑوں بیٹھے گہری سوچ میں گم۔ بار بار اس کی زرد رنگت نگاہوں میں گھومتی تھی۔

(تم مجھے ٹوٹا ہوا دیکھنا چاہتے ہو نا!) فارس نے سر جھٹکا۔

"ہاں' میں ایسا ہی دیکھنا چاہتا ہوں آپ کو۔" اس نے آنکھیں بند کیں۔ ذہن کے پردے پہ ایک منظر سا سوچنا چاہا۔ اس کی فرضی خواہش کا منظر..... مگر پھر تکلیف سے آنکھیں کھول دیں۔

یہ تصور ہی تھا جو وہ چاہتا تھا' پھر اس کو سوچ کر دکھ کیوں ہوتا تھا؟ خوشی تو زمر کے الزام اور ان تمام طنز و طعنے بھری باتوں سے بھی نہیں ہوتی تھی' اصولاً" تو اس ٹوٹی پھوٹی شرمندہ لڑکی کو تصور میں دیکھ کر خوشی ہونا چاہیے تھی' مگر نہیں ہوتی تھی۔ اسی لیے تو کی تھی اس سے شادی' وہ اس کو خود اذیتی کا شکار کرے گا' ضمیر کی ملامت سے گھیر لے گا' پھر یہ سوچ کر خوشی یا تسکین کیوں نہیں ملتی تھی؟ کیا وجوہات وہی تھیں جو وہ سوچتا تھا؟ یا جو وہ سوچتا تھا' وہ صرف توجیہات تھیں؟

حوالات کی سیاہ سلاخوں کے پار مدھم روشنی تھی۔ اس روشنی کو بے خیالی سے دیکھتے فارس غازی کا ذہن ایک دفعہ پھر پیچھے چلا گیا۔

ولایت بیگم کا گھر اس نے کیوں چھوڑا تھا؟ وہ کیوں ایک رات گھر سے نکلا تھا؟ وہ چاہتا بھی تو نہ بھلا سکتا تھا۔

لڑائی ہوئی تھی گھر میں۔ ہوتی پہلے بھی تھی' مگر اس رات کچن میں کسی بات پہ اونچا اونچا بولتے' جھگڑتے ولایت بیگم نے ہاتھ مار کر سالن کا ڈونگا گرایا تھا اور گرم گرم سالن سیدھا اس کی ماں کے پیروں پہ گرا تھا۔ سانحہ یہ نہیں تھا۔ سانحہ یہ تھا کہ اس کا باپ تب بھی کمزوروں کی طرح ولایت بیگم کو منانے اور ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ غصہ فارس کے اندر ابل ابل رہا تھا۔ وہ کمرے میں بیٹھی' پیر کے آبلوں پر مرہم لگاتی علیمہ کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ وہ اب ادھر نہیں رہیں گے' وہ اس کے ساتھ واپس چلے' مگر علیمہ اس کو صبر' تحمل اور برداشت کا درس دیتی رہی۔ وہ بھی ایک کمزور عورت تھی۔ ٹوٹی' پسی ہوئی عورت جو کبھی ظلم کے خلاف نہیں کھڑی ہو گی۔

اس وقت اس کے نزدیک یہ سب ظلم ہی تھا اور اپنی ماں سے پہلی دفعہ وہ دل برداشتہ ہوا تھا۔ پیر میں جوتی تھی یا نہیں' وہ وہاں سے نکل بھاگا۔ طویل سرد سڑکوں پہ وہ چلتا رہا' چلتا رہا۔ کیسے قصر کاردار پہنچا' کچھ یاد نہیں۔ جواہرات نے اس کو اپنے گھر میں پناہ دی' پیروں پہ مرہم لگایا اور پھر اس کے ماں باپ کو بلا لیا۔ جانے کس نے طے کیا' مگر اس کے بعد علیمہ ادھر ہی انیکسی میں رہنے لگی۔ وہ ماں سے خفا تھا۔ وقت کے ساتھ خفگی ڈھل گئی' مگر دل کا کانٹا ساری زندگی نہیں نکلا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اسے بھی دل میں باتیں

رکھ کر نہ نکالنے کی بیماری ہے۔

ولایت بیگم کی وفات کے بعد ندرت اور وارث کو ابو انیکسی میں لے آئے۔ علیمہ کا رویہ ان کے ساتھ عجیب سا تھا۔ ولایت بیگم کے گھر میں وہ بے بس ہوتی تھی' یہاں وہ مالکن تھی۔ ظلم نہیں کرتی تھی' ہر شے مہیا کرتی تھی' ہر سہولت' ہر آسائش' مگر ان سے بات نہیں کرتی تھی۔

ندرت کے اپنے غم بہت تھے۔ شادی کے بعد شوہر سے ناراضی اور شیر خوار بچے کو سسرال والوں کے رحم و کرم پہ چھوڑ آنے کا غم' وہ بہت دکھی رہتی تھی۔ وارث خاموش رہتا تھا۔ جیسے نہ کسی سے محبت ہو' نہ کسی سے گلہ۔ پھر آہستہ آہستہ وقت بدلا۔ ندرت اس کے کام کرنے لگی۔ اس کا خیال رکھنے لگی۔ وہ چھوٹا تھا' وارث سے بھی کافی چھوٹا' ندرت کو اس میں سعدی نظر آنے لگا تھا۔ وہ کبھی کبھی بے خیالی میں اسے سعدی بھی پکار لیتی' وہ برا مانے بغیر چپ چاپ آجاتا تھا۔ اس کی تصحیح نہیں کرتا تھا۔

وارث عینک لگاتا تھا۔ پڑھتے وقت بھی' ٹی وی دیکھتے وقت بھی۔ سرما کی ایک شام وہ انیکسی کے لاؤنج میں بیٹھے تھے' جب ابو نے وارث سے کوئی شے ڈھونڈنے کو کہا' تو وہ جو بغیر عینک کے بیٹھا تھا' سادگی سے بولا کہ اس کی عینک ٹوٹ گئی ہے' وہ نہیں ڈھونڈ سکتا۔

ابو نے وہی کام فارس سے کہہ دیا۔ فارس خاموشی سے اٹھا اور اندر گیا۔ واپس آیا تو ہاتھ میں وارث کی عینک تھی' جس کے شیشے نکلے ہوئے تھے۔ عینک اس نے وارث کے سامنے رکھی۔

"اس کے شیشے ہوتے' تب بھی وہ زیرو نمبر کے تھے۔ ان سے تمہاری نظر پہ کوئی فرق نہ پڑتا۔ جاؤ اور جو ابو نے کہا ہے' وہ ڈھونڈ کر لاؤ۔"

اس نے یہ الفاظ بہت آہستہ سے کہے تھے۔ ٹی وی کا شور تھا اور ابو دور تھے' سن نہ سکے۔ وارث کا رنگ سفید پڑا۔ اس کی چوری پکڑی گئی تھی۔ اس وقت تو وہ چپ چاپ اٹھ گیا' لیکن رات کو اس کے ساتھ والے سنگل بیڈ پہ لیٹے اس نے پوچھا تھا۔

"تمہیں کیسے پتا کہ میری نظر کمزور نہیں ہے؟"

"مجھے پتا ہے۔" وہ چت لیٹے لیٹے چھت کو دیکھتے بولا تھا۔

"میں اس لیے لگاتا ہوں کیونکہ مجھے عینک اچھی لگتی ہے۔" کچھ دیر بعد اس نے خود ہی وضاحت دی۔ فارس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا' وہ کہنا چاہتا تھا کہ یہ تم پہ اچھی نہیں لگتی' اس سے تمہاری آنکھیں اندر کو دھنس جائیں گی' مگر اس نے وارث کا چہرہ دیکھا اور اس کا دل نہیں چاہا کہ وہ اس کی خوشی چھین لے۔

"ہاں' یہ تم پہ اچھی لگتی ہے۔" اس دن کے بعد ان دونوں کے پاس ایک دوسرے سے کرنے کے لیے بہت سی باتیں ہوتی تھیں۔ وارث اس کا دوست بن گیا' وہ کبھی کبھی اس کو ڈانٹ بھی دیتا تھا' جب اسکول میں فارس کسی سے لڑ کر' کسی کا دانت توڑ کر آتا' تو وارث غصے سے اس کو کالر سے پکڑ کر جھنجھوڑتا۔

"یوں لڑتے رہو گے لوگوں سے تو جیل میں پڑے ہو گے کسی دن۔"

اور اب فارس سوچتا تھا کہ وہ جیل اس لیے گیا تھا کیونکہ اس دفعہ وارث لڑا تھا!

امی کی وفات کے بعد اس کا دل دنیا سے اُچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ سارا سارا دن سڑکوں پہ آوارہ پھرتا رہتا تھا۔ بے مقصد' بے رونق زندگی کو ایک دم وہ صرف گزارنے لگا تھا۔ کبھی دوستوں کے ساتھ کسی طرف نکل گیا۔ تو کبھی اکیلا کسی ٹرین میں بیٹھ گیا۔ وارث لاہور میں تھا' ندرت اپنے گھر میں خوش اور ابو کو وفات پائے تو عرصہ بیت چکا تھا۔ فارس کی زندگی میں اکتاہٹ' بے گانگی بڑھ گئی تھی۔ اس کا دل پڑھائی میں نہیں لگتا تھا۔ کچھ دوستوں کے ساتھ وہ شکار پہ جانے لگا تھا۔ ماں باپ کا چھوڑا ہوا پیسہ وہ جھونکتا جا رہا تھا۔ وہ گنز' وہ خوب صورت گنز جن کو ہاتھ میں پکڑ کر تاک کر کسی پرندے کی طرف نشانہ باندھنے کی کیفیت اور سرور ہی کچھ اور ہوتا تھا۔ وہ گنز اس کا جنون بنتی گئیں۔

ندرت اس کی حالت اور یہ آوارگی دیکھ کر اسے اپنے ساتھ لے آئیں۔ عام حالات میں وہ بہن کے گھر

جا کر نہ رہتا مگر اپنے گھر میں ذہن ایسا پراگندہ رہتا تھا کہ وحشت ہونے لگتی۔ حنہ تب تین سال کی تھی۔ سعدی اسکول جاتا تھا' ایک وہی ہوتی تھی جو دن رات اس کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتی تھی۔ اتنا بولتی کہ الاماں۔ یہ کیوں ہے؟ یہ کیا ہے؟ وہ کبھی زچ ہو جاتا' کبھی ہنس دیتا۔ زندگی ان ہی دو انتہاؤں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔

وہ پڑھائی میں ہر گزرتے دن کے ساتھ نکما ہوتا جا رہا تھا۔ دور کے شہروں' جنگل' بیابانوں میں جاتا' کئی کئی دن گھر نہ لوٹتا' عجیب تھی اس کی زندگی بھی۔ وارث فون پہ غصہ کرتا رہتا' وہ فون بند کر دیتا۔ ندرت پیار سے سمجھاتیں' وہ دوسرے کان سے نکال دیتا۔

پھر ایک دن ندرت کے سسر آئے۔ پتا نہیں ندرت نے ان سے کیا کہا تھا کہ جب وہ ان کے پاس اکیلا' چپ اور بیزار سا بیٹھا تھا' تو وہ اس سے باتوں باتوں میں پوچھنے لگے۔

"تم کیا کرو گے آگے؟ کیریئر کے حوالے سے؟"

"جس چیز کا موڈ بنا۔" اسے لگا ابھی لیکچر شروع ہو گا' سو مزید اکتا گیا۔

"تمہاری زندگی میں ترجیحات کیا ہیں؟"

"کیا؟" وہ واقعی الجھا تھا۔

"تمہاری ترجیحات؟ کس کو سب سے اوپر رکھتے ہو؟ کس کے لیے سب کچھ کر سکتے ہو؟"

فارس لمحے بھر کو چپ ہوا۔ "اپنے خاندان کے لیے۔"

"وہ تو ابھی ہے نہیں۔"

"ہے تو سہی۔"

"خاندان بیوی اور بچوں کا نام ہوتا ہے۔ میں جو اتنے استحقاق سے اس گھر میں آتا ہوں' اس لیے کہ یہ میرے بیٹے کا گھر ہے۔ کیا میں اپنے بھائی یا بہن کے گھر اتنے استحقاق سے جا سکتا ہوں؟ حکم چلا سکتا ہوں؟ نہیں۔ وہ بھی میرا خاندان ہیں' لیکن اس عمر میں آ کر بیوی بچے سب سے پہلے آتے ہیں۔ تم کیا چاہتے ہو زندگی میں؟"

وہ متذبذب رہا۔ زیادہ بات نہیں کر سکا' مگر چند دن وہ سوچتا رہا۔ پھر ایک دن وہ ان کے گھر گیا۔ معلوم ہوا تھا کہ ان کی بیٹی کا جہیز جل گیا ہے' بہت نقصان ہوا ہے۔ وہ افسوس کے لیے گیا تھا' مگر ان کے پاس بیٹھے' اس نے ان سے کہا تھا۔

"میری ترجیحات ایک سادہ زندگی کی ہیں۔ میری بیوی' میرے بچے' ایک چھوٹا سا گھر' جس میں کوئی پیچیدگیاں نہ ہوں۔ کوئی سازشیں' کوئی منافقت' کوئی دوسری بیوی کے جھگڑے نہ ہوں۔ ایک سادہ زندگی گزاروں میں۔ نائن ٹو فائیو کی جاب اور گھر کا سکون۔ یہی چاہتا ہوں میں۔"

"پھر محنت کرو۔ اپنی بیوی اور بچوں کا سوچ کر محنت کرو' کہ تم ان کو کیا دے سکتے ہو۔"

اور اس گفتگو نے فارس کی سوچ بدل دی تھی۔ وہ جیسے کسی لمبے خواب سے جاگا تھا۔

آنے والے سالوں میں خود پر خوامخواہ کے چڑھے قرضے' پڑھائی کی تکمیل' نوکری' ہر فرض کی ادائی میں ندرت کے سسر نے اس کی مدد کی تھی۔ ان سے اس کا کوئی رشتہ نہ تھا (سوائے دور پار کی رشتے داری کے) مگر احسانات بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ ان کا بہت احترام کرتا تھا۔ ان کی بات جیسے سنتا کسی اور کی نہیں سنتا تھا۔

وہ نوکری میں اچھا جا رہا تھا' سادہ زندگی سادہ ہی چل رہی تھی' لیکن پھر اسے اندرون سندھ بھیج دیا گیا۔ وارث اگلے ماہ اس سے ملنے آیا تو سخت برہم تھا۔

"تم نے مجھ سے کہا کہ تمہاری سندھ میں پوسٹنگ ہوئی ہے!"

"اور نہیں تو کیا؟"

"تم نے یہ نہیں بتایا کہ تمہیں یہاں سزا کے طور پہ بھیجا گیا ہے۔" وہ بے حد تیخ پا ہو رہا تھا۔ فارس نے ناک سے مکھی اڑائی۔

"میں نے کچھ غلط نہیں کیا تھا۔"

"یہی بات تم نے کہی تھی اپنے ڈائریکٹر سے۔ فارس! تم نے غلط کیا ہے۔ اس بینک آفیسر کے اریسٹ وارنٹ نکل رہے تھے اور تم نے اسے اطلاع دے دی

تاکہ وہ ضمانت قبل از گرفتاری کروالے!"

"پہلی بات، میں نے کوئی ثبوت چھوڑا نہیں، دوسری بات، وہ بینک آفیسر تین چھوٹی چھوٹی بیٹیوں کی ماں ہے اور بے گناہ ہے۔"

"تو وہ اس کے ٹرائل میں ثابت ہو جائے گا کہ وہ بے گناہ ہے۔ تمہیں بیچ میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"وارث! وہ ایک جوان، مڈل کلاس عورت ہے، اگر وہ بے گناہ نہ ہوتی تب بھی میں اس کو خبردار کرتا، ضمانت اس کی چوبیس گھنٹوں میں ہو ہی جاتی، لیکن اگر وہ ایک رات بھی حوالات میں گزار لیتی تو وارث اس کی زندگی برباد ہو جاتی۔ مرد کئی سال بھی جیل میں رہے تو کچھ نہیں ہوتا، عورت کو کون قبول کرے گا بعد میں؟ ہاں ٹھیک ہے میں نے جرم کیا ہے۔" وہ بھی برہمی سے بول رہا تھا۔ "لیکن مجھے دس بار ایسا موقع ملے میں تب بھی یہی کروں گا۔ کیونکہ میں اسی معاشرے میں رہتا ہوں جہاں جیل میں ایک رات بھی رہی عورت کی بیٹیوں کی شادیاں نہیں ہوپاتیں۔ میرا ضمیر مطمئن ہے کیونکہ جو قانون روٹی نہیں دے سکتا، وہ ہاتھ نہیں کاٹ سکتا۔ بھلے اس کی پاداش میں مجھے کتنے ہی سال اس چھوٹے شہر میں پوسٹڈ رہنا پڑے۔"

"فارس!" وہ تھک کر ساتھ بیٹھا اور سمجھانے لگا۔ "دیکھو "صحیح" کام کرنے کے لیے قانون توڑنا ضروری نہیں ہے۔ میں بائی دی بک کام کرنے والا آدمی ہوں، مجھے تمہارا یہ ویجیلانٹ رویہ ڈراتا ہے۔ اگر ان کو کوئی ثبوت مل جاتا تو تم جیل بھی جاسکتے تھے اور اگر تمہاری یہی حرکتیں رہیں نا تو میں اگلے پانچ سال بعد تمہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے دیکھ رہا ہوں۔" سمجھاتے سمجھاتے وہ خفا ہو گیا تھا۔

"اور پتا ہے میں تمہیں اگلے پانچ سال بعد کہاں دیکھ رہا ہوں؟" وہ آگے ہو کر سنجیدگی سے وارث کی آنکھوں میں جھانک کر بولا تھا۔ "اسی نقلی عینک کے پیچھے!" اور ایک دم وہ دونوں ہنس پڑے تھے۔

آہنی سلاخوں کو دیکھتے ہوئے وہ زخمی سا مسکرایا تھا۔ اسے جیل میں سب سے زیادہ وارث یاد آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ہو نہ سکا کبھی ہمیں اپنا خیال تک نصیب
نقش کسی خیال کا لوح خیال پر رہا

اس مصروف شاہراہ پر رات نو بجے اچھی خاصی سردی ہونے کے باوجود گہما گہمی تھی۔ ایسے میں زمر، کندھے پہ لگا پرس مضبوطی سے پکڑے، متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی چلی رہی تھی۔ پھر اسے وہ نظر آ ہی گیا۔ تیزی سے اس تک آئی۔

"احمر! مجھے دیر ہو گئی نا؟" وہ معذرت خواہانہ انداز میں جلدی جلدی کہتی قریب آئی۔ "کیا وہ لڑکا آگیا؟" احمر چونک کر مڑا پھر فخر سے سر کو خم دیا۔

"جی، اور کام بھی ہونے والا ہے۔" مسکرا کر سامنے اشارہ کیا۔ زمر نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔ وہاں ایک خوبرو نوجوان اپنے سامان کی ٹرالی لیے کھڑا تھا، اور قدرے حیرت اور تعجب سے سیکورٹی افسران سے بات کر رہا تھا جو ایک دم سے اس کو گھیر کر اس سے بازپرس کرنے لگے تھے۔ وہ صرف پولیس اہلکار نہیں تھے بلکہ کسی دوسرے محکمے کے افسران بھی تھے۔

"وہ چیزیں اس کی کار میں ڈلوادی تھیں نا احمر؟ پولیس اس کو اریسٹ کرلے گی؟" وہ فکرمندی سے بولی تھی۔

"جی جب یہ گیس بھروانے پمپ پر رکا تھا تو میرے لڑکے نے ایک بیگ اس کی گاڑی کی ڈگی میں رکھ دیا تھا۔ بیگ میں اس لڑکے کے آئی ڈی کارڈ کی کاپی اور ڈرائیونگ لائسنس کی کاپی بھی ہے۔ وہ انکار بھی کرے تب بھی وہ لوگ اس بیگ کو اسی کی ملکیت سمجھیں گے۔"

"اوکے۔ تھینک یو۔" ہر چیز پلان کے مطابق جا رہی تھی، اسے ذرا سکون ملا۔ "کافی ساری ڈرگز ڈالی ہیں نا؟"

"ڈرگز؟" احمر نے نگاہوں کا رخ موڑا۔ "کون سی

ڈرگز؟"

زمر کا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ "احمر! اس کے بیگ میں ڈرگز ڈالنے کو کہا تھا میں نے آپ کو' تاکہ پولیس اسے گرفتار کرے۔"

"میں آپ کو شکل سے کوئی ہیروئن اسمگلر لگتا ہوں یا بذات خود کوئی نشئی لگتا ہوں جو میرے پاس ڈرگز ہوں گی؟ نہیں' آج آپ مجھے بتا ہی دیں کہ میں آپ کو کیا لگتا ہوں۔" وہ بہت ہی خفا ہوا تھا۔ زمر کا دماغ ویسے ہی آج کل گھوما رہتا تھا' اب تو مزید کھول گیا۔

"احمر! آپ نے کیا ڈالا ہے اس کے بیگ میں؟" پریشانی سے ان لوگوں کو بھی دیکھا۔ آفیسرز کے پاس کتے بھی تھے اور وہ گھوم گھوم کر اس کے سامان کو سونگھ رہے تھے۔ لڑکا ابھی تک بحث کر رہا تھا۔

"دیکھیں' یہ ڈرگز' یہ اسلحہ' یہ کرنسی اسمگلنگ.... یہ میوزیم کے نوادرات سارے انگریزی فلموں والے گھسے پٹے آئیڈیاز تھے۔ میں نا بڑا اوریجنل بندہ ہوں۔ میں نے سوچا' کوئی پاکستانی چیز ٹرائی کروں۔ وہ دیکھیں۔" فخر سے مسکرا کر اس طرف اشارہ کیا۔ زمر پریشانی سے ادھر دیکھنے لگی۔ وہ لوگ اب باری باری لڑکے کے بیگز چیک کر رہے تھے۔ قلی نو دو گیارہ ہو چکا تھا۔ ایک آفیسر نے بھورا بیگ کھولا اور پھر گویا شور مچا دیا۔ باقی اہلکار بھی ادھر ہی لپکے۔ لڑکا حیران پریشان وضاحتیں دے رہا تھا۔ زمر نے ایڑیاں اونچی کر کے دیکھنا چاہا۔ بمشکل ایک افسر سامنے سے ہٹا تو کھلے بیگ کا دہانہ نظر آیا۔ اور اس کے اندر....

"کچھوے!" وہ بے یقینی سے احمر کی طرف گھومی تھی۔ "استغفراللہ احمر' آپ نے کچھوے ڈال دیے؟" دل چاہا اس کو زمین میں گاڑ دے۔

"پورے پچاس کچھوے۔" اس نے اسی تفاخر سے اس طرف اشارہ کیا۔ دور سے اتنا پتا چلتا تھا کہ اس بیگ میں چھوٹے چھوٹے' شامی کباب کے سائز کے کچھوے چل رہے تھے۔ زمر نے ماتھے کو چھوا۔

"اف احمر.... آپ کو مذاق لگتا ہے یہ سب؟"

"دیکھیں مسز زمر!" وہ سنجیدہ ہوا۔ "اگر ڈرگز ڈالتا یا اسلحہ تو وہ گرفتار ہو جاتا' لیکن صبح سے پہلے تک باہر ہوتا۔ سوائے وائلڈ لائف والوں کے کوئی بھی محکمہ اس کو کل دوپہر سے پہلے تک نہ رکھتا۔"

"کچھوے' احمر!" وہ اب بھی شدید نالاں تھی۔

"یہ وائلڈ لائف والوں کے خاص spotted کچھوے ہیں۔ صبح ہی چوری ہوئے ہیں۔" مسکرا کر آنکھ دبائی "یہ لڑکا کل سنگاپور جا رہا ہے۔ سنگاپور میں ایک کچھوا کئی ہزار کا بکتا ہے۔ وہ لوگ کچھوے کھانے کے شوقین ہیں' مگر وہاں پابندی ہے اس کے شکار پہ کیونکہ اس معصوم کی نسل ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ سو ہمارے ہاں سے لوگ اسمگل کرتے ہیں۔ بی پاکستان۔ بائی پاکستان۔"

زمر نے صرف گھور کر اسے دیکھا اور سامنے دیکھنے لگی جہاں کسٹم اور وائلڈ لائف کے اہلکار اس لڑکے کو ہتھکڑی لگا رہے تھے اور وہ مسلسل چلا رہا تھا۔ زمر کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے۔ آئیڈیا کچھ اتنا برا بھی نہ تھا' لیکن احمر شفیع کو شکریہ کہنا.... ناممکن!

وہ گھر آئی تو حنین اس کے کمرے میں چت لیٹی' چھت کو دیکھتی مایوس نظر آ رہی تھی۔ بیگ اور موبائل رکھتے ہوئے اس نے حنہ کو مخاطب کیا۔ "شہرا کا کیا بنا؟"

"میں نہیں کر سکی۔" وہ شرمندہ تھی۔

"اوکے! میں خود اس سے بات کر لوں گی۔"

حنین سیدھی اٹھ بیٹھی' بے چینی سے اسے دیکھا۔

"وہ تکلیف میں ہے' اس کو اکیلا چھوڑ دیں۔"

"حنین! اس کی صحت اب بہت بہتر ہے اور ہم اس کی مدد بھی کریں گے اس کے مجرموں کو پکڑنے کے لیے۔" وہ بالوں میں برش کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ہاتھ پہ پٹی بندھی تھی۔ حنہ کو نہیں نظر آئی۔ وہ کہیں اور تھی۔

"وہ اب بھی وہی آوازیں سنتی ہے۔ جنگل کی' جانوروں کی' خنزیروں کی اور...."

حنین ایک دم ساکت ہوئی۔ چونک کر زمر کو دیکھا۔ پھر یکایک بستر سے اتری اور ننگے پیر بھاگتی باہر نکل گئی۔

زمر سر جھٹک کر رہ گئی۔ حنہ اب تیز تیز زینے پھلانگتی تہ خانے کی طرف جا رہی تھی۔ اسے ابھی ابھی کچھ یاد آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

بے وفائی کی گھڑی' ترکِ مدارات کا وقت
اس گھڑی اپنے سوا نہ یاد آئے گا کوئی

عالیشان' بلند و بالا سا بنگلہ تھا جس میں صبح کی ٹھنڈ اور سرما کی دھوپ مل جل کر آ ٹھہری تھیں۔ ملازم حنین کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلے گئے تھے۔ وہ شنزا کی دوست تھی' اس نے یہی کہا تھا۔ اس روز کے برعکس' وہ کھلے بالوں پہ ہیئر بینڈ لگائے' ہاتھ میں فائل فولڈر پکڑے' ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھی کافی پُراعتماد نظر آرہی تھی۔ کھڑکی سے باہر لان میں منتظر بیٹھا اسامہ نظر آرہا تھا۔

چوکھٹ پہ شنزا کھڑی دکھائی دی تو حنین جگہ سے اٹھی۔

"میں نے کہا تھا' مجھے تمہاری مدد نہیں کرنی۔" وہ بے نیازی سے پلٹنے لگی تھی۔

"تم نے کہا تھا' تمہیں بھاری بوٹس کی دھمک سنائی دی تھی' تم نے کہا تھا' کوئی بھائی اس قابل نہیں ہوتا کہ اس کے لیے کچھ کیا جائے۔" شنزا چونک کر اس کی طرف گھومی۔ حنہ فولڈر سے کاغذ نکال کر اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"تمہارا تو کوئی بھائی نہیں ہے شنزا! مگر تم عادتاً اپنے بہنوئی سرمد شاہ کو بھائی کہہ کر پکارتی ہو نا۔" کاغذ اس کے چہرے کے آگے لہرایا۔ شنزا کے ان باکس میں سرمد کی میلز کے پرنٹ آؤٹ۔ شنزا کی رنگت سفید پڑی۔ "اس نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تمہاری بہن کو چھوڑ دے گا' تمہیں اپنا لے گا اور جس دن تم اغوا ہوئیں' اس روز اسی نے آنا تھا تمہیں پک کرنے۔ اسی نے کیا ہے یہ سب! مگر کتنا بڑا اداکار ہے وہ۔ جب میری فیملی نے نیاز بیگ کو اس کیس میں پھنسانا چاہا تو اس نے ایسی اچھی اداکاری کی کہ ہم سب بھی کنوینس ہو گئے کہ وہ اپنی "بہن" کا مجرم نیاز بیگ کو ہی سمجھ رہا ہے۔"

شنزا اسٹک کے سہارے چلتی چپ چاپ سامنے آکر بیٹھی۔ بھیگی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"میں کسی کو نہیں بتا سکتی کیونکہ سب کو میں قصور وار لگوں گی۔ کوئی نہیں مانے گا کہ میرا اس سے تعلق صرف پسندیدگی کا تھا۔" وہ ایک دم شکست خوردہ لگنے لگی تھی۔ کچھ دیر لگی اسے کھلنے میں۔

"میں یہ تعلق ختم کرنا چاہتی تھی' میں چھپ چھپ کر فون پہ بات کرنے والے گلٹ سے تنگ آگئی تھی' اسی لیے اس نے بلایا تو میں ملنے چلی گئی۔ مجھے نہیں پتا تھا وہ یہ سب......" آواز رندھ گئی۔ "تم نہیں سمجھ سکتیں' میں کیا محسوس کر رہی ہوں!"

حنین اس کے سامنے دھیرے سے بیٹھی۔ "میں سمجھ سکتی ہوں شنزا۔ تم نے ایک غلط آدمی سے محبت کی' جو تمہارا رشتے دار تھا' تم سے عمر میں بڑا تھا' تم اسے بھائی کہتی تھیں۔ اور اس نے... اس نے تمہاری حوصلہ افزائی کی۔" اس کے اندر بہت کچھ اٹکا۔ "اس کے لیے تو یہ محض وقت گزاری تھی۔ تمہارے لیے یہ روگ تھا۔ تم بیک وقت اس سے بات کرنے سے خوش بھی ہوتی تھیں اور گلٹی بھی۔ تم دو دلوں کے ساتھ جی رہی تھی۔ پھر ایک دن اس نے تمہیں بلایا۔ تم چلی گئیں۔" بہت کچھ یاد آیا تھا۔ "تمہیں نہیں پتا تھا کہ وہ ایک کرمنل بھی ہے' تم جاتیں نہ جاتیں' تمہیں کبھی نہ کبھی پتا چل ہی جاتا۔ اور تب بھی تم دو حصوں میں بٹ جاتیں جیسے اب بٹی ہوئی ہو۔ تمہارا ایک دل اس سے شدید محبت کرتا ہے دوسرا دل اس سے نفرت کرتا ہے۔ ایک طرف تم اس سے انتقام لینا چاہتی ہو' مگر انتقام خوشی نہیں دیتا۔ دوسری طرف تم اب بھی' اس سب کے بعد بھی' دور اندر اس کو پانا چاہتی ہو' مگر اب خوشی پانے سے بھی نہیں ملے گی۔"

"پھر میں کیا کروں؟"

"تم ساری آوازیں بھول جاؤ اور اپنی آواز اٹھاؤ' تمہاری آواز کے پس منظر میں ہر شے غائب ہو جائے

گی۔"

"نہیں کر سکتی! وہ سارا الزام مجھ پہ ڈال دے گا۔ بابا اور عائزہ مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔" بے بسی سے اس کی آواز بلند ہوئی۔

"کتنے لوگوں کو پتا ہے کہ تم اس سے یوں میسجز پہ بات کرتی تھیں؟"

"صرف مجھے اور سرمد کو!" آواز کپکپائی۔ آنکھوں میں بیک وقت دونوں جذبے ابھرے۔

"تو پھر تم یہ والی بات چھپالو۔" شہرا چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"تو میں کیا کہوں گی؟ کیوں ملنے گئی تھی سرمد سے؟ اور میری کسی جھوٹی وجہ پہ بابا کیسے یقین کریں گے؟"

"اس پہ کریں گے!" مسکرا کر اس نے ایک پھولا ہوا پیکٹ شہرا کی طرف بڑھایا تھا۔ "تمہیں سرمد شاہ کی الماری سے یہ ملا تھا۔ تم اسی کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھیں اور اس نے جو بھی کیا تمہیں خاموش کرانے کے لیے کیا۔" شہرا حیرت سے اسے دیکھتی پیکٹ کھولنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ لان میں آئی تو سیم نے بے اختیار پوچھا تھا۔

"کیا تم نے کرلیا پھپھو کا کام؟"

"ہاں کرلیا!" اس نے مزے سے سیم کی کہنی میں بازو ڈالا اور آگے چلنے لگی۔

"ویسے یہ سب تھا کیا؟" وہ متجسس ہوا۔ حنہ نے اسے گھورا۔

"چپ کر کے چلو۔ زیادہ جہان سکندر بننے کی ضرورت نہیں ہے۔" سیم نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا مگر چپ رہا۔



☼ ☼ ☼

خزاں کے پھول کی مانند بکھر گیا کوئی
تجھے خبر نہ ہوئی اور مر گیا کوئی

کورٹ کی راہداریوں میں ہنوز ویسا ہی رش تھا۔ بھانت بھانت کی بولیاں اور آتے جاتے قدموں کی دھمک۔ ایسے میں ایک راہداری کے باہر، ہی لڑکا جو گزشتہ رات چوری کیے مسروقہ پھولوں کے ساتھ پکڑا گیا تھا' وہ ہتھکڑیوں میں کھڑا تھا' ساتھ پولیس اہلکار موجود تھے۔ چند وکلاء اور ایک سوٹ میں ملبوس صاحب جو چہرے مہرے سے اس لڑکے کے والد لگتے تھے' آپس میں بحث کررہے تھے۔

"میں کراچی میں نہ ہوتا تو دیکھتا' میرا بیٹا کس طرح حوالات میں رات گزارتا ہے۔" والد برہمی سے کہہ رہا تھا۔ پھر گھڑی دیکھی۔ "کتنی دیر مزید لگے گی؟"

وکیل جواب میں جلدی جلدی کچھ بتانے لگا۔ تب ہی دور راہداری سے زمر چلتی آتی دکھائی دی۔ بال جوڑے کی شکل میں' چہرے پہ مسکراہٹ اور چال میں اعتماد۔ ان صاحب کے پاس وہ رکی۔

"کیا میں آپ سے علیحدگی میں بات کرسکتی ہوں؟" شائستگی سے ان کو مخاطب کیا۔ لڑکے کا والد چونک کر مڑا' اسے دیکھا' پھر ساتھ چلا آیا۔

"کسٹم کے یہ آفیسر آپ سے ملنا چاہتے ہیں' مگر علیحدگی میں' انہوں نے یقین دلایا ہے کہ آپ کے بیٹے کا ریکارڈ بھی کلیئر رہے گا۔ ان کو معلوم ہے کہ وہ سی ایس ایس کی تیاری کررہا ہے۔" مسکرا کر ایک کارڈ اس کی طرف بڑھایا' پھر اس کی پیشانی کو دیکھا جہاں ہلکا ہلکا پسینہ تھا' مگر خود بھی اس پسینے سے بے خبر' اس آدمی نے کارڈ لیا اور پھر اثبات میں سرہلایا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اس کے ساتھ چلتی اس کو مختلف راہداریوں سے گزارتی چلتی جارہی تھی۔ ساتھ ہی بار بار گھڑی بھی دیکھتی۔ کن انکھیوں سے اس نے دیکھا کہ وہ شخص ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کررہا تھا۔ جیسے اسے گھٹن ہورہی ہو۔

زمر ایک دروازے کے سامنے رکی۔ وہاں دو پولیس اہلکار کھڑے تھے۔ ایک نے دروازہ کھول دیا۔

"آپ اندر چلے جائیں' الیاس فاطمی صاحب!" وہ مسکرا کر بولی تو اس نے اندر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ وہ خالی کورٹ روم تھا۔ الیاس فاطمی دو قدم اندر گیا ہی تھا کہ زمر نے دروازہ بند کیا اور بولٹ چڑھا کر لاک کلک

سے بند کیا' پھر چابی نکال کر پولیس اہلکار کی مٹھی میں دبائی۔

"اگر وہ مقررہ وقت سے پہلے باہر نکلا تو تمہارے آدھے پیسے کاٹ لوں گی۔" گھور کر تنبیہہ کی۔ سپاہی نے سینے پہ ہاتھ رکھا۔

"آپ فکر ہی نہ کریں میڈم صاحبہ۔" زمر سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔ (آئی ایم سوری اللہ تعالیٰ' ان تمام قوانین کے لیے جو آج میں نے توڑے! اور فارس اور احمر جیسے کرمنلز کے ساتھ کام کرنے کے لیے!) جھرجھری لے کر وہ بڑبڑاتی جارہی تھی۔ کوئی عادت سی تھی جو واپس آرہی تھی۔

خالی کورٹ روم میں آگے چلتے یک دم الیاس فاطمی مڑا۔ اسے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ چونک کر وہ دروازے تک آیا اور اسے کھولنے کو ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ۔۔۔

"اپنی توانائی بچا کر رکھو۔ دروازہ لاکڈ ہے' اسے توڑنے میں پندرہ منٹ لگیں گے جبکہ تمہارے پاس صرف بارہ منٹ ہیں۔"

آواز پہ وہ ایک دم گھوما۔

جج کے خالی چیمبر کا دروازہ کھول کر وہ باہر نکل رہا تھا۔ کورٹ روم کی کوئی بتی نہیں جلی تھی۔ دن کی روشنی کافی تھی' پھر بھی جج کا چبوترہ اندھیرے میں لگ رہا تھا۔ الیاس فاطمی نے آنکھیں سکیڑ کر تعجب سے دیکھنا چاہا۔ نیلی جینز کے اوپر اس نے بھورا سوئیٹر پہن رکھا تھا۔ پوری آستین والا سوئیٹر۔ چھوٹے کٹے بال اور بڑھی شیو۔ سنہری آنکھوں میں چبھن لیے وہ جج کی کرسی کے پیچھے آکھڑا ہوا اور کرسی کی پشت پہ اپنے دونوں ہاتھ رکھے۔ ہتھکڑی میں بندھے ہاتھ۔

"ڈرو نہیں۔ میں ہتھکڑی میں ہوں۔ قید میں ہوں۔ پہچانا تم نے مجھے؟ میں فارس غازی ہوں۔ وارث غازی کا بھائی!" الیاس فاطمی کی گردن کے بال تک کھڑے ہوگئے۔ لب کھل گئے۔ آنکھوں میں شاک ابھرا۔ پھر ایک دم وہ گھوما۔

"کچہری میں جہنم کی طرح کا شور ہے' دروازہ پیٹنے کی آواز سن بھی لی جائے تو فائدہ نہیں۔ تمہارے پاس صرف گیارہ منٹ ہیں' کیونکہ تمہاری طبیعت خراب ہونا شروع ہوچکی ہے۔" فاطمی نے دروازے پہ ایک دفعہ ہی ہاتھ مارا تھا کہ اس کا آخری فقرہ سن کر چونکا' پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ اسی سکون سے کرسی کے اوپر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔

"تمہارے سر میں درد ہو رہا ہے نا؟ ہر گزرتے پل کے ساتھ یہ تیز ہوجائے گا۔ کیونکہ جو چائے تم نے پراسیکیوٹر کے آفس میں پی تھی' وہ چائے نہیں تھی۔"

فاطمی نے بے اختیار اپنی پیشانی کو چھوا۔ وہ ٹھنڈی پڑ رہی تھی۔ اس نے دوسرا ہاتھ گلے پہ رکھا۔ وہ گھٹ رہا تھا۔ آنکھیں وحشت سے پھیلیں۔

"کیا... کیا مطلب؟" وہ مڑ کر پھر سے دروازہ بجانے لگا' مگر ہاتھوں سے جان نکل رہی تھی۔

"وکیل سے شادی کرنے کا ایک فائدہ ہوتا ہے۔ آپ کورٹ کا ہر ملازم خرید سکتے ہیں۔ اس ملازم نے زیادہ کچھ نہیں ملایا۔ صرف ایک چھوٹی شیشی تھی۔ زہر کی۔" ہلکا سا مسکرایا۔ "میرا ایک دوست ہے' لاہور کے مضافات میں اس کا اپنا فارم ہاؤس ہے اور لیب بھی۔ وہاں ایسے وائرس اور زہریلے محلول کلچر کیے جاتے ہیں۔ ابھی تو تمہارا دم گھٹ رہا ہے' لیکن اگلے آٹھ منٹ میں سانس بھی رکنے لگے گا' پھر ناک اور کانوں سے خون آئے گا' پھر دل کی دھڑکن بے قابو ہوگی..." وہ کہتے ہوئے چلتا ہوا کرسی کے پیچھے سے نکلا۔ "پھر سینے میں شدید درد اٹھے گا..." وہ چبوترے کے دہانے پہ آکھڑا ہوا اور نیچے وہیں بیٹھ گیا۔ "اور گیارہویں منٹ تمہارے دماغ کی شریان پھٹ جائے گی اور..." بند مٹھی کھول کر دکھائی۔ اس میں شفاف شیشی تھی جس میں شفاف محلول تھا۔ "اگر تم نے اس زہر کا antidote (تریاق) نہ لیا۔" الیاس فاطمی نے قدم بڑھائے' مگر لڑکھڑا کر زمین پہ گرا اور بے اختیار دیوار کا سہارا لیا۔ پھر سفید چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو!" اس کا سانس رکنے لگا تھا۔

"ٹھیک ہے' پھر گیارہ منٹ بعد پتا چل جائے گا۔"

الیاس فاطمی بے اختیار پلٹا اور خود کو زمین پہ گھسیٹتے دروازے کو نیم جاں ہاتھوں سے بجایا۔ باہر دونوں پولیس اہلکار کھڑے اونچی آواز میں فون پہ بات کررہے تھے۔

"اگر تم نے دوبارہ دروازہ پیٹا تو میں اس شیشی کو توڑ دوں گا۔ قریبی اسپتال جانے میں رش آور کے باعث تمہیں پون گھنٹہ لگے گا۔"

گہرے گہرے سانس لیتے فاطمی نے ہاتھ کی پشت سے ناک رگڑی تو۔۔۔ اس پہ خون لگا تھا۔ اس نے خوف اور دہشت سے سامنے چبوترے پہ بیٹھے فارس کو دیکھا۔

"تم۔۔۔ کیا چاہتے ہو تم؟ میں نے تمہارے بھائی کو نہیں مارا۔"

"مجھے معلوم ہے' تم نے صرف اسے بیچا تھا۔" وہ شیشی کو ہاتھ میں گھماتے' نگاہیں اس پہ جمائے بولا تھا۔ "مجھے دو سوالوں کے جواب دو' تو میں یہ antidote (تریاق) تمہیں دے دوں گا۔ اگر تمہارے منہ سے نکلنے والے اگلے الفاظ میرے سوال کے جواب کے علاوہ ہوئے تو میں اسے توڑ دوں گا۔"

"بولو۔۔۔ بتاؤ۔۔۔ کیا پوچھنا ہے۔" وہ نیم جاں زمین پہ دوہرا ہوا بمشکل بول پایا۔

"وارث نے تمہیں کچھ فائلز دی تھیں' یقیناً" وہ ثبوت تم نے کسی تک پہنچا دیے تھے اور انہوں نے وارث کو مار دیا۔" نگاہ اٹھا کر چھت سے لٹکتے پنکھے کو دیکھا۔ "ان فائلز میں کیا تھا؟"

"وہ۔۔۔ منی لانڈرنگ کررہے تھے۔۔۔ وہ ان کی کرپشن کا پتا لگاتے لگاتے غلط سمت آنکلا تھا۔۔۔" بے ربط پھولی سانسوں کے درمیان وہ بول رہا تھا۔ "وہ دہشت گردوں کے لیے منی لانڈرنگ کررہے تھے۔ کراچی میں میٹنگز کا ریکارڈ تھا' کوئی گواہ بھی تھے۔ وہ میرے پاس نہیں ہیں۔ وارث کے لیپ ٹاپ میں تھیں۔"

"آئی سی!" اس نے گہری سانس لی۔ "تو وہ دہشت گرد ہیں۔۔۔ گڈ!" وہ ہلکا سا مسکرایا۔ "دوسرا سوال' ان لوگوں کا ماسٹر مائنڈ کون ہے؟ ہر تنظیم کا ایک برین ہوتا ہے' جو احکامات دیتا ہے۔ ان کا برین کون ہے؟ میرے بھائی کے قتل کا حکم کس نے دیا تھا؟"

فاطمی کے کانوں سے خون رسنے لگا تھا۔ آنکھوں سے پانی ٹپک رہا تھا' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"وہ مجھے جان سے مار دے گا۔"

فارس نے شیشی کو اونچا اٹھایا۔ گویا گرانے لگا ہو' فاطمی دہل کر رہ گیا۔ "ہاشم۔۔۔ ہاشم کاردار۔۔۔ تمہارے بھائی کے قتل کا حکم ہاشم نے دیا تھا۔"

کمرے میں ایک دم موت کا سناٹا چھا گیا۔

اپنے تئیں دھماکا کرکے فاطمی نے اسی خوف اور دہشت سے فارس کا چہرہ دیکھا۔ وہ سپاٹ تھا۔ سخت اور سرد۔۔۔

"ہاشم کاردار؟" وہ دہراتے ہوئے اٹھا اور قدم قدم چلتا فاطمی کے قریب آکھڑا ہوا۔ گردن جھکا کر اسے دیکھا۔

"میں نے پوچھا تھا' ان کا برین کون ہے؟ ہاشم کاردار یا اس کی ماں؟"

فاطمی کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔ "تم جانتے ہو؟" فضا ایک دم ساکت ہوگئی تھی۔

وہ ہلکا سا مسکرایا۔ "میں ساڑھے چار سال سے جانتا ہوں۔ یہ بھی کہ میرے بھائی اور بیوی کو کس نے قتل کروایا' یہ بھی کہ میرا بھانجا بھی ان ہی کے پاس ہے۔"

فاطمی نے تعجب اور بے یقینی سے نفی میں سر ہلایا۔

"مگر ہاشم نے کہا تھا' تم نہیں جانتے کہ اس سب کے پیچھے کون ہے۔"

"میں واقعی نہیں جانتا کہ ان سب کے پیچھے کون ہے۔ ہاشم اپنی ماں کے پیچھے ہے یا جواہرات اپنے بیٹے کے پیچھے ہے۔ یہ جاننا میرے لیے ضروری ہے' تاکہ مجھے معلوم ہوسکے کہ مجھے کس کی جان اپنے ہاتھوں سے لینی ہے۔"

"مگر ہاشم نے کہا تھا۔۔۔ تم اداکار نہیں ہو۔" وہ اب بھی بے یقین' خوف زدہ تھا۔

"جس غازی کو وہ جانتا تھا' وہ اداکار نہیں تھا۔" اس نے اذیت سے آنکھیں موندیں۔ (جیل نے میرے ساتھ کیا کیا' میں نے جیل میں کیا کیا ہے۔) آنکھیں کھولیں۔ ان میں سرد آگ تھی۔ "ہاشم نہیں جانتا۔ کوئی نہیں جانتا اور اب تم لوگ مجھے دوبارہ وہیں بھیجنا چاہتے ہو۔"

"مگر... ہاشم نے کہا' تم سمجھتے ہو' تمہاری بیوی نے تمہیں اس میں پھنسایا ہے۔"

"پانچ منٹ کے لیے میں نے یہی سمجھا تھا۔"

"تمہیں... تمہیں معلوم ہے تمہارا بھانجا۔"

اسے شدید کھانسی آنے لگی تھی۔ وہ بول نہیں پا رہا تھا مگر حیرت اور بے یقینی اسے اپنی حالت بھی بھلائے دے رہی تھی۔

"مجھے اس کے اغوا کے اگلے دن معلوم ہو گیا تھا کہ یہ سب ہاشم نے کروایا ہے مگر میں..." پنجے کے بل اس کے قریب زمین پہ بیٹھا۔ "میں وہ ساڑھے چار سال پہلے والا آدمی نہیں ہوں جس نے جیل جاتے ہی ہاشم کا ردار کا نام لیا تھا۔ جیل نے مجھے بدل دیا ہے الیاس فاطمی! مجھے اداکاری آ گئی ہے۔ مجھے لوگوں کے سامنے کیسا نظر آنا ہے' یہ میں خود طے کرتا ہوں اب۔" وہ ذرا سا اس پہ جھکا۔

"تم لوگ... ہمیشہ ایک بات بھول جاتے ہو... کہ فارس غازی... بھی ایک کاردار کی ہی اولاد ہے۔" پھر شیشی والی مٹھی بلند کی۔ الیاس فاطمی دہرے ہوتے' بے اختیار ہاتھ اٹھانے لگا مگر اتنی سکت ہی نہیں رہی تھی۔

"تم میرا راز جان چکے ہو۔ تمہیں زندہ نہیں رہنا چاہیے۔"

"نہیں... پلیز... دیکھو' میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ دیکھو وقت ختم ہو رہا ہے۔ یہ مجھے دے دو خدا کے لیے..." وہ شاید رو بھی رہا تھا۔

"اگر تم نے..." شیشی اوپر اٹھائے' اس کی آنکھوں میں دیکھتے چبا چبا کر وہ بولا۔ "کسی کو ایک لفظ بھی بتایا تو یاد رکھنا... میں تمہیں نہیں ماروں گا۔ مگر تمہاری بیٹی... جو شادی کے آٹھویں سال بالآخر اپنی اولاد کی منتظر ہے۔ صرف ڈھائی ماہ بعد... میں اس کا بچہ غائب کر دوں گا اور تم اور تمہارا سارا خاندان زندہ در گور ہو جاؤ گے۔ بری خبر یہ ہے کہ تمہاری بیٹی سفر نہیں کر سکتی' تم اس کو کہیں بھیج بھی نہیں سکتے۔"

وہ جلدی جلدی نفی میں سر ہلانے لگا' اس کا گویا سانس بند ہو رہا تھا۔ "میں کسی کو نہیں بتاؤں گا' پلیز یہ مجھے دے دو۔"

فارس اٹھا' سیدھا کھڑا ہوا۔ گردن جھکا کر اسے دیکھا۔ "میرا بھائی تمہارے پاس آیا تھا فائلز لے کر... اس نے تم پہ اعتماد کیا تھا اور تم نے معلوم ہے اس کے ساتھ کیا کیا؟" اس نے شیشی فضا میں بلند کی۔ "تم نے اسے چھوڑ دیا۔" اور اس نے شیشی چھوڑ دی۔ الیاس فاطمی کے منہ سے چیخ نکلی۔ شیشی اس کے قریب گر کر چکنا چور ہو گئی۔ محلول بہہ گیا۔ وہ پاگلوں کی طرح جھک کر انگلیوں سے محلول اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ "یہ تم نے کیا کیا... تم نے مجھے مار دیا۔"

فارس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ساتھ میں کچھ کہا بھی۔ اہلکار نے جلدی سے دروازہ کھولا اور اندر آیا... اس کی ہتھکڑی کو اپنی زنجیر کے ساتھ نتھی کیا۔ پھر نیچے گرے' پاگلوں کی طرح اس محلول کو چاٹتے' روتے' بلکتے فاطمی کو دیکھا۔ "یہ مر تو نہیں جائے گا۔"

"اس جیسے لوگ آسانی سے نہیں مرتے۔ فکر نہ کرو' زہر نہیں دیا۔ ٹارچر ڈرگ تھی' آدھے گھنٹے میں ٹھیک ہو جائے گا۔" بے نیازی سے کہہ کر وہ ان کے ساتھ باہر نکل گیا۔ ادھر الیاس فاطمی ابھی تک کراہتے' روتے اس محلول کو چاٹنے کی سعی کر رہا تھا جو صرف... سادہ پانی تھا۔

راہ داری میں چلتے ہوئے زمر مخالف سمت سے آئی اور اس کو روکا۔

"کچھ معلوم ہوا؟" دھڑکتے دل سے پوچھا۔ فارس نے نفی میں سر ہلایا۔

"اسے کچھ بھی نہیں معلوم... ابھی تک اس شخص کا پتا نہیں چل سکا جو فاطمی کو اس جج سے جوڑ

سکے۔" وہ بے زار اور خفا لگ رہا تھا۔
زمر کے چہرے پہ مایوسی پھیلی۔ "کیا واقعی؟"
وہ۔ "جی" کہہ کر اہلکاروں کی معیت میں آگے بڑھ گیا۔ اس کا نام پکارے جانے کا وقت قریب تھا۔
آج اس کا چودہ روزہ جسمانی ریمانڈ ختم ہو رہا تھا۔ عدالت نے ضمانت کی درخواست مسترد کرتے ہوئے اسے جوڈیشل ریمانڈ پہ جیل بھیجنے کا حکم صادر کر دیا۔ اپنی گرفتاری کے چودہ دن بعد بالآخر وہ اسی جیل میں دوبارہ جا رہا تھا جو چار سال تک اس کا "گھر" بنی رہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ چلتی باہر تک آئی تھی جہاں "حوالات" (جیل لے جانے کے لیے وین خوف ناک سواری) تیار کھڑی تھی۔ لمحے بھر کے لیے اس نے فارس کو روکا تھا۔
"آج عدالت نے تمام کاغذات، تفتیش کی تفصیلات، چالان وغیرہ کی کاپی ہمارے حوالے کر دی ہے۔ اب ہمارے پاس ایک ہفتہ ہے اگلی سماعت تک۔ سو اب تم جس کو چاہو اپنا وکیل مقرر کر لو!" وہ کچھ کہنے لگا تھا مگر زمر نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکتے بات جاری رکھی۔ "لیکن اگر تم مجھے ہائر کرنا چاہتے ہو تو.... فارس.... تمہیں مجھ سے.... ریکویسٹ کرنی ہو گی۔"
اس کا ابرو بے اختیار اٹھا۔ برہمی سے کچھ کہنے لگا۔ پھر گردن گھما کر دیکھا۔ اس کے انتظار میں اہلکار کھڑے تھے۔ بہت ضبط سے زمر کی طرف گھوما۔ وہ مسکرا رہی تھی۔
"مسز زمر...." ایک نظر اس کے پٹی میں بندھے ہاتھ پہ ڈالی' دوسری ناک کی لونگ پہ۔ "کیا آپ کمرہ عدالت میں میری نمائندگی کرنا پسند کریں گی؟"
"پہلے کہو' پلیز!" (اور یہ الفاظ کہتے اسے کچھ اور نہیں صرف پھوپھو یاد آئے تھے۔)
فارس نے صبر کا گھونٹ بھرا۔ "پلیز!"
"شیور!" وہ مسکرا کر شانے اچکاتی پرس کھنگالنے لگی۔ "مگر تم یہ سائن کر دو۔" ایک چیک اور پین نکال کر اس کے سامنے کیا۔ فارس کے اب کی بار دونوں ابرو اٹھے۔ "یہ تو میری چیک بک کا چیک ہے۔"

"اور اس پہ جو رقم لکھی ہے' وہ میری ابتدائی فیس ہے! سائن کر دو یا کوئی اور وکیل ڈھونڈ لو!"
"یہ صرف ابتدائی فیس ہے؟"
"ہاں فارس.... تم نے کیا بے مول سمجھ رکھا تھا مجھے؟" مسکراتے ہوئے بھی اس کی آواز میں شکوہ در آیا تھا۔ فارس نے بس ایک تیز نظر اس پہ ڈالی' ہتھکڑی لگے ہاتھوں سے قلم تھاما اور سائن کر دیا۔ پھر اسے ان ہی نظروں سے گھورتا جانے کے لیے پلٹ گیا۔
وہ اس ٹھنڈی سی سہ پہر میں ان اہلکاروں کو اسے حوالات میں ڈال کر لے جاتے دیکھتی رہی۔

☼ ☼ ☼

انمول پتھروں کی قیمت لگائی ہے سب نے
دیوار جو نہ بنتے' بازار بن کر جیتے

سمندر کنارے وہ اونچی ہوٹل کی عمارت رات کے اس پہر روشن تھی۔ نیچے تاریک تہ خانے میں میری انجیو فون لیے سعدی کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ جو اضطرابی انداز میں مسلسل ٹہل رہا تھا' تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ آنکھوں میں شدید بے چینی تھی۔
"کال کرو ہاشم کو!"
"تم ٹھیک نہیں کر رہے سعدی! تم پچھتاؤ گے۔" وہ شدید متفکر تھی۔ "تمہیں فارس کے مشورے پہ بھروسا ہے؟"
"دیکھو' وہ غصے کے تیز ہیں' جلد باز ہیں' ہاتھوں سے سوچتے ہیں' میں سب جانتا ہوں مگر میرا دل کہتا ہے' وہ ٹھیک کہہ رہے ہیں اور میں دل کی سننا چاہتا ہوں۔" میری نے سر جھٹکا اور فون ملا کر' ہاشم سے بات کروانے کا کہہ کر ریسیور اسے دیا۔
"بولو سعدی!" ہاشم کا لہجہ خشک تھا۔
"میں اپنے وکیل کا نام بتانے کو تیار ہوں.... مگر...."
"مگر تمہیں بدلے میں کچھ چاہیے' بتاؤ۔" وہ آفس میں بیٹھا فون کان اور کندھے کے درمیان رکھے' کاغذات کھنگال رہا تھا۔
"میں صرف آپ کو بتاؤں گا' آپ اور آپ کی والدہ

دونوں میرے پاس آئیں گے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ سچ سچ بتادوں گا۔ میں آپ کے لیے کام بھی کرنے کو تیار ہوں لیکن بدلے میں' میں پیسے لوں گا' بہت پیسے۔ وہ پیسے میرے خاندان کو دیے جائیں گے اور میرا پیکج آپ اور مسز کاردار ––– میرے ساتھ بیٹھ کر مجھ سے ڈسکس کر کے طے کریں گے۔"

"اس تبدیلی کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟"

"میں تھک چکا ہوں ہاشم بھائی! میں تنگ آگیا ہوں۔" وہ روانی میں کہہ گیا تھا' پھر رک کر مسکرایا اور بظاہر تصحیح کی۔ "ہاشم!" میری کو دیکھتے آنکھ دبائی۔ اگر وہ ندرت ہوتی تو جوتا اٹھالیتی۔

"اور پلیز۔۔۔ اس ہپنو تھراپسٹ سے کہیں' یہاں سے چلی جائے' میں نے نہیں کروانا اس سے علاج' کیوں میرے پیچھے پڑی ہے؟" وہ کاغذ فائل سے نکالتا رکا۔ ایک دم چونک کر چہرہ اٹھایا۔ فون کندھے سے نکال کر ہاتھ میں لیا۔ "کون تھراپسٹ؟"

"وہی سرخ اسکارف والی' آپ کے بزنس پارٹنر کی بیٹی۔ جس کو کرنل خاور میرے پاس لایا ہے۔" لمحے بھر کو رکا۔ "کیا آپ کو نہیں پتا؟"

دوسری طرف فون منقطع ہوچکا تھا۔ ہاشم موبائل رکھتے ہی آندھی طوفان کی طرح کمرے سے نکلا تھا۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلے کرتے سرخ چہرے کے ساتھ وہ تیز تیز قدم بڑھاتا ہال عبور کر کے سامنے آیا۔ ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔

خاور فون پہ بات کر رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر اٹھا۔ ہاشم آگے بڑھا' فون کا کریڈل کھینچ کر زمین پہ دے مارا۔ خاور ایک دم ششدر رہ گیا۔ اس نے گریبان سے پکڑ کر خاور کو جھٹکا دیا۔

"کس کی اجازت سے تم آبی کو وہاں لے کر گئے؟ تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟" سرخ آنکھوں سے اسے دیکھتا وہ دھاڑا تھا۔

"سر۔۔۔ میں نے ہپنو تھراپسٹ کی بات کی تھی آپ سے۔۔۔ میں نے ہارون صاحب سے۔۔۔" وہ ہکلاتے ہوئے وضاحت دینے لگا۔

"بکواس بند کرو' تم میرے لیے کام کرتے ہو' ہارون عبید کے لیے نہیں۔" غصے سے اس کا کالر جھٹک کر اسے پرے دھکیلا۔ "تم مجھ سے پوچھے بغیر اتنا بڑا قدم کیسے اٹھا سکتے ہو؟ مجھے یقین نہیں آرہا۔"

"سر۔۔۔ میں تو۔۔۔"

"بکواس بند کرو۔" اس نے زور سے بوٹ کی ٹھوکر ماری اور نازک سی ٹی ٹرالی الٹ کر پیچھے جاگری۔ "ابھی۔۔۔ ابھی اس کو واپس لاؤ گے تم وہاں سے۔۔۔ خاور! اگر وہ دوبارہ اس سے ملی تو میں تمہیں شوٹ کردوں گا۔ سنا تم نے۔"

خاور کا اہانت اور شاک سے بھرا چہرہ چھوڑ کر وہ اسی طرح باہر نکل گیا۔ اسے کہیں پہنچنا تھا جلدی' ورنہ شاید وہ واقعی خاور کو شوٹ کردیتا۔ خاور ابھی تک دنگ تھا۔ پس منظر میں ایک آواز ابھری تھی۔

"تم کبھی کاردار نہیں بن سکتے۔ وہ تمہیں کبھی اپنے ساتھ نہیں بٹھاتے۔"

☼ ☼ ☼

رہا مبتلا میں عمر بھر آگے کی دوڑ میں
جو آج مڑ کر دیکھا تو تنہا کھڑا تھا میں

سرمد شاہ ان دنوں ایک ورکشاپ کے سلسلے میں ملک سے باہر تھا۔ فارس غازی جوڈیشل ریمانڈ پہ جس دن جیل بھیجا گیا' اس روز سرمد شاہ واپس آیا تھا۔ ایئرپورٹ سے گھر کے راستے میں اس نے ڈرائیور سے پوچھا تھا۔

"عائزہ بی بی کہاں ہیں؟ دو دن سے فون نہیں اٹھا رہیں۔ لینڈ لائن بھی نہیں مل رہا۔"

ڈرائیور لاتعلقی کا اظہار کر کے خاموش رہا تھا' البتہ بار بار بیک ویو مرر میں صاحب کو دیکھتا ضرور تھا۔ کار گیٹ کے اندر داخل ہوئی اور وہ دروازہ کھولتا باہر نکلا تو دیکھا لان میں عائزہ اور شہزا کے والد کھڑے تھے۔ وہ دراز قد' سیاہ سرمئی قلموں والے' بھرے بھرے جسم کے تنومند انسان تھے' سفید شلوار اور سوٹ میں ملبوس اور چہرے کا رنگ سرخ گلابی سا' ساتھ موجود چار افراد

بھی اسے دیکھ کر کھڑے ہوئے تھے۔ سرمد شاہ کو انہونی کا احساس ہوا تھا۔

"السلام علیکم انکل۔۔۔" وہ بظاہر مسکرا کر کہتا گلاسز گریبان میں اٹکاتا ان کی طرف آرہا تھا۔ آئی جی صاحب آگے بڑھے اور ایک دم سے اسے گریبان سے پکڑ لیا۔

"ساری دنیا کہتی تھی' جیسا باپ ہے' ویسا بیٹا نکلے گا' پھر بھی میں نے تمہارا اعتبار کیا۔" انہوں نے بھاری بھرکم ہاتھ اس کے منہ پہ جڑا تھا۔ غصے سے وہ بہت سے مغلظات بھی کہہ رہے تھے۔ سرمد شاہ پیچھے کو لڑکھڑایا۔ "تم نے میری دونوں بیٹیاں برباد کردیں۔"

"انکل۔۔۔ کیا ہوگیا ہے؟" اس کا چہرہ سرخ ہوا' وہ ان کا ہاتھ روکنے کی کوشش کرنے لگا' دو نوجوان آگے بڑھے اور آئی جی صاحب کو تھام کر بمشکل ہٹایا۔ ایک نے سرعت سے سرمد شاہ کے ہاتھ پیچھے باندھے اور اس سے پہلے کہ وہ مزاحمت کرپاتا' اس نے ہتھکڑی بند کردی۔

"کیا کررہے ہو' چھوڑو مجھے۔۔۔ انکل۔۔۔ میری بات سنیں۔" وہ بھی غصے سے چلایا تھا۔ "وہ جھوٹ بول رہی ہے' وہ بکواس کررہی ہے' میں۔۔۔"

"وہ تمہاری دوسری شادی کے بارے میں جان گئی تھی' اس لیے تم نے اسے اغوا کرلیا۔ تم نے میری بیٹی کو برباد کردیا۔" وہ غصے اور دکھ سے پھر اس کی طرف بڑھے تھے مگر دونوں جوانوں نے انہیں پھر سے تھام کر پیچھے کیے رکھا۔

"سر! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' آپ اندر جائیں' یہ ہمارے حوالے ہے۔" ایک آفیسران کو تسلی دے رہا تھا۔

"عائزہ کہاں ہے؟ عائزہ کو بلاؤ۔ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔" وہ ان دو اہلکاروں کے نرغے میں پھنسا' سرخ چہرے کے ساتھ چلا چلا کر ملازموں سے کہہ رہا تھا مگر کوئی نہیں سن رہا تھا۔

"نام مت لو میری بیٹی کا۔" وہ انگلی اٹھا کر تنبیہہ کرتے رکے تھے۔ "عائزہ' عرصم' اور شنزا کو ملک

سے باہر بھیج دیا ہے میں نے' ساری زندگی تم اپنے بیٹے کی شکل کو ترسو گے۔ تم بھی تو جانو اولاد کو کھونے کا درد کیا ہوتا ہے سرمد۔"

"آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔ چھوڑو مجھے' میرا بیٹا کہاں ہے؟" وہ چلایا تھا۔

"لے جاؤ اسے دور لے جاؤ میری نظروں سے۔ اس سے طلاق نامے پہ دستخط کرواؤ اور پراپرٹی کے کاغذوں پہ بھی... اس کو... اس کو اتنا مارو ولید! کہ اس کی شکل بدل جائے۔" وہ تیز تیز بولتے ہانپنے لگے تھے۔ دو اہلکار اس کو زبردستی کھینچتے گھسیٹتے گاڑی کی طرف لے جا رہے تھے۔

"دیکھ لوں گا میں تم سب کو۔ کوئی بھی عدالت میں مجھ پہ کچھ ثابت نہیں کر سکتا۔" وہ ہذیانی انداز میں چلایا تھا۔ آفیسر نے اسے کار میں دھکا دیا' پھر جھک کر سختی سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"کون سی عدالت؟ ہم تمہیں تمہارے جیسے کسی تھانے نہیں لے جا رہے۔ ہم تمہیں بیورو کی زیر زمین جیل میں لے جا رہے ہیں۔ کریمنل پروسیجر کورٹ ہم پہ اپلائی نہیں ہوتا' نہ ہم تمہیں کسی عدالت میں پیش کریں گے۔ آج سے تم ایک مسنگ پرسن ہو۔"

اور کھٹاک سے دروازہ اس کے منہ پہ بند کیا۔ آئی جی صاحب ابھی تک غصے سے ہانپتے اس کو گالیاں دے رہے تھے۔ پھر وہ تھک کر کرسی پہ نڈھال سے بیٹھ گئے۔ انہیں معلوم تھا' وہ طاقت ور لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگا ہے' وہ ناجائز پیسہ بناتا ہے' فیورز دیتا ہے مگر انہوں نے اسے کچھ نہیں کہا۔ وہ غیر جانب دار رہنا چاہتے تھے اور انسان کو جہنم میں اس کی غیر جانب داری ضرور پہنچاتی ہے۔

انیکسی کے تہ خانے میں دیوار پہ لگے کاغذوں کے سامنے حنین کھڑی تھی۔ ہاتھ اونچا کر کے اس نے سرمد شاہ کی تصویر اتاری اور اس کے دو ٹکڑے کر کے قریب جلتے ہیٹر پہ رکھ دیے۔ آگ کے شعلے تصویر کو اپنی لپیٹ میں لے کر سیاہ کرنے لگے۔

☆ ☆ ☆

کبھی جو مدتوں بعد اس کا سامنا ہوگا
سوائے پاس آداب تکلف کے اور کیا ہوگا

حنہ نے اطمینان سے مڑ کر زمر کو دیکھا جو میز پر فائلیں اور کتابیں رکھے نوٹس بنا رہی تھی۔ سر اٹھائے بغیر بولی۔

"اس کو انجوائے مت کرو۔"

حنہ چونکی پھر سر جھٹک کر بولی۔ میں انجوائے تو نہیں کر رہی۔

زمر کے موبائل کی ٹون بجی تو وہ فون اٹھا کر دیکھنے لگی۔ اس کے ڈاکٹر کا پیغام تھا۔

"خوش قسمتی سے ایک ڈونر کا بندوبست ہو گیا ہے۔ اس کا نمبر بھیج رہا ہوں' آپ اس سے بات کر لیں اور تمام معاملات طے کر لیں۔ غریب آدمی ہے' پیسوں کی سخت ضرورت ہے اسے۔" ساتھ ہی ایک نمبر موصول ہوا۔ زمر نے گہری سانس لی اور "ڈونر" کے نام سے اسے محفوظ کر دیا۔ دل سے ایک بوجھ سا ہٹا تھا۔

"وہ فائلز کہاں تک پہنچیں حنین؟"

"بتایا تھا نا' اپنی ایک فلیش خاور کے پاس لے کر گئی تھی' اس پہ تجربہ کر کے اس سے انکرپٹ کرنے کا طریقہ سیکھا ہے۔ اب ان فائلز پہ احتیاط سے اپلائی کر رہی ہوں وہ طریقہ... بہت سی چیزیں اب بھی نہیں معلوم' سو کچھ دن لگیں گے۔ شاید مہینہ... مگر ہو جائے گا۔" وہ پُرامید تھی۔

ان سے چند کوس دور' قصر کاردار کا لاؤنج پورا روشن تھا اور اوپر سے نوشیرواں چہرے پہ ڈھیروں بے زاری سجائے' سستی سے زینے اتر رہا تھا۔ جمائی روکتے وہ نیچے آیا اور صوفے پہ ڈھیر ہو گیا۔ آنکھوں کے گلابی پن سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ڈرگز استعمال کر رہا تھا۔

"ممی کہاں ہیں فنٹونا؟" فنٹونا سامنے آئی تو اس نے پکارتے ہوئے میز پہ پیر رکھے اور موبائل چہرے کے سامنے کیے فیس بک کھولنے لگا۔

"مسز کاردار اور ہاشم صاحب صبح سری لنکا کے لیے نکلے تھے۔ ان کی کوئی میٹنگ تھی اور ایک سیمینار بھی

تھا۔"

"ہوں۔۔۔" وہ خاموشی سے بیٹھا موبائل دیکھتا رہا۔ شیرزن کی ساری ٹائم لائن چیک کی۔ ایک ایک پوسٹ پڑھی مگر پھر بے زار ہوگیا۔ سر جھٹک کر چہرہ اٹھایا تو مرکزی دیوار پہ بڑا سا وکٹورین ڈیزائن کا فریم آویزاں دیکھا جس میں وہ چاروں کھڑے مسکرا رہے تھے۔ اورنگ زیب' ہاشم جواہرات اور وہ خود۔۔۔ شیرو اسے تکے گیا' مکمل فیملی گروپ فوٹو۔

ایک خیال نے ذہن پہ ہلکی سی دستک دی۔ کیا یہ مکمل گروپ فوٹو تھا؟ مگر فیملی تو مکمل نہ تھی۔ کسی معمول کی طرح اس نے موبائل اسکرین کو چھوا۔ سرچ کے خانے میں لکھا۔ "**علیشا کاردار**" اور کچھ بھی سوچے بنا کلک کر دیا۔

فہرست میں پہلے نام کی بریکٹس میں لکھا تھا۔ (Ants Ever After) جس زمانے میں گھر میں اس لڑکی کے نام پہ جواہرات اور اورنگ زیب میں لڑائی ہوتی تھی' تب اس نے سرچ کیا تھا اس کو۔ شاید اسی لیے اس کا نام اب بھی نکل آیا تھا۔ سر فہرست۔ نوشیرواں نے پروفائل کھولی۔ کور فوٹو پہ کلک کیا۔ وہ دو ہفتے قبل لگائی گئی تھی۔ پہلے سے ذرا بڑی بڑی اور مسکراتی ہوئی **علیشا**' کتابیں لیے کسی یونی ورسٹی کے باہر کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں۔۔۔ شیرو نے اسکرین کو زوم ان کیا۔۔۔ بالکل اورنگ زیب جیسی تھیں۔ نوشیرواں جیسی۔۔۔ فارس جیسی۔۔۔

کتنے ہی پل بیت گئے۔ وہ یوں ہی گردن ترچھی کیے اس کی تصویر دیکھتا رہا۔ وہ اسپتال سے صحت یاب ہو کر آگئی تھی اور اب تعلیم حاصل کر رہی تھی' یہ تصویر سے واضح تھا۔ بغیر کسی دوسرے خیال کو ذہن میں لائے' شیرو نے فرینڈ ریکویسٹ کے آپشن کو کلک کر دیا۔

"دوستی کی درخواست بھیج دی گئی ہے۔" فیس بک نے ادب سے اطلاع دی۔ وہ عجیب سا محسوس کرنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

نہ شاہ پہ مرے ہم' نہ شاہ سے ڈرے ہم!
کچھ عجیب گر نہ ہوتے' شاہکار بن کے جیتے

کولمبو' نم' بھیگی ہواؤں میں اس شام عجیب سا جوش تھا۔ جو مایوسی کی انتہا پہ پہنچنے والوں کو نئے دن کے سورج کی امید دلایا کرتا ہے۔ ایسے میں اس طویل قامت ہوٹل کی عمارت کی ایک کھڑکی سے اندر جھانکو تو بیڈ پہ نیم دراز آبدار کتاب پڑھتی دکھائی دے رہی تھی۔ بال اسکارف سے آزاد' لمبے اور سرخ رنگ کے تھے۔ چمکتا ہوا سرخ بھورا رنگ۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پہ دھرا موبائل خاموش تھا۔ اس پہ ہاشم کی پچھلے سات دنوں میں سات کالز آئی تھیں جو اس نے نہیں اٹھائی تھیں۔ خاور کی ایک ہی تھی جو اس نے سن کر بے رخی سے صرف اتنا کہا تھا۔

"ابھی وہ دن نہیں آیا جب ہاشم کاردار مجھ پہ حکم چلا سکے' جب مرضی ہوگی چلی جاؤں گی۔" اور کھٹاک سے فون بند کر دیا تھا۔

اب بھی پڑھتے پڑھتے اس نے اچانک دراز کھولی اور وہ مڑا تڑا سا کاغذ نکالا۔ ہمن۔۔۔ اس کا کیا مطلب تھا؟ وہ الجھ کر اس تصویر پہ ہاتھ پھیرنے لگی۔

زیر زمین جاؤ تو سعدی کے کمرے کے باہر بنے لاؤنج میں ہاشم گہرے سوٹ' ٹائی اور مسحور کن پرفیوم میں لپٹا' ایک کرسی پہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھا تھا۔ جبکہ جواہرات وزدیدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی' پرس نیچے رکھتی' دوسری کرسی پہ بیٹھ رہی تھی۔ اس کے لبوں پہ مسکراہٹ مگر آنکھوں میں شدید کوفت تھی۔

سعدی سامنے آکھڑا ہوا تو وہ بروقت مسکرائی۔ نزاکت سے ماتھے پہ آئے بال انگلی سے پیچھے جھٹکے اور سر سے پیر تک اسے دیکھا۔

"تم کیسے ہو سعدی؟ مجھے خوشی ہے کہ تم نے درست راستے کا انتخاب دیر سے ہی سہی مگر کر لیا۔"

وہ سفید ٹی شرٹ اور نیلی جینز میں ملبوس تھا۔ چہرے پہ سنجیدگی اور آنکھوں میں نرمی تھی۔ ذرا سا مسکرایا۔

"میں ٹھیک ہوں مسز کاردار۔ کیا آپ نے مجھے کبھی مس کیا؟" پھر مقابل کرسی پہ بیٹھا اور ایک نظر ہاشم پہ ڈالی جو سنجیدہ اور سپاٹ نظر آرہا تھا۔

"کیوں نہیں... تم ہمارے بہت اچھے دوست تھے سعدی!"

"میں اب بھی آپ ہی کا دوست ہوں۔" اس نے جواہرات کی آنکھوں میں دیکھ کر یاددہانی کروائی۔

"کام کی بات پہ آؤ سعدی! تمہیں کیا چاہیے؟ ممی کو بمشکل میں نے ساتھ آنے پہ راضی کیا ہے۔ اگر اس میں پھر تمہاری کوئی گیم ہوئی تو..."

"شہرین کاردار... میری وکیل شہرین تھی۔" وہ تیزی سے بولا۔ "اس کو دی تھی میں نے ویڈیو کی ایک کاپی... نیلے رنگ کے لفافے میں ایک سی ڈی ہے جو encrypted ہے۔ اس نے اپنے کمرے کے لاکر میں رکھی تھی۔"

ہاشم بری طرح چونکا تھا۔ ٹانگ سے ٹانگ ہٹائی۔ ایک نظر جواہرات کو دیکھا جو دوسری جانب یک ٹک دیکھ رہی تھی۔ "میری ادھر کیا کر رہی ہے؟" میری کچن کی چوکھٹ پہ سر جھکائے کھڑی تھی۔

"شہری؟ شہری نے... تم سچ بول رہے ہو؟"

"میں جھوٹ نہیں بولتا، تمہیں پتا ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسی انداز میں بولا تھا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

"میری ادھر کیسے ہاشم؟" جواہرات کسی خواب کی سی کیفیت میں بولی تھی۔ بے یقین نگاہیں میری پہ جمی تھیں۔

"میری کو ہاشم نے میری دیکھ بھال کے لیے رکھ لیا ہے مسز کاردار... فکر نہ کریں... ہمارا بہت اچھا وقت گزر رہا ہے یہاں۔" مسکرا کر اطلاع دی تو جواہرات ایک دم گم صم سی اسے دیکھنے لگی۔

"کام کی بات پہ آؤ سعدی، تمہارا پیکج؟"

"میں نے آپ کو یہاں کچھ اور بتانے کے لیے بلایا ہے۔" ہاشم کے چہرے پہ برہمی ابھری۔

"تمہارے گیمز نہیں ختم ہوں گے، میں جا رہا ہوں۔" وہ بے زار سا کھڑا ہوا ہی تھا کہ سعدی نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تمہارے باپ کی موت طبعی نہیں تھی۔ اسے قتل کیا گیا تھا۔"

لمحے بھر کو ہر شے ساکت ہو گئی۔ باہر بہتا سمندر، تیز چلتی نم ہوا، ہاشم کی آنکھیں اور جواہرات کی دھڑکن۔

"کیا بکواس ہے یہ؟" وہ بیٹھا نہیں، انداز میں غصے سے زیادہ تعجب تھا۔

"تمہارے باپ کا چہرہ مرتے وقت بے حد سفید تھا۔ تم نے ڈاکٹر سے بھی پوچھا تھا مگر ڈاکٹر نے تم سے جھوٹ بولا۔ اس نے کہا، یہ **استھما** کی وجہ سے ہے۔" وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ لمحے بھر کے لیے بھی ہاشم کی آنکھوں سے نگاہیں ہٹائے بغیر... "مگر ڈاکٹر بک چکا تھا۔ تم نے بھی یقین کر لیا، کیونکہ تمہارے نزدیک یہ ناممکن تھا کہ تمہارے ناقابل تسخیر باپ کو، تمہارے دیوتا جیسے باپ کو کوئی قتل کر سکے۔ قتل تو ہم چیونٹیوں جیسے لوگ کیے جاتے ہیں۔ پیر کے نیچے مسلے جاتے ہیں۔ آج میں تمہیں بتاؤں گا کہ تمہارا باپ بھی قتل ہوا تھا۔"

جواہرات ایک دم کھڑی ہوئی۔ وحشت سے دور کھڑی میری کو دیکھا اور پھر سعدی کو جو ہاشم کے مقابل کھڑا تھا۔ اس نے ہاشم کا چہرہ دیکھا، وہ برہم تھا، متعجب تھا اور... اور وہ چونکا ہوا بھی لگتا تھا۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"تمہارے آفس آکر بھی تم سے سب سچ بولا تھا میں نے ہاشم۔ تم مجھے جانتے ہو۔ میں ثبوت اور گواہ دیکھ چکا ہوں، اسی لیے کہہ رہا ہوں، تمہارے باپ کو قتل کیا گیا تھا اور جانتے ہو کس نے قتل کیا؟ نہیں؟" وہ ہلکا سا مسکرایا، ایک سرد تپتی نگاہ سفید چہرے والی جواہرات پہ ڈالی۔

وہ نمک کا مجسمہ بنی کھڑی تھی۔ بے یقین، خوف زدہ۔ یہ کچھ کرنے کا وقت تھا۔ وہ بے ہوش ہو جائے، طبیعت خرابی کا کہہ کر ہاشم سے کہے کہ وہاں سے نکلیں... اسے سعدی کو خاموش کروانا تھا مگر وہ جانتی

تھی ہر بات بے سود تھی۔

"ہاشم! یہ جھوٹ بول رہا ہے' اس کی بات مت سنو۔" بدقت وہ بڑبڑائی۔ دل ڈوب رہا تھا مگر ہاشم نے نہیں سنا۔ اس کا غصہ کم ہو رہا تھا اور وہ چونک کر سعدی کو دیکھ رہا تھا۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"جاؤ' اپنے ڈاکٹر کی کنپٹی پہ پستول رکھو اور اس سے پوچھو کہ کس نے رپورٹ بدلنے کا حکم دیا تھا؟ وہ بھی اسی کا نام لے گا جس کا نام میں لوں گا' بتاؤں کون ہے وہ؟"

"ہاشم....." جواہرات کی آنکھوں میں آنسو آ ٹھہرے۔ وہ صرف ہاشم کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ وہ سعدی کی آنکھوں میں دیکھتے کسی ٹرانس میں تھا۔ وہ پُریقین نہیں تھا' مگر وہ شک میں تھا۔

"تم میرے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہے ہو' مجھے معلوم ہے سعدی!"

"مگر تمہاری آنکھیں کہہ رہی ہیں کہ تم اس شخص کا نام جاننا چاہتے ہو' تو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ کس نے قتل کیا تمہارے باپ کو۔" پھر سے ایک کاٹ دار نظر جواہرات پہ ڈالی۔ "تمہارے باپ کو اس نے مارا ہے' جس کے ساتھ تم ایک چھت تلے رہتے ہو۔ قاتل تمہارے گھر میں سے ہی ہے۔"

جواہرات کو لگا سعدی نے زنجیر کا پھندا اس کی گردن میں ڈال رکھا ہے اور اب آہستہ آہستہ زنجیر تھما رہا ہے۔ گویا کھینچنے ہی والا ہو۔

"کس کی بات کر رہے ہو؟"

"وہ جس کو تم سے محبت کا دعوا ہے..... تمہاری خیر خواہی کا دعوا ہے' تم سے دوستی کا دعوا..... جس پہ تم بہت اعتماد کرتے ہو..... اس نے تمہیں دھوکا دیا ہے ہاشم کاردار!"

جواہرات کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ اس کا سانس رک چکا تھا۔ گردن کے گرد زنجیر تنگ ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

"کون؟ کس کی بات کر رہے ہو؟" وہ بھی شک و شبے مگر تھمے سانسوں کے ساتھ سعدی کو دیکھ رہا تھا۔

سعدی ایک قدم مزید آگے بڑھا' ہاشم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکرایا۔ "خاور..... کرنل خاور نے قتل کیا ہے تمہارے باپ کو۔"

اور چند فلور اوپر..... بیڈ پہ نیم دراز سرخ بالوں والی لڑکی کاغذ کو دیکھتی ایک دم سیدھی ہو کر بیٹھی۔ اس کی بلی جیسی آنکھیں چمکی تھیں۔

"میں اسے غلط دیکھ رہی تھی' یہ کانٹا نہیں ہے۔" وہ دبے دبے جوش سے بڑبڑائی تھی۔ "یہ کراس ہے' صلیب ہے اور یہ لفظ..... یہ ہمن نہیں ہے..... یہ..... یہ ہامان ہے۔" اس کے ابرو اٹھے۔ "اور ہامان کون تھا؟"

وہ چونکی۔ "فرعون' موسیٰ کا وزیر..... اس کا دست راست..... اس کے سارے کام سرانجام دینے والا..... اس کی حفاظت کرنے والا۔" وہ متعجب ہوئی۔ اتنے دن بعد اس نے بالآخر وہ پیغام ڈی کرپٹ کر لیا تھا جو کہہ رہا تھا۔

"ہامان کو..... سولی چڑھا دو!"

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عینی ملک





## ناولٹ

"لاحول ولا قوۃ۔"

"کیا ہو گیا ہے مجید صاحب! اتنی دیر سے آپ ادھر سے ادھر' ادھر سے ادھر جلے پیر کی بلی کی طرح چکر لگا رہے ہیں' آخر ہوا کیا ہے؟"

"تمہاری بیٹی اور داماد کو دیکھ کے آیا ہوں' کیسی بے حیائی سے دونوں اپنی جوان جہان بیٹی کے ساتھ ریسٹورنٹ میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔" مجید صاحب بے حد غصہ میں تھے۔

"تو اس میں کیا بڑی بات ہے' وہ جاتے رہتے ہیں۔" شمع بیگم کو یہ بات فضول لگی۔

"جانے پر اعتراض نہیں کر رہا' ریاض نہ تو شہینہ کو پردے کا کہتا ہے اور نہ ہی ردا کو' جواد بھی باپ کے نقش قدم پر چل رہا ہے' اس کو بھی فرق نہیں پڑتا اور پھر ایسی جگہوں پر تو...."

"بس کریں' اب رہنے دیں' یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے' ویسے بھی آپ کی کون سنتا ہے۔ خوامخواہ غصہ کر کے اپنے آس پاس کے لوگوں کو بھی ٹینشن دیتے ہیں اور اپنی طبیعت بھی خراب کر لیتے ہیں۔"

مجید صاحب' شمع بیگم کو گھورنے لگے۔

"میں نے کیا کیا ہے' اب مجھے کیوں ایسے گھور رہے ہیں' اچھا میں وضو کر لوں' مجھے نماز پڑھنی ہے عشاء کی۔"

مجید صاحب انہیں جاتا دیکھتے رہ گئے۔

☆ ☆ ☆

مجید صاحب اور شمع بیگم کی چار اولادیں تھیں۔ سب سے بڑا ولید جس کی شادی مجید صاحب کی بہن کی بیٹی میمونہ سے ہوئی اور ان کے تین بچے تھے۔ سب سے بڑی سلیمہ' پھر فواد اور چھوٹی حلیمہ' دوسرے نمبر پر شہینہ تھی جو مجید صاحب کے بھائی کے بیٹے ریاض سے بیاہی ہوئی تھی اور اس کے دو ہی بچے تھے' بڑی ردا اور چھوٹا جواد' تیسرے نمبر پر جمیل تھا جو رخسانہ سے ماں باپ کی مرضی کے خلاف شادی کر لایا تھا اور سب سے چھوٹی نمرہ تھی' جو بی اے کے

امتحانات سے فارغ ہوئی تھی۔
"نمرہ۔۔۔"
"جی ابا جی۔۔۔" وہ دوپٹا درست کرتی مجید صاحب کے پاس آکر بیٹھ گئی۔
"نماز پڑھ لی۔"
"جی۔۔۔" اس نے جھوٹ بولا۔
"اچھا تمہارا رزلٹ کب آرہا ہے؟؟"
"جی پرسوں۔"
"خیر کل آئے یا پرسوں' بس تم نے جتنا پڑھنا تھا پڑھ لیا' اب تم گھر بیٹھ کر گھر کے کام کاج سیکھو۔" وہ سر جھکائے سنتی رہی' کہنا تو بہت کچھ چاہتی تھی مگر ابا جی کے سامنے منہ کھولنا مشکل تھا۔
"جاؤ چائے بنا کر لاؤ۔" انہوں نے رعب دار آواز میں کہا تو وہ بھاگ کر کچن میں آگئی۔
"کیا ہوا پھپھو' آپ اس طرح سے کیوں بھاگ رہی ہیں؟" علیمہ کے پوچھنے پر سانسیں درست کرتی نمرہ غصے سے لال پیلی ہوگئی۔
"تم سے میں نے کتنی دفعہ کہا ہے' مجھے پھپھو نہیں' آپی بولا کرو۔ کتنی بڑی ہوں میں تم سے' مشکل سے سات سال۔"
"اچھا اب ڈانٹیں تو نہ' یہ بتائیں بھاگ کیوں رہی تھیں؟؟"
"ہر بات بتانا ضروری ہے کیا؟ چلو دفع ہو جاؤ یہاں سے۔۔۔" علیمہ منہ بناتی کمرے میں آئی تو سوتی ہوئی سلیمہ کو دیکھ کر اور بھی غصہ آگیا۔
"اب اٹھ بھی جائیں آپی اور کتنا سوئیں گی۔" اس نے نمرہ کا غصہ اسے جھنجوڑ کر نکالنا چاہا۔
"کیا ہے' ابھی تو سوئی ہوں۔ ایک تو اس گھر میں کسی کو چین نہیں ہے۔ جب بھی سوتی ہوں کوئی نہ کوئی آکر اٹھا دیتا ہے۔" وہ غصے سے کہتی دوبارہ نیند کی وادیوں میں جانے ہی لگی تھی کہ علیمہ نے پھر اسے ہلا ڈالا۔ "تم یہاں سے جاتی ہو یا میں دو لگاؤں؟" اس نے آنکھیں نکالیں۔
بہن کے تیور دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "جاتی ہوں بابا' جا رہی ہوں' ایک تو اس گھر کے سارے لوگوں نے آج جیسے مرچیں چبا رکھی ہیں۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل آئی۔
"کیا ہوا؟ غصے میں کیوں ہو؟" ردا کی آواز پر علیمہ نے گردن گھما کر گیٹ کی طرف دیکھا جہاں سے وہ داخل ہو رہی تھی۔ "شکر ہے تم آئیں' میں کتنے دنوں سے تمہیں بلا رہی تھی۔ اتنی بور۔۔۔ ہو رہی تھی۔ یہاں تو کسی کو پروا نہیں' جسے دیکھو آنکھیں نکالے چلا آتا ہے۔"
"ارے ارے بریک تو لگاؤ۔ اب مجھے آرام سے بتاؤ ہوا کیا ہے؟؟"
"ہونا کیا ہے مت پوچھو' روز کی کہانی ہے۔ تم بتاؤ یہ اتنا پیارا سوٹ پہنا ہوا ہے' کب لیا؟" وہ اس کا سوٹ غور سے پکڑ کر دیکھنے لگی۔
"میرا رزلٹ آیا تھا تو ابو نے گفٹ دیا ہے۔ پچھلے ہفتے گئے تھے مارکیٹ۔" وہ خوش ہو کر بتانے لگی۔
"تب تو کھانا بھی باہر کھایا ہوگا۔"
"ہاں۔۔۔"
"کتنی لکی ہو تم' ہماری ایسی قسمت کہاں؟" علیمہ کے لہجے میں اداسی در آئی۔
"میں ابو کو کہوں' تو کپڑوں کے نام پر گھسے پٹے پرنٹ اٹھا لاتے ہیں' کبھی ساتھ لے کر نہیں گئے' جیسے میں بازار اٹھا کر لے آؤں گی۔"
"اچھا بس بس۔۔۔ چلو مجھے اچھی سی چائے پلاؤ۔" ردا نے علیمہ کو ٹوک دیا ورنہ اس کا ابو نامہ بہت دیر تک چلتا رہتا۔

☼ ☼ ☼

"اماں۔۔۔ آپ کہیں نا ابا سے' مجھے شہنہ آپا کے گھر جانے دیں' کچھ ہی دنوں کی تو بات ہے' اب تو میرا رزلٹ بھی آگیا ہے۔ ایک تو جھوٹے منہ بھی ابا نے مبارک باد نہیں دی' اوپر سے آپا کے گھر بھی نہیں جانے دیتے۔"
"ارے۔۔۔ ارے لڑکی۔۔۔ زبان کو لگام دے' کب

سے بولے چلے جارہی ہے' تمہارے باوا نے سن لیا نا' تو شامت آجائے گی۔" شمع بیگم نے جیسے اسے ڈرایا۔

"اماں... میں کہہ رہی ہوں' میں کل جاؤں گی آپا کے گھر بس..." وہ بھی نمرہ تھی۔

"اچھا شام کو آئیں گے تیرے ابا تو پوچھ لوں گی۔" شمع بیگم بھی بحث سے تنگ آچکی تھیں۔

"ہائے... میری پیاری اماں... تم کتنی اچھی ہو۔" وہ ماں کے گلے لگ گئی۔

"اب مکھن نہ لگا' چل جا ہنڈیا دیکھ۔"

وہ خوش ہوتی کچن میں آگئی۔ آج تو بات ہی کچھ اور تھی' ورنہ وہ کبھی بھی ہنڈیا کے لیے کچن میں نہ آتی۔ جب دونوں بھابھیاں ہوتیں تب تو بھول کر بھی نہ جاتی بلکہ کمرے سے ہی نہ نکلتی تھی مگر اب مجبوری تھی کہ بھابھیاں گھر پہ نہ تھیں۔ شام کو مجید صاحب آئے تو ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا گیا۔

"شمع! تمہارا دماغ تو ٹھکانے پر ہے۔"

ان کو یہی امید تھی' اس لیے پکا پروگرام بنا کر بیٹھی تھیں "لو اس میں دماغ خرابی کی کیا بات ہے۔ اب وہ اپنی بہن کے گھر بھی نہ جائے۔"

"مگر وہاں پر ریاض کا بھائی طارق بھی رہتا ہے' میں جوان بیٹی کو منہ اٹھا کر وہاں جانے کی اجازت کیسے دے دوں' تم میں کچھ عقل نہیں ہے تو مجھ سے ادھار لے لو' مگر کوئی ضرورت نہیں نمرہ کو وہاں بھیجنے کی' سمجھیں۔"

"بس بس... رہنے دیں... آپ کی نظر میں تو سارا زمانہ خراب ہے' سب کو ایک ہی بات سوجھتی ہے ان کو کوئی اور کام نہیں کیا' مجھے بھی پتا ہے' جوان بیٹی کی ماں ہوں' آج کل طارق کام کے سلسلے میں کسی دوسرے شہر گیا ہوا ہے' کچھ دن لگ جائیں گے اسے' اس لیے نمرہ آرام سے ہو آئے گی۔"

"اچھا تو یہ بات ہے' مجھے کیا پتا تھا' پہلے بتانا تھا نا۔" وہ نیم رضامند ہوئے۔

"آپ سنتے ہیں کسی کی۔" وہ دھیرے سے کہہ کر پان دان پر جھک گئیں۔

✵ ✵ ✵

"جمیل بھائی..." نمرہ نے جمیل کو آواز دی۔

"میں یہاں ہوں۔" اپنے کمرے میں بیٹھے چائے پیتے وہ وہیں سے بولے۔

"آفس جاتے ہوئے مجھے آپا کے گھر چھوڑ دیں گے؟"

"ارے یہ تو نہیں جاسکتے۔ پہلے ہی انہیں دیر ہورہی ہے' ہے نا جمیل۔" رخسانہ بھابھی اچانک سامنے آکر جمیل کو گھوری ڈال کے نند کو ٹکا سا جواب دے کر باقاعدہ مشورہ دینے لگیں۔ "تم ایسا کرو' ولید بھائی سے کہہ دو' وہ ویسے بھی سارا دن گھر میں فارغ ہی بیٹھے رہتے ہیں' گھر کے سارے کام تو جمیل کے ذمے ہیں' اب دیکھو نا..."

"اچھا ٹھیک ہے' میں ولید بھائی سے کہتی ہوں۔" اس نے بیچ میں ہی بھابھی کی بات کاٹی' کیونکہ فی الحال اتنی لمبی تقریر سننے کا اس کا کوئی موڈ نہیں تھا۔ اس نے وہاں سے نکلنے کی کی' ورنہ تو رخسانہ نان اسٹاپ شروع ہوجاتیں' جمیل یہ کرتے ہیں' جمیل وہ کرتے ہیں' اس گھر میں تو جمیل کی کسی کو پرواہ نہیں' یہی باتیں کر کرکے جمیل کو بھی گھر والوں سے بدظن کردیا تھا۔ وہ بھی ٹھہرے کانوں کے کچے' جی جی کرتے رخسانہ کی ساری سچی جھوٹی باتوں پر ایمان لے آتے تھے۔ رخسانہ تو کبھی غلط کہہ ہی نہیں سکتی۔

"حلیمہ! ولید بھائی کہاں ہیں؟"

"پھپھو وہ... او سوری آپی... ابو نہا رہے ہیں۔"

"تم کیا کررہی ہو؟"

"میں ردا کے گھر جارہی ہوں۔"

"کس کے ساتھ؟"

"ابو کے ساتھ..."

"ارے! مجھے بھی وہیں جانا ہے' میں اپنا بیگ لے کر آتی ہوں۔ تم کتنے دن رکو گی؟" حلیمہ ہنسنے لگی۔

"میں نے کوئی لطیفہ تو نہیں سنایا۔" نمرہ گھور کر پوچھنے لگی۔

''نہیں وہ دراصل آپ کو پتا تو ہے ابو کہیں بھی مجھے رات نہیں رکنے دیتے' پھر کیوں پوچھ رہی ہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' وہ خوشی خوشی بیگ لینے چل دی۔

☼ ☼ ☼

''ارے واہ... آج سورج کہاں سے نکلا ہے؟'' ردا' نمرہ اور حلیمہ کو دیکھ کر حقیقتاً'' خوش ہو گئی۔

''اب بکو مت...'' حلیمہ کے ساتھ ساتھ ردا بھی کھل کر مسکرا دی۔

''کس کے ساتھ آئی ہو؟''

''ابو کے ساتھ...''

''ارے ماموں اندر نہیں آئے؟'' وہ گیٹ کے باہر جھانکنے لگی۔

''نہیں... مجھے جب واپس لینے آئیں گے شام کو تو آ...''

''یہ کیا بات ہوئی۔ تم رکو گی نہیں؟''

اس سے پہلے حلیمہ کچھ کہتی نمرہ بے زاری سے بولی۔ ''اب یہیں کھڑی رہو گی یا اندر بھی جانے دو گی۔''

''نہیں... نہیں آئیں اندر...'' اس نے ایک طرف ہٹ کر راستہ دیا۔

''آپا کہاں ہیں؟''

''امی کی طبیعت ذرا ٹھیک نہیں تھی۔ وہ سو رہی ہیں۔''

''اچھا ذرا ناشتا تو بنا دو۔'' نمرہ نے حکم جھاڑا۔

''جی...'' وہ کہہ کر کچن میں آئی تو حلیمہ بھی آگئی ساتھ اس کی مدد کرنے کے لیے۔

''بڑی آئیں... ناشتا تو بنا دو' ہنہ مہارانی۔''

''بری بات نمرہ! خالہ کو برا لگ جائے گا' سن لیا تو...'' ردا' حلیمہ کو ٹوکنے لگی۔

''رہنے دو تم تو... لگتا ہے برا تو لگے اور تم اب انہیں خالہ نہ بلانا۔''

''کیوں...؟'' ردا ذرا حیران ہوئی۔ ''کہتی ہیں مجھے آپی بلاؤ۔ اس دن میں نے غلطی سے پھپھو کہہ دیا تو ایسی جھاڑ پلائی۔'' ردا ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی۔

''ہنسو اب تم بھی۔'' حلیمہ مصنوعی خفگی سے اسے گھورنے لگی۔

☼ ☼ ☼

''ردا! ناشتا نہیں بنا ابھی تک؟'' شہینہ نے ردا کو آواز دی۔

''لائی امی...'' اس نے وہیں سے آواز دی۔

''ارے تم دونوں کب آئیں؟'' شہینہ اپنے کمرے سے باہر آئیں تو نمرہ اور ردا کو ٹی وی دیکھتے پایا۔

''صبح ابو کے ساتھ آئے تھے۔ آپ کیسی ہیں؟''

''ٹھیک ہوں۔''

حلیمہ نے تو جواب بھی دے دیا مگر نمرہ ٹی وی کی اتنی شوقین کہ اسے نہ ہی شہینہ کی آمد کا پتا چلا اور نہ ہی حلیمہ کا شہینہ سے گفتگو کا۔

''نمرہ ناشتا کر لیا؟'' جب نمرہ نے کوئی نوٹس نہ لیا تو شہینہ خود ہی بول پڑیں۔

''جی... آپا آپ اٹھ گئیں؟'' وہ خجل سی ہوتی جواب دینے لگی۔

''تم یہ بتاؤ ابا نے تمہیں کیسے آنے دیا؟''

''ہائے نہ پوچھیں آپا... کس طرح اماں کو مکھن لگا کر ابا سے اجازت لی ہے۔ آپ کو پتا ہے میرا رزلٹ آگیا ہے۔ ابا نے مجھے مبارک باد بھی نہیں دی' اوپر سے آگے پڑھنے سے بھی منع کر دیا ہے' آپ کو تو پتا ہے وہاں ٹی وی بھی نہیں' میں تو سخت بور ہو جاتی ہوں اور...''

ردا نے ماں کو ناشتا دے کر حلیمہ کو اپنے کمرے میں آنے کا اشارہ کیا۔ ''بہت اچھا کیا جو بلا لیا۔''

''اچھا وہ کیوں؟'' ردا نے سوال کیا۔

''وہ اس لیے کہ گھر میں بھی نمرہ آپی کو سنو اور یہاں بھی ان ہی کی رام کہانی' دکھوں کی داستان سمیت سنو' اگر تم مجھے نہ بلاتیں تو قسم سے...''

''شش... بری بات...'' ردا نے ہونٹوں پر انگلی رکھ

کرا سے منع کیا۔

"ایک تو تم بھی نا، تمہیں ایم بی بی ایس نہیں کسی اسلامک یونیورسٹی سے ماسٹرز کرنا چاہیے تھا۔ تم اور تمہارے اقوال زریں۔۔۔" حلیمہ کے منہ پھلا کر جھنجلانے پر ردا کھلکھلا کر ہنس دی۔

✡ ✡ ✡

نمرہ کا دل ابھی تک اتھل پتھل ہو رہا تھا۔

شہینہ کے کہنے پر وہ ٹیرس سے کپڑے اتارنے گئی تو طارق اپنے کمرے سے نکل کر باہر آگیا۔ وہ کپڑے اتار کر مڑی تو طارق سے ٹکرا گئی اور طارق کے آنکھ مارنے پر تو بری طرح گھبرا گئی اور نیچے کی طرف دوڑ لگا دی۔

وہ سخت جھنجلائی ہوئی تھی۔ "یہ کہاں سے آگیا، ابا کو پتا چل گیا تو ابھی مجھے واپس بلوالیں گے۔ کیا مصیبت ہے۔ اسے بھی ابھی آنا تھا، دو دن بعد آتا تو اس کا کیا چلا جاتا۔ اوپر سے دیدہ دلیری دیکھو۔ اس کی شکایت تو آپا سے کروں گی۔"

شام کو ریاض کے آنے سے پہلے شہینہ جلدی جلدی کھانا بنانے میں مصروف تھیں، ردا اسپتال میں ڈیوٹی کرنے گئی تھی اور جواد شام کو اکیڈمی جاتا تھا۔ نمرہ ٹی وی میں مگن ارد گرد سے بے نیاز، اتنا بھی نہیں کہ بہن کا ہاتھ ہی بٹا دے۔

"اے نمرہ۔۔۔ شش۔۔۔ شش۔۔۔" طارق نے اس کا کندھا ہلایا تو وہ اچھل پڑی۔

"ایک منٹ اوپر آؤ۔" وہ کہتا اوپر چلا گیا۔

"اس کو تو آج بتاتی ہوں۔ سمجھتا کیا ہے خود کو۔" یہی باتیں سوچتی وہ دھپ دھپ کرتی سیڑھیاں چڑھ گئی۔

"کیا ہے؟" وہ غرائی۔

"تم تو جنگلی بلی کی طرح غراتی ہو۔"

"یہی بتانے کے لیے بلایا تھا؟" وہ غصے سے کمر پر ہاتھ رکھے اس سے پوچھنے لگی۔

"نہیں۔" وہ ایک دم سنجیدہ ہوا۔ "نمرہ! تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ جب سے میں نے تمہیں دیکھا ہے یقین مانو مجھے اپنی زندگی خوب صورت لگنے لگی ہے، میں تمہیں چاہنے لگا ہوں، تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں کیا تم مجھ سے شادی کرو گی۔" اور اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

نمرہ نے ایسا پہلی بار سنا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ دنیا کی سب سے خوش قسمت لڑکی ہے، جسے اتنی شدت سے چاہا جا رہا ہے، بچپن سے وہ پیار کو ترسی ہوئی تھی گھر کے ماحول میں ایک جھجک، کھنچاؤ، تنگ نظری اور سختی تھی۔ کوئی کام سچی نیت سے بھی کیا جاتا تو شک کی ایسی عینک لگا کر دیکھا جاتا کہ کرنے والا مجرم سا ہو جاتا۔ وہ اتنی توجہ اور محبت کے رسیلے بول سن کر پگھل سی گئی اور شرما کر دھیرے سے اپنا ہاتھ طارق کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

✡ ✡ ✡

"طارق تم آج کل کچھ زیادہ ہی گھر پر رہنے نہیں لگ گئے؟"

شہینہ کے پوچھنے پر پانی پیتے طارق کو اچھو لگ گیا۔ وہ کچھ دیر بعد سنبھل کر بولا۔

"جی بھابھی! بس آج کل فیکٹری میں زیادہ کام نہیں ہے، آج لگاؤں گا چکر۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ دراصل تمہارے بھیا پوچھ رہے تھے۔"

وہ طارق سے کہہ کر نمرہ سے مخاطب ہوئیں۔

"ابا کا فون آیا تھا نمرہ۔"

"اچھا! کیا کہہ رہے تھے؟" وہ اب یہاں سے دور جانے کے خیال سے ہی پریشان ہو رہی تھی۔

"کہہ رہے تھے نمرہ کو بھیج دو۔"

"تو آپ نے کیا کہا؟"

طارق اور نمرہ سانس روکے شہینہ کو دیکھنے لگے۔

"مجھے کیا کہنا تھا، میں نے کہا اچھا بھیج دیتی ہوں۔" نمرہ کے ساتھ ساتھ طارق کا بھی چہرہ اتر گیا۔

"طارق ایسا کرو، تم نمرہ کو چھوڑ آؤ۔"

"میں۔۔۔؟" طارق نے بن کر پوچھا۔
"ہاں ہاں تم۔۔۔ آج بھی اسے نہ بھیجا گھر تو ابا خود ہی آجائیں گے۔ تم پلیز چھوڑ آؤ۔"
"چلیں جیسا آپ کہیں۔"
گاڑی میں بیٹھتے ہی طارق نے رومانوی گیت لگا دیے۔
"میں سوچ رہا ہوں پہلے تمہیں مزے دار سا لنچ کراؤں اور پھر گھر چھوڑ دوں' کیوں' کیا خیال ہے؟" وہ شوخ نظروں سے اسے دیکھ کر پوچھنے لگا۔
اس نے کبھی زندگی میں کہیں باہر لنچ نہیں کیا تھا' یہ سن کر اسے اپنی تمام تر محرومیاں یاد آگئیں اور زور سے ہاں میں سرہلا دیا۔
"کم آن یار! ہمیں قسمت سے موقع ملا ہے اور تم ہو کہ کچھ بولتی ہی نہیں' صرف سرہلانے پر اکتفا کیا ہوا ہے' ایسا کیسے چلے گا۔"
"اچھا جی۔۔۔"
دونوں اپنے آنے والے کل سے بے خبر ریسٹورنٹ میں لنچ انجوائے کرنے لگے۔

☆ ☆ ☆

"رخسانہ! تمہاری ماں نے تمہیں تمیز نہیں سکھائی۔" شمع بیگم' بہو پر بگڑ رہی تھیں۔
"رہنے دیں اماں! آپ کو تو اپنی اولاد کا پتا نہیں اور چلی ہیں میری اماں کی تربیت پر انگلی اٹھانے' کچھ بھی کہنے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانک لیں۔"
"ہاں ٹھیک کہا تم نے۔۔۔ اپنی اولاد اچھی ہوتی تو تم جیسی کو بیاہ کر ہمارے سروں پر نہ بٹھاتی جو پہلے دن سے ہمارے سینوں پر مونگ دل رہی ہے۔"
بس شمع بیگم نے تو اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔ رخسانہ سدا کی زبان دراز تو تھی' یہ کیسے برداشت کرلیتی اور سارے لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے ہاتھ نچا نچا کر جاہل عورتوں کی طرح شمع بیگم کی جان کو آگئی۔
"آپ کو صرف جمیل کی غلطیاں نظر آتی ہیں' اپنی لاڈلی بیٹی کا بھی کچھ پتا ہے' جو بازاروں میں پرائے مرد کے ساتھ گلچھرے اڑاتی پھر رہی ہے' باپ کی اتنی بڑی داڑھی ہے' ماں اسلامی اور اخلاقی درس دیتے نہیں تھکتی اور بیٹی کے کرتوت تو خدا کی پناہ۔۔۔" پہلے اسے لگام ڈالیں' پھر میرے یا میرے گھر والوں کی تربیت کی بات کریں۔"
"یہ کیا کہہ رہی ہو رخسانہ۔۔۔"
میمونہ بے چاری سارے معاملے سے بے خبر کچن سے نکلی تو رخسانہ کی زہرخند باتیں سن کر ہکا بکا رہ گئی۔
"ٹھیک کہہ رہی ہوں' میں نے خود نمرہ کو طارق کے ساتھ ریسٹورنٹ میں لنچ کرتے دیکھا ہے' دونوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اور۔۔۔"
"بس چپ ہو جاؤ۔" مجید صاحب کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ وہ کب سے رخسانہ کی بکواس سن رہے تھے۔ یہ سن کر تو وہ آگ بگولا ہو کر باہر نکل آئے۔
"مجھے تو آپ چپ کرادیں گے' دنیا کو' لوگوں کو کیسے چپ کراتے پھریں گے۔" اس نے چیخ کر کہا۔
"رخسانہ تم اپنے کمرے میں چلو۔" میمونہ کے کہنے پر وہ تن فن کرتی کمرے میں گھس گئی۔
"جارہی ہوں' اپنی لاڈلی کی فکر اور خبر کریں۔ بڑے آئے' اسلام کے پیروکار' ہنہ۔۔۔"

☆ ☆ ☆

"لو آگئیں میڈم۔۔۔ تم۔۔۔ دل بھر گیا تمہارا۔۔۔؟" شمع بیگم نے کاٹ کھانے والی نظروں سے نمرہ کو سر سے لے کر پاؤں تک گھورا۔
"کہاں سے آرہی ہو تم؟" وہ گم صم سی کھڑی باپ کا سوال سن کر سوچ میں پڑ گئی۔
"میں نے کہا۔ کہاں سے آرہی ہو؟" اس بار مجید صاحب غصے سے بلند آواز میں بولے۔
"جی۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔ وہ۔۔۔"
"میں۔۔۔ میں کیا کرتی ہے' سیدھی طرح بک' کہ یار سے مل کر آرہی ہے۔"
"اماں۔۔۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"ماں کو کیا دیکھتی ہو' تم کو ذرا بھی شرم نہیں آئی میری پگڑی اچھالتے ہوئے' اسی وقت سے ڈرتا تھا۔ تمہیں اس لیے شہنہ کے گھر نہیں جانے دیتا تھا' آج تمہاری وجہ سے مجھے جو باتیں سننی پڑی ہیں نا' دل تو کہتا ہے تمہیں گولی مار دوں۔" یہ کہتے وہ تیزی سے نمرہ کی طرف بڑھے تو شمع بیگم نے روک لیا۔

"کیا کر رہے ہیں' جوان اولاد پر ہاتھ اٹھائیں گے۔"

تم خاموش رہو' تمہاری وجہ سے یہ دن دیکھنے پڑ رہے ہیں۔ تم نے ہی اسے شہنہ کے گھر جانے کی اجازت دی تھی۔ اب بھی تم اسی کی طرف داری کر رہی ہو' اگر جوان اولاد پر پہلے ہی ہاتھ اٹھایا ہوتا تو آج ایسا کچھ نہ ہوتا۔ میں کہے دیتا ہوں شمع بیگم اسے کہو باز آجائے' ورنہ میں اسے زندہ زمین میں گاڑھ دوں گا۔" وہ کہتے باہر کی طرف چلے گئے۔

اور نمرہ کھڑی سوچنے لگی کہ ابھی تو پیار کی پہلی کونپل ہی دل میں پھوٹی تھی اور قسمت نے کیسے اسے رسوا کر ڈالا تھا۔ ابھی تو وہ ٹھیک سے پیار کے جذبے کو پہچان بھی نہیں پائی تھی۔ کہ اس پر انگلیاں اٹھ گئی ہیں اسے اپنی غلطی کا احساس بھی تھا۔ جو اس نے طارق کے ساتھ لنچ پہ جا کر کی تھی۔

رات کو وہ خاموشی سے مجید صاحب کا موبائل اٹھا کر چھت پر آ گئی۔

"طارق... طارق یہ کیا ہو گیا' میں تو... میں تو..."

وہ ہچکیوں سے رو دی۔

طارق کے پوچھنے پر اس نے سب بتا دیا۔ پھر میٹھی میٹھی باتوں نے نمرہ کے دل پر مرہم رکھ دیا اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اس کے دکھائے سپنوں میں کھونے لگی۔

☆ ☆ ☆

"مجھے کم از کم تم سے یہ امید نہیں تھی ریاض..." مجید صاحب خفا خفا سے داماد سے شکایت کرنے لگے۔

"چاچا جی میں نے کیا کیا ہے؟"

"انجان مت بنو' تم اپنے نکمے بھائی کے لیے میری نمرہ کا رشتہ کس منہ سے لے کر آئے ہو؟ میری نمرہ نے بی اے کیا ہے اور طارق میٹرک فیل' کام کاج وہ نہیں کرتا' دل کیا تو تمہاری فیکٹری میں چلا گیا' ورنہ آوارہ گردی' کیا میں کچھ نہیں جانتا؟"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں' مگر آپ یہ بھی تو دیکھیں دونوں کی مرضی اسی میں ہے اور پھر..."

"میری بچی کا نام نہ لو۔"

"کیسے نہ لوں... اگر صرف طارق کی خواہش ہوتی تو میں کبھی بھی سوالی بن کر نہ آتا۔ اب جبکہ نمرہ بھی یہی چاہتی ہے تو میرے خیال سے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی شادی کر دیں' ورنہ جوان اولاد جب ضد باندھ لے تو انجام بہت برا ہوتا ہے چاچا جی۔"

"مجھے مت سکھاؤ ریاض۔ میں نے دنیا دیکھی ہے' تم اپنی اولاد کی فکر کرو۔ تم نے جس طرح کی آزادی ردا اور جواد کو دے رکھی ہے نا' ایک دن پچھتاؤ گے' جواد سارا سارا دن گھر سے باہر ہوتا ہے' ردا بھی اسپتال کے بہانے نہ جانے کہاں کہاں جاتی ہے۔"

ریاض یہ سن کر ایک دم کھڑے ہو گئے۔ "بس چاچا جی! آپ بڑے ہیں' کچھ بھی کہہ سکتے ہیں مگر میرے بچوں کے کردار کے بارے میں ایک لفظ بھی کہنے کی میں کسی کو اجازت نہیں دوں گا۔"

"لگی نہ چوٹ دل پر... مجھے بھی اسی طرح لگی ہے۔" مجید صاحب بھی کھڑے ہو گئے۔

"آپ کو چوٹ آپ کی اولاد کی دی ہوئی ہے۔ اس میں کسی اور کا کوئی قصور نہیں۔ آپ کی مرضی' آپ نمرہ کا رشتہ دیں یا نہ دیں مگر میرے بچوں کے بارے میں برائے کرم کچھ نہ کہیں۔"

یہ کہہ کر وہ تو چلے گئے مگر مجید صاحب کو سوچنے پر مجبور کر گئے۔

"کیا کہا ریاض نے؟" شمع بیگم نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

"رشتہ لے کر آیا تھا نمرہ کا طارق کے لیے' میں نے انکار کر دیا۔"

''آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا' کیوں خود کو رسوا کرانے پر تلے ہیں۔''

''اب اس سے زیادہ کیا رسوائی ہوگی' تم نمرہ سے کہہ دو' شادی کر رہا ہوں میں اس کی' اب مزید کچھ سننے اور سہنے کی ہمت نہیں مجھ میں۔''

وہ اپنا حتمی فیصلہ سنا کر چائے پینے لگے۔

☼ ☼ ☼

''نمرہ! خدا کا واسطہ ہے تمہیں' کیوں تنگ کر رہی ہو ہمیں' میرے سفید بالوں کو دیکھو' جہاں تمہارے ابا کہتے ہیں شادی کر لو۔'' شمع بیگم نے بیٹی کے آگے ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔

''کبھی بھی نہیں' میں شادی کروں گی تو صرف طارق سے۔''

''سارے جگ میں تو ہمیں بدنام کر چکی ہو' کیا چاہتی ہو اب تم' مر جائیں ہم سب' جس طرح سے تمہارے عشق کے قصے سب کی زبانوں پر ہیں' قسم سے جی چاہتا ہے کہیں ڈوب مروں اور تم جس کی شہ پر ہم سے لڑ رہی ہو وہ ایک نمبر کا آوارہ لفنگا ہے' نہ دین کا پتا ہے' نہ دنیا کا۔ خدا کے لیے ہوش میں آجاؤ بیٹی' زندگی گزارنے کے لیے صرف محبت کافی نہیں ہوتی۔''

شمع بیگم اب رونے لگیں کہ شاید نمرہ کا دل پسیج جائے مگر نہیں' وہ جس راستے پر قدم رکھ چکی تھی وہاں سے واپسی ناممکن تھی۔

''آپ مجھے مت بتائیں زندگی گزارنے کے لیے کیا ضروری ہے' کیا نہیں اور طارق جیسا بھی ہے میں نے اسے چاہا ہے' آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا اسے برا بھلا کہنے کا۔''

''اچھا اب ہمارا حق بھی ختم ہو گیا ہے۔'' شمع کے دل پر جیسے چھریاں سی چل گئیں۔

''آپ مجھے ایموشنل بلیک میل نہ کریں' میں نے کہہ دیا نا' میں شادی کروں گی تو صرف طارق سے۔ اگر آپ لوگوں نے میرے ساتھ زبردستی کی تو میں خودکشی کر لوں گی یا پھر عین نکاح کے وقت انکار کر دوں گی۔ پھر بچاتے رہیے گا اپنی جھوٹی انا اور عزت۔''

شمع بیگم کے پیروں سے تو جیسے زمین ہی نکل گئی' وہ شدت غم سے صرف اتنا کہہ پائیں۔

''نمرہ تم اتنی بے حس ہو چکی ہو کہ تمہارے لیے باپ کی عزت بھی معنی نہیں رکھتی؟''

''اسے اور مت سمجھاؤ شمع۔ یہ نہیں سمجھنے کی' ہماری عزت پر جو داغ لگنا تھا لگ گیا' ٹھیک کہتا تھا ریاض' جوان اولاد جب ضد پر آئے تو نتیجہ برا ہی ہوتا ہے' تم ریاض کو فون کر کے ہاں کہہ دو' اگلے ہفتے ہی اس بدنامی کے ڈھیر کو رخصت کرا کے لے جائیں۔''

مجید صاحب جیسے ہار گئے تھے اور کر بھی کیا سکتے تھے۔

یہی طریقہ رہ گیا تھا اپنی بچی کچی عزت بچانے کا۔ اولاد کا درد خدا کسی کو نہ دکھائے۔ ان سب باتوں سے نمرہ بے نیاز دل ہی دل میں خوش ہو کر طارق کو داد دینے لگی۔ ''ٹھیک کہتے تھے' ایک دو دن سختی کریں گے' پھر مان جائیں گے' مان گئی آپ کو طارق۔''

☼ ☼ ☼

''اب آیا نا اونٹ پہاڑ کے نیچے' بڑے آئے تھے مجھے کوسنے کہ پسند کی شادی کی ہے' میمونہ خاندانی بہو ہے' میں تو صرف جمیل کی پسند ہوں' اب پتا چلا اپنی بیٹی نے کیسے منہ کالا کروایا۔''

''بس کرو رخسانہ۔'' میمونہ اس کی باتیں اور نہیں سن سکتی تھیں۔

''آپ تو رہنے دیں میمونہ بھابھی' آپ نہیں دیکھتی تھیں کہ میرے ساتھ کیسا سلوک کرتے تھے سب' سچ ہے اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔''

''بس رخسانہ اب ایک بھی اور لفظ کہا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ سبزی کی ٹوکری اٹھا کر کچن میں چلی گئیں۔

''مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' دیکھ لوں گی آپ کو ذرا انتظار فرمایئے۔ ذرا اس ڈرامے کا تو مزا اٹھا لوں پھر

آپ کو کیسے میں دن میں تارے دکھاتی ہوں۔"
وہ جاتی ہوئی میمونہ کی پشت دیکھ کر یہ سب خرافات سوچنے لگی۔

☼ ☼ ☼

فواد اور طارق شادی کی شاپنگ کرکے ریسٹورنٹ میں کھانا کھا رہے تھے۔
"یار فواد! تم کیا کہتے ہو، نمرہ سے شادی کرنا کیسا رہے گا؟"
"طارق بھائی سچی سچی بتاؤں؟"
"ہاں نا یار..."
"میری مانیں تو بچ جائیں پھپھو سے۔"
"تمہاری نمرہ سے نہیں بنتی کیا؟"
"میری نہیں بنتی؟ ان کی تو کسی سے نہیں بنتی، ہر وقت رعب جھاڑنا، اپنی منوانا، ضد کرنا، سب گھر والوں کا جینا دوبھر کیا ہوا ہے، آپ مہربانی کرکے اپنی امانت جلد از جلد لے جائیں۔"
پہلے تو وہ فواد کی باتیں ہونقوں کی طرح سنتا رہا اور پھر زوردار قہقہہ لگایا۔ "مذاق اچھا کرلیتے ہو۔"
"ارے تو آپ کو مذاق لگ رہا ہے؟" فون کی بیل پر طارق فون اٹینڈ کرنے دور جا کھڑا ہوا۔
"طارق بھائی تو گئے کام سے۔" وہ سر جھٹک کر بریانی پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

مہندی کے فنکشن کے لیے حلیمہ اور روا نے ایک جیسے لہنگے بنوائے تھے
دونوں جب شیشے کے کام والی چولی، چنری لی سبز، لال اور پیلی اوڑھنی اور اس کے ہم رنگ لہنگے کے ساتھ، پراندہ ڈال کر پائل چھنکاتی باہر آئیں تو سب ان کی طرف متوجہ ہوگئے۔ وہ بہت ہی پیاری لگ رہی تھیں۔ روا نے دوپٹا اسٹائل سے سیٹ کیا ہوا تھا مگر حلیمہ باپ کے ڈر سے سر پر لیے ہوئے تھی۔
گھر میں کسی قسم کی سجاوٹ نہ تھی۔ ایک تو ان چاہی شادی اور دوسرا نہ ہی گھرانہ... مگر نہ جانے کیسے نمرہ نے اپنی دوست سے کہہ کر ڈیک کا انتظام کرالیا اور بہت ہی دھیمی موسیقی کی آواز پر حلیمہ اور روا رقص کرنے لگیں مگر اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ مردانے میں آواز نہ جائے۔
اس کے بعد رسمیں ہوئیں۔ مہندی لگائی گئی۔ پھر کھانا کھلایا گیا۔ روا کھانا کھا کر پانی کی تلاش میں کچن میں چلی آئی۔

نگاہوں نے چھیڑا ہے دل کا ترانہ
سن کر کہیں نہ تم برا مان جانا

میں نے کیا ہے پیار
پہلی بار...

وہ اچھل کر مڑی تو فواد غلیظ نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ وہ جانے لگی تو وہ دروازے کے آگے آگیا۔
"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" وہ ماتھے پر بل ڈال کر گویا ہوئی۔
"اچھا! تو بلی کو بولنا بھی آتا ہے۔" وہ دانت نکالے اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔
"فواد بھائی... آپ ہٹتے ہیں یا..."
"ابھی بھی فواد بھائی..." وہ اس کے غصے کو خاطر میں لائے بغیر معنی خیز انداز میں بولا۔ "میں تمہیں بتاتا ہوں کہ مجھے کیا بولو؟"
اس کے ساتھ ہی ایک زناٹے دار تھپڑ فواد کا گال لال کر گیا۔
"آپ نہیں، میں آپ کو بتاتی ہوں، آپ کی اصلیت، آپ کو شرم نہیں آتی، اپنے ہی گھر کی عزت کو بے عزت کرتے ہوئے، ایک نمبر کا آوارہ، لفنگا اور بے غیرت..."
"خاموش..." وہ چلایا۔
"چلائیں مت... چلانا مجھے بھی آتا ہے، مگر میں آپ کی طرح نہیں ہوں۔ مجھے اپنی عزت کے ساتھ ساتھ اس گھر کے لوگوں کی عزت بھی جان سے پیاری ہے، ارے آپ کو کیا پتا عزت کیا ہوتی ہے، گھٹیا لوگ کبھی سمجھ بھی نہیں سکتے، اگر آئندہ میرے ساتھ بدتمیزی کی یا پھر کچھ ایسا ویسا کرنے کا سوچا بھی۔ تو میں

آپ کا منہ توڑ دوں گی' سمجھے آپ۔"

اور زور سے اپنا ہیل والا جوتا فواد کے پاؤں کے انگوٹھے پر مار کر تن فن کرتی وہاں سے بھاگ گئی۔

اور فواد بلبلا کر نیچے جھک گیا اس کے انگوٹھے سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔

"کم از کم اگلی بار کسی شریف لڑکی کو ایسا کہنے سے پہلے ہزار بار تو سوچے گا' بے غیرت نہ ہو تو۔" وہ سوچتی رہی اور کڑھتی رہی۔

کچن کے باہر کھڑے ولید صاحب یہ سب سن کر ایسے ہو گئے تھے کہ جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

"ابا نے ہمیشہ ہمیں اسلام کے قوانین کی پابندی سکھائی ہے اور آگے ہم نے بھی وہی چیز اپنے بچوں میں منتقل کی ہے تو پھر کہاں کمی رہ گئی تربیت میں۔ میں ریاض کو ماڈرن سمجھتا تھا۔ ردا کو بھی ویسا ہی نمرہ تو اپنی حدود جانتی ہے' اسے سب اچھے برے کی تمیز ہے' میں نے بھی اپنے سب بچوں کو یہی سکھایا ہے تو پھر کہاں غلطی ہو گئی مجھ سے؟"

وہ ساری رات سوچتے رہے مگر کوئی سرا ہاتھ نہ آیا۔

☆ ☆ ☆

شادی کے بعد طارق اور نمرہ بہت ہی خوش تھے۔ انہیں اپنی زندگی کسی فلم کی کہانی سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ جو چاہا وہ پایا بلکہ دنیا سے چھینا... ان کی خوشی ان کے چہروں سے عیاں تھی۔

"طارق ہم ہنی مون پر کہاں جائیں گے؟" وہ بڑے لاڈ سے پوچھنے لگی۔

"نمرہ مجھے یہ سب فضول خرچی لگتی ہے۔" وہ اخبار دیکھتے ہوئے بولا۔

"یہ کیا بات ہوئی طارق؟ آپ لے چلیں نا ہم کون سا روز روز جائیں گے۔"

"نمرہ ضد نہ کرو' ایک تو سرا سر وقت کا زیاں ہے اور دوسرا میرے پاس اتنی فرصت نہیں اور پھر ابھی شادی میں اتنا خرچا ہو گیا ہے۔" وہ رسان سے اسے سمجھانے لگا۔

"وقت کا زیاں' طارق آپ کون سی جاب کرتے ہیں جو وقت ضائع ہو گا۔"

"تم مجھے بے روزگاری کا طعنہ دے رہی ہو؟" اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"جو ہو ہی بے روزگار' اسے طعنہ کیا دیا جائے۔"

"تم کتنی بدزبان ہو۔"

"کیا' کیا کہا آپ نے... میں بدزبان ہوں' میں... میری خامیاں نظر آ رہی ہیں' اپنی بے روزگاری بلکہ نکما پن نظر نہیں آتا۔" وہ بھی غصے سے دوبدو بولی۔

"نمرہ خاموش ہو جاؤ' ورنہ..."

"ورنہ کیا... کیا کریں گے آپ؟"

"ٹھیک کہتا تھا فواد..."

"اب یہ فواد بیچ میں کہاں سے آ گیا۔ اسے چھوڑیں' مجھے ہنی مون پر لے جا رہے ہیں یا نہیں۔"

وہ جیسے فواد کے ذکر سے بدمزہ ہو گئی تو دو ٹوک انداز سے پوچھنے لگی۔

وہ بھی طارق تھا۔

"نہیں..." یہ کہہ کر وہ تو کمرے سے باہر چلا گیا مگر وہ غصے سے دانت پیستی بیگ لے کر گھر پہنچ گئی۔

"ارے نمرہ تم! کتنے دن رہو گی یہاں؟" شمع بیگم نے پھولے ہوئے بیگ پر نظر ڈال کر پوچھا۔

"ہاں... اور میرے آتے ہی آپ کو واپسی کی فکر ہو رہی ہے۔ میں یہاں رہنے نہیں آ سکتی کیا؟"

"آؤ... ہزار بار آؤ مگر..."

"کیا مگر اماں... میں طارق سے ناراض ہو کر آئی ہوں' آپ کو میرا یہاں آنا اچھا نہیں لگا تو واپس چلی جاتی ہوں۔"

شمع بیگم ہکا بکا رہ گئیں۔

"دن ہی کتنے ہوئے ہیں تمہاری شادی کو لڑکی اور ناراضگیاں بنا کر آ گئی ہو' ناس پیٹی' ہمیں مار کے ہی دم لے گی' لوگ کیا کہیں گے' محبت کی شادی کی اور دوسرے دن ہی واپس آ گئی۔"

"ایک تو لوگوں کی ہر وقت پروا ہے' میری نہیں۔" وہ کمرے میں کنڈی لگا کر روتے روتے سو گئی۔

☆ ☆ ☆

"سلیمہ...... تم آج کل چچی کے کمرے میں کچھ زیادہ نہیں جانے لگ گئیں؟"

"کیا مطلب امی! وہ میری چچی ہیں' میں ان سے بات بھی نہیں کر سکتی؟" وہ الٹا ان سے ہی پوچھنے لگی۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا' پہلے تو تم نہیں جاتی تھیں' خیر...... مجھے تم سے ضروری بات کرنی تھی۔"

"جی کہیں......"

"آج شام کو تمہیں دیکھنے کچھ لوگ آرہے ہیں' تیار ہو جانا۔"

"کیا......" اسے شاک لگا۔

"اماں میں عادل سے شادی کروں گی۔"

"کیا؟" اس بار میمونہ کو شاک لگا۔

"تمہارا دماغ چل گیا ہے کیا؟ اس لیے چچی سے دوستیاں بڑھ رہی تھیں۔" میمونہ تو جیسے ہل کے نہیں دے رہی تھیں۔

"اس میں دماغ خراب ہونے کی کیا بات ہے؟"

"سلیمہ! وہ شادی شدہ ہے' اس کے تین بچے ہیں۔" میمونہ نے جیسے حقیقت بتائی۔

"تو کیا ہوا؟" اسے جیسے کوئی پروا نہ تھی۔ میمونہ کے پیروں سے اب "حقیقتاً" زمین نکل گئی۔

"رخسانہ نے اپنا رنگ دکھا دیا تھا۔" ایک ذرا سی بات پر' صرف رخسانہ کو چپ کرانے پر اس نے اس کی بیٹی کی زندگی خراب کر دی۔ میمونہ کا دماغ بالکل ماؤف ہو چکا تھا۔ ان کو آخری سوجھا۔

"سلیمہ...... شام کو مہمان آرہے ہیں۔ چپ چاپ آجانا' اگر کوئی گڑبڑ کی تو میرا مرا منہ دیکھو گی' میں تمہیں بھی زہر دے دوں گی اور خود بھی زہر کھا لوں گی' سمجھیں تم......" انہوں نے فیصلہ سنا کر حلیمہ کو سلیمہ کی نگرانی پر مامور کر دیا۔

شام کو بخیر و عافیت سب طے پا گیا۔ سلیمہ ان کو پسند آگئی اور لڑکے کی باہر جاب ہونے کی وجہ سے جلد شادی کی تاریخ بھی رکھ دی گئی' بظاہر سب ٹھیک تھا مگر میمونہ کو ڈر تھا کہ رخسانہ کوئی گڑبڑ نہ کر دے۔

ولید صاحب سے میمونہ کی پریشانی چھپ نہ سکی۔ پوچھنے پر اس نے سب شوہر کو بتا دیا۔

☆ ☆ ☆

طارق' نمرہ کو منا کر لے گیا' اس شرط پر کہ وہ اسے مری' سوات وغیرہ لے جائے گا۔ وہ وہاں سے گھوم کر آئے تو نمرہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

"میں نہ کہتی تھی کہ مزہ آئے گا مگر آپ تو......"

"اچھا بس بس' چائے پلاؤ ذرا۔" وہ چائے بنا کر لائی۔

"میں سوچ رہی تھی طارق کہ کیوں نا ہم الگ گھر لے لیں۔"

"کیا؟" اس کا چائے کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ رک گیا۔

"اس میں حیرانی کی کیا بات ہے؟"

"نمرہ! تمہیں نہیں پتا میرا۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔"

"آپ کے پاس ہوتے کب ہیں' ڈھنگ سے کوئی جاب کریں تب نا۔ پڑھے لکھے بھی نہیں مگر ریاض بھائی کی فیکٹری میں بھی آپ کو پتا نہیں کیا تکلیف ہے۔"

"تم مجھے یہ بتاؤ' تمہیں یہاں کیا تکلیف ہے۔ تمہاری بہن ہیں' بھانجی' بھانجا' سب اپنے ہیں۔"

"بس بس رہنے دیں اپنے...... آپ کے جانے کے بعد سارا دن آپا مجھ سے کام کرواتی ہیں اور وہ روا تو اسپتال کا کیا خوب بہانہ ہے۔ جواد کی تو فرمائشیں ختم نہیں ہوتیں' یہ بنا دیں' وہ بنا دیں۔"

"نمرہ...... میں الگ گھر افورڈ نہیں کر سکتا۔ میرے ساتھ رہنا ہے تو یہیں رہو۔"

"طارق میں نے سوچا تھا آپ کے ساتھ شادی کے بعد میں ایک خوب صورت اپنی مرضی کی زندگی گزاروں گی مگر مجھے کیا پتا تھا کہ سسک سسک کے جینا پڑے گا۔"

"نمرہ خوامخواہ بات کو مت بڑھاؤ، تمہیں سب پتا تھا شادی سے پہلے میں کیا کرتا ہوں کیا نہیں، اب مجھے سنا کر کیا جتانا چاہتی ہو؟"

"مجھے نہیں پتا، مجھے الگ گھر چاہیے بس۔"

"تم ایک ضد سے اترتی ہو دوسری پہلے تیار کر لیتی ہو۔"

"تو کون سی ناجائز ضد ہے۔"

"ناجائز ہے، بس رہنا ہے تو یہیں رہو، ورنہ جو دل میں آئے کرو۔"

"طارق...." ابھی وہ کچھ اور کہنے لگی کہ اسے زور سے چکر آیا اور وہ گر گئی۔ طارق اس کی طرف دوڑا۔

اسپتال پہنچنے کے بعد وہ بے چینی سے ڈاکٹر کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگا۔ "ڈاکٹر باہر آتا دکھائی دیا۔

"کیا ہوا ڈاکٹر صاحب.... نمرہ ٹھیک تو ہے، کوئی پریشانی کی بات تو نہیں۔" وہ بے چینی سے پوچھنے لگا۔

"نہیں.... کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ آپ باپ بننے والے ہیں۔ آپ کی بیگم اب بالکل ٹھیک ہیں، آپ انہیں لے جاسکتے ہیں۔" ڈاکٹر نے گویا نوید سنائی۔

"تھینک یو سوچ ڈاکٹر۔" وہ نمرہ کی طرف بڑھا۔ وہ گاڑی خوشی خوشی گھر کی طرف موڑنے لگا۔

"مجھے اماں کے گھر ڈراپ کردیں۔"

طارق کو لگا وہ اپنی خوشی ماں سے بانٹنا چاہتی ہے، سو اسے وہیں چھوڑ دیا مگر وہ تو....

☼ ☼ ☼

"ریاض! میری سمجھ میں نہیں آرہا، میں کہاں غلط ہوں، میں نے سب بچوں کو وہ ہی تعلیم دی ہے جو ابا نے ہمیں دی تھی۔ ہم تو اس طرح سے کبھی نہیں کرتے تھے، میں نے اپنی زندگی کو بچوں کی اچھی تربیت اور پرورش کے لیے استعمال کیا ہے، مگر ایسا لگتا ہے کہ میری ساری محنت اکارت ہوگئی ہے۔" اتنے بڑے قد کاٹھ کے ولید اب باآواز بلند رونے لگے۔

"کیا کررہے ہو ولید، کیوں خود کو ہلکان کررہے ہو،

سب ٹھیک ہوجائے گا ان شاء اللہ! کہاں ہے سلیمہ بیٹی، بلاؤ اسے، میں بات کرتا ہوں۔"

سلیمہ آئی تو ولید باہر چلے گئے۔ کافی دیر گزر جانے کے بعد ولید اندر آئے تو سارا منظر ہی بدل چکا تھا۔ سلیمہ زارو قطار رو رہی تھی۔

"کیا ہوا، رو کیوں رہی ہے یہ؟" وہ اپنی بیٹی کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتے تھے، چاہے اس نے کتنے ہی آنسو دیے ہوں۔

"کچھ نہیں، بس ذرا دل پر غبار چھایا ہوا تھا، اب چھٹ گیا ہے، اب سب ٹھیک ہے، پریشان نہ ہوا کرو، اللہ سے مدد مانگا کرو۔" وہ ولید کو حیران چھوڑ کر چلے گئے۔

"ابو.... ابو.... پلیز مجھے معاف کردیں، میں بہت بری ہوں بہت.... میں نے آپ کو بہت دکھ پہنچایا نا، آپ جیسا کہیں گے میں ویسا کروں گی، آپ بس مجھے معاف کردیں۔" وہ بلک بلک کر معافی مانگ رہی تھی اور باپ کا کندھا بھی گیلا کرچکی تھی۔

"مت رو سلیمہ...."

"ابو میں غلطی پر تھی میں.... میں...."

"بس چپ ہوجاؤ، تمہیں احساس ہوگیا ہے یہی بہت ہے، اب رونا نہیں، تم تو میری اچھی والی بیٹی ہو، جاؤ منہ صاف کرو، شاباش...." وہ پھر بھی ان کے کندھے پر سر رکھ کر کھڑی رہی۔

"سلیمہ بس کرو بیٹا! دیکھو تو میرے سارے کپڑے گیلے کردیے ہیں۔"

"او.... سوری ابو...." وہ جلدی سے الگ ہوئی۔

"کوئی بات نہیں۔" وہ دھیرے سے مسکرادیے۔

آخر ریاض نے کیا جادو کیا ہے۔ سلیمہ کو نہ صرف غلطی کا احساس ہوگیا ہے بلکہ اپنی غلطی کی معافی بھی مانگ لی ہے۔

☼ ☼ ☼

"کیا؟ تم پھر سے ناراض ہوکر آئی ہو۔" شمع بیگم نے گویا اپنا سر پیٹ لیا۔

"نمرہ! کچھ تو ہوش کرو' ساری زندگی بات بے بات یوں ہی گھر چھوڑ کر آجایا کروگی۔"

"اماں آپ نہیں سمجھیں گی۔" اس نے جھنجلا کر کروٹ بدل کر منہ دوسری طرف کرلیا۔

"ہاں میں پاگل ہوں نا' جو کچھ سمجھوں گی نہیں' اب تم خیر سے ماں بننے والی ہو۔ کچھ تو عقل سے کام لو' ہر دفعہ ایسے گھر چھوڑ کر مت آجایا کرو' ابھی تو میں زندہ ہوں' میرے بعد تمہیں کوئی پوچھے گا بھی نہیں' بھائیوں کو تم دیکھ رہی ہو' بہن کے پاس تم جانا نہیں چاہتیں' کیوں اپنی زندگی خراب کررہی ہو' پچھتاؤ گی ایک دن۔" اس پر تو کچھ اثر نہ ہوا مگر شام کو طارق خود ہی آگیا۔

"چلو نمرہ' ضد چھوڑو اور گھر چلو۔"

"کون سا گھر؟"

"کیا مطلب؟"

"اگر نیا لے لیا ہے تو چلتی ہوں' ورنہ نہیں۔" وہ ڈھیٹ بن کر بولی۔ جانتی تھی طارق اپنے آنے والے بچے کے لیے بہت خوش تھا۔ وہ کسی قیمت پر اسے تنگ نہیں کرنا چاہتا تھا' سو وہ اسی کا فائدہ اٹھا رہی تھی۔

"ابھی تو چلو میں وعدہ کرتا ہوں' اگلے سال الگ گھر لے دوں گا۔ ابھی ہاتھ تنگ ہے۔"

"کوئی اگر مگر نہیں' چلو جاؤ سیدھی طرح سے۔" شمع بیگم نے مداخلت کی۔

"نہیں! میں نہیں جاؤں گی' کہہ دیا نا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے' جب دل چاہے آجانا' اب میں تمہیں لینے نہیں آؤں گا' ہر بار نئی ضد باندھ کر آجاتی ہو' نہیں آنا تو مت آؤ' میں جارہا ہوں۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"ارے ارے بیٹا' یہ تو پاگل ہے' جانے دو اسے تم میری بات....." شمع بیگم کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے اور وہ غصے سے چلا گیا۔

"نمرہ... بہت برا کیا تم نے' میں اور مجید صاحب سمجھتے تھے کہ وہ ان پڑھ' جاہل گنوار ہے' بے روزگار ہے مگر تم سے زیادہ سمجھ دار اور صلح جو انسان ہے وہ اب بھی وہ ہی تمہاری منتیں کرنے آیا تھا' اپنا گھر بچانے آیا تھا۔ مگر تم نے اسے مایوس لوٹا کر اچھا نہیں کیا۔ کیا فائدہ تمہاری تعلیم کا' تم سے تو وہ ہی ان پڑھ اچھا' جسے کم از کم رشتے نبھانے تو آتے ہیں اور ہم پاگل' ہمیں اس بات پر زعم تھا کہ تم پڑھی لکھی ہو' غلط تھے ہم' بہت غلط۔"

وہ کہہ کر اسے دیکھنے لگیں مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔

☼ ☼ ☼

سلیمہ کی شادی کی تیاری زوروں پر تھی۔

رخسانہ جب بھی سلیمہ کے پاس جاتی یا تو میمونہ یا پھر حلیمہ' سلیمہ کے پاس بیٹھی رہتیں یا سلیمہ ہی سیدھے منہ بات نہ کرتی۔ اب موقع پاکر رخسانہ آئی تو سیدھا مطلب پر ہی آگئی۔

"تمہیں کیا ہوگیا ہے سلیمہ' تم کس کے دباؤ میں آکر شادی کرنے پر آمادہ ہوگئی ہو' کون ہے وہ بتاؤ مجھے؟" اس کا جواب نہ پاکر وہ پھر سے شروع ہوگئی۔

"سلیمہ مجھے بتاؤ' میں تمہارا ساتھ دوں گی۔"

"نہیں چاہیے آپ کا ساتھ۔" وہ پھٹ پڑی۔

"مگر ہوا کیا' عادل کا کیا ہوگا' وہ تو تمہارے بغیر مر جائے گا۔"

"تو مرجائے میری بلا سے۔"

"کیا...؟" رخسانہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"میرے بھائی سے جو وعدے وعید کیے تھے وہ کہاں گئے سب؟ تم جھوٹی' مکار اور دھوکے باز ہو۔"

"بس...." وہ چیخی۔ "بند کریں اپنی بکواس' میں سب سمجھتی ہوں' آپ کا پلان' آپ کی گندی سوچ' مجھے بدنام کرکے میری ماں کو سبق سکھانا چاہتی تھیں مگر آپ کے گندے اور ناپاک ارادے میرے کانوں نے سن لیے تھے' جب آپ عادل سے بات کررہی تھیں کہ سلیمہ کو اپنے جال میں پھانس لو اور جب وہ پوری طرح تمہارے حصار میں ہو' پھر اسے رسوا کرکے چھوڑ دینا' یہی تھا نہ آپ کا پلان؟"

رخسانہ تو اتنی جلدی اپنے ڈرامے کا اینڈ سوچ بھی

نہ سکتی تھی۔ منہ میں گھنگھنیاں ڈالے چپ چاپ اسے دیکھے گئی۔

"آپ اتنا گر سکتی ہیں' میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی' رخسانہ چچی آپ کو اللہ سے ڈر نہیں لگتا؟ نہیں آپ کو کیوں لگے گا۔ میں بھی کتنی پاگل ہوں جو آپ سے پوچھ رہی ہوں' مگر اب آپ فکر نہ کریں' مجھے سب پتچ پتا چل گیا ہے' چلی جائیں میرے کمرے سے' اپنی گندی سوچ سمیت اور آئندہ ادھر کا رخ بھی کیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

رخسانہ کو ہرگز یہ توقع نہیں تھی۔

"آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرتا' آپ کی اصلیت میں جان گئی ہوں' خبردار! جو اپنی گندی سوچ کا رخ میری بہن کی طرف کیا تو؟" وہ ابھی یہی سوچ رہی تھی کہ حلیمہ۔ مگر اس وقت سلیمہ۔ جیسے اس کی سوچ پڑھ رہی تھی۔ وہ مزید کھڑی نہ رہ سکی اور وہاں سے چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"نمرہ ہوش کرو' آخری بار میں تمہیں لینے آئی ہوں' کیوں لوگوں کو اپنا تماشا دکھانا چاہ رہی ہو؟"

شہینہ بھی آج آخری دفعہ کوشش کرنے آئی تھیں۔

"آپا۔۔۔ آپ کو کس نے کہا ہے میرے معاملے میں بولیں' آپ پہلے بھی کئی بار آچکی ہیں' تب بھی میرا جواب یہی تھا اور اب بھی۔" نمرہ کو ہر بات بری لگتی تھی۔

"مجھے کسی نے نہیں کہا' میں بس تمہارا گھر بسا دیکھنا چاہتی ہوں' تم مجھے ردا کی طرح عزیز ہو۔" انہوں نے اسے رسان سے سمجھانے کی کوشش کی۔

"بس کریں آپا' مجھے کسی کا پیار نہیں چاہیے' آپ ردا کی فکر کریں' وہ ہی کافی ہے۔"

شہینہ سرد آہ بھر کر اٹھ کر باہر آئیں۔ "اماں یہ نہیں سمجھنے کی' اپنے پاؤں پہ خود کلہاڑی مار رہی ہے' ایسا نہ ہو کہ بعد میں روئے۔" شمع بیگم جیسے بجھ سی گئیں۔

"میں نے بھی بہت کوشش کی بیٹا! مگر کیا کروں' مان کے نہیں دیتی' سلیمہ اپنے گھر کی ہوگئی' ردا کو بھی اچھا بر مل گیا۔ حلیمہ بھی تیرے گھر کی بہو بننے جارہی ہے' سب کے کلیجے ٹھنڈے ہیں مگر میرا جلتا ہے۔ اس کے آنے والے کل کا سوچ کر۔"

"اماں! اب آپ روئیں تو نا' آپ کے دم سے تو میکہ ہے' آپ کو کچھ ہوگیا تو میں کہاں جاؤں گی؟"

دونوں ماں بیٹی گلے لگ کر روتی رہیں۔

"تو کیوں ہلکان ہوتی ہے' تیرے ابا بھی بجھ سے گئے ہیں۔ وہ بھی اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئے مگر پتا نہیں اس کے دل میں کیا ہے۔ اللہ تو ہی کوئی راستہ دکھا' اس لڑکی کو عقل دے۔"

وہ آسمان کی طرف دیکھ کر دعا کرنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

"یار ریاض! بہت مبارک ہو' تمہارا داماد تو لاکھوں میں ایک ہے۔"

چائے پیتے وہ مسکرانے لگے۔ "اچھا۔۔۔ وہ کیسے؟"

"بھئی جب میں ردا بیٹی کے گھر گیا' اتنے احترام اور پیار سے ملا' حالانکہ ڈیوٹی پر جارہا تھا مگر میرے لیے رک گیا۔"

"اچھا۔۔۔"

"ہاں اور اتنی شائستہ گفتگو دھیما مزاج' خوش اخلاق' آخر تم نے ڈھونڈا کیسے؟"

ریاض کا قہقہہ بلند ہوا۔

"ارے چھوڑو یہ سب' تم بتاؤ' سلیمہ بیٹی اپنے گھر میں خوش تو ہے؟"

"ہاں شکر ہے اللہ کا۔۔۔"

"اب فواد کے بارے میں کیا سوچا ہے۔"

"میں نے کیا سوچنا ہے' اب تو پہلے سے کہیں زیادہ سنبھل گیا ہے' سچ کہوں تو یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔"

"میری وجہ سے۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔ تم کیا ایسا جادو کرتے ہو؟"

"تمہیں بھی سکھاؤں؟ بڑا آسان ہے۔"
"ہاں...." وہ بے صبری سے ریاض کو دیکھنے لگے۔
"پیار...."
"کیا....؟"
"ہاں پیار! پیار ایک ایسی چیز ہے جو دلوں کو موم کر کے بہت خوب صورت احساس پیدا کرتی ہے۔"
"اچھا...." ولید دلچسپی سے سننے لگے۔
"بچے ہمیشہ پیار کے بھوکے ہوتے ہیں۔"
"تمہارا کیا مطلب ہے' والدین اپنے بچوں سے پیار نہیں کرتے؟ کرتے ہیں تو ان پر سختی کرتے ہیں' تاکہ وہ اچھے انسان بنیں۔"
"ٹھیک بالکل ٹھیک.... ہر ماں باپ بچوں سے پیار کرتے ہیں مگر ان کا طریقہ ذرا مختلف ہوتا ہے' ہر باپ اپنی اولاد کو بے پناہ چاہتا ہے' اس کی اچھے اصولوں پر پرورش کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر بعض دفعہ ہم بچوں پر اتنی سختی کر جاتے ہیں کہ وہ تنگ نظری کے زمرے میں آجاتا ہے۔"
"تو ہم بچوں پر ان کی غلطی کی سزا کے طور پر غصہ بھی نہ کریں۔"
"نہیں ایسا تو نہیں کہا میں نے' غصہ کریں مگر اتنا نہیں کہ بچے تنگ آجائیں' بات بے بات ماں باپ سے غصے کی امید کر کے کوئی بات بھی ماں باپ سے شیئر نہیں کریں گے۔ بچوں سے ناراض ہو مگر اتنا بھی نہیں کہ وہ بدظن ہو جائیں' خاص طور پر جب اولاد جوان ہو رہی ہوتی ہے' ان کو ایسی کوئی بات نہ کریں جو انہیں بری لگے' ہمیں پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیے۔"
"جوان اولاد کا خون گرم ہوتا ہے' ذرا سی سختی انہیں بے نتھے بیل کی طرح بھڑنے پر اکسا دیتی ہے اور پھر وہ ایسا کر جاتے ہیں جس کی ہمیں توقع نہیں ہوتی۔
گھر میں جب تنگ دستی' سختی اور بے اعتباری ہو تو بچے باہر پیار ڈھونڈتے ہیں' جہاں انہیں دو بول پیار کے ملے وہ وہیں کھنچے چلے جاتے ہیں۔
"ہمیں اپنے بچوں پر یقین اور اعتبار ہونا چاہیے' ان کو یقین دلائیں کہ ہم ان پر اعتبار کرتے ہیں' ان کو بات بے بات ٹوکیں نا' ان کو خود ہی اچھا برا سمجھنے دیں' ان کے کاموں میں زیادہ مداخلت نہ کریں مگر ان پر نظر رکھیں جہاں وہ غلطی کریں انہیں پیار سے سمجھائیں۔"
ولید غور سے سنتے رہے' پھر بولے۔ "صحیح کہتے ہو ریاض! میری بچیاں تو پھر جیسے تیسے اچھے گھرانوں کی بہوویں بنی ہیں' خوش و خرم زندگی گزار رہی ہیں مگر نمرہ کا دکھ دل کو کھائے جاتا ہے' ویسے تو طارق اچھا ہے مگر نمرہ...."
"ہاں.... اللہ اسے سمجھ دے' آمین۔"
"آمین...."

☼ ☼ ☼

حلیمہ اور جواد کے ولیمے پر بھی نمرہ نہ آئی۔
جب سے اس کا بچہ ضائع ہوا تھا اس کی طبیعت واقعی اکثر ٹھیک نہ رہتی۔ پھر طارق نے بھی پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ سب لوگ پوچھتے تو یہی کہا جاتا۔ "اس

کی طبیعت ٹھیک نہیں۔"

"نمرہ! آج بھی تم نہیں آئیں سب.... "

"پھر سے وہ ہی لیکچر شروع مت کر دیجئے گا۔"

"جب وقت تھا' تب ہم اچھی پرورش نہ کر سکے تیری' اب کیا خاک اثر ہو گا ہمارے لیکچر کا۔"

"اب یہ تربیت اور پرورش بیچ میں کہاں سے آگئی؟" وہ جی بھر کر بدمزہ ہوئی۔

"ہاں ہماری پرورش میں ہی کوئی کمی رہ گئی ہے۔ اسی لیے تو ہمیں اس کی سزا دے رہی ہے' کاش.... "

"اب کچھ نہیں ہو سکتا شمع بیگم! آج جب میں نے ریاض کی گفتگو سنی تو یقین مانو مجھے بہت برا لگا کہ ہم کتنا غلط سمجھتے تھے اسے' مگر وہ جانتا ہے کہ اولاد کو کس طرح سے پالنا ہے' آج کے دور کے تقاضے کیا ہیں' جنریشن گیپ کو مٹانا جانتا ہے۔ اب دیکھو نا آج اس کی اولاد اس کے آنکھوں کا نور اور کلیجے کی ٹھنڈک ہے اور ہم.... " اچانک فون کی گھنٹی پر مجید صاحب فون سننے چلے گئے۔

"کیا؟" ان سے اور نہ سنا گیا اور فون ہاتھ سے گر گیا۔

"شمع! طارق کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے' جلدی چلو۔" وہ کہہ کر رکے نہیں۔

نمرہ سنتے ہی جیسے نڈھال ہو گئی۔ اسے لگا ایک پل کے لیے جیسے اس کے جسم کا سارا خون کسی نے نچوڑ لیا ہو۔ جیسے دنیا ختم ہو گئی ہو' جیسے اس کے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی گئی ہو اور سر سے آسمان۔ وہ دیوانہ وار بھاگتی ہوئی اسپتال پہنچی۔ وہاں پر ردا سب کو تسلی دیتے ہوئے آپریشن تھیٹر میں چلی گئی۔ اس کا شوہر بھی ساتھ تھا۔

نمرہ کوریڈور میں بیٹھی بے آواز روتی رہی اور طارق کی زندگی کی دعائیں مانگتی رہی۔

"اب کیوں روتی ہو' تم تو پہلے بھی اسے چھوڑ کر رہ رہی تھیں' اب اگر وہ مر بھی جاتا ہے تو.... "

"بھابھی.... " وہ غم و غصے سے رخسانہ پر چیخ پڑی۔

"رخسانہ! کچھ تو موقع محل دیکھ کر بات کیا کرو' خدا کے لیے اتنا سوچ لیا کرو کہ تمہارے اس طرح بولنے سے کسی کے دل پر کیا بیتے گی۔" میمونہ اسے سمجھانے لگیں۔

"کسی کے دل پر جو بیتے میں تو خدا لگتی کہوں گی۔"

اتنی دیر میں ردا اپنے شوہر اور باقی ڈاکٹرز کے ساتھ آپریشن تھیٹر سے مسکراتی باہر نکلی۔

"سب ٹھیک ہے' اللہ کا شکر ہے' آپ لوگ کچھ دیر بعد ان سے مل سکتے ہیں۔"

ردا نے جیسے نمرہ میں نئی روح پھونک دی ہو' جیسے ہی طارق کو آپریشن تھیٹر سے کمرے میں منتقل کیا گیا۔ وہ بھاگ کر طارق کے پاس گئی۔

"آئی ایم سوری طارق.... پلیز مجھے معاف کر دیں' میں کبھی کوئی ضد نہیں کروں گی' آپ جیسا کہیں گے ویسا کروں گی' آپ پلیز.... "

"نمرہ.... " طارق نحیف آواز میں گویا ہوا۔

"طارق! مجھے ایک پل کے لیے ایسا لگا جیسے میرے سر سے کسی نے بھرے بازار میں چادر کھینچ لی ہو' میں تو آپ کے بنا کچھ بھی نہیں' آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں' میں آپ کو اب کبھی تنگ نہیں کروں گی۔"

طارق کے کہنے سے پہلے رخسانہ بول پڑی۔

"یہ نہیں مانے گا' نمرہ اب تم اپنا انتظام کر لو۔"

"نہیں بھابھی! صبح کا بھولا شام کو گھر واپس آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔" طارق کے کہنے پر جہاں سب کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی' وہیں رخسانہ پیر پٹختی چلی گئی۔

سچ ہے کچھ لوگ کبھی بھی نہیں سدھرتے۔

خالدہ جیلانی

# میری بیاض سے

**ثناء عبدالقیوم ــــــــ بنک چیمہ**

رخِ مصطفےٰ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ
نہ کسی کی بزم خیال میں نہ دکانِ آئینہ ساز میں

**ناہید اصغر آرائیں ــــــــ لالہ موسیٰ**

تیرا ساتھ ہو تو سارے موسم اچھے لگتے ہیں
ورنہ بے مزا ہیں پھول خوشبو اور دسمبر کی یہ شام

**شائستہ اکبر ــــــــ گڈو کالونی**

واپس نہ جا وہاں، کہ تیرے شہر میں منیر
جو جس جگہ پہ تھا، وہ وہاں پر نہیں رہا

**عظمیٰ شفیق ــــــــ جڑانوالہ**

میری ساری زندگی کو بے ثمر اس نے کیا
عمر میری تھی مگر اس کو بسر اس نے کیا

**فرحت اشرف گھمن ــــــــ سید والا**

میں بھی بہت عجیب ہوں، اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں

**نور العین الزاہرہ ــــــــ عبدالحکیم**

امیرِ شہر میری جھونپڑی پہ طنز نہ کر
تیرے ظرف سے ہر ملال میں بڑی ہو گی

**فہمیدہ گل ــــــــ لاڑکانہ**

دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے جینے نہ دیا
جب چلی سرد ہوا میں نے تجھے یاد کیا
اس کا دکھ نہیں کیوں تم نے کیا دل برباد
اس کا غم ہے، بڑی دیر سے برباد کیا

**ثمینہ کوثر عطاری ــــــــ ڈوگہ گجرات**

تیرے آنے کی امید بھی، ہو چلی معدوم
نئے برس کا اہتمام ہے، دسمبر آن پہنچا ہے
خنک رت میں تنہائی بھی جو کھٹ پہ کھڑی ہے
جاڑے کی اداس شام ہے، دسمبر آن پہنچا ہے

**شہلا اسلام ــــــــ قائم پور**

کسی کی چاہ میں ایسا بھی کیا سرشار ہو جانا
کہ اپنے رستے کی آپ ہی دیوار ہو جانا
بھلانے ترک رسم و راہ کے خود ڈھونڈتے رہنا
کسی کو چاہنا اتنا کہ پھر بے زار ہو جانا

**آمنہ ولید ــــــــ لاہور**

ایسا وجدان کہ ہر چیز میں تُو ہی تُو ہے
ایسا فقدان کہ نزدیک رگِ جاں بھی نہیں

**زوباریہ خالد ــــــــ لاہور**

چلو بتاؤں تمہیں اک نشانی اُداس لوگوں کی
کبھی غور کرنا یہ ہنستے بہت ہیں

**فوزیہ ثمر بٹ ــــــــ گجرات**

اپنے کرب کو چھپا کر رہنا مشکل ہوتا ہے
دھیمی دھیمی آگ میں جلنا مشکل ہوتا ہے
یوں تو ضبط بہت ہے ہم کو لیکن کیا بتلائیں
آنکھ تک آئے آنسو بہنا مشکل ہوتا ہے

**عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر ــــــــ کراچی**

یہ ضروری تو نہیں کہ آگ سے جل جائے بشر
بعض لوگوں کو مقدر بھی جھلسا دیتے ہیں

**ندا، فضہ ــــــــ کراچی**

زرد موسم کے اُداس لمحوں میں
ہم رو پڑے یونہی ہنستے ہنستے

**نوال افضل گھمن ــــــــ لاہور**

آیا تو ہے پیامِ بہاراں صبا کے ساتھ
خوں رنگ نہ ہو جائیں کہیں پھر فضا کے ہاتھ
پھر پیار آ گیا ہے بہت آسمان کو
موتی لٹا رہے ہیں زمیں پہ گھٹا کے ہاتھ

شگفتہ جاہ

# رنگا رنگ پھول

## رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مسلمان کو جو بھی تکان یا بیماری، فکر، غم اور تکلیف پہنچتی ہے، حتیٰ کہ کانٹا بھی چبھتا ہے تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف فرما دیتا ہے۔"

(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ مومن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا جو خاص معاملہ ہے اس میں اس کا بیان ہے کہ دنیا میں پہنچنے والے آلام و مصائب کو اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے لیکن یہ اسی صورت میں ہے جب مومن صبر کرے۔ اگر وہ صبر کے بجائے ماتم، رونا دھونا اور تقدیر الٰہی کا شکوہ کرے گا تو اجر سے محروم رہے گا۔ بلکہ گناہوں کا بوجھ بھی اٹھانا پڑے گا۔

2۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندۂ مومن کو کسی بلند مرتبے تک پہنچانا چاہتا ہے لیکن اس کے اعمال اس کا ساتھ نہیں دیتے تو اللہ تعالیٰ آلام و مصائب کے ذریعے اس کے درجات بلند فرما دیتا ہے۔ بشرطیکہ وہ صبر کرے۔

## واصف علی واصف،

بڑی عجیب بات ہے کہ
سبب فرعون ہو تو نتیجہ موسیٰ نکلتا ہے۔
اور یہی بات اہل ظاہر کی سمجھ میں نہیں آتی۔
جہاں سبب اور نتیجہ کی سائنس ختم ہوتی ہے

وہاں سے رضا اور نصیب کی حد شروع ہو جاتی ہے اور رضا رضا ہے۔ چاہے تو محنت کو مراد دے اور چاہے تو محنت کے بغیر با مراد کر دے۔

(بلا سبب قطرہ قطرہ قلزم سے اقتباس)

نوال افضل گھمن۔ لاہور

## ثبوت،

ایک بیگم صاحبہ گرمیوں کی چھٹیوں میں بچوں کو لے کر میکے چلی گئیں اور روز شام کو فون کر کے شوہر سے پوچھتیں۔

"کہاں ہیں آپ...؟"

وہ صاحب جواب دیتے۔

"گھر پر ہوں۔ میں نے کون سی دوسری کے پاس جانا ہے۔"

بیگم کہتیں۔ "جوسر چلا کے دکھائیں؟"

شوہر اٹھ کر جوسر چلا دیتا۔ "گھرر... گھرر... گھرر"

ایک شام بیگم صاحبہ بغیر بتائے واپس آ گئیں۔ دروازے پر تالا لگا تھا۔ پڑوسن سے پوچھا۔

"یہ کب آتے ہیں، کچھ پتا ہے؟"

پڑوسن نے کہا۔ "صبح جوسر لے کر نکلتے ہیں، رات کو ایک دو بجے واپس آتے ہیں۔"

## پاکستانی ڈاکٹروں کا سب سے بڑا لطیفہ،

ڈاکٹر: "اگر تم ایک گھنٹہ پہلے لے آتے تو ہم اس کو بچا لیتے۔"

لڑکا: "ابے پندرہ منٹ پہلے تو ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔"

اقصیٰ ناصر۔ کراچی

## المیہ،

سنو۔!
تم نے کبھی میلے میں ڈھول بجتے دیکھے ہیں
عجیب ہے المیہ ان کا
بہت ہی شور کرتے ہیں
مگر۔
اندر سے خالی ہیں
یہی میرا افسانہ ہے

نمرہ، اقرا۔ کراچی

## دیر آید،

میکسیکو سٹی کا ایک رومانی جوڑا جلد بازی میں کوئی فیصلہ کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ ان دونوں کا خیال تھا کہ ہر کام بہت غور و خوض کے بعد کرنا چاہیے۔
لہٰذا وہ دونوں منگنی کے بعد باسٹھ برس تک۔ شادی کے سوال پر غور کرتے رہے اور آخر جب وہ ایک دوسرے سے مطمئن ہو گئے تو انہوں نے شادی کر لی۔ شادی کے وقت ان کی عمر بیاسی برس تھی۔

صبا سلیم۔ کراچی

## سوال،

گاڑی چلاتی ہوئی ایک خاتون کو ٹریفک سارجنٹ نے اشارے سے روکا اور قریب آکر پوچھا۔
"محترمہ! آپ کا کب تک گھر سے باہر رہنے کا ارادہ ہے؟"
"کیا مطلب، تم یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہو!"
"خاتون! میں تو صرف اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ جب آپ گھر چلی جائیں گی تو دوسری سینکڑوں گاڑیوں میں بیٹھے لوگ اس سڑک کو استعمال کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔"

مدیحہ نوید۔ فیصل آباد

## دوست،

- سب کا دوست کسی کا دوست نہیں ہوتا۔
(ارسطو)
- دوست اس کو سمجھو، جو تنہائی میں تمہارے عیب تم پر ظاہر کرے، تمہیں تنبیہ کرے اور تمہارے (پلیٹ) پیچھے لوگوں میں تمہاری تعریف کرے اور مصیبت کے وقت تمہاری مدد کرے۔"
(مامون)
- اگر تمہارے دوست ایسے ہیں، جو تمہاری غلط تعریفوں کے بجائے تمہیں تمہاری غلطیوں سے آگاہ کرتے ہیں تو تم نے عقل مندی اور اچھے دوستوں کا انتخاب کیا۔
(نیٹا غورث)
- برا دوست کو برے کاموں سے باز نہیں رکھ سکتا، وہ دوستی کے قابل نہیں۔"
(جالینوس)
- ہر اچھی کتاب انسان کی بہترین دوست ہے۔
(ملٹن)

سمیرا بتول اللہ بخش سعیدی۔ حیدر آباد

## خوشی اور غم،

کم ظرف آدمی دوسروں کو خوش دیکھ کر ہی غم زدہ ہو جاتا ہے۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ لوگ خوش رہیں۔ وہ ان کی خوشیوں کو برباد کرنے پر تل جاتا ہے۔ اس کی خوشی یہ ہے کہ لوگ خوشی سے محروم ہو جائیں۔ ایک بخیل انسان نہ خوش رہ سکتا ہے نہ خوش کر سکتا ہے۔ سخی سدا بہار رہتا ہے۔ سخی ضروری نہیں کہ امیر ہی ہو۔ ایک آدمی جو غریب ہے وہ بھی سخی ہو سکتا ہے۔ اگر وہ دوسروں کے مال کی تمنا چھوڑ دے۔

(کتاب دل، دریا، سمندر سے اقتباس)
(واصف علی واصف)

نوال افضل گلشن۔ لاہور

## ماں اور خالہ،

ایک انسپکٹر چیکنگ کے دوران سپاہیوں سے مختلف سوال کر رہا تھا۔ گل خان جو کہ نیا آیا تھا اس کے

پاس آیا اور پوچھا۔
"تمہارا نام کیا ہے؟"
اس نے کہا۔ "میرا نام گل خان ہے۔"
اس انسپکٹر نے گل خان سے پوچھا۔ "تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟"
اس نے کہا۔ "سر! میرے ہاتھ میں بندوق ہے۔"
اس انسپکٹر نے کہا۔ "نہیں یہ بندوق نہیں۔ یہ تمہاری عزت ہے۔ یہ تمہاری آن ہے، یہ تمہاری ماں ہے۔"
اس کے بعد اس نے پاس کھڑے سپاہی سے پوچھا۔
"یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟"
وہ فوراً بولا۔ "سر یہ گل خان کی ماں اور میری خالہ ہے۔"

شکیلہ نور۔ لالہ موسیٰ

## برکت،

حضرت یحییٰ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں۔
"تین چیزیں جس گھر میں ہوں، اس سے برکت اٹھ جاتی ہے اور وہ تین چیزیں یہ ہیں۔
1۔ فضول خرچی۔
2۔ بدکاری۔
3۔ خیانت۔

عابدہ نثار۔ کراچی

## نمک پارے،

- بعض لوگوں کی آزادی اپنی مرضی کے پنجرے میں قید ہونے کے حوالے سے ہوتی ہے۔
- غدار اسے نکما نہیں کہیے جو لیٹے لیٹے ہی چارپائی توڑ رہا ہے۔
- بعض لکھاریوں کی تحریریں کاغذ کو بے وقعت کرنے کے سوا کچھ نہیں کرتیں۔
- ٹی وی پروگرامز ان لوگوں کے لیے ہیں جن کا اپنا کوئی پروگرام نہیں۔
- ٹی وی چینلز کے رات کے مناظرے اور مذاکرے

دیکھ کر لگتا ہے کہ ملک ڈوبنے لگا ہے جب کہ مارننگ شوز دیکھ کر یہ تاثر زائل ہو جاتا ہے۔
(انیس یعقوب)
نور سجاد۔ گجرات

## بیزار،

حضرت جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔
"جو شخص حضرت ابوبکر وحضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھلائی سے نہ یاد کرے، میں اس سے بیزار اور الگ ہوں۔"
(تاریخ خلفا۔ حضرت علامہ جلال الدین سیوطی)
تحریم، عائشہ۔ گوجرہ

## چند پند مگر سود مند،

- مجھے بتاؤ تمہارے دوست کون ہیں؟ میں تمہیں بتاؤں گا کہ تم کون ہو۔۔۔؟ (سروانٹس)
- جو اپنی محبت کا اظہار نہیں کرتے، وہ دراصل محبت ہی نہیں کرتے۔ (شیکسپیئر)
- جو شخص کسی مقصد کو سامنے رکھ کر محنت کرتا ہے اس کو اس کا پھل ضرور ملتا ہے۔ (گوئٹے)

## احساس،

ایک دن سونے نے لوہے سے کہا۔
"یار ہم دونوں ایک ہی لوہے کی ہتھوڑی سے پٹتے ہیں مگر جب تمہاری باری آتی ہے تو تم زیادہ چیخنے چلانے کیوں ہو؟"
اس پر لوہے نے جواب دیا۔
"جب اپنا اپنے کو مارے تو درد زیادہ ہوتا ہے۔"
(اسامہ علی)

## دسمبر تم نہ جاؤ نا،

ابھی لمحے نہیں بکھرے
ابھی موسم نہیں بچھڑے
میرے کمرے کی ٹھنڈک میں
ابھی کچھ دُھوپ باقی ہے
میری ڈائری کے کچھ صفحے
ابھی کچھ کہہ نہیں پائے
میرے آنگن کے سب پودے
ابھی بھی گنگناتے ہیں
میرے بے جان ہونٹوں پر
ابھی مسکان باقی ہے
کسی کے لوٹ آنے کا
ابھی امکان باقی ہے
دسمبر بات اک سُن لو!
سُنو! تم مان جاؤ نا
کہ جب تک وہ نہیں آتا
دسمبر تم نہ جاؤ نا۔

شازیہ رانا

اُس کی تصویر کیا نظر آئی
کہکشاں آنکھ میں اُتر آئی

میں وہاں خود کو یاد آیا ہوں
وہ جہاں خود کو بھول کر آئی

جانے کیا کہہ دیا ہے میں نے اسے
کچھ دِنوں میں ہی وہ نکھر آئی

میں پرندوں کے پاس بیٹھا تھا
کل وہ جس وقت میرے گھر آئی

اجنبیت کی تیز بارش میں
وہ مرے ہاتھ مختصر آئی

آج مدت کے بعد اُس کے ساتھ
خود کو دیکھا تو آنکھ بھر آئی

سخت بے سمت زندگی تھی حسن
اُس کے آنے سے راہ پر آئی

حسن عباسی

## کانچ کی گڑیا

خوابوں کی ایک بستی تھی
ایک لڑکی اس میں رہتی تھی

اپنے گھر کے آنگن میں
کچھ سپنے بویا کرتی تھی

اپنے کمرے کی کھڑکی میں
بوندوں سے کھیلا کرتی تھی

سب کے سامنے ہنستی تھی
اور چھپ چھپ کر رویا کرتی تھی
چاند کو کہیں دیر تک گھورا کرتی تھی
پھر خود سے باتیں کرتی تھی
دیکھنے والی سب آنکھوں کو
کانچ کی گڑیا لگتی تھی
ٹوٹ گئی تو سب نے جانا
وہ پگلی ....
پیار کسی سے کرتی تھی

عمرانہ جمیل

بکھرنا کارِ ہنر نہیں ہے
فغاں کا کوئی اثر نہیں ہے

ہیں رت جگوں کی ہزار راتیں
مگر مقابل سحر نہیں ہے

میں آئینہ ہوں کہ عکس کوئی
مجھے خود اپنی خبر نہیں ہے

اتارے کوزے کو چاک جاں سے
کہیں وہ دستِ ہنر نہیں ہے

عجب سفر ہے، عجب مسافت
مکاں بہت ہیں پر گھر نہیں ہے

ظریف احسن

امت الصبور

# خاتون کی ڈائری

## تسنیم شریف کی ڈائری سے

شاعری اور خوابوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ امجد اسلام امجد کی خوبی یہ ہے کہ وہ صرف خواب نہیں دیکھتے بلکہ اپنے قاری کو غیر محسوس انداز میں اپنے خوابوں میں شریک کرکے اسے استعاروں سے سجی ایسی دنیا میں لے جاتے ہیں جہاں چار سو محبت کا فسوں پھیلا ہے

دستک کسی کی ہے کہ گماں، دیکھنے تو دے
دروازہ ہم کو تیز ہوا کھولنے تو دے

سودا ہے عمر بھر کا، کوئی کھیل تو نہیں
اے چشم یار، مجھ کو ذرا سوچنے تو دے

شاید کسی لکیر میں لکھا ہو میرا نام
اے دوست اپنا ہاتھ مجھے دیکھنے تو دے

یہ سات آسمان کبھی مختصر تو ہوں
یہ گھومتی زمین کہیں ٹھہرنے تو دے

کیسے کسی کی یاد کا چہرہ بتاؤں میں
امجد، وہ کوئی نقش مجھے بھولنے تو دے

## ثوبیہ قطب کی ڈائری سے

نسائی جذبوں کو، رنگوں اور خوشبو کے پیرا ہن میں ڈھالنے کا فن جس خوش ادا شاعرہ کو حاصل ہے، بلا مبالغہ اس کا نام پروین شاکر ہے۔ "عورت اور خوشبو" جن کی شاعری کا مرکزی محور ہیں۔ کسی شرمیلی لڑکی کے دل میں ہلکورے لیتی محبت کو چاند، سمندر، خوشبو کے استعاروں سے جاننے والی اس دلربا شاعرہ کی تریسٹھویں سالگرہ پر ان کی ایک نظم پیش خدمت ہے۔

### اُلجھن

رات ابھی تنہائی کی پہلی دہلیز پہ ہے
اور میری جانب اپنے ہاتھ بڑھاتی ہے
سوچ رہی ہوں
ان کو تھاموں
زینہ زینہ سناٹوں کے تہہ خانوں میں اتروں
یا اپنے کمرے میں ٹھہروں
چاند مری کھڑکی پہ دستک دیتا ہے!

## ثنا عبدالقیوم کی ڈائری سے

چھوٹی بحر میں سادہ سے لفظوں میں معنی کا ایک جہاں اور سادگی و پرکاری کی مثال اس غزل میں پہلے پہل محبت سے آشنائی پر دل کی کیفیات بڑی خوبی سے بیان کی گئی ہیں۔

سراپا حقیقت، مجسم فسانہ
محبت کا عالم، جنوں کا زمانہ

وہ پہلے پہل دونوں جانب یہ عالم
ادا بے تعلق، نظر محرمانہ

نظر اٹھتے اٹھتے، نظر ملتے ملتے
دھڑکتے دلوں کا وہ نازک زمانہ

طبیعت شگفتہ مگر کھوئی کھوئی
ہر انداز دلکش مگر والہانہ

وہ شعر و ترنم کا پُر کیف موسم
وہ اشک و تبسّم کا رنگیں زمانہ

غرور و تجمّل مگر زخم خوردہ
شکستِ محبت مگر فاتحانہ

## سیدہ لوبا سجاد کی ڈائری سے

کچھ لوگ چھوڑ جانے کے بعد بھی ساتھ رہتے ہیں اور کچھ ساتھ ہو کر بھی دُور۔ یہ غزل آپ سب بہنوں کے لیے۔

یوں راہِ وفا کی صلیب پر دو قدم اُٹھانے کا شکریہ
بڑا پُر خطر تھا یہ راستہ تیرے لوٹ جانے کا شکریہ

جو اُداس ہیں تیرے ہجر میں جنہیں بوجھ لگتی ہے زندگی
سرِ بزم یوں انہیں دیکھ کر تیرا مسکرانے کا شکریہ

تیری یاد کس کس بھیس میں میرے شعر و نغمے میں ڈھل گئی
یہ کمال تھا تیری یاد کا مجھے یاد آنے کا شکریہ

جو اصول زمانے بھر کا تھا وہ اصول تو نے نبھا دیا
یہی رسم ٹھہری ہے معتبر مجھے بھول جانے کا شکریہ

## انجل کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر کسی نامعلوم شاعر کی اس نظم کے تمام معتبر اور سچے موتیوں سے قیمتی حروف ایک بہت پیاری اور انمول ہستی کے نام۔

خواب سارے خیال سارے
حقیقتوں کا لبادہ اوڑھے
ہماری ہستی سنوار جائیں
یہ چاند سورج، یہ سارے تارے
چراغ جتنے بھی جل رہے ہیں
ہمارے چہرے کے رنگ دیکھیں تو ہار جائیں
یہ بہتی ندیاں، یہ چڑھتے دریا یہ گہرا ساگر
یہ جھیل جھرنے، یہ آبِ صحرا یہ اپنا جیون
ہماری آنکھوں پہ وار جائیں یہ رنگ، خوشبو
گلاب سارے، محبتوں کے نصاب سارے
یہ سب ہماری بلائیں لیں
اور
نظر ہماری اُتار جائیں

## شہنیلا اسلام کی ڈائری سے

سردیوں کی اُداس شامیں جب پورے چمن کو اُداس کر دیتی ہیں، انسان اپنی سوچوں اور اُداسی سے نبرد آزما ہوتا ہے تو ایسے میں محسن نقوی کی شاعری ہماری کیفیت کی خوب عکاسی کرتی ہے۔ پھر ہم اپنی حالت کو بہ زبان محسن نقوی اس طرح سے بیان کرتے ہیں۔

**ابھی کیا سوچیں،**

ہر اک جانب اُداسی ہے
ابھی سوچیں تو کیا سوچیں

ہر اک سُو، ہُو کا عالم ہے
ابھی بولیں تو کیا بولیں
ہر اک انسان پتھر ہے
ابھی دھڑکیں تو کیا دھڑکیں
فضا پر نیند طاری ہے
ابھی جاگیں تو کیا جاگیں
ہر اک مقتل کی شہ رگ سے لہو کی لہر جاری ہے
ابھی دیکھیں تو کیا دیکھیں
ہر اک انسان کا سایہ ابھی مٹی پہ بھاری ہے
ابھی لکھیں تو کیا لکھیں

# خبریں وبریں

وصفہ سہیل



## دوستی

مستنصر حسین تارڑ اپنی یادداشتوں کو کھنگالتے ہوئے احمد فراز کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "جب میں نے جیو پر "شادی آن لائن" شروع کیا تو فراز نے مجھے خوب برا بھلا کہا۔ کہ تمہارے مرتبے کا ادیب ایسا گھٹیا پروگرام کرے 'نائیوں کی مانند لوگوں کے رشتے کرائے' لعنت ہے تم پر' میں نے ایک بار توجیہہ پیش کی' یار معاشی مجبوریاں بھی ہوتی ہیں۔ آج تک کسی کو اتنا معاوضہ نہیں دیا گیا۔ میں نے اپنے پیکیجز کی مرمت کرالی' گاڑی نئی لے لی اور دو چکر امریکہ کے لگا آیا ہوں۔"

تو فراز نے باقاعدہ اپنی جیب میں سے چیک بک نکال کر میرے سامنے رکھ دی کہ "جتنا معاوضہ وہ دے رہے ہیں اتنے کا چیک بھر لو اور پروگرام چھوڑ دو۔"

## صلاحیت

بچوں کی مشہور سیریز انسپکٹر جمشید' کامران سیریز شو کی سیریز کے خالق اشتیاق احمد اپنی زندگی کے بارے میں بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ "مجھے زندگی میں قدم قدم پر حیرت کا سامنا کرنا پڑا' میں نے پہلی کہانی لکھی' چھپ گئی' دوسری' تیسری جو بھی لکھی چھپ گئی میں حیران نہ ہوتا تو کیا کرتا۔ جب بچوں کے لیے پندرہ بیس کہانیاں لکھ لیں تو سوچا کہ اب بڑوں کے لیے لکھنا چاہیے اس وقت میری عمر سولہ سال تھی' یوں ایک رومانی افسانہ لکھا اور شمع کراچی میں بھیج دیا جو چھپ گیا' پھر اوپر تلے چھ سات افسانے لکھ کر بھیجے اور وہ سب شائع ہو گئے۔ سیارہ ڈائجسٹ کا اجرا ہوا تو انہوں نے معاوضے کا اشتہار دیا۔ میں نے اس میں لکھنا شروع کر دیا اور وہاں سے پیسے ملنے لگے۔ میں نے سیارہ ڈائجسٹ میں پروف ریڈنگ بھی کی۔ اس کے بعد سوچا کہ اب ناول لکھنا چاہیے تو ایک رومانی ناول لکھا اور سیارہ ڈائجسٹ کے نائب مدیر ابو ضیاء اقبال کے توسط سے ایک پبلشر کے پاس پہنچا تو انہوں نے کہا کہ ہم یہ بعد میں چھاپیں گے' آپ پہلے ایک جاسوسی ناول تقریباً سو صفحات کا لکھ دیں۔ یوں تین دن کے مختصر وقت میں انسپکٹر جمشید سیریز کا ناول' پیکٹ کا راز' لکھا اس کے کردار آج تک چلے آرہے ہیں پبلشر نے اس ناول



کے پچاس روپے دیے۔ پھر ایک اور ناول لکھ کر دوسرے پبلشر کے پاس گیا تو اس نے ناول چھاپ دیا اور تین سو روپے دیے۔ پھر ماہنامہ جگنو کے لیے مدیر رکھ لیا گیا اور دو سو تنخواہ مقرر ہوئی، جگنو والوں نے مجھ سے دو سو کہانیوں کی کتابیں بھی لکھوائیں۔ اس دوران میں نے اپنی میونسپل کارپوریشن کی نوکری چھوڑ دی کیوں کہ وہاں رشوت کا بازار گرم تھا۔ ان ہی دنوں جگنو والوں نے بھی مجھے فارغ کر دیا پریشانی کا یہ دور تقریباً" ایک سال رہا۔ میں نے اللہ سے دعا کی اسی دن جگنو والوں نے مجھے دوبارہ رکھ لیا اور کہا کہ انسپکٹر جمشید سیریز کے بارہ ناول لکھ کر دیں۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور یہیں سے میرے ناولوں کے دور کا آغاز ہوا یہاں تک کہ میں اپنا پبلشنگ ہاؤس قائم کرنے کے قابل ہوا۔"

آٹھ سو ناولوں کا خالق ساری زندگی سفید پوشی کا بھرم رکھتا رہا۔ اگر ان کے ناولوں کو ہیری پورٹر کی طرز پر فلمایا جاتا تو شاید وہ پوری دنیا میں پاکستان کی پہچان بن جاتے مگر......؟

اشتیاق احمد جو بچوں کے مقبول ترین ادیب تھے۔ کراچی ایئرپورٹ پر دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔



## حیرت

اداکارہ ثنا آج کل فاروق مینگل کی فلم کے آئٹم سونگ کو کرنے کی وجہ سے موضوع گفتگو بنی ہوئی ہیں۔ ثنا کا اس بارے میں کہنا ہے کہ فاروق مینگل ایک سمجھ دار اور منجھے ہوئے ڈائریکٹر ہیں (کیا اس لیے کہ انہوں نے آپ سے آئٹم سونگ کروایا۔؟) میں نے ان کے ساتھ بہت کام کیا لیکن فلم کا تجربہ پہلی مرتبہ ہوا ہے۔ (ایک آئٹم سانگ کر کے اپنے آپ کو فلم کا حصہ سمجھ لیا آپ نے تو۔؟) اس فلم میں مجھے آئٹم سانگ کے لیے منتخب کیا گیا اور مجھے سیٹ پر یہ دیکھ کر بہت حیرت اور خوشی ہوئی کہ آئٹم سونگ کے تمام لوازمات موجود تھے۔ (تو باقی کے سیٹ پر کیا ہوتا ہے۔؟) فلم دیکھ کے آپ کو لگے گا کہ یہ واقعی آئٹم سانگ ہے۔ (لگتا ہے ثناء کو فوبیا ہو گیا۔ بھئی آئٹم سانگ کا۔) ہمارا پڑوسی ملک سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔ (کون کرتا ہے بھئی۔؟) لیکن ہم کسی سے مقابلہ نہیں کرنا چاہتے ہم تو بس کام کرنا چاہتے ہیں (جو آتا ہی نہیں۔) ہماری انڈسٹری میں کام کرنے والے لوگ کسی سے کم نہیں ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ہماری انڈسٹری آگے جائے گی۔ (کس سے۔؟)"

## دعویٰ

حریم فاروق آج کل دکھائے جانے والے اکثر ڈراموں میں نظر آنے والا ایک ایسا نام ہے جس نے مختصر عرصے میں متنوع کردار کر کے اپنی ایک شناخت بنالی ہے۔ (یہ اور بات کہ ہر کردار میں ان کے چہرے پر ایک ہی ایکسپریشن ہوتا ہے۔) تھیٹر سے ڈراموں میں آنے والی اس فنکارہ کی اگلی منزل۔ فلم ہے۔ پاکستان میں بھی فلموں میں آئٹم نمبرز ہونے لگے ہیں اور اکثر ٹی وی فنکارائیں ٹی وی سے فلم میں انٹری آئٹم نمبر کے ذریعے ہی دیتی ہیں (بھئی عائشہ عمر اور مہوش حیات اس بارے میں حریم فاروق کا کہنا ہے کہ "مجھے آئٹم نمبر کرنے میں کوئی مسئلہ نہیں (بتانے کی ضرورت نہیں،

سبب جانتے ہیں) میں اس کام کو ہرگز برا نہیں سمجھتی مگر (ہاں جب اعتراض نہیں برا نہیں سمجھتیں تو پھر یہ مگر۔؟) میں خود کو اس کام کے لیے فٹ نہیں سمجھتی' میں ایک سنجیدہ اداکارہ ہوں (تو عائشہ عمر اور مہوش حیات کیا۔؟) اور اپنی یہی شناخت آگے بڑھانا چاہتی ہوں' آئٹم نمبر سے مجھے وقتی اور مختصر شہرت تو ضرور مل جائے گی (تو اس کا مطلب ہے کہ یہ دونوں اداکارائیں۔؟) میں چاہتی ہوں کہ میں پاکستانی سینما کے لیے کوئی ایسا کام کروں جس کے باعث ہماری سینما انڈسٹری کا نام بین الاقوامی سطح پر اجاگر ہو جائے۔"

## بادام

بادام کی گری بہت فائدہ مند ہے۔ یہ جسمانی قوتوں کی حفاظت کرتا ہے' اس سے عمدہ خون بنتا ہے۔ دمہ اور نمونیا میں بادام کا استعمال مفید ہے۔ جسم کو معتدل غذا فراہم کرتا ہے اور موٹا کرتا ہے۔ مرزا غالب بھی باداموں کے رسیا تھے اور اکثر کھانے کے بعد بادام کی گری کھاتے تھے۔

## کچھ اِدھر اُدھر سے

برطانوی شہر مانچسٹر میں میڈیا کانفرنس کے دوران جب ایکسپریس نیوز کی سینئر اینکر غریدہ فاروقی نے ریحام خان سے سوال کیا کہ کیا کبھی آپ نے عمران پر ہاتھ اٹھایا؟؟"۔

اس پر انہوں نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا اور خاموش رہیں۔ میڈیا کانفرنس میں صحافیوں نے ان سے کئی تلخ سوالات بھی کیے تاہم انہوں نے ان کو تحمل سے سنا۔

(ایکسپریس نیوز)

معاملہ اتنا سادہ نہیں کہ حاکم وقت پر اچانک کام 'کام' صرف کام کی حقانیت آشکار ہو گئی ہو اور اس نے یوم اقبال کی چھٹی ختم کرنے کا اعلان کر دیا ہو بات کہیں پیچیدہ ہے۔ یہ یوم اقبال کی چھٹی کے خاتمے کا اعلان نہیں یہ "اقبال کی چھٹی" کا اعلان ہے۔ یہ فیصلہ معلوم



ہوتا ہے مقامی سیاست کی "بصیرت" سے نہیں پھوٹا۔ اس کی جڑیں کہیں اور ہیں۔

(آصف محمود۔ نئی بات)

ڈاکٹر عافیہ کا فیصلہ سنایا گیا تو کمرہ عدالت میں اس فیصلے کے بعد جج کے خلاف شیم شیم کے نعرے بلند ہوئے۔ متعصب امریکی وکیل و تجزیہ نگار اسٹیون ڈاؤنز جس نے ہمیشہ عافیہ کی مخالفت میں تبصرے تحریر کیے تھے۔ عافیہ کی جرم بے گناہی کی سزا دیکھ کر چیخ اٹھا۔ "میں ایک مردہ قوم کی بیٹی کو ملنے والی سزا دیکھنے آیا تھا لیکن اب میں انسانیت کی ماں ڈاکٹر عافیہ صدیقی کو سلام پیش کرتا ہوں۔"

(مسز بینا حسین ایڈووکیٹ۔۔۔۔ جسارت)

امریکی عدالت میں ڈاکٹر عافیہ صدیقی کا فیصلہ سناتے ہوئے متعصب جج رچرڈ برلن نے اپنے فیصلے میں یہ بھی لکھا کہ باوجود اس کے کہ ڈاکٹر عافیہ کے خلاف کسی قسم کے کوئی ثبوت موجود نہیں ہیں لیکن پاکستانی وکلاء کے دلائل کی روشنی میں عافیہ کو 86 سال قید کی سزا دی جا رہی ہے۔

(مسز بینا حسین ایڈووکیٹ۔ جسارت)



نادرہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

## صدف آصف۔۔۔ کراچی

اکتوبر کے شمارے میں "خاموشی کو زباں ملے" سلسلہ میں سندس خلیل کا تعارف شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد سندس کی بہن ماہم خلیل کا یہ میسج آیا جو میں آپ سے شیئر کر رہی ہوں۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے معجزہ کہوں یا اتفاق؟ میری بہن سندس جنہیں رضائے الٰہی سے اس دنیا سے رخصت ہوئے ایک سال ہونے کو آگیا ہے۔ اس کے قلم سے لکھے ہوئے یہ الفاظ جب میں نے آج خواتین ڈائجسٹ کے ستمبر کے شمارے میں صفحہ نمبر 34 پر دیکھے تو خوشی اور غم کی جس کیفیت سے دوچار ہوئی' شاید ہی اس کا اندازہ کوئی کرسکتا ہے۔ سندس نے اپنے میڈیکل کا پہلے سال کا ایگزام دینے کے بعد اس ڈائجسٹ کی تحریر کا جواب دینا چاہا تھا اور آج چھ سال کے بعد اکتوبر کے ہی مہینے میں اس تحریر کو شائع کیا گیا جب کہ وہ خود اپنی زندگی میں اس کے شائع ہونے کی امید ہی چھوڑ بیٹھی تھی۔ آج ہوتی تو کتنی خوش ہوتی۔ مجھے نہیں معلوم وہ کون ہے' جس نے چھ سال پرانی تحریروں میں سے سندس کے الفاظ کو منتخب کیا۔ بس میری ماں کی التجا ہے خواتین والوں سے کہ اگر وہ لکھنے والے کے الفاظ اس کی زندگی میں ہی شائع کردیں تو بہتر ہوگا۔"

ج۔ پیاری ماہم! ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب آپ نے اور آپ کے گھر والوں نے اس سلسلہ میں سندس کا نام دیکھا ہوگا اس کے الفاظ پڑھے ہوں گے تو ان کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ یہ سلسلہ امثل نے منتخب کیا تھا۔ دراصل ہر ماہ ہمیں ڈھیروں خطوط موصول ہوتے ہیں۔ ان خطوط کے ڈھیر میں بہت سی تحریریں دب جاتی ہیں لیکن اتنی مدت بعد اس کا شائع ہونا واقعی حیرانی کی بات ہے۔ اسے قدرت کی طرف سے معجزہ کے ساتھ مصلحت بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے شائع ہونے سے بہت سارے دلوں میں سندس کی یاد تازہ ہوئی' جب ہم نے آپ کا میسج پڑھا تو بے اختیار سندس کی مغفرت کے لیے دعا کی اور ہم اپنی قارئین سے بھی درخواست کررہے ہیں کہ وہ سندس کے لیے دعا کریں۔ اور ہمیں یقین ہے کہ قارئین بھی سندس کے لیے دعا کریں گی۔ یہ تحریر سندس کی زندگی میں شائع ہوتی تو یقیناً" اسے خوشی ہوتی لیکن ہمیں اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ ڈھیروں دعاؤں کے یہ پھول سندس تک پہنچیں گے' اسے زیادہ خوشی ہوگی۔

## شائستہ سجاد بٹ۔۔۔ لاہور

ٹائٹل ہمیشہ سے خوب صورت تھا۔ "کرن کرن روشنی" نے دل کو ہی روشن کردیا۔ اقبال بانو سے ملاقات گویا دل کی مراد پوری ہوگئی۔ عمیرہ احمد کا آب حیات پڑھ کر دل کو کچھ سکون ہوا کہ سالار سکندر اتنی بڑے ٹارگٹ سے نکلا۔ حنا یاسمین کی "ہم کہاں کے عقل مند" ایک ہلکی پھلکی تحریر تھی جو کوئی واضح رنگ نہ دے سکی۔ ہاجرہ ریحان کی "فریب" زبردست تھی۔ پڑھ کر اچھا لگا۔ "نسل" یعنی کہ میرا فیورٹ ناول اس کہانی میں سعدی کا کردار بہت اہم ہے۔ نمرہ جی پلیز سعد کا کچھ مت کیجیے گا۔ عفت سحر طاہر کے "بن مانگی دعا" کی آخری قسط بہت

جان دار تھی۔ "اور اک کا لمحہ" ملیحہ صدیقی کا خوش آئند ناول تھا۔ اصل عزیز شہزاد کی "شہر آشوب" دل کو چھو لینے والی تحریر ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں بھی اس کہانی کا کوئی کردار ہوں۔ میں تو اس کہانی کے سحر میں ایسی کھو جاتی ہوں کہ اردگرد کا ہوش ہی نہیں رہتا۔ صدف آصف کی "آرزوئے محبت" ایک سبق آموز افسانہ تھا۔ آٹھویں کلاس میں اسکول کی ایک سہیلی سے خواتین ڈائجسٹ لے کر پڑھا۔ آج میری شادی کو اٹھارہ سال ہوگئے ہیں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے کل کی بات ہو۔ ڈائجسٹ پڑھنے کا شوق کم نہیں ہوا۔ فرق صرف اتنا پڑھا ہے جو رسالہ میں دو دن میں ختم کرتی تھی۔ اب سات آٹھ دن لگ جاتے ہیں۔

## فرحت عباس۔۔۔ پیرو جھنگ

"بن مانگی دعا" کا اینڈ اچھا تھا' اس کے بعد "نمل" کی تو بات ہی کیا ہے' اس کی تعریف کے لیے مجھے الفاظ نہیں مل رہے۔ قرآن پاک کی تفسیر وہ جس طرح سے بیان کرتی ہیں' پڑھ کر دل کو سکون آجاتا ہے اس کے علاوہ "شہر آشوب" بھی بہت اچھا ہے۔ اس کے علاوہ سب ہی سلسلے بہت ہی اچھے ہیں۔ ناول اور افسانے بھی اچھے تھے۔

## شازیہ رباب۔۔۔ شاہدرہ لاہور

خواتین کے سلسلوں میں مجھے "خامشی کو بیاں ملے" بہت پسند ہے اور "آپ کا باورچی خانہ" بھی اچھا ہے اور عفت سحر کا ناول تو حالانکہ بیچ میں شروع کیا تھا مگر جب جب پڑھتی گئی بہت اچھا لگتا گیا۔ خصوصاً "عون اور ثانیہ کی جملے بازی بہت مزہ دیتی تھی۔

ج ۔ پیاری شازیہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید' آپ نے ہمیں یاد کیا' بہت شکریہ' آپ کی رائے۔ جاننے کا ذریعہ آپ کے خط بھی ہوتے ہیں۔ آپ نے "نمل" کی دو تین اقساط نہیں پڑھیں۔ کوئی بات نہیں' ہم خلاصہ اسی لیے دیتے ہیں' تاکہ نئی پڑھنے والی قارئین کہانی کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

## زارا محفوظ۔۔۔ چکلالہ ایرپورٹ

سب سے پہلے "نمل" قرآن مجید کی اتنی خوب صورت تفسیر' نمرہ جی! اس دفعہ کی قسط پڑھ کر دل اداس ہو گیا ہے۔ کم از کم فارس کو جیل مت بھیجیے کیونکہ پھر ٹیم ٹوٹ جائے گی۔ اب آتے ہیں آب حیات کی طرف۔ عمیرہ جی بڑی خوب صورتی سے ناول کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ تنزیلہ ریاض کے عہد الست کی تعریف لیٹ ہو گئی۔ اس قدر خوب صورت تحریر کہ جس کی تعریف کے لیے الفاظ ہی نہ ملے۔

ج ۔ پیاری زارا! آپ اپنی دوست کی والدہ کے حالات زندگی لکھ کر بھجوا دیں' ہم سائرہ رضا تک پہنچا دیں گے۔ وہ کہانی لکھ دیں گی۔
خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

## آمنہ طالب۔۔۔ کاہنہ نو

میٹرک سے خواتین اور شعاع ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں اور اب میں میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ اب ایک سوال آپ سب سے۔

ہر لکھاری اپنی کہانیوں میں ایکسٹرا اور ڈنری (غیر معمولی) انسانوں کا ذکر کرتی ہیں۔ جو ہر لحاظ سے پرفیکٹ ہوتے ہیں۔ میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا ایک عام لڑکی جو قربانی کا جذبہ بھی رکھتی ہے مگر بھی اپنے بارے میں بھی سوچتی ہے جو کیا وہ ناول کی ہیروئن نہیں ہو سکتی؟؟؟ کیا ایک معمولی لڑکا ناول کا ہیرو نہیں ہو سکتا؟

خواتین کے سب رسالے پاکستان کی مڈل کلاس اور دیہات میں زیادہ شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ اپنے ناولز میں فینٹسی ضرور دکھائیں زندگی کی خوب صورتیاں بھی بیان کریں مگر ان لڑکیوں کو بتائیں کہ زندگی کا حسن صرف رومانس اور شادی ہی نہیں ہے۔

ہمارے معاشرے میں آج کل کیا ہو رہا ہے' ہوٹلوں' پارکوں میں پروان چڑھنے والی محبتیں تو غلط ہیں ہی۔ مگر خاندان میں کزنز کے درمیان ہونے والے عشق اور محبتیں کتنی سچی ہیں؟ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔

اپنے ناولز کے ذریعے آپ نئی نسل کو اور خاص طور پر لڑکیوں کو تعلیم کی طرف راغب کریں۔ اور آخری بات کہ۔ میں کسی بھی قاری بہن کو یہ اجازت نہیں دیتی کہ وہ میری اس رائے پر تنقید کریں کیونکہ میرے سوالات آپ سے اور اپنی رائٹرز سے ہیں۔

ج۔ بے شک آمنہ آپ کی تعریف و تنقید سر آنکھوں پر۔ جن کہانیوں میں مڈل کلاس کو دکھایا جاتا ہے ان کے اکثر

ہیرو' ہیروئن ہمارے گردو پیش رہنے والے عام انسان ہی ہوتے ہیں۔ اور جن کہانیوں میں پرفیکٹ لوگ دکھائے جاتے ہیں وہ بھی پرفیکٹ نہیں ہوتے' ان کی خامیاں بھی اجاگر کی جاتی ہیں۔ وقت گزاری دفلمی محبت کے تو ہم بھی قائل نہیں اس کا انجام ہمیشہ برا ہی ہوتا ہے اور برا ہی دکھایا جاتا ہے مگر ہم اور آپ جس دنیا میں رہتے ہیں وہ اب حسین رہی کہاں ہے؟ ایسے میں اگر دل کو خوش کرنے والے کچھ خواب ہی دیکھ لیے جائیں تو کیا حرج ہے۔؟

لڑکیوں کو تعلیم کی طرف راغب کرنے کی ضرورت نہیں' ہمارے ہاں کی لڑکیاں بہت ذہین ہیں۔ وہ پڑھنے کا شوق رکھتی ہیں اور پڑھنا بھی چاہتی ہیں لیکن انہیں تعلیم کی سہولیات مہیا نہیں ہیں۔ سندھ اور پنجاب کے کتنے ہی گاؤں ایسے ہیں۔ جہاں لڑکیوں کے لیے سرے سے اسکول ہی نہیں اور اگر کہیں لڑکیوں کے لیے اسکول ہیں تو والدین لڑکیوں کو پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے۔

**اسماء سیف... ملک پورہ ایبٹ آباد**

لوگوں نے کہا ہے کہ آپ ہمارے علاقے کی کہانیاں بغیر پڑھے ہی کوڑا دان کی زینت بنا دیتے ہو' بہت لوگوں نے بہت باتیں کیں۔ دل توڑ دینے والی باتیں۔ مجھے نہیں پتا انہوں نے ایسا کیوں کہا یا پھر ان کی باتوں میں کتنی سچائی ہے۔

ج۔ پیاری اسما! ہماری تو کوشش ہوتی ہے کہ تمام بہنوں کے خطوط' بزم میں ہوں لیکن اکثر خطوط واقعی بہت تاخیر سے ملتے ہیں اور بعض اوقات صفحات کی کمی بھی آڑے آتی ہے' لوگوں کی باتوں کی زیادہ پروانہ کیا کریں۔ کوئی بھی خط یا کہانی ہماری نظروں سے بچ کر تو کوڑے دان میں جانے سے رہی۔ اشعار ہوں یا کہانیاں' ہم معیار پر سمجھوتا نہیں کرسکتے اتنی سی بات ہے۔ بھائی کی شادی کی مبارک باد۔ امتحان میں کامیابی کے لیے ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

**سدرہ... ٹھٹھہ**

"من مانگی دعا" آخر کار اختتام پذیر ہو ہی گیا' ابیہا اور معیز کو ایک ہونا ہی تھا اور وہ ہو گئے' بہت معصوم تھی ابیہا اور سفینہ بیگم کا دل بھی آخر کار نرم پڑ گیا۔ نمرہ احمد کا "نمل" بہت اچھے موڑ پر ہے' ہاشم کا انجام برا ہو گا' اتنی حد تک گر گیا ہے۔ مجھے حنین کا کردار بہت پسند ہے' بہت ذہین بچی ہے۔

ج۔ سدرہ! حنین کا کردار واقعی اچھا ہے' لیکن نمل کے تو سارے ہی کردار غیر معمولی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ ناول اپنے کرداروں کی وجہ سے عرصہ تک قارئین کے دلوں میں رہے گا۔ عفت سحر طاہر تک آپ کی تعریف پہنچا رہے ہیں۔

**حافظہ مہدیہ' خدیجہ اور ربیعہ... گاؤں رکن پور**

ہم تینوں نے قرآن پاک حفظ کیا ہوا ہے اور حفظ کے دوران ہی ہم نے خواتین پڑھنا شروع کیا تھا۔ خدیجہ آپا میری بڑی بہن ہیں اور ربیعہ ان کی دوست ہیں۔ ہم گاؤں میں رہتے ہیں۔ ہمارے گاؤں میں سب سے پہلے خواتین میری آپی خدیجہ نے پڑھنا شروع کیا تھا اور اب تقریباً" ہر ایک لڑکی پڑھتی ہے۔ میری عمر پندرہ سال ہے' لیکن میں رسالہ ضرور پڑھتی ہوں اس کی وجہ صرف نمل اور نمرہ احمد ہیں اور عمیرہ احمد بھی بہت کمال رائٹر ہیں' باقی نومبر کا شمارہ بھی بہت زبردست تھا' اور مہربانی کر کے حنین کا ہیرو ہاشم کو نہ بنایئے گا۔ حنین کا ہیرو کوئی سعدی جیسا نیک بنایئے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ زمر کو کچھ نہ ہونے دیجیے گا کیونکہ زمر اور فارس سے ہی ناول میں مزہ آتا ہے۔

ج۔ حافظہ مہدیہ' خدیجہ اور ربیعہ! بھولی بھالی اور معصوم بچیوں! یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ تینوں نے قرآن پاک حفظ کیا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو عمل کی توفیق عطا کرے۔ بہت اچھا لگا یہ جان کر کہ آپ اتنے شوق سے ہمارا رسالہ پڑھتی ہیں' بس' آپ کو بہت انتظار نہیں کروائیں گے جلد ہی دسمبر کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہوگا' مگر اس دفعہ پورے شمارے پر تبصرہ بھیجنا ہے۔ ٹھیک! اطمینان رکھیں' حنین کو عقل آگئی ہے۔ ہاشم اس کا ہیرو نہیں ہو سکتا۔ اب یہ اس کی قسمت ہے کہ اسے آگے کیا ملتا ہے۔

**ثمینہ کوثر عطاری... ڈوگہ گجرات**

سرورق بس ٹھیک ہی تھا ہاں البتہ جھمکے بہت پیارے تھے پھر اس کے بعد "کہنی سنی" میں حقیقت کو کڑوے گھونٹ کی طرح پی کے ہم بڑھے "کرن کرن روشنی" کی طرف جس میں موجود ثواب کی روشنی نے مجھے پچھلے تلخ

گھونٹ بھلا کر رحمت کی ٹھنڈی بارش میں لا کھڑا کیا۔ یہ سلسلہ مجھے سارے خواتین کی جان محسوس ہوتا ہے بہت خوب صورت۔ بہت مکمل! انٹرویوز میں "اقبال بانو" سے مل کے بہت اچھا لگا۔ شاہین رشید کا شکریہ جو ان پیاری پیاری ہستیوں سے ہم کو ملواتی ہیں۔ ہمارے نام میں ہم نے فوزیہ ثمر کی بہت کمی محسوس کی۔ باقی سب کے خط بھی لاجواب تھے۔ اب آتے ہیں جی "بن مانگی دعا" کی طرف تو اس کا اینڈ مجھے بہت پسند آیا۔ "آب حیات" ایک ایسا مکمل ناول ہے جس کی تعریف کرنے کے لیے مجھے الفاظ مل ہی نہیں رہے بس اتنا کہوں گی عمیرہ جی اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ اور پھر میں پہنچی نمرہ احمد کے "نمل" کی طرف تو یہ کیا؟ فارس تو واقعی بہت برا پھنسا ہے' خیر زمر جیسی وکیل کے ہوتے ہوئے تمام قارئین بہنوں یا پھر فارس غازی کو پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں۔ افسانے تمام کے تمام بہت اچھے بلکہ سبق آموز تھے۔ شہر آشوب بہت اچھا لگا ہے "ادراک کا لمحہ" بھی بہت اچھی کاوش تھی ملیحہ صدیقی کی۔

ج۔ پیاری ثمینہ کوثر! خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ ہماری طرف سے بھائی کو وعلیکم السلام۔ اللہ آپ دونوں کو خوش رکھے اور کامیابیاں عطا فرمائے۔ آمین۔ فوزیہ ثمر کا خط اس بار لیٹ ملا۔ اس لیے شامل اشاعت نہ ہو سکا۔

## فہمیدہ گل۔۔۔ لاڑکانہ

نمرہ جی! اسے بڑھ کر آپ کو اور کیا چاہیے کہ نمل پڑھنے والا ہر شخص جب بھی قرآن مجید کی تلاوت کرے تو اسے بے اختیار آپ یاد آئیں' کیوں کہ جس طرح آپ نے تفصیل سے قرآن پاک کی تفسیر کی ہے' اس سے ہمارے دماغ کے کئی بند خانے کھل چکے ہیں۔ فارس جب زمر کو طلاق کی بات کرتا ہے مجھے اتنا دکھ ہوا کہ بس۔ ان دونوں کے بیچ تھوڑا بہت رومانس بھی دکھائیے۔ اور نمل کی باقی کتنی اقساط ہیں۔ میرے شوہر نامدار اسے پڑھنے کے لیے بے چین ہیں اور نمرہ جی پلیز' پلیز فارس کو آئندہ قسط میں ہی جیل سے نکالیے گا پلیز ورنہ مزا نہیں آئے گا۔ "بن مانگی دعا" کی آخری قسط بہت اچھی لگی۔ اس کی کمی محسوس ہو گی۔ باقی سب کہانیاں لاجواب ہیں۔ آپ ایک بات تو بتائیں یہ جو ہماری بہنیں ہیں نمرا' اقرا' نوال افضل اور گڑیا شاہ' خاص کر کے نمرا' اقرا یہ کیا آپ کی رشتے دار ہیں؟ نمرا' اقرا' نوال' گڑیا' مائنڈ مت کرنا۔ ہاں اس رسالے کے سائے تلے ہم ایک ہیں' ہم ایک ہیں۔

ج۔ پیاری فہمیدہ گل! ہم اپنے سارے قارئین کے ساتھ محبت کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں اور کسی کو بھی' کسی دوسرے پر فوقیت نہیں دی جاسکتی۔ آپ کی جانب سے۔ بس صرف ایک دفعہ اشعار موصول ہوئے تھے اور اب یہ محبت بھرا شکایت نامہ۔ بات یہ ہے کہ جتنی بہنوں کے نام آپ نے لکھے ہیں' وہ ہر ماہ باقاعدگی سے خط اور دیگر سلسلوں کے لیے نگارشات بھیجتی ہیں اور پرچہ شائع ہونے سے پہلے۔ بس اسی لیے رسالے میں انہیں جگہ مل جاتی ہے ورنہ اور تو کوئی بات نہیں۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کے شوہر بھی خواتین پڑھتے ہیں۔

خواتین کی پسندیدگی کا شکریہ۔ ہم آپ کے اگلے خط کے منتظر رہیں گے۔

## صفیہ جعفر حسین۔۔۔ کھوہ جیوے والا

خواتین و شعاع سے میرا رشتہ 20 سال پرانا ہے باقاعدگی سے یہ دونوں ڈائجسٹ پڑھتی ہوں' میں ایک گھریلو خاتون ہوں میرے دو بیٹے' دو بیٹیاں ہیں۔ اس میں موجود تمام سلسلے مجھے بہت پسند ہیں' ان سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ نمرہ احمد' عمیرہ احمد' فاخرہ جبیں' راحت جبیں' نزہت شبانہ' سمیرا حمید یہ تمام میری پسندیدہ مصنفین ہیں۔

ج۔ پیاری صفیہ! اتنا دیرینہ تعلق ہے تو اظہار میں اتنی تاخیر کیوں.....؟ خیر دیر آید' درست آید اب شرکت کرتی رہیے گا۔ تفصیلی تبصرے کے ساتھ۔

## شبانہ عندلیب۔۔۔ گوجرانوالہ

"کہنی سنی" کے بعد سب سے پہلے نمل پڑھا۔ ہائے ہائے۔ ہم تو فارس کو اپنا ہیرو سمجھتے رہے وہ تو ایک ظالم شخص نکلا۔ ہائے میری پیاری زمروہ تو پہلے ہی زخموں سے چور اور غموں کی ماری ہے اور نمرہ جی آپ نے اسے فارس کے ہاتھوں اور دکھی کر دیا' ہاشم کو دوزخ نصیب ہو۔ "آب حیات" میں ہم مجیب السائلین تک آپہنچے ہیں۔ کچھ نئے انکشافات لیے یہ قسط اچھی تھی۔ امامہ کا سالار کو محبت کے

جواب میں کچھ نہ کہنا آج بھی ہمیں چبھتا ہے۔ لگتا ہے کہ وہ سالار کے مرنے کے بعد ہی اسے آئی لو یو کہے گی۔ حمین کی شرارتوں نے بہت محظوظ کیا۔ آخر میں سالار کے برین ٹیومر نے ہلا کر رکھ دیا۔ "بن مانگی دعا" میں ابیہا اور معیز کے متعلق عفت جی نے کچھ زیادہ اور خاص نہیں لکھا۔ کچھ اور چٹ پٹا لکھتیں تو اور اچھا لگتا۔ اگلا ناول میں تو سمیرا حمید کا پڑھنا چاہتی ہوں' بھلے اس کا اینڈ وہ کتنا ہی دکھی کیوں نہ لکھیں وہ میری فیورٹ ہیں۔ صدف ریحان کو اتنے عرصے بعد پڑھ کر اچھا لگا۔ افسانوں میں عنیقہ بیگ کو بہت دیر بعد پڑھا۔ آپی "صاف گو" کی رائٹر عمارہ خان نئی ہیں یا وہی پرانی جو پہلے لکھا کرتی تھیں۔ باقی افسانے بھی اچھے تھے۔

ج۔ پیاری شبانہ! دشمن کے لیے بھی دوزخ کی دعا نہیں مانگتے۔ ہدایت کی دعا مانگتے ہیں۔ ان سطور کے ذریعے آپ کے نیک خیالات نمرہ تک پہنچ جائیں گے۔ امید تو نہیں ہے' وہ آپ پر اور زمر پر کوئی ظلم ـــــ کریں گی۔ سمیرا حمید آپ کے لیے ناول ضرور لکھیں گی تھوڑا انتظار کریں۔ عمارہ خان نئی رائٹر ہیں۔

## حنا احمد ـــــ کراچی

میری زندگی کا سب سے بڑا خواب ہے کہ میں بھی کہانیاں لکھوں اور وہ شائع بھی ہوں' میں رائٹر تو بننا چاہتی ہوں (مگر کامیاب رائٹر) میں نے ایک افسانہ بھی لکھا ہے جس کا نام ہے شہر خموشاں کی داسی اسے بھیجنا چاہتی ہوں۔

ج۔ پیاری حنا! ضرور لکھیں' ہماری دعائیں اور تعاون آپ کے ساتھ ہے۔ "شہر خموشاں کی داسی" نام کچھ سمجھ میں نہیں آیا' شہر خموشاں کی اصطلاح جس جگہ کے لیے استعمال ہوتی ہے وہاں داسی کا کیا کام۔ بہرحال آپ بھجوا دیں اور یقین رکھیں' اچھا ہوا تو ضرور شائع ہوگا۔

## اقرا یعقوب ـــــ قصور

خواتین ڈائجسٹ میں تقریباً" 6th کلاس سے پڑھ رہی ہوں اور اب میں کہانی لکھنا چاہتی ہوں۔ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے اجازت کی طلب گار ہوں۔

ج۔ پیاری اقرا! ہماری طرف سے آپ کو پوری اجازت ہے' ضرور لکھیں اور ہمیں بھجوائیں۔

## حمیرا رفیع ـــــ کراچی

اپنی زندگی کچھ ادب و آداب کے ساتھ گزری ہے لکھا بہت کم ہے پڑھا زیادہ ہے۔ ایک عمر کے بعد روایتی رومانوی ادب سے آدمی صرف نظر کرتا ہے۔ میں نے اپنے بچوں کے گھر میں عمیرہ احمد کا ناول دیکھا پڑھا تو اندازہ ہوا کہ (پیر کامل) فکر نو میں اک نئی دلکش تبدیلی ہے۔ نئی نسل درس وعظ کے پرانے بوجھل انداز سے چھٹکارا پا کر ایک پُراثر اور دلکش راستے کو اپنا رہی ہے۔ جدید تعلیمی انداز فکر کو بھی صحیح جگہ استعمال کرتے ہوئے مطلوب مقاصد حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ راستے کی رکاوٹیں صبر اور برداشت طلب کرتی ہیں اور یہ منزل زینہ بہ زینہ کس طرح آرہی ہے (آب حیات)۔ دیگر لکھنے والیاں بھی جیسے نمرہ احمد نے بھی بڑا منفرد اسلوب اپنایا ہے جو اچھی کوشش ہے۔ کاش سب بچیاں پڑھیں اور اس سے مثبت اثرات قبول کریں' لیکن۔ تفسیر' قرآنی آیات بیان کرنے میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ فرحت اشتیاق بھی بہت خوب صورت انداز میں جذبے جگاتی ہیں۔

ج۔ محترمہ حمیرا رفیع صاحبہ! آپ کی تحریر سے آپ کے' ادب سے لگاؤ کا بخوبی اندازہ ہو رہا ہے۔ بہت شکریہ کہ آپ کو ہمارا پرچہ پسند آیا۔ ہمارے ادارے کی دیگر دو کاوشیں شعاع اور کرن بھی ہیں۔ کبھی فرصت ملے تو انہیں بھی پڑھ کر دیکھیے گا۔ وہ بھی یقیناً" آپ کے مزاج اور ذوق سے ہم آہنگ ہوں گے۔

## آمنہ ولید ـــــ ٹاؤن شپ لاہور

ایک فرمائش کرنی ہے شاہین رشید سے کہ نعمان اعجاز کا انٹرویو لیں پلیز اور ان سے یہ ضرور پوچھیے گا کہ وہ مذاق رات سے کیوں چلے گئے۔ میں آب حیات نہیں پڑھ رہی وجہ صرف سالار ہے اگر سالار کو کچھ ہوا تو میں آب حیات مکمل ہونے کے بعد بھی نہیں پڑھوں گی۔ فیس بک سے اس ناول کی اپ ڈیٹس updates لیتی رہتی ہوں' لیکن پڑھنے کا حوصلہ نہیں پڑتا۔ "بن مانگی دعا" کا اختتام اچھا ہو گیا۔ نمل کی پچھلی قسط میں لگا کہ بس اب سب کچھ ٹھیک ہونے والا ہے' لیکن یہ قسط پڑھ کے دل ڈوب ڈوب گیا۔ نگاہ پست کرنے کے دس فائدے لاجواب ہیں۔ یہ آمنہ ریاض' عنیزہ سید' فرحت اشتیاق' راحت

جبیں کہاں غائب ہیں۔ پلیز انہیں کہیں 'خواتین کا چکر ہی لگا جائیں(ہاہاہا)

ج۔ آمنہ ولید اجن مصنفین کا آپ نے ذکر کیا' وہ انہیں بھی کم عزیز نہیں ہم انہیں یاد کرتے اور یاد دلاتے رہتے ہیں کہ ہماری بہت ساری قارئین ان کی منتظر ہیں' لیکن شاید ان کی مصروفیات انہیں مہلت نہیں دیتیں ورنہ ایسا کیسے ہوسکتا ہے اتنی ساری قارئین کی محبتوں کی قدر نہ کی جائے۔

آمنہ ریاض کے لیے تو ہم خوش خبری سنا چکے ہیں۔ ان شاءاللہ جنوری میں ان کا ناول شامل ہوگا۔

سالار کے سلسلے میں تھوڑا دل مضبوط کرلیں۔ ''آب حیات'' بہت دلچسپ ہے' یقیناً'' آپ لطف اندوز ہوں گی۔

## شہناز فیضی۔۔۔ کراچی

شاہین رشید نے میری پسندیدہ رائٹر اقبال بانو سے ملاقات کروائی۔ ''اعجاز کا رنگ'' بہت اچھا سلسلہ ہے۔

عمیرہ احمد کی تحریر ''آب حیات'' دل میں اتر گئی۔ ''بن مانگی دعا'' عفت سحر طاہر کا بہت اچھا ناول تھا۔ صدف ریحان کی تحریر ''مثل ماہتاب'' واہ خوب واہ' عمارہ خان اور صدف آصف کے افسانے پسند آئے۔ ''اچھا لگا۔ باقی سلسلے بھی اپنی جگہ خوب تھے سرورق خوب لگا۔

ج۔ پیاری شہناز! آپ کی آمد نے کتنی پرانی یادیں جگا دیں۔ جب ہم سب ساتھ تھے کتنے لوگ ساتھ چھوڑ گئے۔ بابر صاحب' خاور صاحب اور پھر ریاض صاحب بھی رخصت ہوگئے۔ ناظمہ طالب نے شہادت کا رتبہ پایا۔

آپ نے پرچے پڑھنا چھوڑ دیے تھے یا خط لکھنے کی فرصت نہیں ملی۔۔۔؟ آپ تو ہماری ان قارئین میں سے تھیں جو سب سے پہلے ہمیں خط لکھتی تھیں اور باقاعدگی سے سارے سلسلوں میں شرکت کرتی تھیں۔

خواتین ڈائجسٹ میں آپ کو سب کچھ خوب لگا' بہت شکریہ۔ اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔

## ندا حسنین۔۔۔ کراچی

میں خواتین وشعاع کی بہت پرانی قاری ہوں۔ اسکول کے زمانے سے ہی اس ڈائجسٹ کا نشہ کچھ یوں چڑھا کہ رفعت سراج' تنزیلہ ریاض' عمیرہ احمد' عنیزہ سید' فاخرہ جبیں' راحت جبیں' فائزہ افتخار' صائمہ اکرم چوہدری' فرحت اشتیاق' فاخرہ گل' نگہت عبداللہ اور نمرہ احمد کو پڑھتے پڑھتے نہ جانے کب اور کیسے لکھنے کی لگن من میں جاگی اور اللہ کے حکم سے لکھنا شروع کردیا۔ یوں یہ ثابت ہوا کہ یہ ادارہ ایک رہنما کے ساتھ ساتھ ایک بہترین استاد کی بھی حیثیت رکھتا ہے۔

اب بات ہوجائے نومبر کے شمارے کی۔ سرورق بے حد پیارا تھا۔ اقبال بانو سے ملاقات بے حد دلچسپ لگی۔ عمیرہ احمد کا نام کسی تعارف کا محتاج تو ہرگز نہیں۔ وہ لفظوں کی جادوگرنی ہیں اور نمرہ تو وہ بائیک ہائیر ہیں جو اپنے قلم سے لفظوں کی وہ بانسری بجاتی ہیں کہ ہم ان کی کہانی کی بھول بھلیوں میں کھوتے چلے جاتے ہیں۔ عفت سحر طاہر نے ''بن مانگی دعا'' کا جس خوب صورتی سے اختتام کیا وہ قابل ستائش ہے۔ اس ماہ کے افسانے کافی دلچسپ تھے سب سے بہترین مجھے صدف آصف کا آرزوئے محبت لگا۔ ایک بے حد مختلف موضوع جسے بے حد خوب صورتی سے قلمبند کیا صدف آصف نے۔ عمارہ خان کا صاف گو بھی سبق آموز تھا۔ فریب پڑھ کر اچھا لگا۔ ہاجرہ ریحان نے بہت خوب صورتی سے کہانی کو لفظوں میں ڈھال کر پیش کیا۔ امت العزیز شہزاد کا شہر آشوب بھی اچھا جارہا ہے۔ یقین ہے کہ کہانی جوں جوں بڑھتی جائے گی مزید دلچسپ ہوتی جائے گی۔

ج۔ پیاری ندا خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ امت العزیز شہزاد نی رائٹر ہیں ان کی کردار نگاری بہت زبردست ہے ہر کردار سے پورا انصاف کررہی ہیں۔ آپ کا ایک افسانہ منتخب ہوچکا ہے جلد شامل اشاعت ہوگا۔ ندا آپ ماشاءاللہ باصلاحیت ہیں' تحریر میں بے ساختگی اور ندرت ہے اگر ہلکے پھلکے موضوعات کا انتخاب کریں تو یقیناً'' قارئین کی پسندیدہ مصنفین کی فہرست میں آپ کا نام بھی شامل ہوگا۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

## حنا گل۔۔۔ بنوں۔ خیبر پختون خواہ

اس ماہ ڈائجسٹ کا سرورق گزارہ تھا۔ سرورق میں کچھ بھی 'کوئی پینٹنگ' کوئی خطاطی یا سیاحتی مقام کی تصویر کچھ

بھی ہو سکتا ہے، عورت ضروری ہے کیا؟ "کرن کرن روشنی" سے خود کو منور کرتے ہوئے بڑھتے گئے "بن مانگی دعا" کا اختتام اچھا ہوا۔ ابیہا کو صبر کی جزا مل گئی واقعی "اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" اس وقت پوری دنیا اللہ تعالیٰ سے کھلے عام کھلی جنگ کا ارتکاب کررہی ہے۔ عمیرہ احمد نے قلم کے ذریعے سود کے خلاف اسلامی مالیاتی نظام کا جو ڈھانچہ بنایا ہے یا بنارہی ہیں یہی وقت کی اولین ضرورت ہے۔ ویل ڈن عمیرہ احمد... اور اب دی ون اینڈ اونلی نمرہ احمد... کیا کہنے نمل ___ کے، جب جب پڑھتے ہیں تشنگی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ایک بات مجھے حیرت ہوتی ہے اکثر دوستوں پہ جو ہاشم کا کردار پسند کرتے ہیں۔ یہ تو شرافت کے لبادے میں چھپے بھیڑیے ہیں، جن کی وجہ سے سعدی جیسا ٹیلنٹ رل جاتا ہے۔ ایک قاری بہن اقرا شریف نے ایک سوال اٹھایا تھا وحی کے بارے میں کہ ہم شیطانی یا رحمانی وحی کو شریعت کے ذریعے کیسے جج کریں! تو شریعت کیا ہے! قرآن اور سنت۔ ہر وہ خیال یا کام جو ہمارے دل میں آئے اور اس پر عمل کرنے کو دل اکسائے تو اسے انجام دینا واقعی ہمارے اختیار میں ہے اور یہ بھی ہم پہ منحصر ہے کہ ہم اسے قرآن و سنت کی حدود میں اختیار کرتے ہیں یا ان حدود سے تجاوز کرجاتے ہیں۔

ج۔ پیاری حنا! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کا خط شائع نہ ہوسکا۔ بہت اچھا خط لکھا ہے آپ نے۔ آپ کے دیگر سلسلے بھی شامل ہوں گے۔ ہماری کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ اپنے پیارے قارئین کو مایوس نہ کریں۔ بس تھوڑی دیر سویر ہوجاتی ہے۔
خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ نمرہ تک آپ کی پسندیدگی پہنچا رہے ہیں۔

## صبا عشل... بھاگووال فیصل آباد

نومبر کا خواتین سامنے میز پر رکھا ہے ٹائٹل بس ٹھیک ہی ہے۔ "آب حیات" بہت زبردست جارہا ہے۔ "آب حیات" کے بعد نمل لاجواب' سچ کہوں تو وہ الفاظ نہیں جن میں تعریف کی جاسکے۔ شہر آشوب بھی اچھا لگا۔ "بن مانگی دعا" ابھی تک نہیں پڑھ پائی۔ افسانوں میں تمام ہی افسانے اچھے لگے۔ انیقہ بیگ کا افسانہ "دروازہ" اچھا لگا۔ حنا یاسمین کا افسانہ "ہم کہاں کے عقلمند" پڑھ کر مزہ آیا دلچسپ انداز تحریر۔ صدف آصف کا "آرزوئے محبت" ایک لاجواب تحریر مصنفہ کی کہانی پہ گرفت شاندار تھی۔ "صاف گو" عمارہ خان کا ایک جامع افسانہ۔ ہاجرہ ریحان کا "فریب" بس ٹھیک ہی لگا۔ ناولٹ بھی اچھے رہے۔ خواتین کے باقی تمام سلسلے میرے پسندیدہ ہیں اور معیار تو ظاہر ہے خواتین اور شعاع کا بلند ہے ہی۔

ج۔ صبا! افسانہ بھجوانا چاہتی ہیں تو پوچھنے کی ضرورت نہیں ضرور بھجوائیں۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

## تسکین گل... نامعلوم شہر

میں خواتین ڈائجسٹ کی بہت پرانی قاری ہوں۔ اردو ادب میں ماسٹرز کرنے کے بعد کالج میں کانٹریکٹ جاب بھی کرچکی ہوں۔
نومبر کے شمارے میں عفت جی نے آخر "بن مانگی دعا" کا اختتام کرہی دیا اور کیا کمال لکھا۔ پڑھ کے دل خوش ہوگیا۔ ول ڈن عفت جی! پلیز آپی! آئندہ ناول فائزہ افتخار کا شامل کریں ہمیں شدت سے انتظار ہے کہ کب وہ آئیں گی۔ "داہی ڈھولن یار دی" کے بعد وہ تو غائب ہی ہوگئی ہیں۔ وہ میری اور میری بہنوں کی موسٹ فیورٹ مصنفہ ہیں۔ میری بہنیں فائزہ اور حسینہ بہت شوق سے آپ کا ڈائجسٹ پڑھتی ہیں۔ حسینہ کو نمرہ احمد اور فائزہ کو عمیرہ احمد بہت پسند ہیں۔ "نفسیاتی الجھنیں" میں زینب وحید کا خط پڑھا بے حد دکھ ہوا انہوں نے جس طرح اپنے گھر والوں کے لیے قربانیاں دیں وہ پڑھ کر دل سے بے اختیار ماشاء اللہ نکلا۔ امتل جی! میرا مطلب "شہر آشوب" کی مصنفہ امت العزیز شہزاد بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔

ج۔ تسکین! فائزہ افتخار ہماری بھی پسندیدہ مصنفہ ہیں ان کا ناول ضرور شامل کرتے' لیکن وہ آج کل کرن میں ناول لکھ رہی ہیں۔
حسینہ اور فائزہ کو ہمارا اسلام کہہ دیں۔ آپ نے شرکت کی بہت خوشی ہوئی... آئندہ بھی خط لکھتی رہیے گا۔

## جمیلہ شاہ... کھگہ کھگے والا ملتان

سب سے پہلے "آب حیات" "سب کچھ بہت اچھا" مگر آخری لائن پڑھ کرہی دل تھام کر بیٹھ گئی۔ سالار کو ٹیومر' اس کے بعد نمل یہ کیا کیا نمرہ آپ نے اتنی مشکل سے تو

سب ٹھیک ہو رہا تھا۔ زمری کنڈلی کا مسئلہ کہ اب فارس جیل چلا گیا۔ آپی سعدی کو لے آئے گی۔ مریم عزیز آپ کا ناول بہت اچھا تھا شعاع میں آپ غائب نہ ہونا اور عفت! آپ نے اچھا اینڈ کیا مجھے بہت پسند آیا، آپ اپنے دام میں صیاد آگیا۔

ج۔ پیاری جمیلہ! فرحت اشتیاق ناول لکھ رہی ہیں آپ جلد ان کا ناول پڑھیں گی۔ سائرہ رضا فی الحال ٹی وی پر مصروف ہیں، لیکن انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ اگلا ناول ان ہی کا ہوگا۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

**قرۃ العین کمبوہ۔ راجہ رام**

یہ رسالے پچیس سال سے ہمارے گھر آتے ہیں۔ تب پھپھو اور آپی وغیرہ پڑھتے تھے۔ میں نے 6th میں پہلا ناول پڑھا تھا کسی راستے کی تلاش میں۔ تب سے اب تک بہت سے ناولز پڑھے تعداد بھی یاد نہیں اب سیکنڈ ایئر سے فارغ ہو گئی ہوں۔ نمل بلاشبہ ایک بہترین ناول ہے شہر آشوب بھی اچھا جا رہا ہے۔ آب حیات کی شروع کی اقساط بہت مزے کی تھیں مگر اب ہر وقت ڈر لگا رہتا ہے۔ کہ اب کچھ ہوا کہ تب۔ پلیز میری ریکویسٹ ہے کہ سعدی حمید چوہدری، نگہت سیما، عنیزہ سید، جیسی سسٹرز ان سب کو ڈھونڈ لائیں۔

ج قرۃ العین! آپ کی پسندیدہ مصنفین تک آپ کی فرمائش پہنچا رہے ہیں خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

**روزینہ نعیم۔ یاسمین نعیم۔ کھیالی گوجرانوالہ**

خط لکھنے کی سب سے بڑی وجہ ہے "آب حیات" کے "حمین صاحب" کی واہ کیا بچہ ہے یار سالا صاحب کو تو خوب ہی مزا چکھائے گا جب اس کے ڈائیلاگ پڑھے، ہنس ہنس کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ ویل ڈن آج اگر ان کا تذکرہ نہ کرتی تو یہ بے عزتی تھی حمین صاحب کی۔ "شہر آشوب" کی میرو کی زندگی میں بھی کچھ خوشیاں لے آئیں، سائر کی ماں تو نازو ہی لگ رہی ہے اور اب جو صاحبہ تشریف لائی ہیں وہ چندا ہوگی ویسے سائر بیوی کو تو روکتا ہے تو پھر اپنی بہن صاحبہ کو بھی روکے نا۔ پلیز "نایاب" جی کو کہہ دیں کہ اب تشریف لے آئیں۔ اچھی بری کہانی کے ساتھ اور "ازمیر" کو بھی زحمت دیں آنے کی ہم سے دل و جاں سے منتظر ہیں کہانی کے۔

اور ایک اہم بات یاسمین نعیم صاحبہ، میرے ماموں کے بیٹے کے ساتھ رشتہ منگنی جوڑ چکی ہیں۔

ج پیاری روزینہ اور یاسمین! آپ دونوں کو دلی مبارک باد یاسمین کو منگنی کی اور روزینہ آپ کو ماموں زاد بھائی کے بہنوئی بننے کی۔

نایاب جیلانی کی کمی تو ہم بھی محسوس کر رہے ہیں اور ازمیر ٹ ہماری بھی پسندیدہ شخصیت ہیں۔ عفت سحر طاہر اور نایاب جیلانی تک آپ کی فرمائش پہنچا رہے ہیں۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

## قارئین متوجہ ہوں!

1- خواتین ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جا سکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔

3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7- خواتین ڈائجسٹ کے لیے افسانے، خطوط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

**خواتین ڈائجسٹ**
**37- اردو بازار کراچی**

# آپ کا باورچی خانہ

مہناز اختر

اس سلسلے میں شرکت کرنے کو اس لیے دل چاہا کہ "مابدولت" کوکنگ کے شوقین ہیں اور اہل خانہ "کھانا" اور وہ بھی "چٹ پٹا" کھانے کا شوق رکھتے ہیں۔ اس شوق کو نکھارنے اور مزید سنوارنے کے لیے کوکنگ شوز' ماہنامے' ٹپس (کچن اور کوکنگ سے متعلق) دیکھتی اور مطالعہ کرتی رہتی ہوں۔ پھر جب من کو بھا جائے وہ "ریسپی" ضرور ٹرائی کرتی ہوں۔

1 کوکنگ کرتے ہوئے میں سب سے زیادہ صفائی کا خیال رکھتی ہوں کیونکہ ہسبینڈ وہم کی حد تک صفائی پسند ہیں' کچھ میں بھی محتاط سی ہوں۔ سو صفائی کا اہتمام اور گھر والوں کی پسند سے ہی کھانا بناتی ہوں۔ اور جناب جو کھانا زبان کو ذائقہ دے اسے معدہ بھی قبول کرتا ہے۔ (میری ناقص رائے میں) صحت اور غذائیت تو پھر ساتھ ساتھ ہی ہیں۔

2 ہائے دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھ دیا جی۔ چند سال پہلے ہی کی تو بات تھی کہ راوی چین ہی چین لکھا کرتا تھا لیکن قسمت سے ایسے ہسبینڈ (اچھے ہسبینڈ) ملے ہیں کہ وہ آرام طلبیاں اور مستیاں تو قصہ پارینہ ہوئیں۔ "خواتین" اور "شعاع" میں ہیروز کی جتنی بھی اچھی کردار نگاری ہماری رائٹرز کرتی ہیں۔ وہ میرے "ان" میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ مہمان نواز' صفائی پسند' ملنسار' غصہ ور اور بھی بہت ساری۔

کھانا پکانا اور وہ بھی مہمانوں کے لیے مشکل کام تھا میرے لیے لیکن اب آسان ہو گیا ہے کیونکہ اب میرے ہاتھ پیر نہیں پھولتے۔ ماشاء اللہ خاصی بڑی فیملی ہے ہر ویک اینڈ بہت ملنے گلنے والا ہوتا ہے۔ سو ایکسپرٹ ہو گئی ہوں۔ ایک ڈش جو اچانک آنے والے مہمانوں کے لیے موزوں ترین ہے۔ اور یقین کریں بہت لذیذ بنتی ہے۔ ٹرائی کیجیے اور داد وصول کیجیے۔

## قیمہ پیاز

**اجزا:**

| | |
|---|---|
| قیمہ | ایک کلو |
| پیاز | ایک کلو |
| لہسن ادرک کا پیسٹ | ڈیڑھ چمچہ کھانے کا |
| نمک | حسب ذائقہ |
| سرخ مرچ | آدھا چمچہ چائے کا |
| ہلدی | آدھا چمچہ چائے کا |
| پسا ہوا دھنیا | آدھا چمچہ کھانے کا |
| بھنا ہوا سفید زیرہ | ایک چمچہ کھانے کا |
| ٹماٹر | 2 عدد درمیانہ سائز |
| سبز مرچ | سجانے کے لیے |
| آئل | ایک کپ چھوٹا |

**ترکیب:**

ایک عدد چھوٹی سی پیاز کو باریک کاٹ لیں۔ دیگچی میں آئل ڈال کر گرم ہونے پر پیاز گولڈن براؤن کرلیں۔ گولڈن ہونے پر پانی کا ہلکا سا چھینٹا دیں۔ ادرک لہسن کا پیسٹ ڈال کر ہلکی آنچ پر پانچ منٹ تک اچھے طریقے سے بھونیں۔ نمک مرچ' ہلدی اور دھنیا کو ایک پیالی میں ڈال کر پانی بھی شامل کرلیں۔ کیونکہ بعض اوقات مسالا جات میں ریت کے اجزا ہوتے ہیں وہ پیالی میں پیندے میں بیٹھ جائیں گے۔ اب پانی ملا مسالہ بھی شامل کرکے پھر سے بھنائی کریں۔ تیل اور

مسالا الگ ہو جانے پر ٹماٹر اور سبز مرچ باریک کاٹ کر ہلکا سادم دے دیں۔ مسالا ایک جان ہونے پر قیمہ شامل کریں اور خوب بھونیں اور ایک کپ پانی ڈال کر دم دے دیں۔ اب ایک کلو پیاز کو باریک گول گول چھلوں کی صورت میں کاٹ لیں۔ جب قیمہ گل جائے تو پیاز شامل کر دیں۔ اور مکس کرنے کے بعد ہلکی آنچ پر دس منٹ کے لیے دم دے دیں۔

آخر میں ہرا دھنیا اور بھنے ہوئے زیرے کا چھڑکاؤ کریں۔ مزیدار قیمہ پیاز تیار ہے۔ نان یا چپاتی کے ساتھ پیش کریں اور لیموں والی سلاد ہو تو کیا ہی بات۔

3 کچن کی صفائی میں سب سے اہم بات کہ کچن میں صرف ضرورت کی اشیاء ہوں۔ مسالا جات کے ڈبے بھی کم سے کم ہوں۔ فالتو اور زائد مسالا جات کے لیے الگ سے کوئی بڑے سائز کا ڈبہ یا صندوق رکھ لیں اور وقتاً فوقتاً ان مسالا جات کو ہوا لگوائیں۔ میں تو ڈبوں کو روزانہ ترتیب دیتی ہوں اور برتنوں کی دھلائی کے بعد ان کو ان کی جگہ پر ترتیب سے رکھ دیتی ہوں۔ کچن اور چولہے کو کپڑے کی صافی سے روزانہ صاف کرتی ہوں۔ ہمارے گاؤں میں چونکہ ابھی تک گیس نہیں ہے۔ اس لیے لکڑیاں جلائی جاتی ہیں۔ چولہے جن میں لکڑی جلائی جاتی ہے وہ عموماً صحن میں ہوتے ہیں ان کی روزانہ مٹی سے لپائی بھی میری صفائی کا لازمی جز ہے۔

4 ناشتے میں ابا جی (سسر) چائے، رسک لیتے ہیں۔ امی جوس یا دودھ۔ میں چائے پراٹھا۔ ہسبنڈ جب چھٹی پر آتے ہیں تو پھر بھرپور ناشتہ بنواتے ہیں اور خاصا اہتمام ہوتا ہے۔ آملیٹ بنانے کی ترکیب تو بہت سی بہنوں کی طرف سے ہوئی ہیں ایک بہت ہی آسان ترکیب بھی نوٹ کر لیجیے۔ خصوصاً بچے بہت شوق سے کھائیں گے۔

## گرین چلی آملیٹ

اجزا:

| | |
|---|---|
| انڈے | دو عدد |
| سبز مرچ | تین عدد موٹی والی |
| (بچوں کے لیے ڈیڑھ مرچ کر لیں) | |
| نمک | ایک چٹکی |
| دکنی مرچ/وائٹ پیپر | ایک چٹکی |
| قصوری میتھی | ایک چٹکی |
| آئل | حسب ضرورت |

ترکیب:

انڈوں کو خوب پھینٹیں کہ جھاگ بن جائے۔ اب علاوہ تیل کے تمام اجزا شامل کر کے پھینٹیں۔ پین میں آئل ڈال کر گرم کریں اور آمیزہ ڈال دیں۔ خیال رہے کہ آنچ دھیمی ہو۔ آمیزہ پھیلا لیں۔ ایک طرف سے ہلکا سنہرا ہونے پر پلٹ دیں۔ چوکور خستہ پراٹھے کے ساتھ گرین چلی آملیٹ ہو اور ساتھ میں میٹھی لسی۔ واہ جی واہ کیا کہنے۔ (فیر کوئی چوہدری جی اوس دا سوادا اے) (آہم)

5 اس معاملے میں سسر والے اور ہسبنڈ صاحب خاصے تنگ دل، سنگ دل، پتھر دل اور بھی جتنے بھی دل ہیں وہ واقع ہوئے ہیں۔ کھانے کے لیے باہر اپنی زندگی میں ایک بار ہی گئی ہوں وہ بھی شادی کے بعد میری عزیز از جان نند اور نندوئی کی دعوت پر ہونے تھا۔ لاہور کا مشہور ترین "ذی ویچ" بہت مزہ آیا تھا۔ ایک یادگار موقع تھا۔ اس کے علاوہ ہسبنڈ کے ساتھ، مدینہ، مکہ، طائف، ابجاء کے مشہور پاکستانی ہوٹلوں میں بھی کھانا کھایا ہے وہ بھی میری ضد پر۔ کیوں کہ وہ تو گاڑی میں ہی کھلانے پر بضد رہتے تھے۔ ویسے ہمارے ہاں باہر کھانا کھانے کا رواج بالکل بھی نہیں ہے۔ اب نندوں اور جیٹھ جی کے بچے چونکہ جوان ہو رہے ہیں ان کا فرمائشی پروگرام چلتا رہتا ہے۔ ان کے طفیل کبھی کبھار ہمارا شوق بھی پورا ہو جاتا ہے۔ برگر شاپ یا جوس کارنر تک تو رسائی حاصل کر ہی چکے ہیں۔

# موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

## چٹ پٹے بینگن اچاری مصالحہ

ضروری اجزا :

| | |
|---|---|
| بینگن (لمبے والے) | ڈیڑھ پاؤ |
| ٹماٹر | آدھا کلو |
| لہسن' ادرک پیسٹ | دو چائے کے چمچے |
| کڑی پتے | پندرہ عدد |
| نمک | حسب ذائقہ |
| لال مرچ پسی | ایک چائے کا چمچہ |
| دھنیا پسا | ایک کھانے کا چمچہ |
| پسی ہلدی | آدھا چائے کا چمچہ |
| تیل | حسب ضرورت |
| ہینگ | ایک چٹکی |
| سونف | ایک چائے کا چمچہ |
| کلونجی | آدھا چائے کا چمچہ |
| میتھی دانہ | آدھا چائے کا چمچہ |
| رائی | ایک چائے کا چمچہ |

ترکیب :

بینگن کو لمبائی میں کاٹ لیں' پھر گرم گھرے تیل میں سنہرا ہونے تک تلیں۔ ایک ساس پین میں تین کھانے کے چمچے تیل گرم کریں۔

ادرک لہسن کا پیسٹ ڈال کر کڑی پتے شامل کریں۔ کڑکڑانے لگے تو اس میں ہینگ' سونف' کلونجی' رائی' میتھی دانہ ڈالیں۔ جب میتھی دانہ ہو جائے تو اس میں ہلدی' لال مرچ' دھنیا اور نمک شامل کردیں۔ آدھا منٹ تک بھون کر اس میں ٹماٹر گل ڈال جائیں۔ (باریک چوپ کیے ہوئے) بھون لیں ٹماٹر گھل جائیں تیل الگ ہوجائے تو اس کے اندر فرائی کیے ہوئے بینگن شامل کریں ہلکی آنچ پر کچھ منٹ تک پکائیں گرم گرم تندوری روٹی کے ساتھ پیش کریں۔

## بیف ڈونٹ

ضروری اجزا :

ڈونٹ بنانے کے لیے

| | |
|---|---|
| میدہ | دو کپ |
| چینی | ایک چائے کا چمچہ |
| نمک | حسب ذائقہ |
| گھی | دو کھانے کے چمچے |
| بیکنگ پاؤڈر | ایک چائے کا چمچہ |
| انسٹنٹ ایسٹ | ایک کھانے کا چمچہ |
| انڈا | ایک عدد |
| گرم دودھ | حسب ضرورت |

فلنگ کے لیے:

| | |
|---|---|
| گائے کا گوشت | آدھا کلو |
| نمک | حسب ذائقہ |
| لہسن' ادرک پیسٹ | ایک چائے کا چمچہ |
| اوریگانو | آدھا چائے کا چمچہ |
| سفید مرچ پاؤڈر | ایک چائے کا چمچہ |
| کریم | آدھا چائے کا چمچہ |
| چیز | ایک کپ |
| مکھن | ایک کھانے کا چمچہ |

ترکیب :

میدے میں چینی' نمک' گھی' بیکنگ پاؤڈر' انسٹنٹ ایسٹ' انڈا ڈال کر گرم دودھ سے گوندھ لیں اور کور کرکے 2-1 گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔ جب آٹا پھول جائے تو ساسر کے سائز کی چھوٹی روٹی بیل لیں۔

گوشت کو ابال کر چھوٹا چھوٹا کرلیں مکھن گرم کریں

اس میں لہسن ' ادرک پیسٹ اور گوشت فرائی کریں۔ اوریگانو پاؤڈر' نمک' سفید مرچ پاؤڈر اور کریم ملا کر چولہا بند کردیں گوشت ٹھنڈا ہوجائے تو چیز مکس کردیں۔ پزا کی روٹی پر گوشت کی فلنگ رکھیں اور گول بالز بنالیں اور ہاتھ سے پریس کرکے درمیان میں انگلی سے سوراخ کردیں۔ چاہیں تو گرم تیل میں تل لیں یا گرم اودن میں پندرہ سے بیس منٹ تک بیک کریں اور چٹنی کے ساتھ کھائیں۔

## چکن کوفتے ساگ کے ساتھ

ضروری اجزا :

کوفتے کے لیے:

| | |
|---|---|
| مرغی کا قیمہ | آدھا کلو |
| نمک | حسب ذائقہ |
| کٹی لال مرچیں | آدھا چائے کا چمچہ |
| ہری مرچیں | ایک چائے کا چمچہ |
| زیرہ | ایک چائے کا چمچہ |
| ہرا دھنیا | آدھا کپ |
| ڈبل روٹی کا چورا | آدھا کپ |
| کارن فلور | دو کھانے کے چمچے |
| انڈا | ایک عدد |
| پیاز (باریک چوپ کرلیں) | دو عدد |
| لہسن ' ادرک پیسٹ | دو چائے کے چمچے |
| تیل | حسب ضرورت |
| پالک کا ساگ | آدھا کلو |
| ہلدی پاؤڈر | آدھا چائے کا چمچہ |
| لال مرچ پاؤڈر | ایک چائے کا چمچہ |
| دھنیا پاؤڈر | ایک چائے کا چمچہ |
| ادرک | ایک کھانے کا چمچہ |
| ہرا دھنیا' ہری مرچیں | سجانے کے لیے |

ترکیب :

1۔ قیمے میں کٹی لال مرچ' ہری مرچیں' (چھلی ہوئی) زیرہ (بھون کر کوٹ لیں) ہرا دھنیا' (چوپ کرلیں) ڈبل روٹی کا چورا' کارن فلور' انڈا' ایک عدد پیاز (باریک چوپ کرلیں) نمک اور ایک چائے کا چمچہ لہسن' ادرک پیسٹ ملا کر چوپر میں پیس لیں اور کوفتے بنا کر گرم تیل میں تل لیں اور ایک طرف رکھ دیں۔

2۔ جس تیل میں کوفتے تلے تھے اس میں باقی ایک عدد پیاز فرائی کریں لہسن' ادرک پیسٹ' نمک' لال مرچ پاؤڈر' ہلدی پاؤڈر' دھنیا پاؤڈر ڈال کر بھون لیں۔ پالک کو ایک منٹ تک ابال کر پانی نکال کر چوپر میں پیس لیں اور مسالے میں ڈال کر بھونیں۔ کوفتے ڈال کر دم پر رکھیں۔ ادرک' ہری مرچیں' ہرا دھنیا ڈال کر نان یا چپاتی کے ساتھ پیش کریں۔

## گاجر کا حلوہ

ضروری اجزا :

| | |
|---|---|
| گاجر | ایک کلو |
| خشک دودھ | تین پیالی |
| چینی | دو پیالی |
| چھوٹی الائچی | چھ عدد |

سجانے کے لیے حسب ضرورت کھویا' بادام' پستے' اخروٹ کی گری حسب پسند۔

| | |
|---|---|
| گھی | ایک پیالی |

ترکیب :

گاجروں کو کدوکش کرکے بھاپ دے لیں اور کچل کر بالکل خشک کرلیں پھر ایک دیگچی میں گھی گرم کرکے الائچی ڈال دیں۔ پھر گاجریں اور دودھ ڈال کر آہستہ آہستہ بھونیں یہاں تک کہ وہ گھی چھوڑنا شروع ہوجائے پھر چینی ڈال دیں جب شیرا خشک ہونے لگے اور گھی اوپر آنے لگے تو اتار کر ایک تھالی میں چکنائی لگا کر پھیلا دیں اوپر سے کھویا اور میوہ ڈال دیں اور چاندی کے ورق لگا کر گرم گرم پیش کریں۔

## نفسیاتی و ذہنی الجھنیں

**نگہت ۔۔۔ حیدر آباد**

میری عمر 17 سال ہے۔ اور میں فرسٹ ایئر کی طالبہ ہوں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میٹرک کے امتحان سے پہلے میں جس جگہ ٹیوشن پڑھنے جاتی تھی' اس گلی میں ایک صاحب رہتے تھے۔ شروع میں انہوں نے دور دور سے دیکھنے پر اکتفا کیا اور پھر چھوٹے چھوٹے فقروں کا استعمال۔ یہ نئی صورت حال میرے اور میری دوست کے لیے بہت پریشان کن تھی۔ کیونکہ آتے جاتے لوگ بھی دیکھتے تھے کہ وہ حضرت کچھ کہتے ہیں۔ لہٰذا ہم نے اپنی ٹیوٹر سے شکایت کردی۔ انہوں نے ان کو بلوا کر ڈانٹا تو وہ صاحب الٹا ہم پر الزام لگانے لگے کہ وہ تو خود مجھے لفٹ کراتی ہے۔

جب ان باتوں کا مجھے علم ہوا کہ انہوں نے میرے متعلق یہ باتیں کہی ہیں تو میں اور بھی اس سے کترانے لگی۔ لیکن جب امتحان ختم ہوگئے تو اس نے اپنے دوست کی بہن جو اتفاق سے میری بھی دوست تھیں ان سے کہلوایا کہ نگہت سے کہیں کہ میں اسے پسند کرتا ہوں اور یہ کہ میں اس معاملے میں بہت سنجیدہ ہوں۔ میں نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ عرصے بعد میں پھر اپنی دوست جو کہ مجھ سے بڑی ہیں اور میں انہیں باجی کہتی ہوں۔ ان کے گھر گئی تو وہ خود آگئے اور مجھے اپنی محبت کا یقین دلانے لگے اور یہ کہ اگر تم نے میرا ساتھ نہ دیا تو میں ایک بگڑا ہوا انسان بن جاؤں گا۔ انہوں نے بھی میٹرک کا امتحان دیا تھا' کہنے لگے پیپر تو تمہاری وجہ سے اچھے نہیں ہوئے لیکن سپلیمنٹری میں تمام پیپر کلیئر کرلوں گا۔

پھر دو چار دفعہ ہم وہیں ملے حالانکہ میں انہیں بالکل پسند نہیں کرتی تھی۔ لیکن اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ یہ بات مجھے انہیں بتا دینی چاہیے تھی۔ کالج سے واپسی پر وہ حضرت میرے پیچھے آتے ہیں تو مجھے بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے۔ اب میں کیا کروں۔

ج کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔

آپ ناپسند بھی کرتی ہیں اور ملاقات بھی کررہی ہیں۔ خود سوچیں آپ چاہتی کیا ہیں؟ عزت ایک دفعہ چلی جائے تو زندگی بھر دوبارہ واپس نہیں آتی۔ ایسے راستے پر نہ جائیں جہاں صرف بدنامیاں ملیں۔ آپ سختی سے پیش آئیں اور ٹیوٹر کو بھی صحیح صورت حال بتا دیں۔

**ت۔ گل**

بھائی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ سوچتی بہت ہوں اور بہت جذباتی ہوں۔ اگر کوئی میرے ساتھ زیادتی کرے تو کئی مہینوں تک اس پر کڑھتی رہتی ہوں اور چاہ کر بھی بھلا نہیں پاتی۔

پچھلے سال کانٹریکٹ کی بنیاد پر ایک کالج میں تدریس کا فریضہ (ایم اے اردو) انجام دیتے ہوئے میری ایک دوست بنی۔ اس نے میرا بہت ساتھ دیا ہر معاملے میں۔ میں بالکل نئی تھی۔ تو اس نے مجھے ہر پریشانی میں حوصلہ دیا۔ مگر ایک چھوٹی سی بات ہوئی اور وہ مجھ سے ناراض ہوگئی میں نے لاکھ منانا چاہا مگر وہ ناراض ہے۔ یہاں تک تو بات قابل برداشت تھی مگر پھر میری ایک اور دوست نے بھی مجھے ایک معمولی بات پہ مجھے چھوڑ دیا۔ کیا واقعی میں کسی کی دوستی کے قابل نہیں؟ کیا واقعی میں ہی زیادتی کرتی ہوں۔

سالوں پہلے اگر کسی نے میرے ساتھ کچھ برا کیا یا دھوکہ دیا تو وہ بھی مجھے یاد رہتا ہے۔ آپ یقین کریں جن لوگوں نے بھی مجھے زندگی میں دکھ دیا۔ میں انہیں سچے دل سے معاف کرچکی ہوں۔ لیکن پھر بھی میرے دل میں انتقامی خیالات بہت آتے ہیں۔ میں خوش رہنا چاہتی ہوں۔ مگر فضول سوچیں میرے ذہن سے چپک گئی ہیں۔

میں سب کی طرح محفل میں کھل کر اپنے خیالات بیان نہیں کر سکتی۔ کبھی کبھی جب وہ لوگ یاد آئیں جنھوں نے میرے ساتھ زیادتی کی تو انتقامی خیالات میں اتنی شدت آجاتی ہے کہ خود کلامی کرنے لگتی ہوں۔

ج ۔ آپ نے لکھا ہے کہ آپ کی ایک دوست جس نے ہر طرح آپ کا ساتھ دیا' ایک معمولی سی بات پر آپ سے ناراض ہو گئی اور آپ کو چھوڑ دیا۔ دوسری دوست کے ساتھ بھی اسی طرح ہوا' وہ بھی چھوٹی سی بات پر آپ سے خفا ہو گئی۔ آپ نے اس کی وجہ دریافت کی ہے کہ لوگ آپ کے ساتھ ایسا کیوں کرتے ہیں ؟

اچھی بہن وجہ تو آپ نے خود ہی لکھ دی۔ آپ کسی سے بدلہ یا انتقام نہیں لیتیں لیکن دل ہی دل میں کڑھتی رہتی ہیں حتی کہ سالوں کسی بات کو بھول بھی نہیں پاتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ کسی کو بھی سچے دل سے معاف نہیں کر پاتیں' ہو سکتا ہے کہ آپ کو یہ بات عجیب لگے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارے خیالات دوسروں کے دل و ذہن کو متاثر کرتے ہیں۔ اگر ہم کسی کے لیے دل میں خلوص رکھتے ہیں۔ کھلے دل سے ملتے ہیں۔ تو وہ بھی ہم سے مل کر خوش ہوتا ہے لیکن ہم ہر وقت ناخوش نظر آتے ہیں' کڑھتے رہتے ہیں دل میں منفی خیالات رکھتے ہیں تو دوسرے لوگ ہم سے بھاگنے لگتے ہیں۔

اس کا علاج کسی ڈاکٹر یا حکیم کے پاس نہیں آپ کے اپنے پاس ہے۔ ہر وقت اپنی ذات کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیں۔ یہ نہ سوچیں کہ دوسروں نے آپ کے ساتھ کیا کیا' یہ سوچیں آپ دوسروں کے ساتھ کیا کر سکتی ہیں' انہیں کیا دے سکتی ہیں۔ اگر آپ خوش رہنا چاہتی ہیں تو خوشی حاصل کرنے کے بارے میں نہ سوچیں بلکہ یہ سوچیں کہ دوسروں کو کیسے خوش رکھ سکتی ہیں۔ یقین کریں جو آپ دوسروں کو دیں گی وہ لوٹ کر آپکے پاس ہی آئے گا' سب کے لیے اچھا گمان رکھیں۔ دوسروں کے خلوص پر شک نہ کریں۔ سب سے بڑی بات کہ دوسروں کو انسان سمجھیں اور یہ نہ بھولیں کہ انسان خطا کا پتلا ہے۔ اس سے غلطی ہو سکتی ہے۔ آپ یہ سوچ رکھیں گی تو آپ کے لیے دوسروں کو معاف کرنا آسان ہو گا۔ جہاں تک محفل میں بات چیت کرنے کی بات ہے تو جب آپ کی سوچ بدلے گی تو خود بخود آپ کی جھجک بھی ختم ہو جائے گی۔

آپ کی تحریر کی روانی سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ذہین اور سمجھ دار ہیں لیکن اپنی ذات کے بارے میں ضرورت سے زیادہ حساس ہیں۔ تھوڑی سی کوشش سے آپ اس مسئلے پر قابو پا سکتی ہیں۔

## مس افضل ۔۔۔ ملسی

میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے موت سے خوف آتا ہے۔ میرے گھر میں کوئی پریشانی نہیں۔ اللہ کا شکر ہے۔ گھر اپنا ہے چھ بچے ہیں' چار بیٹیاں دو بیٹے۔ کاروبار بھی اللہ کا شکر ہے بہترین ہے مگر میں پھر بھی ہر وقت پریشان رہتی ہوں۔ میرے پتے میں پتھری ہے ڈاکٹر کا کہنا ہے آپریشن کروائیں اور مجھے آپریشن کروانے سے ڈر لگتا ہے۔ مجھے ایسے لگتا ہے کہ آپریشن میں میری ڈیتھ ہو جائے گی۔

ج ۔ موت کا خوف تو ہر شخص کو ہوتا ہے لیکن یہ خوف حد سے زیادہ بڑھ جائے تو زندگی کا لطف ختم ہو جاتا ہے۔ آپ پر بہت زیادہ خوف طاری رہتا ہے۔ جس نے آپ کے ذہن کو متاثر کیا ہے۔

سب سے پہلے تو آپ اللہ تعالٰی کا شکر ادا کریں جس نے آپ کو ہر نعمت سے نوازا ہے۔ پھر اللہ کی رحمت کے بارے میں سوچیں ۔۔۔ اللہ تعالٰی اپنے بندوں پر ستر ماؤں سے زیادہ مہربان ہے۔ جب ماں اپنی نافرمان اولاد سے بھی محبت کرتی ہے تو وہ رب اپنے بندوں سے کتنی محبت کرتا ہو گا۔ آپ اندازہ کریں۔ موت برحق ہے۔ ہر ایک کو آنی ہے اور اللہ تعالٰی ہم سے اتنا پیار کرتا ہے تو پھر خوف کس بات کا ۔۔۔؟

آپ اللہ تعالٰی کے بھروسے پر آپریشن کرائیں۔ ان شاء اللہ کامیاب ہو گا ۔۔۔ نیند کی دوائیں مسئلہ کا حل نہیں۔ آپ صرف ایک کام کریں کہ اپنے پیٹ کا خیال رکھیں' بہت زیادہ مرغن کھانے نہ کھائیں اور دو کیلے روزانہ ضرور کھائیں۔ ایک ماہ بعد خط لکھ کر ضرور بتائیں۔

☆

امت الصبور

# بیوٹی بکس



اسماء وکیل ..... ملتان

س : باجی! میرے بال بہت خراب ہو گئے ہیں۔ نوکیں پھٹ گئی ہیں بڑھنا رک گئے ہیں۔ اور گرتے بہت ہیں۔ پلیز مجھے کوئی ایسا تیل بتائیں جس سے میرے بال نہ صرف اچھے ہو جائیں بلکہ لمبے بھی ہو جائیں کیوں کہ مجھے لمبے بالوں کا جنون ہے۔ پہلے میرے بال بہت لمبے اور گھنے تھے۔

ج : بہن اسماء! سب سے پہلے تو آپ اپنی صحت پر توجہ دیں۔ کچی سبزیاں اور پھل زیادہ کھائیں خصوصاً" گاجر اور سیب جو کہ آج کل آئے ہوئے ہیں۔

بال گرنے سے روکنے کے لیے ایک پاؤ۔ سرسوں کا تیل لے کر نیلے رنگ کی شیشے کی بوتل میں بھر لیں اور اس پر ڈھکن لگا دیں۔ تاکہ ہوا اندر نہ جا سکے۔ پھر اس بوتل کو روزانہ چھ گھنٹے دھوپ میں لکڑی کی چوکی پر رکھیں۔ چالیس روز بلاناغہ دھوپ میں رکھنا ہے۔ تیل تیار ہے۔ یہ تیل بالوں میں لگائیں' بال گرنا بند ہو جائیں گے۔ اگر نیلے رنگ کی شیشے کی بوتل نہ ملے تو سفید شیشے کی بوتل پر نیلا سیلوفین پیپر (جو اگربتی وغیرہ کے پیکٹ پر لپٹا ہوتا ہے وہ والا) لپیٹ کر دھوپ میں رکھیں۔

یا پھر آپ کھوپرے کا تیل اور ارنڈی کا تیل (کسٹر آئل) دونوں ہم وزن لے کر ملا کر رکھ لیں۔ اور اس کا متواتر استعمال رکھیں۔

ف گ ..... ضلع ننکانہ صاحب

س : آپی میری کزن کی عمر 21 سال ہے' 5 فٹ 2 انچ ہائیٹ ہے اور 49 کلو وزن ہے۔ کیا عمر کے حساب سے یہ وزن ٹھیک ہے؟ پیٹ اور کولہوں کا مسئلہ ہے جو بہت بڑھ رہے ہیں' پلیز آپی کوئی ایسی ورزش بتایئے کہ پیٹ کم ہو جائے خاص کر کے کولہے۔ آپی جنوری میں اس کی شادی ہے۔ پلیز پلیز آپی دسمبر کے شمارہ میں جواب دے دینا۔ پلیز آپی آپ سے ریکویسٹ ہے وہ بہت پریشان ہے اس مسئلے کی وجہ سے' پلیز کوئی حل بتایئے۔

ج : بہن ف گ آپ کی کزن کا وزن بالکل ٹھیک ہے۔ پیٹ اور کولہوں کے لیے آپ کی کزن کو چاہیے کہ صبح بستر پر سیدھے لیٹ کر سائیکل چلانے کے انداز میں پاؤں کو حرکت دیں۔ اس کے علاوہ ایک اور طریقہ یہ ہے کہ سیدھی کھڑی ہو کر ہاتھ اٹھا لیں اور آہستہ آہستہ جھک کر پیر کے انگوٹھے کو چھوئیں دس منٹ یہ ورزش روزانہ کریں۔

م ش ..... گجرات

آپ نے اپنی دو بہنوں کے لیے نسوانی حسن کے متعلق پوچھا ہے اس کے لیے بنیر کا استعمال بہترین ہے اس کے علاوہ کالا زیرہ پانی کے ساتھ پیس کر لیپ بنا کر لگائیں' سوکھنے پر جھاڑ دیں۔ ناشتے میں ساگودانہ اور منقی کی کھیر بنا کر کھائیں۔

☼